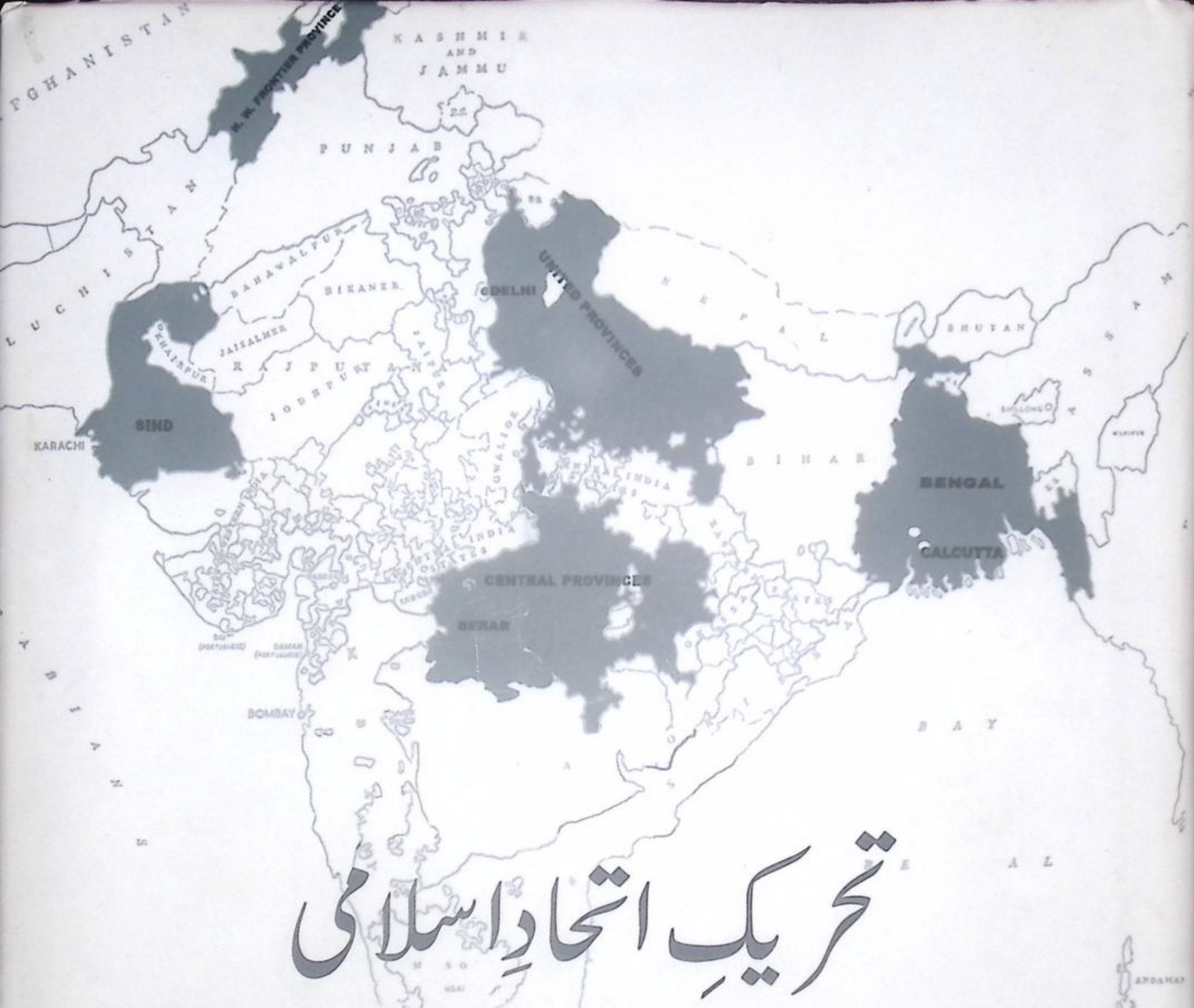

تحریکِ اتحادِ اسلامی

(Pan-Islamism)

اور برطانوی ہندوستان

تاریخ، ادب اور ثقافت

(۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)

خالد امین

تحریکِ اتحادِ اسلامی

(Pan-Islamism)

اور برطانوی ہندوستان

تاریخ، ادب اور ثقافت

(۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)

خالد امین

عکس
AKSPUBLICATIONS

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا ادارہ عکس پبلیکیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت
کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال
ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

کتاب: تحریک اتحادِ اسلامی اور برطانوی ہندوستان

مصنف: خالد امین

صفحات: 432

اشاعت: 2019

تعداد: 500

قیمت: 1000

عکس

AKSPUBLICATIONS

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انتساب

والدہ مرحومہ
کے نام

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
اقبالؔ

maablib.org

فہرست ابواب

پیش لفظ 7

مقدمہ 11

باب اوّل:

تحریک اتحاد اسلامی: تعارف، پس منظر، محرکات 25

باب دوم:

تحریک اتحاد اسلامی اور جمال الدین افغانی 43

تحریک اتحاد اسلامی کا تناظر: جنوبی ایشیا کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی صورت حال 48

فری میسن، جمال الدین افغانی اور ولفرڈ اسکاوَن بلنٹ 67

باب سوم:

سید احمد خان، جمال الدین افغانی اور بین الاسلامیت 97

شبلی نعمانی اور سید احمد خان کے اختلافات: شبلی کی بین الاسلامی مراجعت 107

سید احمد خان کے رفقا کی تحریک اتحاد اسلامی سے قلمی وابستگی 117

تحریک اتحاد اسلامی اور برعظیم کے علما کی علمی و ادبی خدمات 130

باب چہارم:

تحریک اتحاد اسلامی: معاصر علمی و ادبی تحریکوں پر اثرات 151

علی گڑھ تحریک دارالعلوم دیوبند ندوۃ العلما

باب پنجم:

تحریک اتحاد اسلامی: اردو ادب کا نثری سرمایہ 191

داستان　ناول　افسانہ　ڈراما　سفرنامہ
تاریخی وسوانحی کتب ومقالات 232
باب ششم:
تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری 281
الطاف حسین حالی　علامہ شبلی نعمانی　اکبرالہ آبادی
محمد علی جوہر　اسمٰعیل میرٹھی　حسرت موہانی
مولانا ظفر علی خان　علامہ اقبال　زخ ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ)
ابراہیم بیگ چغتائی　آغا غلام حسین ارشد　شاہ قسیم الدین
آغا حشر کاشمیری　مولانا تمنا عمادی　عبدالحلیم شرر لکھنوی
صفی لکھنوی　اشتیاق سلونوی　ہاشمی فرید آبادی
عزیز لکھنوی　رضا علی وحشت
باب ہفتم:
تحریک اتحاد اسلامی کا تناظر: اردو کی علمی وادبی صحافت 363
ماحصل 408
فہرست اسناد محولہ 412

پیش لفظ

تحریک اتحاد اسلامی (Pan-Islamism) انیسویں صدی میں مسلمان ممالک کو انحطاط سے نکالنے کے لیے جمال الدین افغانی نے سلطنت عثمانیہ کی تائید سے شروع کی۔ چوں کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت عثمانیہ کی خلافت کو روحانی، سیاسی اور تہذیبی طور پر اپنا رہ نما تسلیم کرتے تھے اس لیے یہاں کے مسلم دانش وروں کا بہت بڑا طبقہ تمام تر مسلکی اور علاقائی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس میں شامل ہوگیا۔

ان دانش وروں میں علما، سیاست دان اور ادیب شامل تھے۔ اس لیے اس تحریک کے اثرات ادبی حوالوں سے بھی موجود ہیں اردو نظم ونثر کے علاوہ اردو صحافت بھی اس تحریک سے متاثر ہوئی اور اس دور کے ان اخبارات نے بھی اس تحریک کو خصوصی اہمیت دی جن کے مالکان ہندو تھے۔ انھیں وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تحریک کا مطالعہ آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

کوئی بھی ادبی مطالعہ اپنے تاریخی وتہذیبی ربط کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس موضوع میں بھی برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخی وتہذیبی زندگی کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے تاکہ اس عہد کے فکری تناظر کا صحیح اور درست تجزیہ ممکن ہو سکے، کیوں کہ خالص ادب کسی بھی معاشرے میں بذات خود کوئی چیز نہیں ہوتا۔ کسی بھی معاشرے کا فکری اور تصوراتی پہیا ہی اس گاڑی کو توانائی فراہم کرتا ہے۔

جنوبی ایشیا میں اس تحریک کے حوالے سے اردو زبان میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک پر مسلمان دانش وروں اور مستشرقین نے خاصا اہم کام کیا ہے جن کے تراجم بھی اردو زبان میں ہوئے ہیں۔ ان میں کئی کتابیں اور مصنف تو ایسے گزرے ہیں جنھیں ہماری تاریخ نظرانداز کرسکتی ہے نہ ہماری روایات۔ ان کے کاموں میں جذباتی ابال نہ ہونے کے برابر ہے انھوں نے اس تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری علمی اور ادبی میراث ہے۔ بہرحال ان ساری چیزوں کو اس کتاب میں سمیٹنے کی جو کوشش میں نے کی ہے اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں۔ میری کوشش صرف یہی رہی ہے کہ ہماری تاریخ کا یہ گم شدہ باب

ترتیب پا جائے۔

اردو ادب پر اس تحریک نے جو اثرات مرتب کیے اس کو باب پنجم اور ہشتم میں نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس میں کئی ایسی غیر معروف کتابوں کو حوالہ بنایا گیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں پردے میں پڑی ہوئی تھیں۔

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں استاذی ڈاکٹر ذوالقرنین احمد المعروف شاداب احسانی نے نہایت کشادہ دلی سے تعاون کیا۔ ایک اچھے اور مشفق استاد ہونے کے ناتے مقالے کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو حل کرنے میں کافی معاونت کی۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر کو نہ صرف سراہا بلکہ اظہار رائے کی بھی پوری آزادی فراہم کی جس کی وجہ سے میرے لیے اس کام میں کسی بھی قسم کی نظریاتی اختلاف نے رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ اس مقالے کے خاکے کی تیاری اور اس کی تکمیل تک وہ میرے ساتھ رہے اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کی نوک پلک کو سنوارتے رہے۔

اس کتاب کی تیاری میں جن کتب خانوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ان میں غالب لائبریری، انجمن ترقی اردو لائبریری، بیدل لائبریری شرف آباد ہیں۔ زیادہ تر مواد انجمن کی لائبریری سے ملا جہاں حقیقتاً انیسویں صدی کا خزانہ موجود ہے جو لوگ اس صدی کی تاریخ، تہذیب اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس لائبریری میں اس صدی کا نچوڑ جمع ہے۔

ان باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتابوں تک رسائی حاصل کرنا اور مواد جمع کرنے سے کوئی مقالہ تحریر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے کافی تفحص کی ضرورت ہوتی ہے نظم ضبط کے بعد جو مواد ملتا ہے اسے ترتیب دینے کے لیے ایک مکمل سپردگی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ بے ترتیبی کسی صورت مقالہ نگار کو اس کے کام کی تکمیل تک نہیں لے جاسکتی۔

اس پی ایچ ڈی کے مقالے کو تحریر کرنے کے دوران بیدل لائبریری کے زبیر بھائی نے مشفق اور مربی کا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف کتابیں اور رسالے فراہم کیں' بلکہ حوصلہ بھی بڑھایا جس سے کام کرنے میں ایک نئی توانائی حاصل ہوئی۔ اس لائبریری کی فضا میں ایک ایسا اثر ہے جس سے قلم اور ذہن خود بہ خود حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور پھر اس لائبریری کے امان بھائی نے اپنے کام اور مدد کے ذریعے رسائل اور کتابوں تک رسائی کو نہایت آسان بنادیا۔ خود زبیر بھائی نے اخلاص کی ایک ایسی مثال اس لائبریری میں

قائم کی ہوئی ہے جو شہر کے دوسرے اداروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔

میں اس کام کو ان ساری چیزوں کے ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں کر پاتا اگر میرے عزیز دوست ڈاکٹر جاوید احمد خورشید اس کام میں میرے ساتھ نہ ہوتے، نہ جانے کیوں اس علمی کام میں ان کے بغیر مجھے تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے میرے دم توڑتے ہوئے حوصلوں کو اپنی شخصیت کے ذریعے سہارا دیا۔ اور ہر موڑ پر میرے ساتھ کھڑے رہے۔ اس مقالے میں جو انگریزی ماخذ موجود ہیں اس کو سمجھنے میں انھوں نے بہت زیادہ مدد دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالہ مواد کے اعتبار سے کافی زرخیز ہوگیا ہے۔

یہاں پر یہ ضروری ہے کہ اپنے استاذی پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا شکریہ ادا کروں جن کی شفقت اور محبت راقم کے لیے نہایت اہم ہے اور اس کام کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں جو علم نوازی اور بندہ پروری موجود ہے اس کے خصائص تہہ در تہہ ہیں۔ وہ علم کو پروان چڑھتا دیکھ کر نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ اس کی آبیاری بھی کرتے ہیں۔ اس پورے مقالے کی ترتیب میں ڈاکٹر صاحب نہ صرف راقم کے ساتھ رہے بلکہ اپنی قیمتی آرا سے مجھ ایسے کم فہم آدمی کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی سرپرستی کے بغیر یہ کام کسی صورت مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔

برعظیم کی تحریکی فضا میں تحریک خلافت، تحریک انجمن خدام کعبہ اور تحریک ہجرت و ترک موالات کا ذکر خصوصی طور سے کیا جاتا ہے۔ ادب پر اس کے کیا اثرات ہیں اس کا مطالعہ بھی کئی جہتوں کو مدنظر رکھ کر کیا جا چکا ہے۔ مگر تحریک اتحاد اسلامی پر صرف چند کتابیں انگریزی زبان میں ملتی ہیں۔ مگر اردو ادب کو بنیاد بناتے ہوئے اس تحریک کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس تحریک کا ایک مبسوط مطالعہ کیا جائے اور خصوصی طور پر اس کے ادبی اثرات کو دیکھا جائے تاکہ ہماری تاریخ کے یہ گم شدہ اوراق ترتیب پا جائیں۔

یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی بھی قوم کی تاریخ میں تحریکات کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ تحریکیں قوموں کو نظریاتی اور فکری مواد فراہم کرتی ہیں اور ان کے ذریعے قوم کی شعوری تربیت ہوتی ہے۔ نظریے اور فکر زندگی کے معاملات عمدہ طریقے سے ترتیب دینے میں معاونت کرتے ہیں۔ دنیا میں برپا مختلف تحریکوں نے کئی بڑے انقلاب برپا کیے اور اس کے ذریعے سے ایک نئی طرز زندگی کی بنا پڑی جو تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے سابقہ روایات کو منہدم کر کے نئی روایات کا آغاز کرتی ہے۔ اسی لیے تحریکات کا مطالعہ کسی قوم کی تاریخ کا ایک محدود سطح کا مطالعہ بن جاتا ہے۔

برعظیم پاک و ہند کی سرزمین بھی دنیا کے اور خطوں کی طرح تحریکات کے معاملے میں تہی دست نہیں ہے، فکری اور نظریاتی میدان میں اس سرزمین کی تاریخ بڑی زرخیز ہے۔ یہاں پر ایسی تحریکوں کا تسلسل دکھائی دیتا ہے جنھوں نے اپنے عہد پر فیصلہ کن اثرات مرتب کیے۔ اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تخصیص نہیں۔ تحریک اتحاد اسلامی کا بھی انھیں میں شمار ہوتا ہے۔

اس دفتر کو ترتیب دینے میں ڈاکٹر منیر واسطی نے ایسے ماخذ فراہم کیے جو اردو دنیا کے لیے نئے ہیں۔ ساتھ ہی جناب حمزہ فاروقی نے اپنے وسیع مطالعے اور جنوبی ایشیا کے تاریخ کے ایسے اہم حوالوں کی جانب نشاندہی کی جس سے مجھے اس کام میں کافی آسانیاں میسر آئیں۔ ان کے علاوہ کئی مشاہیر اور احباب کا ساتھ بے مثال رہا۔ ان میں محمد علی منظر، ڈاکٹر یامین عثمان، ڈاکٹر داؤد عثمانی، ڈاکٹر طاہر مسعود، ڈاکٹر طاہر قریشی، فیض الدین احمد، محمد عمار فیضان، نیاز سواتی، ڈاکٹر عبدالرؤف، ناصر علی شاہ، عبد الحفیظ شامل ہیں۔ غالب لائبریری کی لائبریرین نازیہ نے بھی کئی اہم نادر رسالے اس سلسلے میں فراہم کیے اور اپنی ممکنہ حد تک میرے ساتھ تعاون کیا۔

علمی تحقیق کے اس دور میں یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی مطالعہ حرف آخر نہیں ہوتا۔ آج کے اس دور میں جہاں نئے انکشافات ہو رہے ہیں وہاں کوئی بھی تحقیقی کام اکملیت اور جامعیت پر مبنی نہیں ہوسکتی خاص کر کسی موضوع کے حوالے سے کیے جانے والے کام تو اس کا امکان حد درجہ ہوتا ہے میرے نقطۂ نظر کے برعکس میری دست رس سے باہر مواد کو پیش کر کے اس تحریک کے کئی اور رخ پیش کر دیے جائیں۔ اس میں پیش کردہ خیالات کی میں مکمل ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اہل نظر کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اس علمی کام میں جن حوالوں اور ماخذات کی تشنگی محسوس کرتے ہیں اس جانب ضرور توجہ دلائیں تاکہ علمی اور تحقیقی سلسلہ اپنی پوری آب وتاب سے روشن ہوتا ہوا دکھائی دے۔

خالد امین

شعبہ اردو

جامعہ کراچی، کراچی

مقدمہ

انیسویں صدی میں روس، برطانیہ اور دیگر مغربی اقوام دنیا میں اپنے تسلط کو بڑھانے کے لیے کوشاں تھیں۔ شمالی افریقہ اور برعظیم ہندوستان پر نوآبادیات کا قبضہ ہو چکا تھا اس قبضے کے نتیجے میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے تمدن کو خطرہ لاحق تھا۔ مسلمانوں رہنماؤں نے محسوس کیا کہ ان کے زوال کی بنیادی وجہ دین اسلام سے روگردانی ہے۔ مسلمانوں کی قیادت نے عالمی استعمار کے خطرے کے پیش نظر اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ محفوظ مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ متحد و متفق ہو کر عالم گیر سیاسی لائحہ عمل تشکیل دیا جائے۔

اس سلسلے میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں سید جمال الدین افغانی نے اتحاد اسلامی (Pan Islamism) کا علم بلند کیا۔ انھوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو پیغام دیا کہ یورپ کی استعماری قوتوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ اپنے ایک مضمون اسلام کی ہمہ گیر قومیت میں پان اسلامزم کی حقیقی روح کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے:

> مسلمان دوسری قومیت اور عصبیت کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اسلام اور صرف اسلام کو رشتہ اتحاد اور رابطہ جنسیت سمجھتے ہیں۔ وہ کسی رابطہ خاص کے قائل نہیں۔ بلکہ ان کا جذبہ ہمدردی اور احساس تعاون وسیع ترین معنی رکھتا ہے۔ جس کے مفہوم میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو مذہب اسلام کے نام لیوا ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کا رابطہ جنسیت رابطہ خاص نہیں بلکہ رابطہ عام ہے۔[1]

تحریک اتحاد اسلامی کے پنپنے کا سب سے بڑا سبب ترکوں کا انحطاط تھا۔ اسی زوال کو سمجھنے کے لیے عالم اسلام کی تاریخ اور انیسویں صدی کے دو تین عشروں کی سیاسی اور تہذیبی پس منظر پر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ میرے خیال میں اس پس منظر کا مطالعہ تین دائروں میں کیا جا سکتا ہے:

۱- دنیائے اسلام بالخصوص سلطنت عثمانیہ، مشرق وسطیٰ، ایران اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال۔

۲- مسلم دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہونے والے تہذیبی و ثقافتی رجحانات، اثرات اور دیگر عوامل کا جائزہ

۳- نوآبادیات کی تاریخ اور اس کا مختصرہ تذکرہ کہ انھوں نے کن بنیادوں پر سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے۔

مسلمانوں کو انیسویں صدی میں اپنے انحطاط کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان کی سیاسی قوت ہر جگہ ناکامی سے دوچار تھی جب کہ سلطنت عثمانیہ اپنی گزشتہ عظمت وقوت اور سخت جانی کی وجہ سے یورپ کی عیسائی قوتوں سے نبرد آزما تھی۔ اس کے مقابلے میں دوسری اسلامی مملکتیں مغربی استعمار کے قبضے میں آ چکی تھیں۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت پر برطانیہ اور وسطی ایشیا میں روس نے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا اور بخارا کی امارت محض روس کی ایک ریاست تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ افریقہ میں برطانیہ نے مصر اور تیونس کو اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ جرمنی نے دارالسلام برونائی تک اپنے قدم بڑھا لیے تھے۔ یہ تمام واقعات اس تیزی کے ساتھ رونما ہوئے کہ مسلمان اپنے آپ کو بے دار ہی نہیں کر پائے اور اگر بے دار بھی کر لیتے تو حربی صلاحیتوں میں وہ نو آبادیات سے بہت زیادہ پیچھے تھے۔

جمال الدین افغانی اور دیگر مسلم دانش وروں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ہر قسم کے ڈر اور شک وشبے کو دور کیا جائے اور جن بنیادوں پر یورپی قوتیں اقتدار پر قبضہ کرتی چلی جا رہی ہیں یہی قوت عمل مسلمانوں میں بھی پیدا کیا جائے۔ اس عمل کو عملی جامہ پہنانے کی یہی ایک صورت تھی کہ مسلمانوں کی کسی ایک مرکزی قوت کو سہارا بنا کر ان کی شیرازہ بندی کی جائے۔ سلطنت عثمانیہ اس انحطاط میں بھی مسلمانوں کا مرکز بن سکتی تھی کیوں کہ مسند خلافت انھیں کے پاس موجود تھا۔

لہذا عثمانوی سلطنت کو مرکز مان کر عالم اسلام کے مسلمانوں نے اس تحریک میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا اور کئی علمی وادبی ادارے قائم کیے جنھوں نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر بڑے دوررس اثرات مرتب کیے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اس تحریک کے اثر سے مسلمانوں میں جذبہ حریت پیدا کیا تا کہ وہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو برطانوی استعمار سے نفرت تھی۔ لہٰذا وہ عثمانویوں کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سید احمد خاں جو اس وقت مسلمانوں کے رہ نما تھے عثمانویوں کے مسائل سے اس وقت تک دل چسپی لیتے رہے جب تک یہ برطانوی حکمت عملی کے مطابق تھی۔ ترکی کے مصائب پر وہ متاسف رہتے تھے تہذیب الاخلاق میں اپنے مضمون میں سلطان محمود، سلطان عبدالحمید، سلطان عبدالعزیز کو مصلح قرار دیا اور ان کی پیروی ہندوستانیوں کے لیے ضروری سمجھی[۲]۔ ان کے مضامین اور خطوط میں جہاں کہیں ترکوں کا ذکر آیا ہے، وہاں ان کی محبت اور انسیت کے

جذبات واضح نظر آتے ہیں۔اس لیے انھوں نے علی گڑھ کے طلبہ کے لیے مغربی لباس کے بجائے ترکی لباس پسند کیا تھا۔لیکن جونہی برطانوی حکمت عملی عثمانویوں کے خلاف ہوئی سید احمد خان نے بھی اپنے خیالات یکسر تبدیل کر لیے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ناراضگی ۱۸۷۷۔۱۸۷۸ء میں روس کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت نہ کرنے پر برطانیہ سے بڑھتی گئی۔ان کی ہمدردیوں میں اتحاد اسلامی اور خلافت عثمانیہ کی بابت اضافہ ہوتا چلا گیا۔انھوں نے سید احمد خان کے مشورے کو رد کر کے حکومت وقت کی فرماں برداری کے بجائے اتحاد اسلامی اور اپنی علیحدہ مسلمان قومیت کی جدوجہد کو پسند کیا۔

ان تمام حالات کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہندوستانی علما نے بھی اتحاد اسلام کے نظریے اور عملی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔دو اہم روایت پسند مذہبی مدارس کے علما جس میں دیوبند اور فرنگی محل شامل تھے انھوں نے اتحاد اسلام کے نظریے کو نہ صرف اپنایا بلکہ وہ اس کی ترویج و اشاعت کے لیے میدان میں بھی اتر آئے، اور احتجاجی تحریک کو مذہبی انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔خاص طور پر دیوبندی علما نے مسلمانوں کے لیے یہ لازمی قرار دیا کہ وہ ترک ہلال احمر سوسائٹی کی مالی معاونت کریں اور بلقان فنڈ میں زکوۃ کا پیسہ بھی دیں۔

لیکن ایک اہم کردار مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ادا کیا جو لکھنو میں مدرسہ فرنگی محل کے بڑے عالم دین تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان بھر میں ایک پیر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے تھے کئی اہم رہنما ان کے ہاتھ پہ بیعت بھی کر چکے تھے وہ اس تحریک کے دوران ترکوں سے رابطے میں تھے ان کے ایک شاگرد مشیر حسین قدوائی نے بھی استنبول کا دورہ کیا۔انھوں نے اپنی شخصیت کے اثر سے ہندوستان میں ترکوں کے وقار کو کافی توانا کر دیا تھا[۳]۔

اسی کے ساتھ ساتھ شبلی نعمانی جو علی گڑھ سے علیحدہ ہونے کے بعد ندوۃ العلما سے تعلق رکھتے تھے استنبول کا دورہ کرنے اور اسلامی ملکوں کے حالات کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اتحاد اسلامی کے پکے حامی ہو گئے تھے۔مصر میں ان کی ملاقاتیں مفتی عبدہٗ سے ہوتی رہیں جو جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے۔

اس تحریک کے ذریعے ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں میں ایک نئی سوچ پیدا ہوئی جس نے کئی صدیوں سے موجود اسلامی مابعد الطبعیات سے اپنے لیے توانائی حاصل کی۔مذہبی دانش وروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے صلیبی جنگوں، اسلامی تاریخ نویسی اور خلافت عثمانیہ کے تعلق

سے علمی کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس میں ان موضوعات پر کتابیں یا رسالوں میں مضامین نہ ملتے ہوں۔

یوں بھی اسلام کے پھیلاؤ میں ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کے مابین یا اور دیگر اسلامی ملکوں کے ساتھ اشتراک کا رشتہ ہمیشہ سے سیاسی نہیں روحانی رہا ہے۔ پان اسلامزم کی تحریک کی دَین یہ ہے کہ اس نے اس روحانی رشتے کو سیاسی طور پر منسلک کرنے کی کوشش کی، بظاہر یہ عمل ناکامی سے دوچار ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر بادی النظر میں اس کے اثرات علمی، تہذیبی اور تمدنی حوالوں سے بہت اچھے رہے۔ اردو زبان میں اسلامی تاریخ نویسی کو نئی توانائی ملی جس نے کئی گم شدہ گوشوں کو پُر کر دیا۔

مسلمان ملکوں کے مابین جو کشش پائی جاتی ہے اس میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کے باہمی ملاپ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسپین ہمیشہ سے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک احیا کی مثال رہا ہے جس نے علم و فن اور سائنس کی ترقی کے مدارج طے کر کے دنیا میں اپنی مثال پیش کی۔ حالیؔ اور شبلی کے علاوہ کئی ارددادیبوں نے متعدد مقامات پر اسپین کی تاریخ کو متعارف کرایا جب کہ اقبال نے اس سرزمین کو خون مسلماں کا امین قرار دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی اسلامی تاریخ نویسی میں اسپین احیائے ملت کی ایک ایسی مثال بن کر ابھرا جو سیاسی سے زیادہ روحانی اور علمی بنیادیں فراہم کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے[۴]۔

پہلی جنگ عظیم نے برطانیہ اور خلافت عثمانیہ کو مدمقابل کر دیا تھا۔ ترکی نے روس کو اپنا روایتی حریف تسلیم کیا اور ترکی کے دوستانہ کردار کو برطانیہ اور فرانس نے حقارت سے رد کر دیا۔ فوجی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے ترکی نے جرمنی اور آسٹریا اور ہنگری کی جانب دیکھا۔ اس موقعے پر متعدد ہندوستانی مسلمانوں کے اداروں نے یہ محسوس کیا کہ اب وقت آچکا ہے کہ اپنی قوتوں کو ہندوستان کی آزادی کے لیے مجتمع کیا جائے۔

دارالعلوم دیوبند کا ادارہ اس کام میں پیش پیش رہا۔ اس ادارے کی جانب سے ریشمی رومال کی تحریک اسی لیے سامنے آئی تھی کہ ہندوستان کو سامراجی قوتوں سے آزادی دلائی جائے۔ ان کے روابط ترکی کے اعلیٰ ترین حکام کے ساتھ تھے جن میں غالب پاشا اور انور پاشا قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے مولانا محمود حسن کو باقاعدہ طور پر خط لکھا جس میں ہندوستان کے سرحدی قبائل کو جنگ کرنے کی دعوت دی گئی تھی[۵]۔

اس کتاب میں اس حوالے سے کئی اہم باتوں کے جوابات تلاش کیے گئے ہیں کہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں طرابلس اور بلقان کی جنگ کے نتائج نے ہندوستانی مسلمانوں اور ادیبوں پر کیا اثرات

مرتب کیے۔ کس طرح اس جنگ نے ہندوستان میں برطانوی تہذیب وتمدن کے خلاف اچانک روایت پسندی کے رجحانات کو تقویت دی۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس میں وہ حرکت نہیں تھی جو ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کو بھرپور طریقے سے پیش کرسکتی۔ مگر پان اسلامزم کے بڑھتے ہوئے رجحان نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ لہٰذا سید ظہور احمد کی کوششوں سے ترکی کے مسئلے پر ستمبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس میں حسرت موہانی، ظفر الملک علوی اور سید جالب دہلوی کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مختلف صوبوں کا دورہ کریں اور اس اجلاس کے لیے لوگوں میں جوش وجذبہ پیدا کریں۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اس کی مخالفت کی، مگر یہ کانفرنس نہ یہ کہ صرف منعقد ہوئی بلکہ کلکتہ کے اخبار مسلمان نے لکھا کہ مسلمانوں کی عوامی زندگی میں ایسا تاریخی موقع کبھی نہیں آیا جب ایسے رہ نما ایک جگہ جمع ہوئے ہوں جو مختلف سیاسی اور مسلکی فکر کے حامل تھے[۶]۔

اس تحریک سے وابستہ کئی اہم سیاسی رہ نماؤں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا نام نمایاں ہے۔ جوہر نے لندن ٹائمز میں ایک مضمون ترکوں کا انتخاب لکھا جس میں ترکوں کو دھمکیاں دے کر سمجھایا بلکہ ایک حد تک حکم دیا کہ وہ جنگ عظیم اول میں شریک نہ ہوں ورنہ یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ اس مضمون کی اشاعت سے قبل کئی لوگوں نے انھیں سمجھایا کہ وہ اسے شائع نہ کریں۔ لیکن انھوں نے کسی کی نہ سنی بلکہ یہاں تک کہا کہ میں موت کے وارنٹ پر دستخط کر چکا ہوں اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا[۷]۔

جوہر نے کلکتہ سے کامریڈ اخبار جاری کیا، جس میں سید امیر علی اور سر آغا خان کے بحری تار آیا کرتے تھے یہ زیادہ ترکوں کی لڑائی یعنی جنگ بلقان میں طبی ضرورتوں کے حوالے سے ہوتے تھے۔ جوہر کی کوششوں کے نتیجے میں انجمن ہلال احمر کے ذریعے ترکوں کی مالی معاونت کی گئی۔

اس تحریک کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی، تہذیبی اور تمدنی روابط کے علاوہ ادبی اشتراک عمل میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اردو ادب کی کئی اہم اصناف پر اس تحریک کے اثرات غیر معمولی ہیں۔ داستانیں جو اردو میں ترجمہ ہوئیں ان میں زیادہ تر کردار ترک ہوا کرتے تھے۔ مگر اردو افسانہ جس کے بارے میں وثوق سے یہ کہا جاتا ہے کہ مغرب سے اردو میں آیا اس پر ابھی غور کرنے کی

ضرورت ہے کیوں کہ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اس صنف میں پہلا ترجمہ ترکی زبان سے اردو میں کیا گیا ہے اور یہ اسی زمانے میں کیا گیا جب ہندوستانی مسلمان پان اسلامزم کی تحریک سے جڑے ہوئے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے جو افسانے ترکی زبان میں تھے اس کے ترجمے کر کے اردو میں افسانوں کی روایت کو مستحکم کر دیا۔

پھر ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ اردو کی نئی اصناف جن پر انگریزی ادب کے اثرات نمایاں ہیں ان میں بھی اتحاد اسلامی ہی کے جذبے کے تحت نگارشات پیش کی گئیں۔ ہندو روایت سے وابستہ ڈراما جیسی صنف جس کا آغاز تو دیو مالائی کہانیوں سے ہوتا دکھائی دیتا ہے مگر انیسویں صدی میں انگریزی اور سامراجی نو آبادیات کے ذہنی رویے کو دیکھتے ہوئے ڈراما نگاروں نے سیاسی اور سماجی موضوعات پر خصوصی ڈرامے پیش کرنا شروع کر دیا اور اسلامی کردار حامل کے کئی اہم پہلوؤں کو ڈراموں میں شامل کیا گیا۔ جو اس تحریک کے اثرات کی وجہ سے ڈراما نگاروں کی مجبوری بھی بن گئی تھی۔

اس تحریک کے وسیع تر اثرات اردو شاعری پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ حالی، شبلی، اقبال، ظفر علی خان اور دیگر اہم شعرا کے یہاں کئی نظمیں ملتی ہیں مگر اس تحریک کے اثرات کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ کئی اور شعرا نے بھی اس کے اثر سے شاعری کی جن کا کلام رسائل میں تھا اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ خاص کر گم نام شعرا کی شاعری کا اس تحریک کے حوالے سے جائزہ لیا جائے۔

ان گم نام شعرا میں آغا غلام حسین ارشد کی نظمیں تمدن اور الناظر میں چھپتی تھیں، یہ خود بھی انجمن ہلال احمر سے وابستہ اور ترکی جانے والے طبی وفد میں شریک تھے ان کی نظموں میں مسلمانوں اور اسلام سے محبت و عقیدت جھلکتی ہے انھوں نے خاص کر اپنی شاعری میں اخوت اسلامی کا درس دیا ہے تاکہ مسلمان فرقہ وارانہ روش کو ترک کر دیں۔ ان کے علاوہ ابراہیم بیگ چغتائی کی مثنوی جنگ روم و روس بھی گم نامی میں پڑی تھی اسے پہلی بار اس کتاب میں موضوع بنایا گیا ہے۔

اس کتاب کے لکھنے کے دوران میری یہ کوشش تھی کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے تمام حالات جو ادبی لحاظ سے اہم ہیں انھیں تحریر کیا جائے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے دوران یہ احساس ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا عالم اسلام سے رشتہ نہایت قدیم ہے اردو داستانوں میں عالم اسلام سے اخوت اور بھائی چارے کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۱۴ء کے بعد بھی اس موضوع پر کثرت سے لکھا گیا۔ خاص کر اردو میں سیاسی مضامین کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو ادبی رسائل میں بھی موجود ہیں۔

مثلاً رفیق خاور کا مضمون دنیائے اسلام ایک مرکز پر پاکستان بننے کے ابتدائی سالوں میں تحریر کیا گیا۔ انھوں نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ اتحاد عالم اسلام کی تحریک کبھی ختم نہیں ہو سکتی بلکہ مستقبل میں یہ امید افزا ہے۔ مضمون خاص کر موتمر عالم اسلامی کے حوالے سے لکھا گیا تھا اس لیے اس میں پاکستان کے عالم اسلام میں امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے انھوں نے جمال الدین افغانی کے نظریے کو مدنظر رکھ کر پوری مسلم دنیا سے کہا کہ عالم اسلام میں اتحاد کی تحریک محض پاکستان کی یک طرفہ اور مفاد پرستانہ حکمت عملی نہیں بلکہ اس سے پوری دنیا کے مسلمانوں کو تقویت ملے گی[8]۔

ڈاکٹر محمد صابر کا ایک مضمون ترک اور بر صغیر بھی تاریخی حوالوں سے نئی معلومات کا حامل ہے۔ مقالہ نگار ترکی تہذیب وتمدن اور تاریخ پر اختصاص رکھتے تھے اس لیے انھوں نے تحریک اتحاد اسلامی کے تاریخی تناظر پر نہایت عالمانہ گفتگو کی تھی۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام سے قبل بھی وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے ترک جنوبی ایشیا کے مغربی علاقوں میں آباد تھے۔ موجودہ پنجاب کا شہر سیالکوٹ ان ترکوں کا مرکز تھا[9]۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ۱۴۹۰ء میں یوسف عادل شاہ ترکمن نے بے جاپور کے علاقے میں جو حکومت عادل شاہی نام سے قائم کی تھی اس کا تعلق بھی عثمانوی ترکوں سے بنتا ہے[10]۔ مگر اس رائے پر انھیں کئی شبہات ہیں کیوں کہ ان کا اس حوالے سے مزید یہ بھی کہنا تھا کہ اس خاندان کا تعلق اوغوزی ترکمن اور آذری ترکمن سے بھی بنتا ہے۔

پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں نے جدید ترکی کے معاشی، سیاسی، سماجی پہلوؤں کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اسم حیات کا مضمون جمہوریہ ترکی کی معاشی ترقی میں ان عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے شکست وریخت کے بعد کیے جانے والے اہم اقدامات تھے۔ اس مضمون میں ترکی کے صنعتی، معدنی اور زراعتی بنیادوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان اعداد وشمار کو بھی پیش کیا گیا ہے جو اس کی ترقی کے امکانات کو تیز کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں[11]۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی جرأت مندانہ اقدامات اور پھر اس کی اسلام دشمنی کے رویے پر اردو زبان میں خاصا مواد موجود ہے راقم کا خیال ہے کہ اس موضوع پر بھی ایک عمدہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کی شخصیت پر ڈراما، افسانہ، ناول اور تاریخی وسوانحی مضامین ومقالات کی بھرمار نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد صابر نے بھی اس شخصیت کو موضوع بناتے ہوئے اس کی جنگی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے سمرنا

یعنی ازمیر میں جس جنگی قوت کے ساتھ یونانی افواج کا مقابلہ کیا اس کی تفصیلات ترکوں کی جنگ آزادی [۱۲] میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس تحریک کے مطالعے کے دوران یہ بات بھی بار بار ذہن میں آتی رہی کہ اردو ادب میں جنگوں کے اثرات پر کئی اہم کام ہوئے ہیں مگر جنگی حکمت عملی یعنی طریقہ جنگ یا یوں کہہ لیں کہ کسی جنگ کے دوران فوجوں کو اپنی حکمت عملی کیسے ترتیب دینی چاہیے اس موضوع پر دفاعی اداروں سے وابستہ کئی لوگوں نے اہم علمی کتابیں اور مقالات تحریر کیے۔ جس کا جائزہ بھی لیا جانا چاہیے کیوں کہ اس نوع کے مواد بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

مثلاً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جناب عبدالقیوم ملک صاحب *Turkish Vistas* کے نام سے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ میں مضمون لکھتے تھے اس کا ترجمہ ترکی زاویے کے نام سے سلیم الحق نے کیا ہے۔ ان مضامین کے بھی زیادہ تر موضوعات مصطفیٰ کمال پاشا کی جنگی مہمات کے حوالوں سے ہوتے تھے [۱۳]۔

ان تاریخی، تہذیبی اور تمدنی مقالات کے علاوہ اردو میں ترکی پر لکھے گئے افسانوں، ڈراموں کے مطالعے کے ابھی کافی امکانات موجود ہیں۔ عبدالحق حامد کا ایک ڈراما فتح اندلس ۱۹۴۹ء میں دوبارہ ترجمہ کیا گیا۔ اس ڈرامے کے ذریعے پاکستانی مسلمانوں کو عظمت رفتہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی نسیم حجازی اور اسلم راہی کے ناولوں کو بھی پان اسلامزم کی تحریک کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عبدالحق حامد کا ڈراما اور اس کا کردار طارق یہ کہتا ہے کہ ''مجھے بھی دشمن پر فتح وظفر کے سوا کسی اور چیز کی تلاش نہیں رہتی۔ اسلام کو تمام دینوں پر غالب و برتر دیکھنا میری دلی آرزو ہے خواہ اس کام کے لیے پانی کی طرح خون بہانا پڑے'' [۱۴]۔

اسی طرح اردو کے اہم افسانہ نگار غلام عباس نے ایک افسانہ ترکی ٹوپی کے عنوان سے لکھا۔ ترکی ٹوپی کو جنوبی ایشیا میں سلطنت عثمانیہ سے تاریخی و تہذیبی ارتباط کے طور پر اپنایا گیا تھا۔ غلام عباس نے اس افسانے میں ایک نوجوان نسیم کے کردار کو پیش کیا۔ جو ترکی میں غربت و افلاس سے تنگ آ کر فرانس چلا جاتا ہے وہاں اس کی دوستی ایک طوائف سے ہو جاتی ہے جو اسے بہت ذلیل و خوار کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ترکی ٹوپی پہنا کرتا تھا مگر فرانس کے ماحول نے اسے اپنی ثقافت اور تہذیب کے سارے نقش مٹانے پر مجبور کر

دیا تھا۔ جب وہ فرانس میں تھا تو اسی وقت ترکی پر غاصبانہ قبضہ شروع ہو جاتا ہے وہی طوائف جو اسے بہت ذلیل کرتی تھی جب اس قبضے کی خبر سناتی ہے تو اس کے اندر حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہی کرم خوردہ ٹوپی اس کے سر کی زینت بن جاتی ہے جو کبھی اس کی یاد کا حصہ تھی[15]۔

ترکی ٹوپی صرف ترکوں کے لیے تہذیب وتمدن کی شناخت نہیں تھی بلکہ یہ خلافت عثمانیہ کی علامت کے طور پر پورے عالم اسلام میں رائج تھی۔ دہلی لٹریری سوسائٹی میں ۱۹۴۳ء میں لفٹننٹ کرنل جی ای وہیلر نے ایک مضمون جدید ترکی پر پڑھا۔ جس میں مصطفےٰ کمال پاشا کی اصلاحات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ترکی ٹوپی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ ترکوں نے جہاں بہت ساری تمدنی اصلاحات میں ترقی کی ہے وہاں فز (ترکی ٹوپی) کو ممنوع قرار دینا احسن قدم ہے انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ترکوں کو یورپین بنانے میں فز کا ترک کر دینا یقیناً بہت ہی مؤثر ہوگا اور اس میں ذرا مبالغے کی گنجائش نہیں ہے[16]۔

گزشتہ کئی عشروں سے ترک اسی جدوجہد میں مبتلا رہے ہیں کہ جلد ہی انھیں یورپین یونین میں شامل کرلیا جائے۔ اس میں شامل ہونے کے لیے انھوں نے صرف فز کو ہی نہیں بلکہ اسلامی روایات کی کئی اہم چیزوں کو ترک کر دیا کئی ایسی چیزوں پر قانونی پابندی عائد کر دی ہے جو اسلامی شعار کا اظہار کرتی تھیں مگر آج ان اقدامات کے باوجود بھی ترکوں کے لیے یورپی یونین میں شامل ہونے کے امکانات دکھائی نہیں دیتے۔ اس انتہا پر پہنچ جانے کے بعد بھی ترکوں کی تاریخ یورپ کے آنکھوں میں کھٹکتی رہتی ہے۔

تحریک اتحاد اسلامی کا مطالعہ چند بنیادی کتابوں کو مدنظر رکھ کر کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں عزیز احمد کی کتاب برصغیر میں اسلامی کلچر اور برصغیر میں اسلامی جدیدیت نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ Studies in Islamic Culture in Indian Environment یہ کتاب عزیز احمد نے لندن میں قیام کے دوران لکھی۔ انھوں نے کینیڈا منتقل ہونے کے بعد اس پر ۱۹۲۶ء میں نظر ثانی کی اور یہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہند اسلامی تاریخ وتہذیب سے وابستہ افراد کے لیے اہم حوالہ ہے۔ ان کی یہ دونوں تصانیف مسلمان مفکرین کے سیاسی افکار کا نچوڑ ہیں ان کا تجزیہ بہت واضح، متوازن اور بے لاگ ہے انھوں نے اپنے موضوع کے حوالے سے اصل بنیادی ماخذ کو پیش نظر رکھا ہے جو کسی بھی اچھے محقق کے لیے بہت ناگزیر ہوتا ہے۔

عزیز احمد کے علاوہ نعیم قریشی کی کتاب Pan-Islam in British India The Politics

of the Khilafat Movement 1918-1924 راست میرے موضوع سے تعلق رکھتی ہے انھوں نے جس انداز میں تحقیق و تفحص سے کام لیا ہے وہ اردو زبان میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس کتاب میں موجود مواد کی ترتیب اور مآخذ قاموسی ہیں۔ نعیم قریشی اس موضوع کے حوالے سے پوری دنیا میں اہم محقق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ Azmi Ozcan جو Blecik University of Turkey کے ریکٹر ہیں انھوں نے ان کے کام پر یوں تبصرہ کیا ہے:

نعیم قریشی کی یہ کتاب اعلیٰ درجے کے تجزیاتی مواد سے پُر ہے یہ پڑھنے والے کو وسیع تناظر میں تاریخی و تہذیبی سفر سے ہم کنار کرتے ہوئے اتحاد اسلامی کی تحریک کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنی مہارت کئی سالوں کی تحقیق کے بعد حاصل کی ہے یہ کتاب ان کے لیے ایک مثال ہے جو کسی بھی موضوع پر تاریخی اور نصابی تحقیق کے خواہاں ہیں۔ اس کتاب میں موجود کتابیات، ہند اسلامی تاریخ پر کام کرنے والے کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں [17]۔

سید تنویر واسطی کے تحقیقی مقالات نے تحریک اتحاد اسلامی کی اس تحریک کو سمجھنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ تنویر واسطی کے مقالات نہایت معلوماتی اور تجزیاتی نوع کے ہوتے ہیں ان کے مقالے سے کچھ ایسی باتوں کا بھی پتا چلا ہے جو اردو دنیا کے لیے بالکل نئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے کے لیے ترکی مآخذ کا استعمال کر کے ہند اسلامی تاریخ میں کئی اہم نوع کے کاموں کو جو شاید تشنہ تھے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً ان کا مضمون *Mushir Hosain Kidwai and the Ottoman Cause* نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون علمی، تحقیقی اور فکری حوالوں سے کئی اہم مآخذ کی جانب اشارہ بھی کرتا ہے۔ میری درخواست پر جاوید احمد خورشید نے اس کا ترجمہ بھی کیا مگر اس کے حقوق چوں کہ *Middle Eastern Studies* جرنل کے پاس محفوظ ہیں اس لیے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پائی۔ جاوید احمد خورشید اور تنویر واسطی کے مابین اس ترجمے کے حوالے سے خط کتابت بھی ہوئی۔ یہاں پر اس کا ذکر کیا جانا ضروری ہے کہ مشیر حسین قدوائی مسلمانوں کے اہم رہ نماؤں میں شمار کیے جاتے تھے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں اردو زبان میں کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا۔ ان پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا تھا کہ وہ قادیانی تھے اس الزام کے حوالے سے سید تنویر واسطی سے جب استفسار کیا گیا تو ان کا جواب یہ ہے جو انھوں نے مشیر حسین قدوائی کی ایک کم یاب کتاب *Islam in England* کو مدنظر رکھ کر دیا تھا۔

قادیان سے تعلق رکھنے والے غلام احمد کے پیروکار کی حیثیت سے میرا شمار کیا جانا بہت بعید ہے۔ لیکن میں انھیں اس بات کی خراج تحسین پیش کرسکتا ہوں کہ انھوں نے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک مذہبی جذبے کی روح پھونک دی۔ خواجہ کمال الدین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مرزا صاحب کے ذریعے اسلام کو سمجھا، جس کے بعد انھوں نے بیرون ملک سے اپنی مصروفیات کو ختم کر کے اسلام کی تبلیغ کے لیے خودساختہ جلاوطنی اختیار کی۔[18]

سید تنویر واسطی کا دوسرا اہم مضمون Muhammad InshaAllah Khan and the Hijaz Railway چونکا دینے والی تحقیق ہے اس تحقیق کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک نئی دریافت پیش کی گئی ہے۔ حجاز ریلوے کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں نے نہایت دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میں مالی تعاون کی اعلیٰ مثال قائم کی مگر شاید ہی کسی کتاب میں یہ حوالہ ملتا ہو کہ محمد انشاء اللہ خان جو ایک اسکول ٹیچر تھے انھوں نے پہلی بار باضابطہ طور پر حجاز ریلوے کا منصوبہ سلطان عبدالحمید کو پیش کیا اور اس کے لیے پورے ہندوستان میں زبردست عملی جدوجہد بھی کی۔ انشاء اللہ خان فعال پان اسلامسٹ تھے اور ترکی خلافت سے محبت رکھتے تھے ان کے علمی کاموں میں عالم اسلام میں اخوت قائم کرنے کی جدوجہد کے جذبات نظر آتے ہیں۔ سید تنویر واسطی نے حجاز ریلوے اور انشاء اللہ خان کے تعلق سے نہایت اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام کیا ہے۔

تحریک اتحاد اسلامی پر اردو زبان میں نہایت اہم تحقیقی کام ڈاکٹر معین الدین عقیل کا ہے۔ ان کی کتاب اقبال اور جدید دنیائے اسلام میں اتحاد اسلامی کو موضوع بناتے ہوئے اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کی یہ کتاب میرے اس تحقیقی کتاب کی تکمیل میں ابتدا سے آخر تک رہنما رہی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں دنیائے اسلام کو جن بیرونی اور داخلی سیاسی افکار و مسائل کا سامنا رہا اس کا تجزیہ پیش کیا ہے انھوں نے اس سلسلے میں اردو کے ادبی ماخذ کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ کسی بھی تاریخی مطالعے کے لیے ادبی ماخذ بھی بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سوچ اس تحریک کے ضمن میں کئی اہم کتابوں میں دکھائی دیتی ہے جن کا ذکر اس مقدمے میں کیا جاچکا ہے۔

یہ تحریک اتنی کامیاب تھی کہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ اور ترکوں سے مسلمانوں کی والہانہ محبت نے تمام مسلم رہ نماؤں کو ایسی مرکزی قوت فراہم کی؛ جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل پر غور و خوض کرنا شروع کیا۔ محمد علی جناح جو بانی پاکستان ہیں انھوں نے

بھی تواتر کے ساتھ ترکوں کی حمایت کی۔ انھوں نے خاص کر ترکی ٹوپی بھی پہنی تا کہ مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ ترکوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ جنگ بلقان کے دوران انھوں نے ترکوں کی اعانت کی۔ انھوں نے اس موقع پر بمبئی میں عوامی جلسے کا انعقاد کیا اور قرارداد پیش کی جس میں انھوں نے برطانیہ سے کہا کہ وہ مسلمانوں کی عظیم قوت خلافت عثمانیہ کی سالمیت کو محفوظ رکھے گی۔ جس کے لیے مسلمان دنیا کے جذبات سیاسی اور مذہبی سطح پر گہرے اور مستحکم انداز سے جڑے ہوئے ہیں [19]۔

اردو اخبار و رسائل نے اس سلسلے میں بڑا وسیع سرمایہ چھوڑا ہے۔ ۱۸۴۰ء کے ابتدا میں دہلی کے اردو اخباروں میں ترکی کی حمایت میں کافی مضامین ملتے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں سید احمد خان نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ نکالا تو اس میں بھی ترکی کے حوالے سے مضامین موجود تھے۔ مگر اردو صحافت کا ترکوں سے تعلق روس اور ترک جنگ کے دوران کھل کر سامنے آیا۔ اس میں اہم جرنلز اور اخبارات نے مکمل طور پر ترکوں کی حمایت کی۔ شمس الاخبار، اودھ پنچ، احسن الاخبار، قیصر الاخبار ہند قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض اخبارات ایسے بھی تھے جن کے مالکان و مدیر ہندو تھے مثال کے طور پر اودھ اخبار جو منشی نول کشور جاری کرتے تھے اس میں ترکوں کی حمایت کی جاتی تھی۔ اخبار عام جو لاہور سے نکلتا تھا اس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے انھوں نے بھی ترکوں کی حمایت کی اور ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کو بھرپور انداز میں پیش کیا [20]۔

علی گڑھ، ندوۃ العلما، دیوبند کی تحریکوں نے ترکی تنظیمات کے اثرات قبول کیے اور پان اسلامزم کو مسلمانوں کے اخوت کو بڑھاوا دینے کے لیے استعمال کیا۔ تحریک اتحاد اسلامی سے ہندوستان میں رومانوی ادب کی تحریک نے توانائی حاصل کی تھی کیوں کہ اتحاد اسلامی کے جذبات نے اردو ادب میں رومانوی حقیقت پسندی کو کافی برانگیختہ کیا تھا۔ اس کی مثال اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں میں اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں موجود ہے۔

پان اسلامزم کی تحریک نے ہندوستانی خواتین میں بھی بیداری پیدا کر دی تھی۔ ترکی عورتوں میں جس تیزی سے مغربی تعلیم کا رجحان ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب آجانے کے بعد پھیلا اسی تیزی سے ہندوستانی مسلمان خواتین بھی اس زد میں آتی چلی گئیں، صحی خانم، خالدہ ادیب خانم، اور دیگر اہم خواتین کا اثر ہندوستان کی پڑھی لکھی خواتین کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سیورا کمار چودھری آفندی نے ترکی عورتیں

نامی مضمون میں قدیم وجدید کا موازنہ کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمان عورتوں پر ترکی خواتین کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے"[21]۔

اردو زبان وادب اور برعظیم کی ملی تاریخ میں اس تحریک نے ہمہ جہت اثرات مرتب کیے ہیں۔ بظاہر یہ تحریک ناکامی سے دوچار ہوئی، مگر علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی تناظر میں اس نے مسلمانوں کی زندگی پر اپنے اثرات جس انداز میں مرتب کیے ہیں وہ دوررس ہیں یہ تحریک اگرچہ سیاسی سطح پر ناکامی سے دوچار ہوئی مگر جن اغراض ومقاصد کی ترویج کی یہ خواہاں تھی اس کے اثرات جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس تحریک سے مسلمانان ہند نے ایک نئی قوت حاصل کی اور اس کے ہمہ گیر اثرات کو معاصر تحریکوں نے اپنے اندر جذب کیا۔ جس کے مظاہر آج بھی سیاسی وتہذیبی منظرنامے پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

maablib.org

حوالہ جات

۱- افغانی، جمال الدین، اپریل ۱۹۳۲ء، ص ۲۹،۲۸

۲- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۴

۳- قریشی، نعیم، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹

۴- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۴۱۵۴

۵- فاروقی، ضیاء الحسن، فروری ۱۹۶۲ء، ص ۶۱

۶- قریشی، ص ۳۳

۷- شاہ جہاں پوری، ابوسلمان، ۱۹۸۳ء، ص ۱۶

۸- خاور، رفیق، مارچ ۱۹۵۱ء، ص ۱۰

۹- صابر، محمد، ڈاکٹر، جون ۱۹۶۵ء، ص ۱۳

۱۰- ایضاً، ص ۱۴

۱۱- حیات، اسم، جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۳۷

۱۲- صابر، محمد، ڈاکٹر، نومبر ۱۹۶۸ء، ص ۵۴

۱۳- ملک، عبدالقیوم، فروری ۱۹۶۸ء، ص ۵۱

۱۴- مائل، محمد زکریا، نومبر ۱۹۴۹ء، ص ۵۶

۱۵- عباس، غلام، جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۱۵

۱۶- وہیلر، جی ای، یکم اگست ۱۹۴۳ء، ص ۸

۱۷- اوزکان، آزمی، ۲۰۰۹ء، پس ورق

۱۸- سید تنویر واسطی بنام جاوید احمد خورشید، ۱۵ اپریل ۲۰۱۴ء، ص ۱

۱۹- قریشی، ص ۲۰۳۲

۲۰- ایضاً، ص ۱۸

۲۱- چودھری، سورا کمار، یکم اگست ۱۹۴۳ء، ص ۲۰

باب اوّل

تحریک اتحاد اسلامی: تعارف، پس منظر، محرکات

تحریک اتحاد اسلامی: تعارف، پس منظر، محرکات

تحریک اتحاد اسلامی (*Pan-Islamism*) انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوئی، اصل میں اس تحریک کو مکمل طور پر تحریک بھی نہیں کہا جا سکتا مگر انیسویں صدی کے رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے کہ عالم اسلام کے مسلمانوں کے رہنماؤں کے دلوں میں یہ خواہش موجود تھی کہ تمام مسلمان چوں کہ آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا وہ کسی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر دنیا میں ایک آواز بن جائیں۔ اس تحریک کے پس پشت جو عقیدہ کارفرما تھا وہ آغاز اسلام سے ہی مسلمانوں کا جزو ایمان ہے۔ مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ انھیں صرف دو قوموں سے علیحدہ اور ایک دوسرے سے وابستہ کیا گیا ہے۔ دین اسلام میں موجود یکسانیت اور اس کے بنیادی اصول کو ماننے کے بعد روئے زمین پر دو قومیں ہی رہ جاتی ہیں۔ ایک وہ جو اسلام کے پیرو ہیں اور دوسرے وہ جو غیر مسلم ہیں۔ قرآن حکیم نے اس کے لیے حزب الله اور حزب الشیطن کے الفاظ استعمال کیے ہیں[1]۔ اسی طرح سورہ آلِ عمران میں ارشادِ ربانی ہے کہ ''تم وہ بہترین امت ہو جسے بہتری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو[2]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے پھیلنے کا سبب عالم اسلام کا انحطاط، بلکہ سلطنت عثمانیہ کا زوال ہے۔ اس تحریک کے مطالعے کے لیے عالم اسلام کی مختصر تاریخ کے علاوہ انیسویں صدی کے دو تین عشروں کی سیاسی، تاریخی، اور تہذیبی منظر پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔

۱۸۶۱ء سے پہلے عالم اسلام میں ایک نہایت قوی زندہ و فعال پلیٹ فارم سلطنت عثمانیہ کی صورت میں موجود تھا۔ لیکن عثمانیوں کی مطلق العنانی اور وہاں پر موجود علماء کی نااہلی کے سبب عثمانوی خلافت اپنی زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ عثمانوی خلافت کی عالم اسلام میں کیا قدر و قیمت تھی اور مسلمانوں کی اس سے روحانی وابستگی کا مطالعہ کیا جائے تو اتحاد اسلامی کی تحریک کی ضرورت اور محرکات کا تجزیہ با آسانی کیا جا سکتا ہے۔

سولہویں صدی کے آغاز سے اٹھارویں صدی کے آخر تک مسلمان تین سلطنتوں میں منقسم تھے: پہلی سلطنت عثمانیہ، دوسری صفوی سلطنت، تیسری مغل سلطنت' لیکن ان میں کوئی باہمی اشتراک نہیں پایا جاتا تھا۔ان سلطنتوں میں تاریخی طرزِ عمل کی مکمل ہم آہنگی اور اتحاد کی کیفیت تو نہیں پائی جاتی تھی مگر باہمی اتحاد کا ایک ثانوی درجہ ضرور کارفرما نظر آتا تھا۔گوناگوں اختلافات کے باوجود ہمیں ایسے مظاہر نظر آتے تھے جس میں مغلیہ سلطنت اور عثمانوی خلافت میں اتحاد و اتفاق کی صورت ملتی تھی [۳]۔

ہندوستان کی مغل حکومت ہمیشہ دو بڑی طاقتوں کے مابین اپنی سفارتی کوششوں کو تبدیل کرتی رہی۔ چناں چہ دارالحکومت میں بادشاہوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سفارتی تعلقات میں بھی تبدیلیاں رونما ہو جاتی تھیں۔یعنی اگر کوئی بادشاہ جس کا طبعی میلان شیعیت کی جانب ہوتو وہ ایران کے صفوی خاندان سے تعلقات کو مربوط کرتا اور اگر سنی العقیدہ ہوتو عثمانی ترک اس کے پاسبان ونگہبان بنتے [۴]۔غرض یہ کہ ہندوستان کی سفارت کاری کسی خاص سیاسی اصول کی پابند نہیں تھی۔مگر اس کے نتائج ادب پر بڑے عالی شان مرتب ہوئے۔دو تہذیبی دھاروں کے وقفے وقفے سے ملاپ نے جہاں ذہن و دل کو متحرک رکھا وہیں ہندی اثرات نے اردو زبان اور اس کے ادب کو کافی حد تک وسیع کیا۔لہٰذا تین اثرات نے مل کر اس زبان کے ادبی معیارات میں وہ خوبیاں پیدا کیں جس نے اس کے شعروادب کو مشرقی ادبیات میں انوکھے طرز کا حامل بنادیا [۵]۔

مغل بادشاہ اکبر نے بہت زیادہ مقامیت کو ترجیح دی جس سے مسلم امت کا تصور دھندلا گیا تھا [۶] مگر ترکی سے آنے والے سفراء جن میں ماہر اہلِ فن بھی تھے اپنے ساتھ مسلم فن تعمیر اور مسلم فنون لطیفہ کی ایک ایسی روایت لیے وارد ہوئے جس نے اکبر بادشاہ کی تحریک سبک ہندی کا دم توڑ دیا اور ہندی مسلم امتزاج سے جو چیز ابھر رہی تھی عثمانوی اثرات کے ذریعے ان کو جدا رکھنے کی تحریک کی بنیاد پڑی اور پھر ہندوستانی فارسی شاعری کا ایسا روپ منظرِ عام پر آیا جس سے عظیم ترین ادبی تخلیقات خراسانی دبستان کی چھاپ لیے منصۂ شہود پر آئیں' مگر اس نے مقامیت کو نظرانداز نہیں کیا [۷]۔

انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے تاروپود آہستہ آہستہ بکھرنا شروع ہو گئے تھے اور خود مسلمانانِ برعظیم کی مغل حکومت ۱۸۰۳ء میں انگریزی عمل داری میں چلی گئی تھی اور ۱۸۵۷ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن عالم اسلام میں بیش تر ملک ایسے تھے جو اس دور میں غلامی کا مزہ نہ چکھ رہے تھے۔سربیا اور ڈینیوب کی دو ریاستوں نے جو ۱۸۲۱ء میں متحد ہو کر ایک ریاست بن گئی تھیں ۱۸۶۵ء میں خلافت عثمانیہ سے تقریباً پوری خودمختاری

حاصل کر لی تھی [۸]۔ معاہدہ برلن کی شرائط کے تحت ۱۸۷۸ء میں بوسنیا اور ہزرے گووینیا کو آسٹریا اور ہنگری کی امانت میں دے دیا گیا تھا[۹]۔ مسلمانوں کی سخت مقاومت کے باجود ۲۰ ر اکتوبر ۱۸۷۸ء کو آسٹریا کا قبضہ مکمل ہوگیا[۱۰]۔ اسی معاہدہ برلن کے تحت سربیا مونٹے نیگرو اور رومانیہ ترکی خلافت کے قبضے سے نکل گئے۔ قفقاز کی سرحد پر قارص اور باطوم کے اقتدار سے سلطنت عثمانیہ کو ہاتھ دھونا پڑا۔ جزیرہ قبرص کے نظم ونسق کا کام انگریزوں نے کرلیا۔ ۱۸۸۲ء میں اختلال مصر کی صورت حال پیدا ہوئی۔ اور چار سو سال تک ترکوں کے زیر انتظام رہ کر مصر برطانیہ کے زیر حفاظت آگیا[۱۱]۔ ۱۸۹۷ء میں ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے نتیجے میں یونانی سلطنت کو توسیع حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۷ء میں کریٹ (اقریطش) خودمختار ہوگیا[۱۲]۔ ۱۳ اکتوبر کو والی بلغاریہ فرڈینیڈ (Ferdinand) نے بلغاریہ کی آزادی کا اعلان کردیا۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اطالیہ نے طرابلس میں اپنی فوجیں اتاردیں۔ اگرچہ ان کے خلاف سخت مزاحمت کی گئی لیکن عہد نامہ لوزان کے تحت ۱۹۱۲ء میں اطالیہ کے قبضے کو تسلیم کرنا پڑا[۱۳]۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان میں یورپی ترکی کے پورے مقبوضات صرف مشرقی تھریس تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اور اس کے ایک حصے پر یونان نے قبضہ کرلیا، ایشیائی ترک کی مشرقی بندرگاہ سمرنا بھی یونان کے قبضے میں میں چلی گئی[۱۴]۔ نجد وحجاز کو اس وقت خلافت عثمانیہ کے انتظام سے نکالنے کا کام بھی اس وقت شروع ہو چکا تھا اور شریف مکہ حسین کی ترکی خلافت سے بغاوت کے نتیجے میں نہ صرف حجاز بلکہ فلسطین کو بھی عرب ریاست کے حدود اور اس کی عمل داری میں دینے کا وعدہ کیا گیا مگر ترکوں کے اقتدار سے الگ کرانے کے بعد برطانیہ اپنے وعدے سے مکر گیا اور پھر اس نے فلسطین میں یہودیوں کو اپنی بستی قائم کرنے میں مدد دی[۱۵]۔ تاکہ مستقبل میں یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی جاسکے۔

تحریک اتحاد اسلامی فی الحقیقت انھیں انحطاط سے بچنے اور مسلمانوں کی سیاسی قوت اور ان کی تہذیب کو زوال سے بچانے کی اضطراری کوشش تھی۔ خلافت عثمانیہ اپنی گزشتہ عظمت وقوت اور سخت جانی کی وجہ سے یورپ کی عیسائی طاقتوں سے نبرد آزما تھی[۱۶] اس کے مقابلے میں تمام اسلامی مملکتیں مغربی استعمار کے قبضے میں آچکی تھیں۔ وسطی ایشیا میں روس نے سمرقند پر قبضہ کرلیا تھا اور بخارا کی امارت کو محض روس کی ایک ریاست تک محدود کردیا گیا۔ افریقہ میں برطانیہ نے مصر اور تیونس کو اپنے تسلط میں لے لیا، جرمنی نے دارالسلام تک اپنے قدم بڑھائے یہ تمام واقعات انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیش آئے ان حالات میں اسلامی دنیا کی رہی سہی علامت سلطنت عثمانیہ ہی تھی جو مسلمانوں کی ناکامیوں کے بعد عہد اسلامی کی آخری یادگار سمجھی

جاری تھی۔ دنیا کے تمام مسلمان اس یادگاری علامت کو بچانے اور مصائب و مشکلات کو حل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ مسلمانوں میں اس تحریک کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ یورپ نسلیت اور مغربی قوتیں قومیت کے مختلف دھاروں میں بہنے کے باوجود عالم اسلام کے بارے میں خطرناک عزائم رکھتے تھے۔ جب کہ اسلامی دنیا اپنی یک رنگی کے باوجود خودغرضانہ اور لالچی بنیادوں پر ٹکڑوں میں بٹ کر دندان آز کا شکار ہو رہی تھی [17]۔ ان حالات میں مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی احساس نے عالم اسلام میں پان اسلامزم یا تحریک اتحاد اسلامی کو مقبول رجحان میں تبدیل کر دیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سلطان عبدالعزیز کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اپنے دور اقتدار اور زوال آمادہ سلطنت کو بچانے کے لیے دنیا کی پیشوائی کا اعلان سہارا ثابت ہوگا، سلطان عبدالعزیز نے اپنے سیاسی اقتدار میں اضافہ کرنے اور اپنے دائرہ اثر کو وسعت دینے کے لیے اسلامی ممالک کو متحد کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ خلافت کو مستحکم کرنے کی آڑ میں اپنے اقتدار کو بڑھائیں اور تمام ممالک اسلامیہ اسے اپنے آپ کو خلیفہ تسلیم کرالیں تو یورپ کی جارحیت کا مقابلہ کرنا آسان اور اسے ناکام بنانا سہل ہوگا [18]۔ اگر بیرونی مسلمانوں کو ترکی کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائے تو بے پناہ طاقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ شمالی افریقہ اور بلقان پر ترکی اپنے اقتدار کی حیثیت کھوتا جا رہا تھا [19]۔ چنانچہ ترکی نے دنیائے اسلام میں بالخصوص ہندوستان، افریقہ، چین، جاوا وغیرہ میں اس غرض کے لیے مبلغین بھیجے تاکہ وہ خلافت کی اہمیت مسلمانوں پر واضح کر دیں۔ اس کوشش سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مختلف ملکوں میں خلافت کے ساتھ پہلے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی [20]۔ ترکی میں ایک اخبار جوائب اسی مقصد کے لیے جاری کیا گیا [21]۔ اسی طرح پیک اسلام سلطان کے ذاتی مطبع خاص میں ہندوستان کے لیے شائع کیا جاتا تھا [22]۔ اور اسے ہندوستان میں ۱۸۸۴ میں تقسیم کیا گیا [23]۔ بہر حال یہ امر اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک اتحاد اسلامی کا تصور ان ممالک میں زیادہ جاذبیت رکھتا تھا جو مغربی استعمار کے تسلط میں آچکے تھے۔

برعظیم کے مسلمانوں میں تحریک اتحاد اسلامی کے قبولیت کے بڑے امکانات موجود تھے۔ کیوں کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل بھی یہ رجحان ان میں موجود تھا۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ کے پاس آفاقی خلافت پر شدید اعتقاد ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برعظیم میں شاہ ولی اللہ کی فکر سے مستفیض علمائے دیوبند اور ندوہ نے خلافت

عثمانیہ کو ہندوستان میں مذہبی اہمیت دلانے میں نمایاں حصہ لیا[۲۴]۔

خلافت عثمانیہ کو کسی ایسے فرد کی ضرورت تھی جو عالم اسلام میں اپنی انفرادیت کے لحاظ سے نمایاں ہو اور وہ اتحاد اسلامی کی سفارت کاری کے فریضے کو بہتر طریقے سے انجام دے سکے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے سید جمال الدین افغانی کی شخصیت، ان کی ذہانت، پیش بینی اور حرکت و عمل سے عالم اسلام میں اتحاد اسلام کی حقیقی روح بیدار ہوئی۔ لیکن جمال الدین افغانی سلطان عبدالحمید پر قطعاً بھروسہ نہیں کرتے تھے[۲۵]۔ سلطان عبدالحمید کے برعکس افغانی کا یہ خیال تھا کہ دنیا بھر میں مسلمان جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں وہ سامراجیت کی ہوس ملک گیری کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ ترکی، ہندوستان، تیونس اور ان جیسے دیگر اسلامی ممالک تباہ کن انتشار اور افتراق کا شکار ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ موثر ترین اتحاد اسلام کا ایسا محاذ قائم کیا جائے جو تمام بیماریوں کو حل کر سکے[۲۶] ان کی کوششوں اور مسلسل جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلم اقوام ایک اسلامی حکومت کے ماتحت ہو جائیں۔ افغانی صرف ملت اسلامیہ کی آزادی اور ترقی کے خواہاں تھے اور ان کی تمام کوششوں کی غرض و غایت بھی یہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام کے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اتحاد اسلامی کی اہمیت و ضرورت کو واضح کر کے لوگوں کو اس تحریک سے دلچسپی لینے پر مجبور کیا[۲۷]۔

ہندوستانی مسلم دانش وروں نے افغانی کی مساعی میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانے کی معاصر ادبی تحریکوں نے جس میں علی گڑھ تحریک، ندوۃ العلما کی تحریک اور دیوبند کی تحریک شامل ہے اس تحریک سے وابستہ ہوگئیں۔ سید احمد خان چوں کہ دیگر مسائل میں الجھے تھے شروع میں تو اس تحریک کا حصہ بنے مگر جب یہ سلطنت برطانیہ سے مزاحم ہوئی تو اس کے خلاف ہو گئے۔ سید احمد خان کی محبت کا محور صرف مسلمانان ہند تھے۔ برطانوی حکومت سے مصالحت ان کی حکمت عملی کا جزو تھی اس لیے انھیں ایسی بات گوارا نہیں تھی کہ جس سے ان کے خیال میں مسلمانوں کے تعلقات برطانوی حکومت سے بگڑ جائیں گے مگر اس معاملے میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے سید احمد خان کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور ہندوستانی مسلمان اس تحریک میں شامل ہو گئے[۲۸]۔

جمال الدین افغانی کی سیاسی حیثیت خانہ بدوش کی سی تھی۔ وہ کسی آفاقی طاقت اور سلطنت کے محکوم شہری نہ تھے افغانی کی شخصیت میں بڑی مقناطیسی کشش اور جذبہ آفرینی تھی[۲۹]۔ وہ پہلی بار دسمبر ۱۸۶۸ء میں ہندوستان آئے اور زیادہ تر یہاں کے علماء اور دانش وروں سے تبادلہ خیال کیا۔ پھر اپریل ۱۸۲۹ء میں ایک

انگریزی جہاز میں سویز چلے گئے[30]۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء کے آخر میں افغانی حیدر آباد پہنچے مگر یہ ایام انھوں نے خاموشی سے بسر کیے اور ہندوستان کی ملی زندگی میں کوئی حصہ نہ لیا[31]۔ افغانی کے یہ دو سال ہندوستان میں کن سرگرمیوں میں گزرے ہیں اس حوالے سے محققین خاموش ہیں۔ حیدر آباد دکن میں افغانی دو اصحاب سے رابطے میں تھے۔ ایک سید علی بلگرامی اور دوسرے نواب رسول یار جنگ اس کے علاوہ کلکتہ کے مولوی عبداللطیف سے بھی افغانی کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ولفرڈ بلنٹ جس سے افغانی کے دیرینہ تعلقات تھے اس کے روزنامچے انڈیا انڈر رپن کے چند سطور میں اس قیام کی جانب اشارے ملتے ہیں[32]۔

افغانی کی جدوجہد کا ایک اہم پہلو جو کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا کہ ہر ملک میں اخبار نویسی کو آلہ کار بنایا جائے۔ چناں چہ جب وہ ہندوستان دوسری مرتبہ آئے تو حیدر آباد دکن سے جناب مولوی محمد محب حسین نے افغانی کے خیالات اور مسلم عوام کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے رسالہ معلم اور معلم شفیق جاری کیا۔ اس رسالے میں افغانی کے خیالات کی ترویج واشاعت بھی ہوئی اور ان کے افکار ونظریات کا ترجمان رسالہ جو فرانس سے جاری ہوتا تھا العروۃ الوثقیٰ کے بیش تر مضامین بھی اردو میں ترجمے ہوئے۔ اس کے علاوہ رسالہ دار السلطنت کلکتہ اور رسالہ مشیر قیصر جو لکھنو سے شائع ہوتا تھا اس میں بھی العروۃ الوثقیٰ کے مضامین کے ترجمے شائع ہوئے[33]۔

سید احمد خان اور جمال الدین افغانی سیاسی اور دینی اختلافات کا جائزہ اگلے باب میں تفصیلی لیا جائے گا۔ مگر علی گڑھ تحریک سے وابستہ متعدد اہلِ فکر ونظر اتحاد اسلامی اور سید جمال الدین افغانی ہی کی کوششوں سے متاثر تھے۔ سید احمد خان کے ساتھیوں میں شبلی، حالی، محسن الملک، اتحاد اسلامی کے پکے حامیوں کے طور پر سامنے آئے۔ شبلی نے اپنے سفر مصر، روم، شام کے دوران اسلامی ملکوں کے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ مصر میں ان کی ملاقات مفتی عبدہ سے ہوتی رہی جو افغانی کے قابل ترین شاگرد تھے، اور عرب ممالک میں ان تحریکوں سے تعلق رکھتے تھے جو انگریزی استعمار کے خلاف سرگرم عمل تھیں[34]۔ جب شبلی قسطنطنیہ پہنچے تو ان پر مسلمانوں کی مجبور اور زوال پذیر حالت کا اثر ہوا، انھوں نے اپنے سفرنامے میں جابجا ترکوں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر سلطان عبدالحمید کی زیارت کا تاثر اثر انگیز ہے[35]۔

اس سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بعد اب اصل موضوع کی جانب آتے ہیں۔ تحریک اتحاد اسلامی کے فکری اور سیاسی رجحانات کے بے پناہ اثرات ہمارے ادب پر ظاہر ہوئے خصوصاً کئی تاریخی

نوع کی کتابیں لکھی گئیں۔ اور اسلام میں اتحاد بین المسلمین کے جذبات کو ابھارنے کے لیے کوششیں کی گئیں۔ اردو ادب نے اس تحریک سے خاصا اثر قبول کیا' تاریخی، تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ان رجحانات کو خصوصی اہمیت دی جو مسلمانوں میں اتحاد بین المسلمین کے جذبات پیدا کر سکتی تھیں۔ اس وقت کے نمائندہ اردو شعرا اس تحریک کے حوالے سے اپنی نظموں کو عالم اسلام کے سلگتے مسائل کے حوالے سے پیش کر رہے تھے۔ ان میں حسرت موہانی، ظفر علی خان، شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، اکبر الہ آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس تحریک کے ادب پر اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رتن ناتھ سرشار یورپی گفتگوں اور شہدوں کے کردار کی پیروی میں حیرت انگیز طریقے پر چھوٹے چھوٹے حقیقی کردار اور دربار، حرم، بازار، میلے ٹھیلے اور ریل کے ڈبے وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف ماحول میں اور فضاؤں سے ہندوستانی زندگی کی جاندار مصوری کرنے میں کامیاب ہوئے۔ متوسط طبقے کے مسلمانوں کی گھریلو زندگی سے ان کی واقفیت حیرت انگیز ہے اور انھوں نے دھڑلے سے مسلمانوں کی سیاسی جذباتیت کی عکاسی کرنے کے لیے اپنے ہیرو آزاد کو روس کے خلاف ترکوں کی جنگ کریمیا میں جنگ کرنے کے لیے بھیج دیا[۳۶]۔

اس کے علاوہ بانکی پورہ سے ۱۸۸۷ء میں ایک رسالہ البنچ جاری ہوا' اس رسالے نے عالمی صورت حال پر توجہ دیتے ہوئے کارٹون شائع کرنے کی ابتدا کی۔ طنز و مزاح کا سہارا لیتے ہوئے روس، فرانس، ترکی اور جرمنی کے سیاسی و سماجی حالات پر مکالماتی نوعیت کا تبصرہ پیش کیا[۳۷]۔

یہ وہ اسباب اور محرکات تھے جس نے اردو ادب میں تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے مربوط منظم رجحان کو جنم دیا، عربوں اور ترکوں کے حوالے سے کئی تاریخی و تہذیبی پہلو اردو ادب میں بیان ہوئے ہیں۔ کئی اعلی درجے کی علمی و ادبی شخصیات نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلافت کو بچانے کے لیے کئی ایسی تحریکیں چلیں جن کے اثرات نہایت دور رس ہیں ان میں انجمن خدام کعبہ، تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت اور تحریک ہجرت پیش پیش تھیں۔ برعظیم کی چند شخصیات ایسی ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی کو اسلام اور عالم اسلام سے وابستہ کر لیا تھا۔ ان شخصیات میں ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور اقبال بھی شامل ہیں۔ ابوالکلام آزاد اور اقبال پر افغانی اور تحریک اتحاد اسلامی کے اثرات نمایاں ہیں۔

ابوالکلام آزاد اپنی ابتدائی زندگی ہی سے عالم اسلام کے مسائل پر پوری اور گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ جو تحریک صرف برعظیم تک محدود ہو وہ مقامی مسلم ملت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی وہی تحریک مفید ہو سکتی ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو سمیٹ لے۔ چونکہ اہل مغرب اپنے آپ کو متحد کرنے کے لیے پان یورپین ازم کی تحریک سے وابستہ ہو چکے ہیں اس لیے ہمیں بھی تحریک اتحاد اسلامی کا داعی بن جانا چاہیے۔ ان کا اردو مجلّہ الہلال ان کے ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ چوں کہ انھیں تحریر میں مہارت تامہ حاصل تھی اس لیے پہلے الہلال اور بعد میں البلاغ کے ذریعے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کو انھوں نے اپنا ہم نوا بنانے میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں [۳۸]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے اثرات کا نمایاں ترین اظہار اقبال کی فکر سے پھوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال پر عالم اسلام کی بے چارگی اور بے بسی واضح تھی اور اس کے پس منظر میں مغربی قوتوں کی ریشہ دوانیاں، جارحیت اور اسلام دشمنی کارفرما تھی، وہ ان سے واقف تھے۔ وہ عالم اسلام کے سیاسی ابتلا پر سخت رنجیدہ تھے اور اپنے رنج والم کو انھوں نے اپنی شاعری میں سمو دیا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو پان اسلامسٹ کہلانے میں فخر محسوس کیا اور ساری زندگی اسلام کے عالم گیر اصولوں کی تبلیغ کی جس کا اظہار ان کے خطوط میں کثرت سے ملتا ہے [۳۹]۔

مولانا محمد علی جوہر بھی پان اسلامسٹ تھے [۴۰] اور کامریڈ کے ذریعے انھوں نے اتحاد اسلامی پر مبنی خیالات کی ترویج کی جب کہ ایک مسلمان رہنما عبداللہ سہروردی نے لندن میں پان اسلامک سوسائٹی قائم کی [۴۱] اور اتحاد اسلامی کے جذبات کو عام کرنے کے لیے ایک جریدہ پان اسلام جاری کیا [۴۲]۔ ہندوستان کے متعدد ادیبوں نے بھی عالم اسلام سے مسلمانوں کو قریب تر کرنے کا کام کیا' حالی کی مسدس، شبلی کی تصانیت، شرر کے ناول، ظفر علی خان کی شاعری اور متعدد اخبارات اور رسائل نے اس تحریک کے زیر اثر ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کے علاوہ کئی ایسے گمنام شعراء ہیں جن کی شاعری معاصر اخبارات اور رسائل کا حصہ ہے ان میں تحریک اتحاد اسلامی کے جذبات موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپی ممالک نے اپنی اسلام دشمنی کے باعث عیسائی اقلیتوں کو بغاوت پر اور بلقانی ریاستوں کو جنگ پر اکسانے یا ترکوں کو سرحدی صوبوں اور ان کی تابع ریاستوں پر بلاواسطہ حملہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا [۴۳]۔ مثلاً فرانس نے ۱۸۳۰ میں الجزائر کو فتح کر لیا اور ۱۹۰۹ء کے اختتام تک صحرا کے بڑے حصے کو اپنے قبضہ میں لے لیا [۴۴]۔

ان حالات میں مسلم مفکرین کی توجہ ۱۹۲۴ء تک مسلم سیاسی طاقت کے زوال پر مبذول رہی یا اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی علمی، سیاسی اور ادبی صلاحیتوں کا استعمال تحریک اتحاد اسلامی کو جلا بخشنے میں صرف ہوا ہے' اور ایک بڑی جماعت افغانی کے نظریے پر عمل پیرا ہو کر انگریزی اور یورپی قوتوں کے خاتمے کی جدوجہد میں شریک ہوگئی۔ اسی نظریے کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی بقا اور ترقی کے لیے مشترک جدوجہد کے مقاصد پر غور کیا' لہٰذا اتحاد اسلامی کا لفظ سامراجیوں کے لیے مکروہ ہوگیا' اس تحریک کے اثرات کی وجہ سے سامراجیوں کو اپنی نو آبادیات میں نہ صرف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' بلکہ انھیں سیاسی اور سماجی لحاظ سے مسلم آبادی میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا[۴۵]۔

مسلم دنیا میں یورپی طاقتوں کے نمو کی وجہ سے یورپی زبانوں کا مطالعہ بھی مختلف مسلم ممالک میں مختلف درجات اور شعبہ جات میں کیا جانے لگا، برعظیم اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ یہاں یورپی جرائد، رودادوں اور کتابوں تک جو رسائی پیدا ہوئی اس نے مسلمانوں کو مغربی حکمت عملیوں اور امنگوں کے مطابق ایک بصیرت بہم پہنچائی۔ یہ علم مختلف واسطوں سے گزر کر عوام اور علماء اور مفکرین تک بھی پہنچا۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے ان زبانوں کو سیکھنے سے اعتراض کیا مگر جہاں تک مسلمانوں کے لیے اہمیت رکھنے والی بین الاقوامی خبروں کا تعلق ہے انھیں مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا تھا[۴۶]۔ علاوہ ازیں ہر سال حج کے موقعے پر بہت سے لوگ دنیائے اسلام سے آ کر مکہ میں جمع ہوتے تھے اور یہاں معلومات کا تبادلہ بھی کیا جاتا تھا۔ مسلمانان عالم حج کے زمانے میں جس طرح اخوت کا اظہار کرتے ہیں اس سے بھی اتحاد اسلام اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلق کا اظہار ہوتا ہے[۴۷]۔

اس لیے حج کے موقعے پر علما کرام مسلم دنیا کے اچھے خاصے واقعات سے باخبر ہوتے تھے۔ برعظیم میں انھوں نے ملت اسلامیہ کو ان خطرات سے جو مسلم دنیا کو درپیش تھے آگاہ کرنے اور دنیا کو ملت اسلامیہ سے مماثلت کا احساس از سر نو پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ان کے کام کے بغیر برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخی تسلسل برقرار نہیں رہتا[۴۸]۔

سلطان عبدالحمید نے اپنی خلافت کے پرچار کے لیے اپنے نمائندے مصر، تیونس، ہندوستان، انڈونیشیا اور جاوا میں روانہ کیے۔ اسی زمانے میں روس پھر ترکی سے نبرد آزما ہوا۔ زارشاہی سلطنت افغانستان کی سرحد تک پھیل چکی تھی۔ برطانوی ہند بھی روسی یلغار کی زد میں تھا۔ ترکی اور ایران کے مقابلے میں روس کی متواتر

فتوحات نے برطانیہ کو پریشان کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد اسلامیانِ ہند انگریز سرکار کے شدید مخالف تھے۔ ان کوروس سے متنفر کر کے برطانیہ نے اپنے مقاصد کو پورے کرنے کے لیے اور خود کو مسلمانوں کا بہی خواہ ثابت کرنے کے لیے تحریک اتحاد اسلامی کی کھل کر حمایت کی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب برطانیہ سفارتی سطح پر ترکوں کا حامی تھا[۴۹]۔

جنگ کریمیا میں برطانیہ نے اپنی مشرقی مقبوضات کی خاطر ترکی کا ساتھ دیا تھا، لیکن ترکی کو بہت جلد اس اعانت کی تلافی کا موقع مل گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کریمیا کی انگریزی فوج اپنے ساتھ ترکوں سے ایک فرمان لائی جس میں خلیفہ اسلام کی حیثیت سے سلطان عبدالعزیز نے ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی اطاعت کی نصیحت کی۔ اس نصیحت کی کوئی نقل اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے مگر یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ ہندوستان میں ہزاروں میل دور رہنے والے مسلمان بھی اس سے ناواقف نہیں تھے۔ چناں چہ مصطفےٰ کامل پاشا کی اپنی تصنیف مسئلہ مشرقیہ جلد اوّل میں صفحہ ۲۱ میں اور تیونس کے اخبار الصواب ۴ رفروری ۱۹۲۱ء میں اس واقعے کی تفصیل ملتی ہے[۵۰]۔

اگر قدیم حوالوں سے ترکوں کے ہندوستان پر اثرات کا جائزہ لیا جائے تو فتح گجرات اور دکن کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علاء الدین خلجی نے ملک نائب کو لشکر جرار دے کر دکن کی مہم پر روانہ کیا تھا اس نے ۱۳۱۰ء تک سارے دکن اور مالوہ کو فتح کر کے دہلی میں شامل کر دیا۔ ملک نائب اور اس کی سپاہ ترکی افواج پر مشتمل تھی[۵۱]۔ یہ حکمران خاندان گجرات سے دکن تک سارے علاقوں میں اپنے متوسلین کے ساتھ آباد ہوئے تو تہذیبی اور لسانی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، یہ لوگ ترک نژاد ضرور تھے لیکن انھیں آباد ہوئے صدیاں گزر گئیں تھیں۔ یہ اپنے ساتھ وہ زبان لے کر آئے تھے وہ بازار ہاٹ میں بولی جاتی تھی اور اس کے ذریعے یہ لوگ معاملات زندگی طے کرتے تھے۔ ان سپاہیوں کی مجبوری یہ تھی کہ یہ نہ اپنے علاقوں کی زبان بول سکتے تھے اور نہ ترکی اور فارسی میں لین دین کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان میں یہاں کے مقامی زبانوں اور فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل کر کے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا، اس طرح یہ زبان کو سیاسی و معاشرتی تقاضوں کے تحت قابل قبول بن گئی[۵۲]۔

ترکی افواج میں مسلسل ترکستان سے سپاہی آتے رہے، بعد کے زمانہ میں ہندی عناصر کو فوج میں غلبہ حاصل ہوا، لیکن سپہ سالار اور دوسرے اہم افسر عام طور پر ترک ہی ہوا کرتے تھے اور چوں کہ فوجیوں کا تعلق

معاشرے سے بھی ہوتا ہے اس لیے آپس کے لین دین کے باعث فوجیوں کی زبان علاقائی زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترکی الفاظ داخل ہو گئے۔ اس کام میں ان ترکی ادیبوں، شاعروں اور عالموں اور فن کاروں نے بھی ضرور مدد کی ہوگی جو منگولوں کے طوفانی حملوں کی وجہ سے اپنے آبائی وطن چھوڑ کر ترک سلاطینِ ہند کے زیرِ سایہ پناہ کے لیے آ گئے تھے[۵۳]۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ترکی شاعری کی روایت جس کا سلسلہ علی شیر نوائی تک پہنچتا ہے اور جسے بابر اپنے ساتھ ہندوستان لایا تھا بیرم خان کے اشعار میں اس روایت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے[۵۴]۔ ہمایوں بھی فارسی زبان کا عمدہ شاعر تھا ترکی بحریہ کا ایک امیرالبحر سیدی علی رئیس پرتگالیوں کے خلاف لڑتے ہوئے اپنے تباہ شدہ بحری بیڑے کو گجرات چھوڑ کر مغل مقبوضات میں داخل ہوا[۵۵]۔ سیدی علی رئیس خود بھی ترک شاعر تھا۔ ہمایوں اس کے حسن تغزل سے بہت متاثر ہوا[۵۶]۔ اس نے اپنے سفرنامے میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے

ہندوستان کی زبانوں اور اس کے ادب میں جو ترکی الفاظ داخل ہوئے ہیں وہ عربی اور فارسی نہیں ہیں بلکہ عام ترکی تہذیب و تمدن اور خاص کر فوج کے جملہ امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً توپ، چاقو، داروغہ، یورش، وغیرہ[۵۷]، یہ الفاظ آج بھی اردو زبان میں مستعمل ہیں۔

پرتگالیوں نے جب ساحل ہند پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو قتل کیا اور کئی مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیا۔ کالی کٹ کی بندرگاہ پر بھی مسلمانوں کی مسجد کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہی حال عرب کے ساحلی شہروں کا کر رکھا تھا۔ حاجیوں کے جہاز بھی انھیں محصول دیے بغیر کسی صورت حج پر نہیں جا سکتے تھے[۵۸]۔

اس وقت ہندوستان کی مرکزی حکومت لودھیوں کے کمزور ہاتھوں میں تھی، دکن اور گجرات میں طوائف الملوکی تھی انھیں بے چاروں نے مل ملا کر اپنی بحری قوتوں کو یکجا کیا اور پرتگالیوں سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ سلطان محمود گجراتی، سلطان محمود بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ اور راجہ ملیبار نے اپنے بحری بیڑوں کو شامل کیا لیکن بدقسمتی سے اس متحدہ قوت کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا[۵۹]۔

اس زمانے میں سلطان سلیم عثمانوی سلطنت کا خلیفہ تھا مگر وہ تین برس زندہ رہا۔ اس کے بعد سلطان سلیمان اعظم اس کا جانشین ہوا جس نے اپنے باپ کی بلند حوصلگیوں کے خواب کو پورا کر دکھایا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان نے بھی اس کی خلافت اور مذہبی عظمت کو تسلیم کر لیا[۶۰] اس کا اثر سب سے پہلے گجرات کے سلاطین پر پڑا جن کے عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ سے راست تعلقات تھے[۶۱]۔

گجرات کے ایک محدث وعالم محمد بن عمر آصفی الغجانی جن کی آمدورفت مکہ مظمہ میں رہا کرتی تھی اور جو سلاطین گجرات کے درباروں میں معزز بھی تھے۔انھوں نے عربی میں ظفر الوالہ کے نام ایک تاریخ لکھی اس تاریخ میں گجرات بلکہ ہندوستان کے مایہ ناز محدث شیخ علی متقی مہاجر،صاحب کنز العمال کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر عرب گئے اور سلطان سلیمان اعظم کے کانوں میں ان کی شہرت پہنچی تو سلطان سلیمان نے ان سے دعا کی آرزو کی،اس تقریب سے محمد بن عمر آصفی الغجانی سلطان سلیمان اعظم کا نام اپنی زبان پر لاتے ہیں[٦٢] اوراس کے بعد کہتے ہیں کہ

> اس وقت ترکی کا بادشاہ اسلام کا سلطان علی الاطلاق تھا اور تمام دنیا میں خدا کا خلیفہ تھا اور وہ سلیمان خان بن سلیم خان بن بایزید تھے[٦٣]۔

سلطان گجرات نے پرتگالیوں اور چمپانیر احمد آباد کے محاذ[٦٤] لڑنے کے لیے سلیمان اعظم سے مدد کی درخواست کی تھی[٦٥] بابر بادشاہ کے زمانے میں بھی قسطنطنیہ ہی کے سلطان کا نام خطبے میں پڑھا جاتا تھا[٦٦]۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلاطین عثمان کی مذہبی برتری اور امامت کبریٰ کو ہندوستان کے بادشاہ بھی تسلیم کرتے تھے[٦٧]۔

حواشی

۱- قرآن حکیم، سورہ المجادلہ، آیت:۳
۲- قرآن حکیم، سورہ آلِ عمران آیت:۱۲
۳- احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، ص ۳۵
۴- ایضاً، ص ۵۰
۵- ایضاً، ص ۵۱
۶- ایضاً، ص ۶۳
۷- ایضاً، ص ۶۳
۸- کرامرز (J.H.Karamers)، ۱۹۲۶ء، ص ۳۴۹
۹- Branilav, Djurdjev، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳
۱۰- ایضاً، ص ۳۲
۱۱- کرامرز، ص ۳۴۹
۱۲- Ross,Ettors، ص ۴۳۸
۱۳- احمد، مرتضی، ۱۹۲۶ء، ص ۵۱۸
۱۴- ایضاً، ص ۵۹۳
۱۵- شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸
۱۶- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۴
۱۷- احمد، شفیق، ڈاکٹر، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۶
۱۸- رزاقی، شاہد حسین، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۶
۱۹- عقیل، ص ۱۳۴
۲۰- ایضاً، ص ۱۳۵
۲۱- ایضاً
۲۲- ایضاً
۲۳- ایضاً

۲۴- احمد،عزیز،جون ۱۹۹۷ء،ص ۱۸۲
۲۵- احمد،عزیز،جون ۲۰۰۵ء،ص ۹۳
۲۶- رزاقی،ص ۱۲۷
۲۷- احمد،شفیق،ص ۱۳۰-۱۳۱
۲۸- عقیل،معین الدین،ڈاکٹر،جون ۲۰۰۸ء،ص ۲۲۳
۲۹- احمد،عزیز،جون ۲۰۰۵ء،ص ۸۸
۳۰- رزاقی،ص ۳۷
۳۱- عبدالغفار،قاضی،فروری ۱۹۳۲ء،ص ۳۵-۳۶
۳۲- ایضاً،ص ۳۶
۳۳- عقیل،معین الدین،ڈاکٹر،۲۰۰۸ء،ص ۱۴۵
۳۴- شبلی،علامہ،سن ندارد،ص ۱۱۶
۳۵- ایضاً،ص ۱۱۶
۳۶- عارف،محمد،ڈاکٹر،۲۰۰۶ء،ص ۳۴۰
۳۷-الپنچ،۱۸۸۷ء،بانکی پورہ،ص ا
۳۸- قریشی،اشتیاق حسین،ڈاکٹر،جولائی ۱۹۹۴ء،ص ۲۸۲
۳۹- ایضاً،ص ۲۸۴
۴۰- ایضاً،ص ۲۸۴،۲۸۵
۴۱- قریشی،محمد نعیم،۲۰۰۹ء،ص ۳۲
۴۲- ایضاً
۴۳- قریشی،جولائی ۱۹۹۴ء،ص ۲۸۲
۴۴- ایضاً
۴۵- ایضاً،ص ۲۸۴
۴۶- ایضاً-ص ۲۸۴-۲۸۵
۴۷- پروفیسر ویمبری کی کتاب،مغربی تمدن اور مشرقی ممالک کا ترجمہ مستقبل اسلام کے نام سے ظفر عمر بی-اے نے اردو میں کیا' افسوس اس کتاب میں انھوں نے مکمل حوالہ نہیں دیا۔اس کتاب میں ایک باب تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے موجود ہے۔پروفیسر موصوف کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں سوائے حج کے موقع کے علاوہ ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی جسے ہم پان اسلامزم کے تصور کی تعریف پر منطبق کرسکیں۔انھوں نے عبدالحمید کو سازشی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ حجاز ریلوے کا منصوبہ اسلامی مرکزوں کے باہمی تعلقات کو آسان تر کرنے کے لیے بنایا گیا ہے یہ عبدالحمید کی سر گرم طبیعت اور سازش پسند واقع ہونے کی ایک مثال ہے۔مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے :مستقبل اسلام،بار

دوم سن ندارد، عبدالرشید اینڈ برادرز لاہور۔ص ۱۳۵
۴۸- قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، جولائی ۱۹۹۴، ص ۲۸۴-۲۸۵
۴۹- قریشی، ۲۰۰۹، ص ۱۹
۵۰- ندوی، سید سلیمان، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۰
۵۱- جالبی، جمیل، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۱۲
۵۲- ایضاً، ص ۱۳
۵۳- ایوبی، ڈاکٹر اکمل، ص ۴۶۴
۵۴- احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، ص ۴۱
۵۵- ایضاً، ص ۴۰
۵۶- ایضاً، ص ۴۱
۵۷- ایوبی، ص ۴۶۰، ۴۶۵
۵۸- ندوی، ص ۲۵۰
۵۹- ایضاً
۶۰- ایضاً
۶۱- ایضاً
۶۲- ایضاً، ص ۲۵۱
۶۳- ایضاً
۶۴- احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، ص ۶۴
۶۵- ندوی، ص ۲۵۱
۶۶- ایضاً
۶۷- ایضاً

maablib.org

باب دوم

تحریک اتحاد اسلامی اور جمال الدین افغانی

تحریک اتحاد اسلامی اور جمال الدین افغانی

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں نیشنلزم کی تحریکات اوّل مصر سے اور اس کے چند ہی روز بعد ملک شام سے شروع ہوتی ہیں۔ اس صدی کے نصف آخر میں وطنی قوم پرستی کے خدوخال زیادہ نمایاں ہوئے۔ عربوں کی یہ ابتدائی تحریک ترکی اقتدار کے خلاف تھی اور اس میں نسلی اور وطنی احساسات کا بہت کچھ دخل تھا۔ ۱۸۷۷ء میں ترکی پر روس کے حملوں کے بعد اس تحریک نے زور پکڑا اور دیکھتے دیکھتے ہی تمام علاقوں میں پھیل گیا اور عربوں نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر کے اپنے تمام علاقوں اور صوبوں کو آزاد کرانے میں کوشاں ہو گئے۔ کہیں اس تحریک کا اساس ''وطنیت'' تھا تو کہیں ''نسل''، مگر زیادہ تر وطنیت رہا[1]۔

اس صورت حال سے سلطنت عثمانیہ اچھی طرح واقف تھی۔ سلطان عبدالحمید نے تحریک اتحاد اسلامی کو ذریعہ بناتے ہوئے ان قوم پرستوں کو مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ سلطان عبدالحمید نے افغانی کی عالم اسلام میں سیاسی اور مذہبی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کہ وہ مسلم ممالک کے عوام میں اتحاد اسلامی کے جذبے کو بے دار کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

افغانی نے اتحاد اسلامی کے نعرے سے عالم اسلام کو روشناس کرایا۔ وہ اسلامی حکومتوں کے زوال کے اسباب پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جب تک تمام اسلامی حکومتیں ربط باہمی کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاسی بقا کی خاطر متحد نہیں ہو جاتیں ان کی ترقی ممکن نہیں[2]۔

افغانی کے خیال میں یہ اتحاد سیاسی اقتدار کا مظہر ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علما متوازی طور پر عالم اسلام میں ایک مرکزی تنظیم کی شکل اختیار کر لیں۔ افغانی کے نزدیک علم اور سیاست کا اتحاد قومی سطح پر ہونا ضروری ہے ملت اسلامیہ کے زوال کا آغاز اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب خلافت کے رتبے سے علم کا رتبہ جدا ہو گیا[3]۔

افغانی کا سیاسی معاملہ عبدالحمید کی پالیسی سے بالکل جدا تھا۔ عبدالحمید خلافت کے نام سے، عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج سے وابستہ کر کے عثمانویوں کو یورپین خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور

افغانی اوّل روز ہی سے ہر ایک تاج وتخت کے دشمن تھے۔ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا۔اور وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلق العنانی کے خلاف ملّی جذبات کو بے دار کرنا چاہتے تھے اور اسلامی ممالک کی بے داری کو اپنے عالم گیر اتحاد اسلامی کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے[4]۔اس کام کے لیے انھوں نے کوئی ٹھوس منصوبہ عمل تشکیل نہیں دیا' یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک کے مسلمان برادرانہ کشش محسوس کرنے کے باوجود سیاسی حکمت عملی کو ترتیب دینے میں ناکام رہے۔

افغانی یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے ظلم و جبر سے آزاد نہ ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بھی عملی ہم دردی نہیں کر سکتے[5]۔اس کے لیے انھوں نے تمام مشرقی اقوام کو ان کے عام سیاسی انحطاط سے متنبہ کیا اور انھیں مغرب کے جارحانہ اثر ورسوخ کے خلاف متحد ہونے کی تلقین کی۔ان کے نزدیک اسلام اپنے تمام ملاحظات میں ایک آفاق مذہب ہے جو اپنی روحانی قوت کی وجہ سے یقینی طور پر ایسی اہلیت رکھتا ہے جو بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکے[6]۔

افغانی کے نظریہ بین الاسلامیت میں وطنی اور قومی ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ان کے عالم اسلام کو یکجا کرنے میں ایک رمز یہ بھی پوشیدہ تھا کہ تمام عالم اسلام کے لوگ اپنے ممالک سے بادشاہت کا خاتمہ کر کے شخصی حکومتوں سے نجات حاصل کرلیں۔مگر برطانوی سامراج نے افغانی کے اس تحریکی عمل سے خوب فائدہ اٹھایا اور اسے مسلمانوں کے خلاف اپنی جارحانہ کارروائیوں کا جواز بنایا۔ پان اسلامزم کو نو آبادیاتی قوتوں نے رجعت پسندانہ اور تنگ نظریہ کی حامل، مذہبی جنون پر مبنی جارحیت پسند تحریک قرار دیا پھر اسی بہانے جہاں کہیں بھی آزادی کے علم بردار اور مصلحین اٹھے،انھیں کچل کر رکھ دیا۔یہ مسلم دشمنی حکمرانوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بعض مستشرقین اور اسکالروں نے بھی مسلمانوں اور مغربی عوام کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی[7]۔

یورپی اقوام نے اتحاد اسلامی کو اپنے رنگ میں پیش کیا تا کہ مغربی اقوام سہم جائیں۔ان کے دل میں یہ وہم سما گیا تھا کہ مسلمان ایک وحشی قوم ہیں جنھوں نے لندن اور پیرس پر چڑھائی کی ٹھان رکھی ہے۔اسلام کی ایسی بھیانک تصویر پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے خلاف مغربی سامراج کی وحشیانہ کارروائیوں کو حق بہ جانب قرار دیا جاسکے۔یورپ نے جس چیز کا نام پان اسلامزم رکھا وہ سلطان عبدالحمید کی وہ سیاسی حکمت عملی تھی جس نے اس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر کی نیندیں حرام کردی تھیں[8]۔

یورپ میں جمال الدین افغانی کے اتحاد اسلامی پر موجودہ عہد میں کئی اعلیٰ درجے کے کام ہوئے ہیں مگر جس زمانے میں افغانی نے اس تحریک کا علم بلند کیا تھا اس وقت اسے کئی خطرناک زاویوں سے دیکھا گیا جو یورپ کے گمراہ کن ذہن کا شاخسانہ تھے جو ہمیشہ سے اسلامی تحریکوں کے حوالے سے ان کے دماغ کا حصہ رہا ہے۔

ہم اس بحث میں نہیں الجھتے کہ افغانی کا نظریہ بین الاسلامیت، عبدالحمید کے نظریہ بین الاسلامیت سے جدا تھا یا ایک سا تھا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ افغانی نے اس تحریک کو اس لیے پروان چڑھایا تھا کہ عالم اسلام شخصی حکومتوں سے نجات حاصل کر کے جمہوری طریقے پر عمل کرے اور تمام عالم اسلام میں ہم آہنگی ہو جو مشکل وقت میں ایک دوسرے کے کام آسکے۔

افغانی کے مطابق کوئی مسلمان قومی یا لسانی اتحاد پر انحصار نہیں کر سکتا، اس کے برعکس اسے صرف مذہبی بنیادوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کو نسل پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے جہاں پر بھی رہیں نسلی تعصب سے انحراف کریں اور کسی بھی قسم کی عصبیت کو اپنے اندر جگہ نہ دیں کیوں کہ یہ عمل اتحاد اسلامی کو نیچا کرتا ہے۔ جو لوگ اسلامی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں تو حقیقت میں وہ اپنی نسل اور قومیت سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں اور ذاتی تعصبات سے اٹھ کر آفاقی رشتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ تمام عالم اسلام کے مسلمان چوں کہ شریعت کے پابند ہیں اس لیے قومیتوں میں فرق محسوس نہیں کرتے۔

افغانی نے نسل اور قومی اتحاد کو سختی سے رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اللہ پسند نہیں کرتا، قرآن کی اس آیت میں اس کا ثبوت ہے کہ اللہ تمام رشتوں کو ناپسند کرتے ہیں ان رشتوں کے علاوہ جو اسلامی اصولوں کے ذریعے عمل میں آئیں۔ جو لوگ اسلامی یگانگت کو اپنی شناخت بناتے ہیں وہ اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں کہ انھیں کسی رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس سے انحراف کرتے ہیں وہ دراصل قرآن کے بنیادی احکام کی ایک درجے میں خلاف ورزی کرتے ہیں۔

تحریک اتحاد اسلامی کا تناظر: جنوبی ایشیا کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی صورت حال

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا اسلامی ممالک اور خلافت عثمانیہ پر ہونے والی زیادتیوں پر احتجاج کرنا فطری امر تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مغربی قوتیں اسلامی ممالک کی تذلیل کر کے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں[9]۔ کئی ایسے بین الاقوامی معاملات تھے جن کا اثر راست ہندوستان کی سیاست پر بھی تھا خصوصاً روس کی کریمیا میں مداخلت اور پھر وسط ایشیا میں اس کے بڑھتے ہوئے قدم نے عالم اسلام کے مسلمانوں کو ایک مرکزی دھارے سے جڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان چوں کہ شاہ ولی اللہ کی آفاقی خلافت پر یقین رکھتے تھے اس لیے اس قدیمی نظریے کو ان حالات میں تائید حاصل ہوگئی تھی اور ہندوستان میں موجود شاہ ولی اللہ کا مکتب فکر جس میں دیوبند اور ندوۃ العلماء پیش پیش تھے عثمانوی خلافت کو آفاقی اسلامی خلافت میں ڈھال کر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت عمدہ طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب رہے[10]۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے عالم اسلام سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا۔ ہر حالات میں یہاں کے مسلمانوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان خواہ کسی بھی خطے کا ہو اسے ہم اپنے قومی شعور سے جدا نہیں کر سکتے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو سیاست میں جس طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور جن قومی حادثات سے وہ مسلسل دوچار تھے اس نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ مغرب کی استعماری قوتوں نے تقریباً تمام بلاد اسلامیہ میں ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور ہر نیا دن مسلمانوں پر اس بات کو اچھی طرح واضح کر رہا تھا کہ بلاد اسلامیہ کو جو حالات درپیش ہیں ان کے پیچھے کسی نہ کسی طرح انگریز سامراج موجود ہے۔

خلافت عثمانیہ کے ساتھ جو معاملات طے ہو رہے تھے اس میں برطانیہ کا کردار ہندوستانی مسلمانوں کے پیش نظر تھا۔ ان حالات میں مسلم دشمن کارروائیوں میں انگریزوں کے کردار کو دیکھ کر ہندوستانی مسلمان

انگریزوں سے بے زار اور مایوس ہو چکے تھے۔ اس بے زاری اور مایوسی میں زندگی کی لہر جمال الدین افغانی نے پیدا کی۔ افغانی کی کوششوں سے غیر ملکی استعماریت سے نجات، نسل، قوم اور وطن کے محدود تصورات سے بالاتر ہو کر اسلام کے ملّی تصورات کو اپنانے اور تمام مسلم ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک کا آغاز ہوا جس نے مسلمانوں کی جمود زدہ زندگی میں تحریک پیدا کر دی"۔

جنوبی ایشیا میں بڑی تعداد ایسے نوجوانوں پر مشتمل تھی جو اتحاد اسلامی کے خیالات سے کامل اتفاق رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کے معاملات میں افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی کی مقبولیت سے بے حد متاثر تھے"[12]۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اس تحریک میں شامل ہو کر انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں ان کی مدد کریں۔

تحریک اتحاد اسلامی کا جب بھی مطالعہ کیا جاتا ہے تو ترکی کی خلافت راست عنوان بن جاتی ہے۔ خلافت عثمانیہ اصل میں مسلمانوں کا وہ واحد ادارہ تھا جس سے یہاں کے مسلمان اپنی روحانی اور جذباتی وابستگی کا اظہار کئی مواقعوں پر کرتے رہے تھے۔ عالمی سیاسی اور اہم مواقع پر مسلمانوں نے خلافت عثمانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ افغانی کی مساعی اگر ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ نہ ہوتی تو اس تحریک کو پروان چڑھانا ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی مشکل امر نہ تھا۔ کیوں کہ ہندوستان کے مسلم دانش ور خلافت عثمانیہ سے راست تعلق رکھتے تھے اور عثمانوی تہذیب وفنون لطیفہ سے بے حد متاثر تھے۔ اس اثرات سے نکلنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ انسٹیوٹ گزٹ میں کالج کے مجوزہ یونی فارم کا اعلان کیا گیا تو ترکی ٹوپی کو لازم قرار دیا گیا"[13]۔ ۱۸۹۸ء میں حاجی اسمٰعیل خاں اور مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے علی گڑھ سے رسالہ معارف کا اجرا کیا۔ تو اس کے اوّلین صفحے پر لکھا گیا:

> معارف ایک ماہوار رسالہ ہے جو بلاد عثمانیہ کے نام ور ترکی رسالوں کے نمونے پر ہر مہینے کی آخری تاریخ کو علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں علمی، فلسفی، مذہبی، ملکی، تمدنی، تاریخی اور ادبی مضامین لکھے جاتے ہیں اور مشرقی طرز کی عمدہ اور پاکیزہ نظمیں درج کی جاتی ہیں"[14]۔

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے اپنے رسالے معارف میں جس انداز میں تحریک اتحاد اسلامی کو جلا بخشی اس کی مثال اس زمانے کے کسی اور رسالے میں کم ملتی ہے۔ انھوں نے خود ترکی کی اور عالم اسلام کے کئی بڑے رہ نماؤں کے اثرات قبول کیے اور اسے اپنے اردو مضامین کا نہ صرف حصہ بنایا بلکہ ان کی تحریروں کو

اپنی تحریروں میں سمونے کی کوشش بھی کی۔ فرید بگ مصر کے ایک روشن خیال رہ نما تھے مسلم گزٹ ۱۱ مارچ ۱۹۱۶ء میں اپنے ایک مضمون مسلمانوں میں زندہ دلی کیوں کر پھیل سکتی ہے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں اور ان میں زندہ دلی عام طور پر پھیل جائے تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنا منتہائے خیال بلند رکھیں اور اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں ورنہ دنیا کی عالم گیر کشش میں وہ اپنی قومی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتے اور ایک دن ضرور فنا ہو جائیں گے[۱۵]۔

خلافت عثمانیہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عالم اسلام میں ایک مرکزی ادارہ تھا اسی لیے ہندوستانی مسلمانوں کے کئی دانش وروں نے اس کی دینی حیثیت پر کئی مضامین اور مقالے لکھے۔ ہندوستانی سیاست میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہندوستانی مسلمانوں کی ساری سیاست اسلامی ممالک کی سیاست اور وہاں کی تحریکوں سے وابستہ ہوگئی[۱۶]۔ کئی اداروں کا قیام عمل میں آیا جو صرف ملت اسلامیہ کے مسلمانوں کے حالات اور وہاں کی تحریکوں اور ان کے ادبیات کو اردو میں روشناس کرانے کے لیے مختص تھے۔

۱۸۷۶ء میں انجمن اسلام بمبئی کی بنیاد پڑی اور انجمن اسلام خدام کعبہ ۱۹۱۳ء لکھنؤ میں قائم ہوئی۔ ان دونوں اداروں کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ روحانی اور مادی طور پر خلاف عثمانیہ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان جگہوں کی جو مقدس مقامات ہیں غیر مسلموں کے تسلط سے انھیں بچانے کے لیے کردار ادا کیا جائے[۱۷]۔ انجمن اسلام بمبئی نے وہی کام کیا جو علی گڑھ تحریک چلانے والوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کیا تھا۔ بمبئی کے مسلمانوں میں تعلیمی بے داری پیدا کرنے کا سہرا انجمن اسلام ہی کے سر ہے[۱۸]۔ انجمن اسلام بمبئی سے وابستہ افراد جن میں محمد علی رو گھے، بدرالدین طیب جی اور آغا خان شامل تھے انھوں نے تحریک اتحاد اسلامی میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ چناں چہ عوام میں سیاسی، علمی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ ان صاحبان نے ملی احساس کو بھی بھرپور طریقے سے نمایاں کیا۔

بمبئی کے مسلمانوں نے تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی مختلف نوع کے کام انجام دیے تھے۔ یہ وہ کوششیں تھیں جس پر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت کم لوگ معترض تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ اشتراک مزید گہرا ہوگیا تھا جب کہ سلطان عبدالحمید کے استبداد پر اندرونی و بیرونی مخالفتیں موجود تھیں[۱۹]۔ ترکوں کے حوالے سے غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں کا کردار کئی حوالوں سے اہم رہا۔

خصوصاً برطانوی مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اسلام اور ترک مخالف پروپیگنڈے کے خلاف جنگ کریں۔ ۱۸۸۶ء کے آغاز میں ایک پان اسلامک سوسائٹی جو انجمن اسلام بمبئی لندن ہی کی ایک شاخ تھی سامنے آئی۔ اس انجمن کی شاخیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں تھیں[۲۰]۔

۱۹۰۳ء میں ایک ہندوستانی بیرسٹر عبداللہ المامون سہروردی نے اس غیر فعال سوسائٹی کو دوبارہ فعال کیا تھا اور اس کا ایک نیا نام The Pan Islamic Society London رکھا۔ بعد میں اس نام کو اسلامک سوسائٹی سے تبدیل کر دیا گیا[۲۱]۔ امیر علی، عبداللہ سہروردی کے بعد اس سوسائٹی کے صدر بننے میں کامیاب ہوئے۔ مشیر حسین قدوائی اس کے سیکریٹری ہوئے اور حافظ محمود شیرانی اس کے جوائنٹ سیکریٹری منتخب ہوئے[۲۲]۔

ترکوں سے راست رابطہ رکھنے کے بجائے اس سوسائٹی نے اہم خدمات انجام دیں خاص طور پر اپنے جرنل پان اسلازم کے ذریعے مسلمانوں کے حوالے سے پھیلی ہوئی بدگمانیوں کو دور کیا۔ اس رسالے میں مسلمانوں کے احساسات اور ترکوں کے احساسات پیش کیے جاتے تھے[۲۳]۔

۱۹۰۶ء کی سیاسی سرگرمیوں میں ہندوستان میں ایک نیا جوش و ولولہ دیکھنے میں آیا۔ یہ جوش و ولولہ اس برطانوی الٹی میٹم سے تعلق رکھتا تھا جس میں ترکی مصری سرحد کا تنازع شامل تھا۔ اور لارڈ کرومر (Lord Cromer) کے ذریعے انڈیا آفس نے اس پروپیگنڈے کی شدید مخالفت کی تھی جس میں سلطان کو خلیفہ بنانے کی حمایت پر اعتراض کرنا تھا۔ ترکوں کی مخالفت سر سید احمد خان کے دور میں بھی کی گئی۔ نواب حاجی اسمٰعیل خان جو بعد میں پان اسلامسٹ ہو گئے تھے اور علی گڑھ کے نواب محسن الملک نے بھی ترکی کے اس دعوے کو کہ سلطان ساری مسلم دنیا کے خلیفہ ہیں متنازع بنانے کی غرض سے کئی اقدامات کیے اور ان صاحبان نے جو اعتراضات کیے وہ سید احمد خاں سے مستعار تھے[۲۴]۔ لیکن ان تمام تر دلائل سے سوائے شور شرابے کے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اس پوری مہم میں مولوی سمیع اللہ نے مصر جا کر لارڈ کرومر کے ساتھ مصری نوجوانوں کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کی، مگر اس پوری مہم میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی[۲۵]۔

ہندوستان میں نوجوانوں نے جس انداز میں اس تحریک کو فعال بنایا، علی گڑھ کے رہ نماؤں کے لیے معنی خیز تھا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ تمام تر مخالفت کے باوجود اتحاد اسلامی کے حامی بن

جائیں گے۔اس تحریک کو پروان چڑھتے دیکھ کر متوازن فکر کے حامل لوگوں نے جس میں محسن الملک اور آغا خان شامل تھے ہندوستانی مسلمانوں کواس بات پر رضامند کیا کہ وہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت کریں تاکہ ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم سے مشترکہ مذہبی افراد کو سامنے لایا جا سکے اور برطانوی مخالف احساسات کو بکھرنے سے بچایا جائے اور ایسی حکمت عملی ترتیب دی جائے جو تمام مسلمانوں کے احساسات کو پیش کر سکے [۲۶]۔ ڈھاکا میں مسلم لیگ کا جو اساسی اجلاس منعقد ہوا اس کی تمام تر کارروائیوں میں ترکی ٹوپی اور ترکی کوٹ نے جو اثرات مرتب کیے وہ دراصل عثمانوی خلافت سے وابستہ ہونے کے احساسات کی غمازی کرتے تھے [۲۷]۔

اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اتحاد اسلامی کو پروان چڑھانے کے لیے اردو کے ادیبوں نے جس طرح اپنی خدمات پیش کی تھیں یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اس انجمن کے قیام سے مسلمانوں کی زندگی میں ایک نیا شعور اور فہم پیدا ہوا اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ عیسائیوں کی تبلیغ کا سدِ باب کیا جائے' اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچایا جائے نیز مسلمانوں کے یتیم ولاوارث بچوں کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں پرورش کے انتظامات کے علاوہ ان کی تعلیم وتربیت بھی کی جائے [۲۸]۔ عیسائی مشنریوں کا مقابلہ کرنا اس لیے ضروری تھا کہ یہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں عیسائی بنانے پر کاربند تھے۔ لہٰذا اس انجمن نے مسلمانوں کی معاشی ومعاشرتی ابتری دور کرنے کے لیے ایک مربوط نظام متعین کیا۔ یہ ادارہ اصل میں مذہبی اور تبلیغی انجمن کی حیثیت سے قائم ہوا اور اس کے مقاصد کا پہلا میدان تبلیغ واشاعت اسلام ہی تھا ان مقاصد کی تکمیل کے لیے چند مکتب بھی قائم کیے گئے لیکن بہت جلد اس نے تحریک کی صورت اختیار کر لی [۲۹]۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسوں سے ممتاز علما، ادبا، شعرا، سیاست دان اور قومی رہنما خطاب کرتے تھے اور مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل میں ان کی رہ نمائی کرتے تھے۔ ان میں مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالٰہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا عبدالغنی، ارشد گورگانی، مولانا ظفر علی خان، سر شیخ عبدالقادر اور چودھری خوشی محمد ناظر کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں [۳۰]۔ یہ انجمن مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی اور جو لوگ ملت کے تعمیری مفاد سے دلچسپی رکھتے تھے وہ اس سے کسی نہ کسی طور ضرور وابستہ رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندی مسلمانوں نے ملت اسلامیہ اور ہندوستانی مسلمانوں کی بہبود کے لیے کئی انجمنوں کو تشکیل دیا، اس میں انجمن اسلامیہ کلکتہ کا کردار اہم ہے۔ یہ انجمن ۶ مئی ۱۸۵۵ء میں مولوی مظہر کے گھر میں قائم ہوئی۔ اس تقریب میں سرکاری ملازمین اور کئی اہم رہنما شریک ہوئے۔ صدارتی خطبہ محمد عبدالرؤف جو کہ رسالہ *Derbin* کے مدیر تھے انھوں نے فارسی زبان میں دیا اور مسلمانانِ کلکتہ سے یہ کہا کہ: اس انجمن کے چند بنیادی مقاصد میں ایک یہ ہے کہ مسلمانان کلکتہ کے عام مسائل کو حل کرنے کی سعی کی جائے اور برطانوی گورنمنٹ جس طرح لوگوں کے مسائل حل میں کرنے مکمل طور پر ناکارہ ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت کوشش کرنی چاہیے[۳۱]۔

اس انجمن کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جائے جو ان کے کردار کو سنوار سکے اور اسلامی اقدار و روایات کی صحیح جھلک ان میں دکھائی دے۔ انجمن اسلامیہ کے پہلے صدر فضل الرحمٰن تھے جو کلکتہ میں چیف آف محمدن لاء آفیسر تھے۔ اس انجمن نے مسلمانان کلکتہ کی جمود زدہ زندگی میں تحرک پیدا کر دی اور انھیں ایک ایسی قوت بہم پہنچائی جو ان کی قومی زندگی کے لیے حیات بخش ثابت ہوئی[۳۲]۔ اس انجمن سے وابستہ دانش وروں کی ایک فہرست ایسی بھی ہے، جس نے اتحاد اسلام کی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

انجمن اسلامیہ امرتسر، مجلس اسلامیہ امرتسر کا تسلسل ہے۔ مجلس اسلامیہ امرتسر کو دوبارہ فعال انجمن اسلامیہ امرتسر کے نام سے کیا گیا۔ یہ انجمن ۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ء میں اپنے چند اہم مقاصد کی تکمیل کے لیے بنائی گئی تھی[۳۳]۔ پہلی بات یہ کہ اس انجمن کے ذریعے مسلمانوں کو دینی تعلیم فراہم کرنا تھا اور دینی علم کے ساتھ علوم مروجہ کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ یہ انجمن پاکستان بننے کے بعد بھی قائم رہی اور اس کے بڑے اہداف میں اہم ہدف کی تکمیل محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول کے قیام کا حصول تھا جو بعد میں کالج کی حیثیت سے مسلمانوں میں اپنی شناخت رکھتا ہے[۳۴]۔

۱۹۱۲ء میں ترکی پر جب بلقانی ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا تو اس موقعے پر ترک بھائیوں کی امداد کے لیے انجمن اسلامیہ امرتسر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا[۳۵]۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو انجمن اسلامیہ امرتسر کے زیر اہتمام ایک جلسہ مولوی نور احمد کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں علماء، وکلاء، رؤسا اور شہر کے سوداگران سمیت تیرہ ہزار لوگ شریک ہوئے۔ مولانا خسرو شاہ نے اپنے وعظ میں احکام الٰہی کی روشنی میں سامعین کو

نصیحت کی کہ وہ مصیبت کے وقت صبر و استقلال سے کام لیں۔اس جلسے میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں جن سے مسلمانانِ امرتسر کے دلی جذبات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے[۳۶]۔امیر حبیب اللہ جو انجمن اسلامیہ امرتسر کے سیکریٹری تھے انھوں نے اس موقعے پر کہا تھا کہ: سلطنت عثمانیہ جو اس وقت چاروں طرف بلاوجہ جنگ میں ملوث کی گئی ہے اس جلسے کو اس کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور حاضرین جلسہ سلطان المعظم کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمانان ہند اس عالم گیر ہمدردی میں برابر کے شریک ہیں جو عالم اسلام کو ایسے نازک وقت میں خلیفۃ المسلمین کے ساتھ ہونی چاہیے[۳۷]۔

چناں چہ اس انجمن نے چندے کی تحریک شروع کی اور ترک بھائیوں کی امداد کے لیے اس کام کو مزید تیز کر دیا گیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء تک آٹھ ہزار پچیس روپے اس فنڈ میں جمع ہو چکے تھے[۳۸]۔اس فنڈ میں جتنی رقم اکھٹی ہوتی تھی وہ سید امیر علی کو لندن میں ارسال کی جاتی تھی جہاں سے وہ رقم برطانیہ میں ترکی کے سفیر کو ارسال کر دی جاتی جو یہ رقم وزیر اعظم ترکی کے حوالے کر دیتے۔مثلاً ۱۳۱ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو تین سو پاؤنڈ اور ۷ نومبر کو دو سو پاؤنڈ سید امیر علی کو لندن روانہ کیے گئے[۳۹]۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا طبی وفد جب ترکی گیا تو بھی اس انجمن نے اس وفد کے ہم راہ پانچ سو روپیہ ارسال کیا[۴۰]۔

مسلمانوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں جس بے داری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے آنے والے وقتوں پر کئی فیصلہ کن اثرات مرتب کیے۔مسلمانوں کی یہ انجمنیں جو ہندوستان بھر میں قائم ہوئی تھیں اور ان انجمنوں نے دینی، سماجی اور تہذیبی حوالے سے خدمات انجام دے کر مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں بے داری کے نئے عنوانات کو جنم دیا۔اسی سلسلے کی ایک کڑی ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے قائم کی۔اس کے پہلے جلسے میں جو کہ لاہور میں منعقد ہوا اقبال نے بھی شرکت کی۔اس انجمن کے بانی میاں کریم بخش تھے اور ان کے تین صاحب زادوں نے بھی اس انجمن کے کاموں میں بہ نفس نفیس حصہ لیا[۴۱]۔

انجمن اتحاد ترقی مسلمانان پنجاب نے بھی پان اسلامزم کے حوالے سے کئی اہم سیاسی و علمی خدمات انجام دیں۔یہ انجمن لاہور میں مارچ ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی اور اس انجمن کے ذریعے متوسط طبقے کے نوجوانوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جس میں ان کی اخلاقی اور مالی حالت کو بہتر بنانا بھی تھا۔اس انجمن نے ملت اخبار میں مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ تمام تر معاملات زندگی میں بدیسی چیزوں کے بجائے دیسی چیزوں کو اپنائیں۔اس انجمن کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مولانا عبداللہ، مولانا محمد عظیم

نے اپنی تعلیمات کو عام نوجوانوں میں نہ صرف پھیلایا بلکہ ان کی اخلاقی حالت بھی بہتر بنائی۔اس کے ایک اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے بھی کی تھی۔ یہ اجلاس ۱۸ اپریل ۱۹۱۱ء میں ہوا جس میں خواجہ کمال الدین نے بھی تقریر کی۔اس انجمن پر انجمن مسلمانان دہلی کے اثرات نمایاں تھے اور اس نے ہندو بائیکاٹ کمیٹی بھی تشکیل دی تھی[۴۲]۔

مسلمانوں کی ایک اور بڑی انجمن، انجمن پنجاب لاہور ہے جو ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء میں قائم کی گئی اس انجمن کے قیام کے پیچھے حکومت وقت موجود تھی اس لیے دیگر انجمنوں کے مقابلے میں اس نے مصلحت سے کام لیا اور سیاسی میدان میں اس نے پنجاب کے مسلمانوں کی علمی لیاقت میں خاطر خواہ اضافہ کیا' چوں کہ اس وقت کے تمام بڑے علمی و ادبی رہ نما اس انجمن میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے اس لیے بہت جلد اس نے پورے ہندوستان میں جداگانہ حیثیت سے اپنا لوہا منوالیا۔

اس انجمن کے قیام کے اغراض و مقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیاء، لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ممالک کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔اس کے علاوہ برطانوی حکومت میں مسلمانوں کو سرکاری نوکری کی اعانت کرنے میں بھی اس انجمن نے اپنا کردار ادا کیا۔انجمن پنجاب لاہور مسلمانوں کے سیاسی حالات خصوصاً عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے لاتعلق نہیں تھی اس کے جاری کردہ اخبار انجمن پنجاب جو سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اس کے مندرجہ جات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے حالات پر بڑی کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی[۴۳]۔ دریائے ڈینیوب، مصلحات بلگیریا، زار روس، ترکی کی حالت یہ وہ تبصرے ہیں جو اس انجمن کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن کی جانب سے جاری کردہ یہ اخبار تحریک اتحاد اسلامی کے موضوع پر اپنے خاص نقطۂ نظر کو جو مصلحت پر مبنی تھا اسے مسلمانان ہند کے سامنے پیش کر رہا تھا[۴۴]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے اہم ترین پیش رفت ہندوستان میں بلقان کی تباہی کے بعد سامنے آئی۔جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو عالمی بین الاسلامیت کو فروغ دینے کے لیے آمادہ کر دیا۔لہٰذا مئی ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ نامی ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔عبدالباری فرنگی محل اس کے صدر تھے اور مشیر حسین قدوائی اور علی برادرز اس کے حامیان میں شامل تھے[۴۵]۔

ترکی اور عالم اسلام کے حالات نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا اس حالت میں اٹلی کی جانب سے

جاری کردہ یہ بیان کہ "ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نمٹ سکتے ہیں[۴۶]"۔ اس بیان نے مسلمانانِ برصغیر کو اور زیادہ مضطرب کر دیا تھا۔ لہٰذا انجمن خدام کعبہ کے حامیان نے دوسرے مقامات مقدسہ اور کعبہ کو غیر مسلموں کی جارحیت سے محفوظ کرنے کے لیے اس پلیٹ فارم سے ایک توانا آواز بلند کی۔ اس انجمن کے حامیان کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا جس کی انھوں نے سختی سے تردید کی تھی کہ تحریک اتحاد اسلامی کے سیاسی پروگرام کو آگے بڑھایا جائے۔ شواہد یہ بتاتے ہیں کہ انجمن مذکور ترکی کی مآخذ سے بے حد متاثر تھی[۴۷]۔

انگریزوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے ملکوں کو اپنی خواہشات اور حرص آز کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں کے باہمی دینی روابط و تعلقات کو درہم برہم کرنے کے لیے لگاتار جدوجہد کر رہے تھے تاکہ ان میں اختلاف و نزاع کی وسیع خلیج حائل کر دیں اور ان کی توانائیوں کو منتشر کر دیں[۴۸]۔ برطانوی استعمار نے اپنی لالچ اور دوسری استعماری قوتوں کی بھوک کو مٹانے کے لیے مسلم ریاستوں کے بخیے ادھیڑنے کی سازشوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

افغانی نے ایسے موقعے پر مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے کہا تھا کہ: "مسلمان چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، شمال کے ہوں یا جنوب کے متحد ہو کر ان مسائل کا مقابلہ کریں جن کا انھیں سامنا ہے"۔ افغانی کے اس نظریے کی انھوں نے مخالفت کی جو مقامی حکمران تھے اور اپنی عیاشیوں کی وجہ سے انگریزوں کے سامنے کھڑے ہونے کا ان میں حوصلہ بالکل نہیں تھا۔ افغانی نے کہا کہ: "یہ لوگ بالکل اس طرح ہیں جس طرح مسلمانوں کی گردنوں کے اطراف میں زنجیر ہے[۴۹]۔ مسلمان دانش وروں کو بالکل مایوس نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اڈرنا سے پشاور تک مسلمانوں کے علاقے ایک لڑی میں پیوستہ ہیں۔ جہاں پر لاکھوں مسلمانوں کی آبادی ہے اور یہ مسلمان طویل عرصے سے اپنی جرأت مندی کے حوالے سے شناخت رکھتے ہیں۔ اگر یہ مسلمان آپس میں متحد ہو جائیں تو ایک ایسا بند باندھ سکتے ہیں جو چاروں طرف سے مضبوط ہوگا"[۵۰]۔

ہندوستانی مسلمان چوں کہ افغانی کے فکر سے متاثر تھے اور پہلی جنگ عظیم نے برطانیہ اور خلافت عثمانیہ کو آمنے سامنے کر دیا تھا۔ ترکی نے روس کو اپنا حریف تسلیم کیا اور ترکی کے دوستانہ کردار کو برطانیہ اور فرانس نے حقارت سے رد کر دیا۔ فوجی سطح پر کمزور ہونے کی وجہ سے ترکی نے جرمنی، آسٹریا اور ہنگری سے اتحاد کیا تھا۔ اس موقعے پر ہندوستانی مسلمانوں کی انجمنوں نے یہ محسوس کیا کہ اب وقت آچکا ہے کہ اپنی قوتوں کو ہندوستان کی آزادی کے لیے مجتمع کریں[۵۱]۔

ہندوستانی دانش وروں کو یہ علم تھا کہ دین اسلام ہی وہ مضبوط زنجیر ہے جو مسلمانوں کی منتشر توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کرتی ہے اور ان کے پراگندہ اجزا کی تنظیم نو ہوتی ہے ان کے درمیان سے رنگ ونسل، قوم و وطن کے امتیازات وحدود کی چٹانوں کو پاش پاش کرتے ہوئے اسلامی شریعت ہی کے ذریعے حدود مقرر کرتی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمانان ہند کو ایک اسلامی مرکز پر جمع کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ ہندوستان میں عالم اسلام کے اتحاد کا خیال اصل میں کوئی سیاسی چیز نہیں تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت پر اس کا اثر محض مذہبی حیثیت سے تھا۔ اس لیے اتحاد اسلامی کی بحث کا سلسلہ خود بہ خود مذہب کی بحث اور اعتراضات سے جا ملتا ہے جو ہندوستان کے دل شکستہ مسلمان ترکوں پر مذہبی حیثیت سے کرتے تھے۔ اس لیے خلافت کے خاتمے کے بعد وہ کہتے تھے کہ ممکن ہے خلافت کا خاتمہ کرنے میں ترک حق بہ جانب ہوں مگر اس میں کون سی مصلحت تھی کہ انھوں نے اپنا مذہب، اپنا تمدن، غرض اپنی ساری امتیازی خصوصیات چھوڑ کر پرائی تہذیب اور معاشرت اختیار کر لی جس کو پوری طرح اپنانے میں غالباً کبھی کامیاب نہیں ہوں گے [۵۲]۔

ہندوستانی مسلمانوں میں ملت کا جو تصور ہے اس کی صحیح صورت حال اس وقت دکھائی دیتی ہے جب برادر اسلامی ملک پر کوئی افتاد پڑتی ہو۔ جنگ بلقان کے سلسلے میں ہلال احمر کے طبی وفد کی قیادت اور ان کے زخمیوں کی مرہم پٹی میں جس طرح ہندوستانی مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کی تاریخ نہایت طویل ہے [۵۳]۔ اردو اخبارات اور اردو مصنفین نے جس طرح عوام الناس کو بے دار کیا اور مسلمانوں کو ایک حرم کی پاسبانی کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اس کی نظیر شاید اس موقع پر کسی اور اسلامی ملک میں نہیں ملتی۔ الہلال نے شذرات کے کالم میں اخوت یا حق جہاد کے عنوان سے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ''بے شک ترک انسان ہیں اور نیز مظلوم، منصف اور نیک روح کے لیے ان کی مدد انسانی ہمدردی اور نوع پرستی میں داخل ہے لیکن ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ مسلمانان ہند کے لیے ان کی مدد نہ تو محض حق اخوت ہے اور نہ محض انسانی ہمدردی، بلکہ صریح اور بین طور پر حق جہاد اور قتال فی سبیل اللہ ہے [۵۴]''

ابوالکلام آزاد نے تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کلکتہ میں اتحاد اسلامی کے عنوان سے ایک تقریر کی، جس میں یورپ والوں کو یہ بتایا گیا کہ اسلام ایک عالم گیر اخوت کا داعی ہے، اور یورپ جس پان اسلامزم کو ہوا بنا کر مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ در اصل یورپ کی ریشہ

دوانیوں کا نتیجہ ہے اپنی تقریر میں وہ کہتے ہیں کہ:

> پان اسلامزم کا فرضی خطرہ جس غرض مخفی سے دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے بہت کم مسلمان ہیں جن کی نظر اس کی حقیقی علت پر ہوگی۔ اس خطرے کے اعلان پر بریت اور احتیاط کی کوشش بالکل بے فائدہ ہے کیوں کہ مسلمان پان اسلامزم کے جرم سے کانوں پر ہاتھ دھر دیں ان کو خود یورپ سے پوچھنا چاہیے کے مسئلہ مشرقی کی حقیقت کیا ہے [۵۵]۔

آزاد کا کہنا تھا کہ مسلمانوں میں پان اسلامزم کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اگر ہوتا تو یورپ کو کسی اسلامی ملک میں دست درازی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں اگر پان اسلامزم کا اصلی وجود ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ ہمارے سامنے ایران پر قیامت گزر جاتی، مراکش کا خاتمہ ہو جاتا، طرابلس میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتیں اور ہمارے قلوب میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوتی [۵۶]۔

یہ خیال کیا جاتا کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کو ترکی سے کوئی نسبت نہیں تھی جیسا کہ اس وقت کے یورپی محققین نے یہ بات کہی صریحاً غلط ہے۔ مسلمان فرماں روایان ہند کے ترکی خلافت کے ساتھ گہرے تاریخی مراسم موجود رہے ہیں کیوں کہ یہاں کے بادشاہ خلافت یا عالم اسلام میں مرکزیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا فخر سمجھتے تھے خصوصاً ترک خلافت سے تعلق کی بنیادیں صرف ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں بلکہ کئی سو سال پر محیط دکھائی دیتی ہے۔ فرانسیسی و برطانوی کش مکش کے موقع پر سلطان ترکی نے والئی میسور کو برطانوی قوم کی اعانت و طرف داری کا جو خط لکھا اور جس کا غیر معمولی اثر یہ ہوا کہ سرحد پر انگریزوں کے خلاف جو تحریک جہاد چل رہی تھی وہ دفعۃً خلیفۃ الاسلام سلطان روم کے خط کے اثر سے رک گئی [۵۷]۔

حیدر آباد دکن کی اسلامی ریاست میں بھی خلافت عثمانیہ کو اعلانیہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ سلطان عبدالحمید کی بیٹیاں نظام دکن کے بیٹوں سے بیاہی گئی تھیں۔ دکن کی مکہ مسجد سے لے کر چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعے کے خطبے میں نظام حیدر آباد دکن کے سامنے پہلے سلطان عبدالحمید کا نام لیا جاتا تھا۔ مکہ مسجد میں یہ نظارہ بھی پیش آتا کہ نمازیوں کی صف میں خود فرماں روایان مملکت نظام موجود ہوتا تھا اور اس کے سامنے خلیفہ اور خادم الحرمین الشریفین کے لیے دعائے خیر ہوتی اور ہزاروں زبانیں آمین پکارتی تھیں [۵۸]۔ اس واقعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند پر ترکی خلیفہ کے اثرات روحانی ہونے کے علاوہ سیاسی بھی تھے [۵۹]۔ اور اس سے اتحاد اسلامی کے جذبات کا بھی اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ جنگ روم و روس کے موقع پر خلافت عثمانیہ کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر ہندوستان میں جو کچھ لکھا گیا اس میں مذہبی عنصر کتنا کام کر رہا تھا اس کا اندازہ

ان فتوؤں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے جید علما کرام نے دیے تھے سیاسی تناظر اپنی جگہ مگر مسلمانان ہند نے ترکی کی عثمانوی حکومت کے ساتھ اپنے آپ کو جس نسبت سے جوڑے رکھا اس کی تہہ میں مذہبی عناصر کے گہرے اثرات موجود تھے[60]۔

پروفیسر ویمبری نے اپنی تصنیف مغربی تمدن اور مشرقی ممالک میں اتحاد اسلامی کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تحریک بظاہر عیسائی دنیا سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کی گئی لیکن یورپین وضع کے مسلمان اس تحریک کو اہمیت نہیں دیتے تھے[61]۔ان کا کہنا تھا کہ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی دنیا کے مختلف اجزا جو عالم اسلامی میں بے ترتیبی کا شکار ہیں کسی امر کے لیے مل کر کام کریں[62]، مگر ویمبری شاید اس تحریک کے حوالے سے پورے تناظر کو صحیح طریقے سے نہیں دیکھ سکے ان کا کہنا کہ یورپ کے مسلمان اس کو ضروری نہیں خیال کرتے مکمل طور پر غلط ہے کیوں کہ لندن میں پان اسلامک سوسائٹی یورپ میں موجود مسلم عوام کو اس تحریک سے وابستہ کرنے کے لیے ہی بنائی گئی تھی انھوں نے نہ صرف ترکوں کی مالی امداد جاری رکھی بلکہ ترکی تہذیب کو اپنانے کے لیے یورپ میں بھی ترکی ٹوپی کو فروغ دیا۔

افغانی نے بھی اپنے مقالے تعصب میں نشاندہی کی تھی کہ عرب، ترک، ایرانی، ہندوستانی، مصری اور مغربی مسلمان مذہبی طور پر جب اپنے کسی ساتھی کو مشکل میں پاتے ہیں اور خاص طور پر جب ان کا ملک ان سے چھن رہا ہو یا تقسیم کیا جا رہا ہو تو تقریباً تمام ممالک کے لوگ اس غم کو محسوس کرتے ہیں۔ افغانی نے اس کے برعکس رویے کی مثال دے کر مسلمانوں میں اتحاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں جنگ آزادی لڑی گئی تو افغانی مسلمانوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مدد نہیں کی اور جب افغانستان اور برطانیہ کے مابین ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۱ء میں جنگ ہوئی تو انھوں نے سیاسی سطح پر برطانیہ کے تسلط کے خلاف ایک مرکز کو تشکیل نہیں دیا لہٰذا آج ملت اسلامیہ جس افراتفری کا شکار ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان بھائی چارے کا اظہار ہو[63] اور مستقبل میں ملت کے تصور کو دوبارہ سے زندہ کیا جائے۔

افغانی کے مطابق کوئی مسلمان قومی یا لسانی اتحاد پر انحصار نہیں کر سکتا۔اس کا انحصار مذہبی بنیادوں پر تشکیل دیا جانا چاہیے تا کہ نسل پرستی کی مخالفت ہو[64]۔ کیوں کہ اتحاد اسلامی یورپین کی نظروں میں کتنا ہی خطرناک کیوں نہ سمجھا جائے مسلمانوں کے لیے جزو مذہب ہے جس کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسلامی

میت کا سنگ بنیاد اخوت اسلامی ہے جس کے سائے میں ہر ملک کا مظلوم مسلمان دم لے سکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یورپ کی موجودہ قومیت کے تخیل سے مستعار نہیں لیا گیا' اور نہ لیا جا سکتا ہے[۶۵]۔

ہندوستانی مسلمان چوں کہ نوآبادیات کا حصہ تھے اور افغانی کو یہ معلوم تھا کہ ہندوستان کی سرزمین میں تحریک اتحاد اسلامی کے پروان چڑھنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ انھوں نے اس تحریک کے حوالے سے حیدر آباد دکن میں کئی لیکچر دیے جس کے اثرات ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں نمایاں طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس تحریک کے حوالے سے کئی علمی و ادبی مضامین بھی منصۂ شہود پر آئے۔ خصوصاً سلطنت عثمانیہ سے دلی وابستگی جو ہندوستانی مسلمانوں کی ایک شعوری کوشش کا نتیجہ تھی مسلمان اس کا ادراک رکھتے تھے اور اردو مصنّفین نے مسلمانوں کو سلطنت عثمانیہ اور اس سے ملحق اسلامی ممالک کی تاریخ سے روشناس کرایا' اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی علمی و ادبی کام منظر عام پر آئے۔

مولوی انشاء اللہ خان نے تو اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا تھا ان کا تفصیلی تذکرہ آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ یہاں ایک اور اہم مصنف مرزا حیرت دہلوی کے کام کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی ہندوستان میں اپنی افتادِ طبع کے حوالے سے علی گڑھ اور دیو بند تحریک سے جدا تھے اور اپنی فکر کے شارح اور خاتم بھی خود ہوئے لیکن تحریک اتحاد اسلامی کے تعلق سے کئی اہم کام کیے جن میں ان کی شاعری بھی شامل ہے۔ انھوں نے روم و یونان کی لڑائی کے کامل حالات لکھے اس کے علاوہ قسطنطنیہ کی عینی کیفیت اور ہندوستانی مسلمان اس زمانے میں کن حالات سے دوچار تھے اس کا تجزیہ انھوں نے اپنی کتاب مضامین حیرت دہلوی میں جو ۱۹۰۴ء میں مطبع کرزن پریس میں طبع ہوئی بیان کیے ہیں[۶۶]۔ اس کتاب میں انھوں نے کریٹ یعنی اقریطش [۶۷] کی تباہی قسطنطنیہ یعنی اسلامبول [۶۸] کے حالات نہایت مفصل بیان کیے تھے۔ پھر مضامین کے اس مجموعے میں انھوں نے تاریخ شہنشاہان عثمانیہ کا بھی مفصل تذکرہ کیا تھا[۶۹]۔

کارزار تھسلی پر شاہ یونان نے جو بیان جاری کیا تھا اس کے جواب میں مرزا حیرت دہلوی نے ایک نظم بھی لکھی اس نظم کو پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ یونان کے بیان کو مفصل نقل کر دیا جائے۔

جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے جنگ چھیڑنے کی کوشش کی۔ میں خود اپنی فوجوں کو لے کے میدان

جاتا ہوں اگر یورپ نے میرے ساتھ دشمنی نہیں برتی تو پھر میں دیکھوں گا کہ وحشی ترکوں کو مجھ سے کون بچاتا ہے۔ ہم آج قسطنطنیہ کا راستہ لیتے ہیں اور آناً فاناً ترکوں کو تہہ تیغ کر کے قسطنطنیہ پر قابض ہو جاتے ہیں[70]۔

مرزا حیرت دہلوی نے اس بیان کے جواب میں جو نظم لکھی ہے اس کے بارے میں خود انھوں نے لکھا ہے کہ ''شاہ یونان کی تقریر کے جواب میں، ہم وہ نظم لکھ رہے ہیں جس میں شاعرانہ لطف کی تو کمی پائی جاتی ہے مگر اس میں یونانی رومی معاملات کے اتار چڑھاؤ کی عجب کیفیات دیکھنے کو ملیں گی''[71]۔ اس کا ایک بند ترکی سے محبت کا والہانہ اظہار ہے:

تو سمجھ بیٹھا تھا دل میں اے ذلیل بے ادب
ان کا حامی ان کا وارث کون اب
جس طرح چاہوں ستاؤں چاہے جو کچھ کروں
گھر جلاؤں جان سے ماروں جتنا ہوں توڑوں غضب
خبط تجھ کو تھا کہ ترکی ہے مریض ناتواں
دم نہیں باقی ہے اس میں ہو گئی ہے جاں بلب[72]

۱۸۸۷ء میں ترکی اور یونان کے درمیان جنگ میں نتیجہ ترکوں کے حق میں رہا' اس جنگ میں یونان کی حالت غیر ہو گئی، مگر یورپی طاقتوں نے ترکی کو فتح یابی کا لطف لینے نہ دیا' ساتھ ہی کریٹ جزیرے کو بین الاقوامی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس جنگ کے دوران ہندوستان میں اتحادِ اسلامی کے جذبات اور تیز ہو گئے۔ کانپور میں ترکی کی حمایت میں چندہ اکٹھا کیا گیا۔ جھانسی اور آگرہ کی مساجد میں ترکی کے سلطان کے لیے دعائیں مانگی گئیں' اردو اخبارں میں ترکی کے سلطان کو خلیفۃ المسلمین کہا گیا[73]۔

مرزا حیرت دہلوی نے اپنی اس کتاب میں ہندوستانی معاشرے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے آجانے سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین جو کش مکش برپا ہوئی اس کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر جو مسیحی مشنریاں کام کر رہی ہیں اس کے نتائج بھی اسلام کے حق میں جائیں گے اور اسلام کی فتح یقینی ہو گی[74]۔ اور یورپ کی تمام قہر سامانیوں کے باوجود اسلام کے تمدن کا آفتاب چمک اٹھے گا۔ سلطنتیں خواہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہوں اشاعت اسلام کے ذرائع کبھی معدوم نہیں ہوتے۔ مسلمانوں میں پائی جانے والی موجودہ نااتفاقی کو ختم کرنے کے لیے لکھا کہ ''اے نااتفاقی تیرا ستیاناس کہ مسلمانوں میں

میل جول نہیں ہونے دیتی اور اسلام جیسے سچے اور مستحکم مذہب کو بدنام اور کچا کر رہی ہے''۷۵۔

انھوں نے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے ایک نہایت دل سوز نظم لکھی جس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ ''یہ نظم اگرچہ شاعری کے دقائق اور باریکیوں سے کوئی علاقہ نہ بھی رکھے پھر بھی اس میں ایک جوش اور دل سوزی پائی جاتی ہے ایک پُر محبت اور پُر درد دل کا جوش ہے جو اس نظم میں ابلا ہوا ہے''۷۶۔اس کا ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے:

تری عظمت اور شوکت کے نمونے دیکھ کر
سکیاں بھر بھر کے رہ جاتے ہم با چشم تر
یاد ہے خیر القرون ترا ہمیں اے محترم
جس میں سب شاہ وگدا تھے بھائی بھائی ہم دگر
امتیاز دولت و ثروت نہ تھا ان میں ذرا
تو نے ان کو کردیا تھا اس طرح شیر وشکر۷۷

پھر موجودہ زمانے کے حالات کو پیش کرتے ہوئے حیرت دہلوی نہایت کرب کے عالم میں کہتے ہیں کہ:

نام لیوا تیرے گو سب ہو گئے زاروخوار　　شان اگلی سے نہیں اب ان میں باقی زنہار
ہے ندیم ان کی مصیبت اور غم ان کا جلیس　　بن گئی ہے بس پریشانی گلے ان کے ہار
خانماں بر باد کا نام و دل حرماں نصیب　　کور بخت و شوم طالع اور پریشان روزگار
سلطنت کے ساتھ کھو بیٹھے وہ کل اوصاف بھی　　ہائے بدبختی کہ تو روتا ہے ان پر زار زار۷۸

مرزا حیرت دہلوی کے علاوہ اور بھی کئی صاحبان علم وفضل عالمی حالات دیکھ کر یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ملت کے ساتھ وابستہ ہوکر برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور امت مسلمہ سے مسلمانوں کے تعلق کو استوار کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان خلافت عثمانیہ سے خود کو وابستہ کرلیں۔اسی نظریے کو تقویت بخشنے کے لیے مسلمانوں کے تنزل اور خلافت عثمانیہ کی تاریخ کو ہندوستان میں خصوصی موضوع بنایا گیا اور کئی اہم کتابیں اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ملی آبیاری کا باعث بنی ہیں۔

مطبع احمدی علی گڑھ سے البلاغ نامی ایک کتاب شائع ہوئی جس کے مصنف مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری تھے انھوں نے اس تصنیف میں مسلمانوں کے ملی انحطاط کو موضوع بناتے ہوئے

اسلام اور خلافت، اسلام وتمدن، اسلام وسیاست، اسلام وحرب اور خلافت پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

> جب سیاست سے ملت کا اثر کم ہوگیا بعض اصول جو مذہب نے بقائے وجود کے لیے ہمیں سکھائے تھے ہمارے ہاتھوں سے ایسے کھوئے گئے کہ پھر نہ ملے۔ چناں چہ یہ اتفاق واتحاد کا مسئلہ جب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو اس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوت جو ایک جگہ جمع تھی حصوں میں منقسم ہوگئی [79]۔

قاضی عبداللطیف نے تاریخ جنگ طرابلس مصور جس میں جنگ طرابلس اٹلی وترکی کی صحیح وچشم دید واقعات کو ابتدا سے آخر مارچ ۱۹۱۶ء تک مور خانہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ قاضی عبداللطیف دارلسلطنت کلکتہ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اس جنگ میں ترکی کو انگلستان سے مدد کی امید تھی لیکن برطانوی سامراج نے ایسا نہیں کیا اس لیے انھوں نے کہا کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے کہ ترکی بے یار ومددگار ہے [80]۔ اس جنگ کے حوالے سے جسٹس امیر علی نے لندن ٹائمس میں ایک مراسلہ بھیجا جسے اس کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔ امیر علی نے کہا ہے کہ:

> میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان موانست پیدا کرنے میں بہت دل چسپی رکھتا ہوں لیکن اٹلی نے طرابلس پر جو حملہ آوری کا اردہ کیا ہے اس سے بہت برے نتائج پیدا ہوں گے اور دونوں قوموں میں اتحاد ومسالمت کی کارروائی صدیوں کے لیے دور جا پڑے گی [81]۔

ایک کتاب تاریخ جنگ بلقان باتصویر شائع ہوئی مگر افسوس اس کتاب کے مصنف کا نام اس میں موجود نہیں۔ اس کتاب میں جنگ بلقان کو روزنامچے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور بلقان کے ان سپہ سالاروں کے بھی حالات اس کتاب میں موجود ہیں جنھوں نے اس جنگ میں مسلمان حکومت کو بچانے کی خاطر خواہ کوششیں کیں [82]۔

جنگ بلقان کے سلسلے میں ہندوستان کی سیاسی فضا میں اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات نے بھی مسلمانوں کے جذبات کی ہم نوائی کی تھی۔ کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں جو ترکوں کی حمایت میں میں منعقد ہوا تھا مشہور بنگالی لیڈر بپن چندر پال نے اعلان کیا تھا کہ ہماری ہمدردی ترکوں کے ساتھ ہے۔ اخبار بنگالی مورخہ ۲۳/ اکتوبر میں سرندر ناتھ بنر جی نے ترکوں کے ساتھ ہم دردانہ جذبات کا اظہار کیا۔ مسٹر تلک کے اخبار مرہٹہ میں مورخہ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو بھی ترکوں کی حمایت وتائید کے خیالات ظاہر کیے گئے۔ بمبئی میں عام طور پر ہندوؤں نے جنگ بلقان کے متعلق مسلمانوں کے ساتھ

ہمدری کا ثبوت دیا تھا [۸۳]۔

جنگ بلقان اور طرابلس واٹلی کی جنگ میں مسلمانان برعظیم نے جس اتحاد اسلامی کا ثبوت فراہم کیا اس کی مثال ایسی ہے جس پر جنوبی ایشیا کی تاریخ ہمیشہ ناز کرے گی۔ بالخصوص ترکی کے مسلمانوں کو جب کبھی کسی مشکل میں گرفتار پایا گیا تو مسلمانوں نے ایسی نادر خدمات انجام دیں جو حکومت برطانیہ کے لیے حیران کن تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو برعظیم میں اٹلی کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہو [۸۴]۔ برطانوی سامراج چوں کہ اس وقت ترکی کا رفیق تھا مگر اس کی دغابازی نے مسلمانان ہند کو مزید اشتعال میں مبتلا کر دیا۔

چناں چہ ہندوستانی مسلمانوں کا جو تعلق ترکی سے تھا اس کے مناظر دھندلے نہیں پڑے۔ ۱۸۹۷ء میں یونان نے جس جنگ کا آغاز کیا اس وقت بھی مسلمانوں نے چندہ کر کے ترکوں کی مالی امداد کی۔ ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان ہوئی تو ایک ایک مسلمان مضطرب ہو گیا اور کثرت سے مالی امداد کے لیے پورے ہندوستان میں چندہ مہم کا آغاز کیا گیا ایسے بھی لوگ تھے جو گھر بار چھوڑ کر اس کے لیے نکل گئے [۸۵]۔

جنگ بلقان کے زمانے میں جو ہیجان مسلمانوں میں پیدا ہوا' اور حرکت و عمل کے لیے مسلمانوں نے جس بے چینی کا اظہار کیا اس سے مسلمانوں کی عالم اسلام سے وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان شب و روز مضطرب تھے کئی نوجوان تو یہ چاہتے تھے کہ وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو کر جہاد کریں۔ چناں چہ فیاض علی ایڈووکیٹ نے ایک ناول شمیم لکھا جو مقبول ہوا۔ ان کا ہیرو آخر کار ترکی جہاد کے لیے چلا گیا [۸۶] اس جنگ کے دوران امیروں اور غریبوں نے دل کھول کر چندے دیے تا کہ کم سے کم یہ تو ہو کہ ترکان احرار کو مالی امداد ملے۔ مالی امداد فراہم کرنے کے لیے مسلمانوں نے خاص کلکتہ میں پان اسلامک سوسائٹی کی معروف شخصیت عبداللہ سہروردی کے ذریعے ریڈ کریسنٹ سوسائٹی قائم کی لیکن زیادہ تر امداد بالائی ہندوستان سے موصول ہوئی جہاں سے محمد انشاء اللہ اخبار وطن لاہور کے مدیر اور ظفر علی خان نے اچھی خاصی رقم ترکوں کے لیے فراہم کیں [۸۷]۔

صرف عوام الناس کا طبقہ ہی ترکوں کی مالی امداد نہیں کر رہا تھا بلکہ ترکوں کے سلسلے میں اچھے خاصے عطیات مشاہیر کی جانب سے بھی موصول ہوئیں جن میں بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم اور گولڑہ پنجاب کے پیر مہر علی شاہ نے بھی حصہ لیا۔ امیر علی نے مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ میں جب کہ وہ خود وہاں موجود

تھے ایک میڈیکل مشن کا اہتمام کیا' تا کہ یہ مشن طرابلس اور ترکی کے مجروحین کی مدد کرے [88]۔ ہندوستان میں سرکاری اداروں سے وابستہ افراد بھی اپنی وفاداریاں بالائے طاق رکھ کر اعلانیہ میدان میں کود پڑے۔ لکھنؤ کے ممتاز بیرسٹر مختار حسین نے امین آباد پارک کے ایک جلسے میں دل دہلا دینے والی تقریر کی [89]۔ مدراس کے مسلمانوں نے بھی اس پورے ماحول میں دل کھول کر تعاون کیا [90]۔

ترکوں نے صلیب احمر کے جواب میں ہلال احمر کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی تقلید میں ہر شہر میں ہلال احمر کمیٹیاں قائم ہوگئیں [91]۔ آغا غلام حسین ارشد جو اس کمیٹی سے وابستہ تھے انھوں نے ترکوں کی امداد کے لیے کئی نظمیں لکھیں جو اس وقت کے اخبارات اور رسائل میں چھپی ہیں لہٰذا تمدن اپریل ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں کہ:

> میں نے ایک مظلومہ کو ہلال احمر میں زخمی حالت میں دیکھا لہٰذا اس کی صورت حال نے مجھے نالہ جگر سوز نامی نظم لکھنے پر مجبور کر دیا ہے متذکرہ بالا نظم کو پیش کرتے ہوئے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس غریب کے لیے جو ہلال احمر کے شفاخانہ میں زیر علاج تھی نیز طرابلس کے دوسرے زخمی بھائی بہنوں کی امداد کے لیے جس قدر ممکن ہو سکے فراہم کر کے انجمن میں پہنچا دیں [92]۔

ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے لیے چندہ کی اپیل پر مسلمانوں نے کس طرح لبیک کہا اس کی مثال مولانا محمد علی کے ساتھی اور کامریڈ کے منیجر محفوظ علی نے لکھا ہے کہ:

> اپیل نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش شروع کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے ہیں اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا تھا [93]۔

کوئٹہ کے مسلمانوں نے ترکوں کی امداد کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا جہاں ایک غریب عورت اپنا کل اثاثہ امدادی فنڈ میں مع ایک خط کے دے دیا۔ اس نے لکھا:

> میں ایک غریب عورت ہوں اپنے کل اثاثہ کو جو میں نے اپنے قبضہ میں رکھتی ہوں مع اس کی فہرست اور قیمت کے روانہ کرتی ہوں، قیمت اس لیے درج کی گئی ہے کہ فروختگی کے وقت زیادہ نقصان نہ اٹھانا پڑے بالفرض محال اگر یہ کپڑے اچھی قیمت پر فروخت نہ ہوں تو دہلی میں معرفت ایڈیٹر کامریڈ ان کی فروختگی کا بندوبست کیا جائے۔ میرے پاس جو کچھ تھا دے دیا اب سوائے دعا کے کچھ نہیں [94]۔

یہ خط روزنامہ پیسہ اخبار لاہور میں ۲۸ نومبر ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا۔ اسی طرح ۸ مارچ ۱۹۱۲ کے کامریڈ میں مولانا ظفر علی خان نے اپنے ایک خط میں ایک سرحدی عورت کے جوش کا ذکر کیا جس نے

اپنے نو ماہ کے بچے کو ترکوں کی امداد کے غرض سے ''ہلال احمر'' کے حوالے کر دیا تھا جو ساٹھ پونڈ میں نیلام کیا گیا[۹۵]۔ برطانیہ پر دباؤ بڑھانے کی غرض مسلمانوں کے رہ نماؤں اور رسالوں نے نو آبادیات کے خلاف احتجاج کو فروغ دیا۔ سید فقیر حسن جو کہ ایک مفتی تھے انھوں نے ایک جہاد نامہ جاری کیا جس میں مسلمانوں کی تعریف و توصیف کی گئی۔ اینگلو انڈین اور ہندی صحافت تحریک اتحاد اسلامی کے بارے میں تنقید پر مبنی رہی۔ ان میں بعض اخبار و رسائل نے یہاں تک کوشش کی کہ ہندی مسلمانوں کو اس احتجاج سے دور رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اخبار و رسائل کے مضامین میں مسلمانوں کے رویے کی حوصلہ شکنی نظر آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمان سلطنت عثمانیہ کا حصہ ہونے کے باوجود خلافت عثمانیہ کی بقا کی جدوجہد کرتے رہے۔ یہاں تک کے جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ترکی کے معاملے میں ہندی مسلمانوں نے ہمیشہ تحفظ اسلام اور تحفظ خلافت مرکز اسلامیہ کا معاملہ سمجھ کر اپنے مذہب، اپنی زندگی اور اپنے وجود و بقا کا معاملہ جان کر تمام خطرات مول لیے[۹۶]۔

ہندوستان میں یورپی مصنوعات کے بائیکاٹ کو مسلم لیگ اور تجارت سے وابستہ افراد فضل بھائی، کرم بھائی اور ابراہیم رحیم تولا نے اس کو کامیاب بنانے میں اپنا کردار ادا کیا[۹۷]۔ طرابلس کا تنازعہ ایرانی سوال کے ساتھ شامل ہو گیا جو شمالی ایران میں تھا۔ شیعہ اور سنی اس پورے معاملے میں ایک مرکز پر متحد دکھائی دیتے تھے پھر مشہد میں امام علی رضا کے مقبرہ پر بمباری نے بھی تحریک اتحاد اسلامی کو کئی زاویوں سے فروغ دیا لہذا کلکتہ میں پر شین ریڈ کریسنٹ سو سائٹی قائم ہوئی جسے آغا خان نے تنہا پانچ ہزار روپے دیے۔ برٹش حکومت کو روس کو رضا مند کرنے کے لیے بلایا گیا کہ وہ جارحیت کو روک دیں اور اپنے فوجیوں کو ایران سے ہٹالیں[۹۸]۔

اس سیاسی تہذیبی مطالعے سے یہ دکھائی دیتا ہے کہ اسلام مسلمانوں کے جذبہ اتحاد کو تقویت بخشتا ہے۔ افغانی کے اثرات نے ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کو عالمی سطح پر روشناس کرایا، ہندوستانی دانش ور خواہ کتنا ہی اس تحریک سے اختلاف کریں مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی حیثیت کو عالمی سطح پر تسلیم کرایا بلکہ کئی مسائل ایسے تھے جن کی بازگشت عالم اسلام میں اس تحریک کی وجہ سے ہوئی اور پھر دنیا نے ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کو عالمی حیثیت میں تسلیم بھی کیا۔

فری میسن، جمال الدین افغانی اور ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ

In the preface to his Poetical Works (London, 1914) W.S. Blunt wrote:
No life is perfect that has not been lived; youth in feeling,
manhood in battle, and old age in meditation.
His eventful life was the concrete embodiment of this precept[99]۔

ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ (*Wilfrid Scawen Blunt*)، جمال الدین افغانی سے گہرے روابط کی وجہ سے عالم اسلام میں ایک ہم درد سیاست دان تصور کیا جاتا ہے۔ اُس زمانے کے دانش ورانِ علم وادب بلنٹ کو آزادی کی تحریکوں کا دوست اور ہم درد قرار دیتے ہیں۔ خصوصاً مصر کے محبانِ وطن ان کے گرویدہ تھے۔ مگر بادی النظر میں بلنٹ کی کوششوں کا جائزہ لیا جائے، تو عالم اسلام میں انیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں قومیت اور وطنیت کی تحریکوں کو کامیاب بنانے اور اسلامی ممالک کو اسلام کے مرکزی دھارے سے علیحدہ کر کے جغرافیائی اور وطنی قوتوں میں بانٹنے کا کام اور دیگر شخصیات کے علاوہ بلنٹ نے بھی انجام دیا ہے۔ جمال الدین افغانی کی سرگرمیوں اور کاوشوں سے بلنٹ نہ یہ کہ صرف باخبر تھا بلکہ قریبی روابط کی بنا پر باہم ایک دوسرے سے مشورے بھی کیے جاتے تھے۔

بلنٹ نہایت زیرک سیاست دان اور گوناگوں صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو ہمہ جہتی بنیادوں پر عالم اسلام پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اعلیٰ سیاست دان ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کا اچھا شاعر بھی تھا، کئی زبانوں میں مہارت رکھنے کے علاوہ عربی اور فارسی میں بے باکانہ اظہار کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

بلنٹ برطانیہ کے ایک معزز خاندان کا رکن تھا۔ اس نے عالم اسلام میں مہدی سوڈانی کی تحریک کو افغانی کے ساتھ مل کر کافی حد تک ناکام بنایا۔ *A. J. Afghani and Freemasonry in Egypt* Albert Kudsi-Zadeh کا مضمون ہے اس میں اس بات کے کافی شواہد ملتے ہیں[100]۔ حقیقتاً افغانی کے

تعلق کی بنا پر وہ عالم اسلام میں اپنی ساکھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔اس کی کئی کتابیں پہلی جنگ عظیم اور اس کے بعد کے حالات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ خصوصاً The Future of Islam میں خلافت اور اس کے بعد کے حالات پر تاریخی شعور کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تجزیہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس کتاب کا ترجمہ اکبرالہ آبادی اور مولوی انشاءاللہ خان نے کیا ہے[۱۰۱]۔

ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ ۱۸ برس کی عمر میں برطانیہ میں سفارتی محکمے میں داخل ہوا اور بارہ برس تک پوری قابلیت کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۱ء تک عراق، شام، عرب اور ایران وغیرہ کی سیاحت کی۔۱۸۸۲ء میں مصر کی قومی تحریک سے خود کو ایک طرح سے وابستہ کرلیا۔۱۸۸۳ء-۱۸۸۴ء میں ہندوستان کا سفارتی دورہ بھی کیا اور اس دورے کے حالات اپنی ایک روز نامچے India under Ripon: A Private Diary میں نہایت مبسوط انداز میں تحریر کیا ہے۔

عربوں کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔اسے عربی گھوڑوں سے محبت تھی اور اس کے اصطبل میں عربی گھوڑے موجود رہتے تھے۔اس کی بیوی انگلستان کی مشہور شاعر بائرن (Lord Byron) کی نواسی تھی اور خود بھی عربی زبان کے ماہرین میں تصور کی جاتی تھی۔شبلی نعمانی بھی اس کے مداح تھے[۱۰۲]۔یہ دونوں اپنے رنگ میں آپ اپنی مثال تھے۔بلنٹ کی کتابیں Secret History of the English Occupation of Egypt، Gordon at Khartoum اور The Future of Islam خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔۱۸۸۸ء میں وہ گیلوے Kilmainhan میں ایک آئرش سے سیاسی ملاقات کے نتیجے میں جیل میں دو ماہ کے لیے قید کیا گیا۔اس نے اپنے اس تجربے کو ایک سانیٹ کے ذریعے پیش بھی کیا ہے۔بلنٹ ایک خوب صورت اور خوبرو انسان تھا علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دل چسپی لینے کی وجہ سے کئی عورتوں سے اس کے روابط تھے۔جسے اس نے اپنے روزنامچے Secret memoirs میں بیان بھی کیا ہے۔

۱۸۵۸ء میں سفارتی سروس میں داخل ہونے کے بعد اس نے عرب ممالک کا سفر کیا۔اس کی اخلاقی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔اس نے سوڈان میں برطانوی پالیسی کی مخالفت کی اور مصر میں قومی حمایت کی۔ہندوستان میں ۱۸۸۴ء میں جب اس نے سرکاری دورہ کیا تو برطانوی نوآبادیات کے مقابلے میں Self Government کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو اس کی کتاب India under

Ripon: A Private Diary میں موجود ہے۔ وہ اپنے اس روزنامچے میں لکھتا ہے کہ:

جب کوئی شخص کسی دیسی دربار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور آداب و درجات کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو گویا وہ قدیم حکومت کی روایت کے بارے میں جس کا مدراس اور بنگال میں عرصہ ہوا خاتمہ ہو چکا ہے ایک ایسی بات سیکھ لیتا ہے جو سیکڑوں کتابوں سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کے اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ گزشتہ زمانے میں حاکم اور محکوم کے تعلقات کس قدر خوشگوار تھے۔ شہزادوں کا عام لوگوں سے کس قدر گہرا تعلق تھا اور ہر ذات اور مذہب کو جو درجہ حاصل تھا اس میں کتنی وسعت پائی جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہندو برہمن اور مسلمان امرا جیسے دو مختلف عناصر ایک ہی نظام کے ماتحت کیسی زبردست فطری زندگی بسر کرتے تھے۔ محض تاریخ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کون سی وجہ تھی کہ لکھنو کا ایک مسلمان کسی راجپوت شہزادے کی فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا جاتا ہے یا نظام دکن کے یہاں کوئی ہندو مدبر وزارت کے عہدے پر فائز ہو جاتا تھا۔ خالصتاً دیسی عدالتوں کو دیکھنے کے بعد یہ رائے رکھنا ناممکن ہے کہ ہندوستانی حکومت کرنے قابل نہیں[۱۰۳]۔

The Future of Islam ایک ایسی کتاب ہے جس کو عالم اسلام میں کافی سنجیدگی کے ساتھ لیا گیا۔ اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کا نہ صرف مطالعہ کیا' بلکہ اس کے متعلق صائب رائے بھی دی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے بلنٹ سے ملاقات میں اردو ترجمے کی بابت اُسے آگاہ بھی کیا۔ بلنٹ اپنی ڈائری لارڈ رپن کا عہدِ حکومت میں لکھتا ہے کہ:

جمال الدین افغانی کے پانچ مرید میری کتاب مستقبل اسلام کے متعلق اظہارِ ہمدردی کی غرض سے آئے یہ سب کے سب نوجوان طالب علم ہیں اور انگلستان سے نفرت رکھتے ہیں۔ جب انھیں جمال الدین کا عربی خط دکھایا تو انھوں نے اسے بوسہ دیا، مذہب کے متعلق ان سب کے خیالات آزادانہ ہیں۔ یہ سب کچھ افغانی کی تعلیمات کا اثر ہے۔ یہ نوجوان نہایت دلیری کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں جو مجھے پسند ہے[۱۰۴]۔

اکبر الہ آبادی سے ملاقات کے احوال میں بلنٹ کا کہنا ہے کہ: ''اکبر حسین آئے اور مستقبل اسلام کے ترجمے کے متعلق کچھ باتیں کیں' وہ نئے دیباچے سے بالکل مطمئن ہیں جسے کل میں نے ان کے حوالہ کر دیا، لیکن میں ان حصوں کو خارج کر دوں گا جو ذاتی طور پر سلطان عبدالحمید سے متعلق ہیں''۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں نے یہ کتاب اپنے دوستوں کو دکھائی تھی ان پر بے حد اچھا اثر ہوا ہے۔ ان میں سے ایک مذہبی امور سے قطع تعلق کر چکے تھے مگر اسے پڑھتے ہی پھر نماز، روزہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اردو ترجمہ کو بہت مقبولیت حاصل ہو گی، میں نے ان سے کہا کہ میرا قسطنطنیہ جانے کا ارادہ ہے جہاں میں

سلطان المعظم سے مل کر پین اسلامک سیناڈ(Pan Islamic Synad)اسلامی اتحاد کو ترقی دینے والی جماعت قائم کرنے کا مشورہ دوں گا، ہم دونوں اس امر پر متفق تھے کہ مصر میں اسلام کی شکست کے بعد اب کسی زیادہ حقدار خلیفہ کے منتظر رہنے کی ضرورت نہیں ہے، جو بات دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ کا کام جن ہاتھوں میں ہے وہ جدید گروہ سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ قدیم خیال کے مسلمان ہیں‘‘[۱۰۵]۔

اس اقتباس میں حیران کن بات یہ ہے کہ مصر میں برطانوی قبضے کو بلنٹ اسلام کی شکست قرار دیتا ہے اور نظامِ خلافت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔Pan Islamic Synad کو قائم کرنے کا منصوبہ بنانا اور اس سلسلے میں عبدالحمید کو راضی کرنے کا خاکہ تیار کرنا یہ دو ایسی متضاد باتیں ہیں جس سے اس کی ڈپلومیسی یا چال بازی ظاہر ہوتی ہے۔

بلنٹ نہایت کو حیرت اس بات کی ہے کہ The Future of Islam کو جن لوگوں نے ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں روشناس کرایا وہ جدید انداز خیال کے نہیں بلکہ قدیم فکر کے ماننے والے ہیں پھر بھی اس کتاب کو پسند کرتے ہیں۔ بلنٹ جب علی گڑھ گیا تو سید احمد خان نے بھی اس سے کہا کہ میں آپ کی کتاب کے پانچویں باب (England's Interest in Islam) سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں[۱۰۶]۔

علی گڑھ سے وابستہ ڈاکٹر سید محمود کی انگریزی تصنیف Khilafat and Islam اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصنیف اس زمانے میں سامنے آئی جب برطانیہ نے ایران میں بلیوجیکٹ فوج اتار دی تھی۔ ڈاکر سید محمود کو ولفرڈ بلنٹ نے بلایا اور کہا کہ انگریزوں کے اس اقدام کی مذمت کرنی چاہیے۔ چناں چہ ایک احتجاجی جلسہ بلایا گیا۔ جس میں دو ہزار ہندوستانی مسلمان اور انگریز شریک ہوئے۔ سید امیر علی بھی اس وقت برطانیہ میں تھے انھیں بھی مدعو کیا گیا مگر انھوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا[۱۰۷]۔ ڈاکٹر سید محمود نے پروفیسر براؤن (E.G Brown) کی مدد سے ایک ریزولیوشن تیار کر کے بلنٹ کو دکھائی وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے براؤن انگریز کو نہیں جانتا یہ پھسپھسا ہے انگریزوں کی سخت مذمت کرو۔ گالیاں دو تب اس پر اثر ہوگا۔ بہر حال جلسہ ہوا اور ڈاکٹر سید محمود اس جلسہ کے روح رواں تھے۔ انھوں نے بلنٹ کی ترمیم کے ساتھ دوسری قرارداد اس جلسے میں پیش کی اور شرکا جلسہ اس سے بے حد خوش ہوئے[۱۰۸]۔ Times of London نے اسے ملک کے شہریوں کی مملکت سے عدم وفاداری قرار دی[۱۰۹]۔

تحریک اتحاد اسلامی، جمال الدین افغانی اور بلنٹ کی شخصیت کا مطالعہ کئی اسرار سے بھرا ہوا ہے۔ جس

پر نظر پڑتے ہی شکوک وشبہات جنم لینے لگتے ہیں۔ مصر میں جاری مہدی سوڈانی کی تحریک کو افغانی نے کافی حد تک اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ مہدی کے بیش تر رفقاء کار افغانی کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی حیثیت ایک بلند پایہ مصلح کی سی تھی۔ جب جنرل گارڈن (Gordon) خرطوم میں مہدی کی سپاہ کے سامنے بالکل پسپا ہو چکا تھا تو اسے ان حالات سے بچانے یا باہر نکالنے کی پیش کش افغانی نے بلنٹ کو کی تھی۔ افغانی اور بلنٹ کے مابین جو خطوط ہیں ان کا مطالعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے، یہ خطوط زیادہ تر فرانسیسی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ۲۱ اپریل ۱۸۸۴ء کو افغانی پیرس سے بلنٹ کو خط لکھ رہے ہیں کہ:

> اگر چہ مجھے اپنے مصر کے دس سالہ قیام میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ مسٹر گارڈن اپنی سوڈان کی گورنری کے زمانے میں آزادی کے حامی اور اسلام کے رفیق ومحافظ رہے ہیں تاہم جو بھروسہ مجھے آپ کی باتوں پر ہے اس کا خیال رکھتے ہوئے میں ان کے افسوس ناک انجام پر بلا تامل ہمدردی کرتا ہوں، اور اس امر کے متعلق اپنا دلی رنج ظاہر کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسی صورت حال میں گرفتار ہو گئے جو دن بدن نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں آپ سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ اس اعتماد پر نظر رکھتے ہوئے جو مہدی اور اس کے بڑے بڑے ساتھیوں کو جن میں سے اکثر میرے سوڈانی شاگرد رہ چکے ہیں، میرے لیے یہ امر آسان تھا کہ میں اس مصیبت سے گارڈن پاشا کو رہائی دلوا دیتا جو ان پر منڈلا رہی تھی[110]۔

ان دونوں صاحبان کے درمیان سوڈان ومصر کے مسائل پر خط کتابت اور اپنی سرگرمیوں کی تفصیلات کا تبادلہ کرنا اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ افغانی اور بلنٹ دونوں نظریاتی اعتبار سے عالم اسلام کے حوالے سے یکساں سوچ کے حامل تھے، اور اس بات کے کہنے میں ذرا بھی شک وشبہے کی گنجائش نہیں رہتی کہ افغانی کے مقاصد مسلم اقوام میں قومیت کو فروغ دینا تھا۔ افغانی مصر میں ۱۸۷۰ء کے واقعات کے بعد اپنے اثر ورسوخ کو پھیلانے میں زیادہ کامیاب رہے۔ مصر کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور انتظامی امور میں خدیو اسماعیل کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں اس سے یورپی اثر ورسوخ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں خزانے کو دیوالیہ قرار دے دیا گیا اور قرض دار ممالک کے ذریعے مالی کنٹرول کا نظام نافذ کیا گیا[111]۔ افغانی کے دائرے میں بہت سے نوجوان شامل ہو گئے جو یہ سمجھتے تھے کہ افغانی مصر میں قومی شعور بیدار کریں گے[112]۔

یہی وہ زمانہ ہے جب افغانی نے مصر میں اپنی سیاسی حیثیت کو منوایا اور فری میسن تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ادیب اسحاق کے الفاظ میں افغانی نے مصریوں کو ذلت سے بچانے کے لیے اس تحریک سے خود کو وابستہ کیا تھا۔ انھوں نے جب مصر کی گرتی ہوئی حالت کا مشاہدہ کیا تو خود کو اس تحریک سے دور نہ رکھ

سکے[۱۱۳]۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب رشید رضا اور مفتی عبدہٗ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ افغانی نے کیوں فری مسنری تحریک سے خود کو وابستہ کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ سیاسی اور سماجی مقصد کے لیے خود کو اس تحریک کا ممبر بنایا[۱۱۴]۔

فری مسنری تحریک کے ساتھ افغانی کا پہلا تعلق ۱۸۷۵ء کا ایک خط ہے جس میں انھیں اس تحریک کے مصر کے Chapter میں داخل کیا گیا تھا[۱۱۵]۔ یہ خط Chapter کا نام ظاہر نہیں کرتا ہے لیکن اس بات کی شناخت ضروری نہیں ہے کیوں کہ افغانی نے جلد ہی کئی Lodges (فری مسنریوں کے بیٹھنے کی جگہ) سے خود کو وابستہ کر لیا تھا۔ دوسرے دستاویزات اس بات کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ افغانی کو کئی میٹنگوں میں بلایا گیا جب وہ مصر چھوڑ کر چلے گئے تھے[۱۱۶]۔

فری مسنری تحریک کو وادیٔ نیل (Nile Valley) کے مقام پر فرانسیسی فوج کے افسران نے متعارف کرایا۔ محمد علی پاشا کے دور حکومت کے دوران فرانس کے Grand Orient کی حدود میں اس تحریک کے کئی Chapter (مراکز) قائم کیے گئے۔ ۱۸۶۰ء تک فرانس میں قائم مراکز نے ان ممالک کے حدود میں کئی اور مراکز قائم کیے۔ فرانس، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، اٹلی، جرمنی اور یونان، رابرٹ فریکے گولڈ (Robert Freke Gould) نے ۱۸۶۲-۱۸۶۸ء کے دوران تنہا انگلستان کی یونائٹیڈ گرینڈ لاج میں ۸ لاجز قائم کرنے کے بارے میں مطلع کیا ہے[۱۱۷]۔

افغانی ایک رہنما ممبر کی حیثیت سے کوکب شرق (Star of the East) کے رکن تھے۔ ان کا نمبر ۱۳۵۵ تھا جو ۱۸۷۱ء میں قاہرہ کے مقام پر قائم کی گئی تھی اور یہ انگلستان کی یونائٹیڈ گرینڈ لاج سے منسلک تھی۔ محمد صابری کے مطابق قاہرہ میں برٹش وائس کونسل رافیل بورگ (Raphael Borg) خود بھی ایک میسن تھا جس نے افغانی اور ان کے عقیدت مندوں سے کہا کہ: 'اب آپ فری میسن کا حصہ ہیں'، جلد ہی مصر کے Chapter میں بہت سے رکن بنا لیے گئے جس میں توفیق پاشا (۱۸۵۲ء-۱۸۹۲ء) جو خدیو اسماعیل کا بیٹا تھا، شریف پاشا، بطروس غالی پاشا، سلمان پاشا، محمد عبدہٗ، سعد زاغلول پاشا، مصر کے آرمی کے افسران جیسا کہ لطیف بے سلیم، سید نصر، ممبران پارلیمان اور کئی علما بھی اس تحریک سے منسلک ہو گئے[۱۱۸]۔ قدسی زادہ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ:

حالیہ دنوں میں سامنے آنے والی دستاویز میں ایک دعوت نامہ افغانی کے لیے جس پر ۲۴ رجنوری

۱۸۷۷ء درج ہے جس میں انھیں ایک غیر معمولی سیشن میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سیشن کے بعد جنوری میں انھیں ۱۸۷۸ء کے لیے Lodge کا صدر منتخب کرلیا جاتا ہے جب ان تاریخوں اور ان کی نوعیتوں پر غور کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ افغانی نے ۱۸۷۶ء میں کوکب شرق میں شمولیت اختیار کی تھی[۱۱۹]۔

افغانی کے اس رویے کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اتحاد اسلامی کا نعرہ کیوں بلند کیا اور پوری مسلم دنیا میں اس تحریک کو پھیلانے کے وہ کون سے اسباب تھے؟ اور کن معاملات کو مدنظر رکھ کر پان اسلامزم کو ساری دنیا میں فروغ دیا گیا۔ اگر گہرائی کے ساتھ اس تحریک کو جس کے اثرات مسلمانوں کی ملی زندگی کے کئی گوشوں پر دکھائی دیتے ہیں مطالعہ کیا جائے تو یقیناً اس تحریک کی بنیادیں افغانی سے پہلے بھی عالم اسلام میں موجود تھیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں عالم اسلام جن حالات سے دوچار تھا اس میں اتحاد اسلام کی آواز کا برپا ہونا ایک فطری عمل تھا۔

افغانی کی سحر آفریں شخصیت اس آواز کو دنیا میں مشہور کرنے کے لیے برطانوی حکومت کے نزدیک اہم ترین آلہ تھی، اس طرح یہ آواز برطانیہ کی دسترس سے باہر کی آواز نہیں تھی، چہ جائے کہ افغانی کے علاوہ اس تحریک کا علم بردار اگر کوئی اور شخص ہوتا تو استعماریت مشکلات کا شکار ہوسکتی تھی۔ اور خلافت عثمانیہ کو ایک مخلص رہنما مل جاتا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں حقیقی اتحاد کی فضا قائم کرنے میں کافی معاونت ملتی اور قومیت کا زہر جو در پردہ فری مسنری تحریک کے لوگ انجام دے رہے تھے اس کو بھی شدید خطرات لاحق ہو جاتے۔

افغانی کی آتش بیاں طبیعت اور عالمی اثر پذیری نے اتحاد اسلامی کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا، مگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم اسلام میں لبرل ازم، جدیدیت اور قومیت کی جتنی تحریکیں انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ظاہر ہونی شروع ہوئیں کم وبیش ان سب کا آغاز افغانی ہی کی اصلاحی فکر سے تخلیقی رشتہ رکھتی ہیں[۱۲۰]۔ ایران میں داخلی طور پر علماء کے خلاف نفرت کے جذبات کا ابھرنا اور خارجی طور پر مغربی تسلط کے خلاف ردعمل کا آغاز، ترکی میں اصلاحات کے مطالبوں میں تنظیم، مصر میں برطانوی تسلط کے خلاف منظم تحریک اور ان سب کو ایک لڑی میں پرونے والی اسلامی قومیت کے تصور کی مقبولیت، یہ سب افغانی کے تصورات کی عملی شکلیں تھیں[۱۲۱]۔

افغانی نے بادی النظر میں اسلامی قومیت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ مختلف جغرافیائی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ظاہر ہوا۔ جیسے ایران میں ایرانی مسلمان، ترک سے ترکی مسلمان، یمن سے یمنی مسلمان۔ اصل

میں افغانی لبرل تحریکوں سے متاثر تھے اور انھوں نے اسلامی تصورات کو اسی انداز فکر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ ہی اسلامی قومیت مشرق وسطٰی میں عرب قومیت میں تبدیل ہوگئی اور یہ پورا خطہ مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر اپنی واحد اسلامی شناخت کھو بیٹھا۔

بلنٹ ہمیشہ سے خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش میں اپنی سرگرمیاں عالم اسلام میں قدامت پسند حلقوں میں کیا کرتا تھا۔ مثلاً سید احمد خان کے گروہ میں ''مولوی چراغ علی جنھیں پرانے مسلمان نیچری کے لقب سے یاد کرتے ہیں وہ بلنٹ کے خیال کی تائید اس لیے کرتے ہیں کہ مستقبل اسلام میں جن سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کا خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ان کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ سلطان المعظم اور خلیفۃ المسلمین ان کو عملی جامہ پہنائیں گے''۔ بلنٹ کا کہنا ہے کہ ''ان کی موجودہ رائے اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے قسطنطنیہ کی کبھی سیاحت نہیں کی، ورنہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ توقع کس قدر ناامیدی سے بھری ہوئی ہے''[۱۲۲]۔ بلنٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> عبدالحمید دمشق یا بغداد کو اپنی آئندہ خلافت کا پایہ تخت خیال کرتا ہے مگر بعض قاہرہ کو اس کا نیا صدر مقام سمجھتے ہیں اور دور اندیش مسلمانوں کو اب یہ صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر واپسی کا سفر شروع ہوا تو اور بھی آگے جانا پڑے گا یعنی مذہب کا اصلی صدر مقام عرب میں ہے جو اس کا زاد بوم اور اس کے الہام کا سرچشمہ ہے دنیا بھر میں یہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہبی بادشاہت کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی شرائط پائی جاتی ہیں۔ عرب میں عیسائی، یہودی اور کسی قسم کے کافر نہیں جن سے اسلام کو مقابلہ کرنا پڑے نہ ہی ایسا زرخیز ملک ہے کہ اس کو دیکھ کر مغربی دول کے منہ میں پانی بھر آئے، وہاں خلیفہ کو کسی فرنگی یا فرانسیسی سفیر کی تنبیہ کا اندیشہ نہ ہوگا وہ جیسا کہ پیغمبر کے جانشین کے واسطے شایان ہے آزادانہ کارروائی کر سکے گا اور وہاں اسلام تمام آلائشوں سے پاک ہوگا پس غالباً آئندہ خلافت مدینہ یا مکہ واپس آئے گی[۱۲۳]۔

اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ: شریف جو اپنے مقدس خاندان سے تعلق کی بناء پر ترکی خلفاء کو عجمی اور کذاب خیال کرتے ہیں اور سلطان حجاز کو خزانے پر بوجھ سمجھتے ہیں ان میں سے ہر کوئی دوسرے سے نفرت کرتا ہے۔ اگر یہ تعلق ایک ضرورت کے تحت نہ ہوتا تو وہ بلا شبہ بہت پہلے وہ اس تعلق کو ختم کر دیتے۔ شریف مکہ سلطان حجاز کا اس لیے لحاظ کرتا ہے کہ اس کو محافظ اور اوقاف کی آمدنی کی ضرورت ہے۔ سلطان حجاز شریف پر اس لیے اعتماد کرتا ہے کہ حجاز میں اس کی حمایت کے بغیر خلافت پر حق تسلیم نہیں کروایا جاسکتا۔ الغرض اسلام کے لیے مکہ کی سرزمین خلیفہ سے بھی زیادہ ضروری ہے اور جو شخص وہاں بادشاہ

ہے وہ فطری طور پر اسلامی دنیا کا بادشاہ ہے[۱۲۴]۔

خلافت عثمانیہ سے بلنٹ کی نفرت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں وہ عرب دنیا پر عثمانوی قوت واثر پر نہ صرف گہری توجہ رکھتا تھا بلکہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے برطانوی حکام کو اس کی صورت حال سے باخبر کرتا رہا وہ لکھتا ہے کہ:

> سلطان عبدالحمید کے زیر اثر صرف چند مقامات اس خطے میں ہیں اور ترکوں کے قلعے میں کم سے کم بیس ہزار ترکی فوجی رکھنی ضروری ہے۔ اگر عثمانوی ساحل پر قابض نہ ہوتے تو ترکی فوج ان مقامات پر مدت تک قابض نہ رہ سکتی۔ ان جگہوں پر ہر روز بغاوت کی خبریں مجھے موصول ہوتی ہیں اور قسطنطنیہ میں کمزوری کی خفیف علامت نمودار ہونے پر عرب کے اس حصے میں فوراً آزادی کی جنگ شروع ہو جائے گی[۱۲۵]۔

بلنٹ اور افغانی کی سوچ میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے وہ خود بلنٹ کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس نے مصر کے انقلاب میں بڑھ چڑھ کر مصریوں کا ساتھ دیا۔ لکھتا ہے کہ "مجھے بلا شبہ اس امر سے بے انتہا مدد ملی کہ انقلاب مصر میں، میں نے مصریوں کی حمایت کی تھی اور اخبارات کے ذریعے میں نے ان کے اغراض و مقاصد کی تائید کی تھی۔ اس کی وجہ سے تحریک اتحاد اسلامی کے روشن خیال لیڈروں سے میری ملاقات ہوگئی اور انھیں کے باعث مجھے ان کے ہندوستانی ہم مذہبوں کا دلی اعتماد حاصل ہوا"[۱۲۶]۔

بلنٹ نے مزید افغانی کے بارے میں لکھا کہ :ایک حقیقی مذہبی اصلاح کی تحریک قاہرہ کے علما کے درمیان ایک عجیب انداز میں شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا نہ کسی عربی، نہ کسی مصری اور نہ ہی کسی عثمانی نے شروع کی بلکہ اس تحریک کی ابتدا نہایت ہی ذہین شیخ جمال الدین افغانی نے شروع کی جو مصر میں آنے سے پہلے دنیا اور وسط ایشیا کا تجربہ رکھتے تھے[۱۲۷]۔ انھوں نے کسی استاد سے تعلیم حاصل کیے بغیر اپنے مطالعے اور خیالات سے مسلمانوں میں زیادہ سریع الحرکت ترقی کے امکانات کو روشن کر دیا[۱۲۸]۔

افغانی کے صرف بلنٹ سے نہیں بلکہ ان کی اہلیہ سے بھی قریبی مراسم تھے۔ افغانی دنیا جہاں کہیں ہوتے بلنٹ سے ان کا رابطہ استوار رہتا۔ برطانوی حکومت۔ امیر ترکی کے مابین افغانی کے جو تعلقات قائم ہوئے اور ترکی حکومت میں جو اثر و رسوخ افغانی کے تھے اس کی وجہ یہی مراسم تھے۔ مشکل وقت میں بلنٹ ہی نے افغانی کی مالی و سفارتی مدد کی تھی[۱۲۹]۔

افغانی نے حقیقتاً مغرب کا مطالعہ علمی بنیادوں پر نہیں، بلکہ سیاحتی بنیادوں پر کیا تھا لیکن ان کی شخصیت پر عظیم شہرت و مقبولیت کے باوجود کئی پردیں اور تہیں ہیں جس کی وجہ سے پوری سیاسی و علمی زندگی ایک معمہ بن

گئی ہے۔ کئی ایسے اقوال، کئی ایسے واقعات ان کی ذات سے منسوب ہیں جن سے ان کی ذاتی اور حقیقی خیالات کا علم نہیں ہوتا[۱۳۰]۔

ترکی سے جمال الدین افغانی کے اخراج کے بعد افغانی جب مصر گئے اور وہاں انھوں نے جدید اہل قلم مصنفین کی تیاری کا منصوبہ بنایا اور انھوں نے اس سلسلے میں تیزی سے کام بھی کرنا شروع کر دیا۔ ان کے اس اقدام کی وجہ سے خدیو مصر توفیق پاشا اس قدر برہم ہوا کہ اس نے ستمبر ۱۸۷۹ء میں افغانی کو مصر سے نکل جانے کا حکم دیا[۱۳۱]۔ اس اخراج کے متعلق سید نے کسی سے کہا تھا کہ ''انھوں نے اسمٰعیل پاشا کے خلاف مصر میں پروپیگنڈا کیا تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے فری مسنری لاج کو بھی استعمال کیا جس کے وہ ممبر تھے[۱۳۲]۔ بعض عربی جرائد اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ افغانی نے اس تحریک کو مسلم دنیا میں متعارف کروایا جس کے ممبروں کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی تھی[۱۳۳]۔ اکثر مصری نوجوان جو اس زمانے میں تحریک حریت میں پیش پیش رہے اور بعض مشہور اہل قلم نے افغانی کے ان خیالات سے استفادہ کیا' جو انھوں نے مصر میں پیش کیے تھے۔ ان میں سب سے اعلیٰ مثال شیخ عبدہٗ کی ہے جو جدید مصر کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور افغانی کے فکر کے اصل روح رواں بھی انھیں مانا جاتا ہے[۱۳۴]۔

افغانی کے بارے میں ایک انگریز مصنف مسٹر اسٹارڈ نے مصر کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مصر کی ابتدائی شورش میں جمال الدین کی زبردست شخصیت کام کر رہی تھی۔ اس عجیب وغریب آدمی کی تعلیمات کا جس قدر گہرا اور پائیدار اثر مصر میں ظاہر ہوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کہنا خالی از مبالغہ نہ ہوگا کہ مصری قومیت کی تحریک انھیں کے سبب وجود میں آئی۔ ان کا اثر نہ صرف عربی پاشا کی شورش میں نمودار ہوا، بلکہ قدامت پرست شیخ محمد عبدہٗ بھی اس سے نہ بچ سکے''[۱۳۵]۔

افغانی کی پراسراریت پر اگر اردو زبان میں سب سے قدیم اظہار کو تلاش کیا جائے تو روزنامہ وکیل ۲۸ مئی ۱۸۹۶ء کو ایک عجیب خبر دیتا ہے جو افغانی کے قتل سے دو سال قبل کی بات ہے۔ ورنہ اردو زبان میں جو بھی شکوک وشبہات ملتے ہیں وہ ان کے انتقال کے کئی سال بعد منظر عام پر آئے۔ اخبار وکیل لکھتا ہے کہ:

> شاہ ناصر الدین مرحوم کے قتل کی نسبت مزید حالات یہ معلوم ہوئے ہیں کہ میرزا محمد رضا قاتل فرقہ بابیہ میں سے نہیں بلکہ مشہور ومعروف سیاح جمال الدین رومی کے قاصدوں میں سے ہے، جس کو اس

نے شاہ روم کے قتل کے لیے مامور کیا تھا۔ جمال الدین افغانی النسل اور ایرانی المسکن ہے وہ شہزادہ میلکم خاں کے ہم جلیسوں میں سے ہے۔ شہزادہ مذکور کے آزاد خیالات شاہ مرحوم کو ناگوار معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ایران سے جلا وطن کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد تھوڑی ہی مدت میں جمال الدین کو بھی خارج الملک کر دیا گیا۔ جمال الدین بڑے عالم وفاضل آدمی ہیں۔ کئی زبانیں جانتے ہیں اور دور دراز ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ ایران سے نکل کر مصر پہنچے۔ مگر سیاسی سازشوں کی وجہ سے ۱۸ برس ہوئے وہاں سے بھی نکال دیے گئے۔ مصر سے ممبئی پہنچے جہاں شیعہ سنی جھگڑا برپا کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار وہاں سے بھی ٹھکانہ نہ ملنے کی وجہ سے حیدر آباد پہنچے۔ مگر وہاں سے بھی اپنی بے قرار طبعیت کی بدولت ملک بدر ہوئے۔ انہی دنوں انھوں نے افغانستان اور پنجاب کے بڑے شہروں کا بھی دورہ کیا۔ ہندوستان سے رخصت ہو کر وہ انگلستان پہنچے، جہاں شہزادہ مرزا میلکم خان (۱۸۳۳ء۔۱۹۰۸ء) سے ان کی ملاقات ہوئی اور شہزادہ نے انھیں ترکی بھیج دیا۔ مگر گورنمنٹ ترکی نے انھیں فی الفور نظر بند کر دیا۔ ان کے متعلق شاہ ایران اور سلطان ترکی کے درمیان عرصہ تک خط وکتابت ہوتی رہی۔ مگر سلطان عبدالحمید نے شاہ مرحوم کو یقین دلا دیا کہ جمال الدین کو نظر بندی میں رکھا جائے گا۔ چناں چہ کچھ مدت تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن تقریباً آٹھ مہینے ہوئے کہ انھوں نے محمد رضا قاتل (وفات ۱۸۹۶ء) اور آٹھ اشخاص کو شاہ ایران کے قتل کے لیے بھیج دیا۔ قاتل برابر آٹھ مہینے کے انتظار کے بعد یکم مئی ۱۸۹۲ء کو اپنی کارروائی میں کامیاب ہو گئے[۱۳۶]۔

ای۔جی براؤن بھی اپنی کتاب انقلاب ایران میں اس کی تائید کرتا ہے کہ ''جمال الدین افغانی جب لندن اور قسطنطنیہ میں مقیم تھے اس زمانے میں انھوں نے شاہ ایران کی اخبارات میں بے حد مخالفت کی تھی اور اپنی تقاریر میں بھی اس کے خلاف بولا کرتے تھے۔ جب شاہ ایران کو مار ڈالا گیا تو حکومت ایران جمال الدین افغانی اور ان کے ساتھیوں کو جن پر اس قتل کی مشورت کا شبہ کیا جاتا تھا حکومت ترک سے مانگا مگر سلطان ترکی نے جمال الدین افغانی کو دینے سے انکار کر دیا۔ مگر دیگر تینوں شخصیتوں کو ایران بھیج دیا جن کو تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دیا گیا[۱۳۷]۔ ان تین لوگوں میں مرزا آغا خان کرمانی نائب اڈیٹر اختر، شیخ احمد روحی کرمانی، حاجی مرزا احسن خان خیر الملک کو ایران کے حوالے کیا گیا۔ یہ تینوں صاحبان بھی علم وفضل کا ایک باب تھے اور شعرو شاعری کے ساتھ گہری نسبت رکھتے تھے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب تاریخ انقلاب ایران کے دیباچے میں مرزا آغا خان کرمانی کے اشعار بھی لکھے ہیں''[۱۳۸]۔

مصر میں جمال الدین افغانی نے قوم پرستوں کی ایک منظم سیاسی انجمن قائم کر لی تھی جس میں تقریباً تین سو افراد جو مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے شریک ہو چکے تھے[۱۳۹]۔ اس انجمن کا نام محفل وطن تھا

اور جو شخص بھی اس کا رکن بنتا اس کا فرض تھا کہ نہ صرف انجمن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ اتفاق رکھتا ہو بلکہ ان پر عمل پیرا بھی ہو، انجمن کی تشکیل کا مقصد مصر کی منتشر قوتوں اور خیالات کو ایک مرکز پر لانا اور ان میں یک جہتی پیدا کرنا تھا[140]۔ محفل وطن کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کی اخلاقی حالت کو بھی سدھارے۔ یہ انجمن عزم وارادے کا ایک سیلاب بن کر اٹھی اور سارے مصر پر چھا گئی[141]۔ مصر کی یہ تحریک یا نیشنل موومنٹ جس کا طلوع آفتاب ۱۸۷۱ء میں ہوا اور اس کا نصف النہار عربی پاشا کی بغاوت پر پہنچا[142]۔ افغانی کے اس انجمن کے اثرات نے ملک کے عامتہ الناس کے خیالات اور زبان کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ شیخ محمد عبدہٗ، سعد زاغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے، احسان بے اور ایسے کتنے ہی اور مصری وطن پرست شیخ کے حلقہ ارادت میں سرگرم عمل ہو گئے اس انجمن کے تین اہم مقاصد یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

اول یہ کہ مذہبی خیالات، عقائد اور توہمات میں اپنے اجتہادات سے تعبیر پیدا کیا جائے۔ درحقیقت افغانی یہی چاہتے تھے کہ آزاد سیاست کا ایسا بیج بویا جائے جس کا رشتہ مذہب کی بنیادوں سے استوار ہونے کے بجائے سائنس اور جدید انکشافات و اکتشافات سے جڑا ہوا ہو۔ افغانی کے تصور اخلاق سے ہمیں ایک ایسی چیز ملتی ہے جس کی ایک مذہبی رہنما سے قطعی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ یہ کہ افغانی کسی روحانی بنیادوں پر اخلاقی اصولوں کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان کا نقطۂ نظر بڑی حد تک مادّی مفکروں سے میل کھانے لگتا ہے[143]۔

دوم یہ کہ افغانی نے پہلی دفعہ مصر میں قوم پرست اخبار نویس پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ۱۸۸۲ء میں تحریك الشبان المصریه *(Young Egypt Movement)* کے ذریعے مصر میں وہ ایک قوت بن کر ابھرے[144]۔ اس انجمن کے ذریعے ملکی اخبارات میں وہ قوت پیدا کر دی جو پہلے کسی اسلامی ملک کو میسر نہ تھی، ایران کے دور انقلاب میں جو ہنگامہ وہاں قومی اور آزاد اخبار نویسوں کے ذریعے پیدا ہوا یقیناً وہ مصری اخبار نویسی کی آواز باز گشت تھی[145]۔

افغانی کی اس جدوجہد کا تیسرا نمایاں پہلو غریب رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لیے بادشاہت کے خاتمے کے حوالے سے تھی اور اس کے نمایاں ترین اثرات مصر کے سیاسی حالات میں دیکھے جا سکتے ہیں جو ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان پیش آئے۔

جمال الدین افغانی نے مصر کو اپنا مرکز بنایا ہوا تھا اور وہاں کے سیاسی حالات کو وہ اپنے افکار کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب بھی ہوئے اور بالآخر مصر میں فرانس اور برطانیہ کے اثرات نے سلطان عبدالحمید کو مجبور کر کے خدیو اسمٰعیل کو معزول کرا دیا۔ اسمٰعیل نے جو کچھ وعدے افغانی سے کیے تھے وہ اس نے زمام کار سنبھالنے کے بعد پورے نہیں کیے۔ لیکن

افغانی کے ترکش میں ایک تیر ابھی باقی تھا اور وہ شاہ زادہ توفیق پاشا تھا جو خفیہ طور پر افغانی کی جماعت میں سربراہ تھا، لہٰذا اسمٰعیل کی برطرفی کے بعد توفیق کو اس منصب پر نامزد کیا گیا۔ جمال الدین افغانی کی جماعت جامعہ ازہر کے خلوت خانوں میں اس بات کا فیصلہ کر چکی تھی کہ بادشاہت کا خاتمہ تمام عالم اسلام میں ہو جانا چاہیے تھا۔ افغانی بادشاہت کے اس قدر دشمن تھے کہ وہ بادشاہوں کی زندگی کو ختم کرا دینا جائز سمجھتے تھے[۱۴۶]۔ ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے بھی اپنی کتاب مصر کی خفیہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ''۱۸۷۹ء کے موسم بہار میں جمال الدین افغانی اور ان کے شرکاء کار کے درمیان یہ مشورہ ہوا تھا کہ کس طرح خدیو اسمٰعیل کو معزول یا قتل کیا جائے''[۱۴۷]۔

توفیق کی وعدہ خلافی کے نتیجے میں افغانی کی اصلاحی تحریک کے اثرات مصری فوج میں نمایاں ہوئے اور احمد بے عربی نے توفیق پاشا کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، لیکن اس میں وہ مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ احمد بے عربی نے اپنی قید کے زمانے میں جو حالات لکھے تھے ان کا ذکر بلنٹ نے اپنی کتاب Secret History of the English Occupation of Egypt میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ: '' عربی پاشا افغانی کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھا وہ اس واقعہ کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ خدیو اسمٰعیل کو قتل کرانے کی سازش میں، افغانی اور مفتی عبدہٗ کے درمیان جو صلاح مشورہ ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسمٰعیل کو سلطان نے معزول نہ کیا ہوتا تو اس کا افغانی کی جماعت کے ہاتھ سے وہی حشر ہوتا جو بعد کو شاہ ایران کا ہوا[۱۴۸]۔ اس واقعہ کی مزید تصدیق مفتی عبدہٗ کی اس بیان سے ہوتی ہے جو بعد میں بلنٹ نے شائع کیا۔ اس بیان میں بقول بلنٹ مفتی عبدہٗ کہتے ہیں کہ: ''اسمٰعیل کو معزول کرنے کا مشورہ اس زمانے میں ہو رہا تھا اور جمال الدین نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسمٰعیل کو کسی دن جب وہ اپنی سواری سے قصر نیل کے پل پر آتے جاتے ہوں قتل کر دیا جائے اور میں اس تجویز سے بالکل متفق تھا۔ مگر یہ گفتگو ہم ہی دو کے درمیان ہو کر رہ گئی اس لیے کہ اس وقت اس کام کا کرنے والا کوئی آدمی ہمارے پاس نہ تھا۔ اگر اس وقت ہماری ملاقات اعرابی سے ہوتی تو ہم اس کے ذریعہ اس کام کا ضرور انتظام کرتے اور بہتر صورت بھی یہی تھی۔ اس لیے کہ اس صورت میں یورپ کی مداخلت کا موقع پیدا نہ ہوگا۔ مگر اہل ملک کی جہالت اور کمزوری کے باعث اس وقت یہ امید نہ تھی کہ ہم جمہوریہ قائم کر سکتے''[۱۴۹]۔

قصہ مختصر افغانی کے سیاسی عقائد کا یہ عجیب پہلو تھا جو پہلی دفعہ مصر میں بے نقاب ہوا مگر یہ حیران کن بات

ہے کہ اس سیاسی عقائد کی تشریح انھوں نے آج تک اپنی تحریروں اور تقریروں میں نہیں کی کہ وہ بادشاہت کو فنا کرنے کے لیے بادشاہوں کا قتل بھی جائز سمجھتے ہیں گو کہ بلنٹ اور مفتی عبدہٗ کا بیان خود ان اقوال و اعمال سے ظاہر ہوتا رہتا ہے [150]۔ پھر شاہ ایران کے قتل میں افغانی کی سازش کی کئی شہادتیں ملتی ہیں جس سے ان کے سیاسی عقیدے میں باشاہوں کے قتل کو جائز سمجھنے کی تقویت ملتی ہے۔

بلنٹ کو بھی عالم اسلام کے سیاسی، معاشی اور جنگی حالات و واقعات سے کافی دل چسپی تھی اور وہ بنیادی طور پر ایک زندہ دل شخص تھا۔ مصر کے حالات و واقعات پر اس نے بھی بے حد رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کے اکابرین کو بھی اس کی تحریروں نے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے جنگ طرابلس میں اس کے ایک مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''ایک انگریز مسٹر بلنٹ نامی نے ایک طویل مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ وزارت انگلستان ہی کی سازشوں سے اٹلی نے طرابلس پر دن دہاڑے عہد بین الاقوامی کی مٹی پلید کر کے ڈکیتی کی اور جب اس سے بھی مطلب حاصل نہ ہوا تو دول بلقان کو جنگ پر آمادہ کیا۔ یہ مضمون اخبار الہلال اور مسلم گزٹ لکھنؤ میں بھی شائع ہوا [151]۔ رسالہ الہلال میں بلنٹ کا ایک خط شائع ہوتا ہے جس میں وہ برطانیہ کے معاہدے کی خلاف ورزی پر اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ: ''انگلستان نے اس معاہدے میں دولت عثمانیہ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر روس کبھی عثمانی ایشیا کے کسی حصہ پر حملہ آور ہوگا تو وہ ہمیشہ اپنی جنگی قوت دولت عثمانیہ کی اعانت پر صرف کرے گا'' [152]۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ برطانیہ نے ہمیشہ عثمانوی خلافت کو نقصان پہنچایا ہے اور اس کے ذریعے سے خلافت کے خاتمے کی سازش کی ہے۔

بلنٹ نے ہندوستان میں سفارتی تعلقات جمال الدین افغانی ہی کے ذریعے سے مستحکم کیے تھے۔ کیوں کہ ہندوستان آمد سے قبل افغانی نے بلنٹ کو چند خطوط دیے، یہ خطوط نواب حیدر آباد دکن رسول یار خان کے نام تھے [153]۔ نواب رسول یار خان نے بلنٹ کو بتایا کہ وہ جمال الدین افغانی کے دوست رہ چکے ہیں [154]۔

بلنٹ جس زمانے میں ہندوستان آیا، اسی زمانے میں مصر میں برطانیہ کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور مہدی سوڈانی کی تحریک اپنے عروج پر تھی، افغانی اس زمانے میں مصر میں تھے۔ ہندوستان کے سفارتی محاذ پر اس کے کیا مقاصد تھے اور وہ ان کو حاصل کرنے میں کتنا کامیاب ہوا، اس کی پوری تفصیلات *India Under Rippon* میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اس کے روابط کا آغاز حیدر آباد دکن سے ہوتا

ہے۔ یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ حیدر آباد دکن کے سر برآوردہ شخصیات بظاہر ریاست کے خادم تھے مگران میں زیادہ تر انگریزی مفادات کو ریاست کے مفادات پر ترجیح دیتے تھے۔

حیدر آباد دکن میں سالار جنگ اور سید علی بلگرامی سے بلنٹ کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ سید علی بلگرامی نے بلنٹ کی کتاب *The Future of Islam* کا مطالعہ کیا تھا لیکن انھوں نے اس کتاب سے مایوسی کا اظہار کیا۔ اسلام کے بارے میں بلگرامی کا خیال تھا کہ اگر ہم عربی اور جامعہ ازہر کے روشن خیال اشخاص کا اقتدار مصر میں از سر نو قائم کرادیں تو ہندوستان میں اس کا اثر بے انتہا ہوگا۔ انھوں نے قسطنطنیہ کے بجائے مصر اور مکہ کی جانب نگاہیں زیادہ اٹھتی ہیں۔ سید علی بلگرامی کا خیال تھا کہ مذہبی اصلاح کی سخت ضرورت ہے[۱۵۵]۔ جب بلنٹ نے سید علی بلگرامی سے افغانی کے متعلق پوچھا تو انھوں نے اس کا جواب دیا کہ ''وہ سوشلسٹ ہیں اور اس قدر جوشیلے کہ ان سے کسی اصلاح کا کام نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے مہدی سوڈانی کے بارے میں کہا کہ میری دعا ہے کہ انھیں کامیابی ملے اور اگر انھیں کامیابی مل گئی تو چھٹی صدی ہجری کی عبداللہ کی تاریخ کا اعادہ ہو جائے گا''[۱۵۶]۔

سید علی بلگرامی انگریزی، فارسی، عربی اور فرانسیسی زبان کے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستانی زبانوں میں جن میں گجراتی، مرہٹی، تیلگو اور بنگالی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ کیمبرج یونی ورسٹی میں مرہٹی زبان کی تدریس کا کام بھی سرانجام دیا۔ تمدن ہند اور تمدن عرب جولی بان (Lee Ban) کی فرانسیسی زبان میں نہایت اعلیٰ تصنیف ہے اس کا اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے[۱۵۷]۔ حیدر آباد دکن میں رسول یار جنگ کے بارے میں بلنٹ نے نہایت تعریفی کلمات کہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سوشلسٹ اور جمال الدین افغانی کے مرید تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں جمال الدین جیسا شخص نہیں ملے گا[۱۵۸]۔

ہندوستانی سیاست کو اور وہاں کے مسلمان زعماء سے ملاقات کے نتیجے میں بلنٹ نے *Self Government* کی پیش گوئی کی تھی۔ البرٹ بل *(Albert Bill)* کے بارے میں جو لارڈ رپن *(Lord Ripon)* نے پیش کی تھی، بلنٹ نے اس کا مطالعہ کیا[۱۵۹]۔ ہندوستان کے سفر میں بلنٹ لکھتا ہے کہ ''رات کو گورنمنٹ ہاؤس میں پارٹی تھی۔ جس میں ہندوستانی اور انگریز دونوں شریک تھے، یہاں مہاراجہ صاحب وائی کرشنا سے ملاقات ہوئی عبداللطیف اور جسٹس امیر علی مجھ سے ملتے ہوئے بچتے تھے، مگر میں نے مؤخر الذکر کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، میں نے یونی ورسٹی کے بارے میں ان سے باتیں کیں، لیکن وہ شروع میں کچھ

ناراض سے رہے، کہنے لگے ہندوستان میں کوئی مسلمان ایسا نہیں جو محض مذہبی تعلیم کی پروا کرتا ہو لیکن جب میں نے ان سے کہا کہ مسلمانوں میں ایسے بالضرور ہیں جو دنیا میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ذرا گھبرا گئے۔ کہنے لگے کہنے لگے ایسی یونی ورسٹی کے لیے کوئی چندہ نہیں دے گا"[۱۶۰]۔ یہاں پر کئی سوالات ایسے ہیں جن کے حوالے سے تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ بلنٹ اسلامی یونی ورسٹی کا قیام کیوں چاہتا تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ اس اسلامی یونی ورسٹی کو قدیم طرز کی درس گاہ کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سالار جنگ کے ساتھ مل کر حیدر آباد دکن میں اسلامی یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتا تھا[۱۶۱]۔ بلنٹ نے حیدر آباد میں یونی ورسٹی کی اسکیم لارڈ رپن کے سامنے بھی پیش کی۔ لارڈ رپن کا کہنا تھا کہ حیدر آباد تباہی کے قریب آ گیا ہے لیکن بلنٹ نے ان سے کہا کہ وہ سدھر جائے گی تو رپن نے اس یونی ورسٹی کے قیام میں آمادگی کا اظہار کیا[۱۶۲]۔ اس نے اپنی ڈائری میں ہندوستانیوں کے بارے میں جو رائے پیش کی ہے اس کو مزید تقویت اس کے ایک اور مضمون جو ستمبر و اکتوبر ۱۸۸۴ء Fortnightly Review لندن میں شائع ہوا 'اس سے بھی ہوتی ہے۔ اس مضمون میں وہ ہندوستانیوں کے بارے میں جو رائے پیش کرتا ہے وہ دیگر انگریز مستشرقین سے نہ صرف الگ ہے بلکہ اس کی رائے میں تعصب نہ ہونے کے برابر ہے۔

بلنٹ کے سب سے زیادہ اثرات مصر میں ظاہر ہوئے ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ جیسے قوم پرستوں[۱۶۳] سے قریبی تعلقات کی بنیاد پر وہ مصر کے علمی و ادبی حلقوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ پیرس میں جب مصر کے قضیہ کے حوالے سے اس کی ملاقات جب افغانی، عبدہٗ اور دوسرے قوم پرستوں سے ہوئی تو وہاں تین نکاتی ایجنڈے پر بلنٹ کو راضی کیا گیا کہ وہ برطانیہ کی سرکار کے سامنے ہمارے یہ مطالبات پیش کریں۔ ان میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ نہر سویز کو عالمی سطح پر کھول دیا جائے۔ اس سفر کے دوران بلنٹ نے شامی اور اور یونانی سرمایہ داروں سے بحری سفر کے دوران ہی خطاب کیا[۱۶۴]۔

مصر سے بلنٹ کی وابستگی اس کی نظم (The Wind and the Whirlwind) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نظم کا پہلا مسوّدہ لیڈی گریگوری (۱۸۵۲ء۔۱۹۳۲ء)(Lady Gregory) نے تیار کیا اور اس کے ذاتی کاغذات میں اسے رکھ دیا۔ یہ نظم ایک سو تین اشعار پر مشتمل ہے[۱۶۵]۔ یہ نظم غصّے اور تلخی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ بلنٹ کے لیے عربی کی شکست، اس کا قید کیا جانا اور ملک بدر کیے جانا یورپ میں ایک لو کی آندھی چلانے جیسے تھی۔ یورپ نے لازمی طور پر اس جارحانہ عمل سے فائدہ اٹھایا اور اس پورے عمل نے برطانوی

حکومت کے لیے مصر میں راستے بھی ہموار کیا[۱۶۶]۔

بلنٹ کی یہ شاعری Secret History of English occupation of Egypt میں صفحہ۴۰۴ سے ۴۱۶ پر شائع ہوئی[۱۶۷]۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ ۱۹۷۰ء کے آخر تک بلنٹ کا نام مارکسی ادب میں سراہا جاتا تھا۔ ایک روسی مصنف *(Alla Mihailovna Lynbarskaya)* نے لینن گراڈ *(Leningrad)* سے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان یہ تھا *(Wilfrid Scawen Blunt Life work & Struggle)* اس کتاب کے ایک حاشیے میں *(Maxism Today August 1970)(Organ* میں نشاندہی کی ہے کہ کارل مارکس اپنی موت سے کچھ مہینے پہلے بلنٹ کی کتاب *(The Egypt Revolution)* مشمولہ جرنل *(Nineteenth Century)* کا مطالعہ کر رہا تھا اور کچھ حاشیے بھی تحریر کیے تھے[۱۶۸]۔ اس نظم کے تحریر کیے جانے کا پس منظر یہ ہے کہ سرکیشائی ترکش آفیسرز کی فوج نے ایک سازش تیار کی تھی جس میں عربی کو قتل کیا جانا تھا۔ یہ خبر انگلستان میں اپریل کے تیسرے ہفتے میں پہنچتی ہے۔ حکومتی اداروں کے لیے یہ خبر خوش کن نہیں تھی۔ رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ اس سازش کے پیچھے خدیو اسمٰعیل تھا[۱۶۹]۔ پچھلے سطور میں خدیو پاشا اور عربی و افغانی کا جو کردار ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہ نظم بلنٹ کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب قضیۂ مصر اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے ہوئے تھا اور انگریز اسکندریہ پر گولہ باری کر رہے تھے۔ انھوں نے اس نظم کے کچھ اشعار جمال الدین افغانی کو بھی سنائے تھے اور انھوں نے پسند بھی کیے تھے[۱۷۰]۔ بلنٹ نے نومبر ۱۸۹۱ء میں تخلیہ مصر پر انگلستان کے ارباب و بست و کشاد کو ایک یادداشت لکھ کر بھیجی تھی۔ اس یادداشت کی ابتدا اس فقرہ سے ہوئی تھی۔ ''انخلائے مصر کا مسئلہ کچھ تو ہماری عزت کا سوال ہے اور کچھ مصلحت اندیشی کا۔ عزت کا اس لیے کہ اس بارے میں مواعید کیے جا چکے ہیں مصلحت اندیشی کا اس لیے کہ فوجی اسباب اس کے متقاضی ہیں''[۱۷۱]۔ وہ برطانیہ کے فوجی مہمات کا ناقد تھا۔ بلنٹ نے اپنی شخصیت سے کئی بڑے لوگوں کو متاثر کیا ہے اس میں ونسٹن چرچل (Winston Churchill) بھی شامل ہے۔ چرچل کے ابتدائی سیاسی سالوں میں اس سے روابط تھے اور اس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ چرچل اور اس کے والد رینڈولف چرچل (Randolph Churchill) پر بلنٹ کی شاعری کے اثرات موجود ہیں[۱۷۲]۔ چرچل نے بلنٹ کے جذبات سے اس موقع پر بھی اتفاق کیا جب ہندوستان کے شمال مغربی

سرحدی علاقوں میں سفاکانہ سیاسی اور خود کو تباہ کن صورت حال سے برطانیہ دوچار کیا ہوا تھا[۱۷۳]۔

بہر نوع بلنٹ کی اس نظم کا ترجمہ روزنامہ خلافت بمبئی کے ایڈیٹر قمر احمد غازی پوری نے ۱۹۲۷ء میں اردو میں منظوم انداز میں سیلاب حوادث کے نام سے کیا تھا۔ اس نظم کے چیدہ چیدہ اشعار یہاں پر بھی پیش کیے جا رہے ہیں[۱۷۴]۔ نظم کی مشرقیت اور اس کا لہجہ دل آویز ہے جبکہ الزبتھ لانگ فورڈ (Elizabeth Longford) جس نے بلنٹ کی سوانح لکھی ہے کہنا ہے کہ اس نظم کی بنیاد میں بلنٹ کا جنون شامل ہے[۱۷۵]۔

Samuel C. Chew کا کہنا ہے کہ: بلنٹ بائرن کی روایات کے پاس دار تھے بعد میں ان کی انگریزی شاعری میں بائرن کے طرز کی ہلکی سی شعوری جھلک پائی جاتی ہے[۱۷۶]۔ اس کی نظم میں اس طرز احساس کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔ اس کے برعکس W.E Henly جو بلنٹ کی شاعری میں معاون مدیر تھے ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ نظم مکمل طور پر بائرن کے طرز کا اظہار ہے[۱۷۷]۔ قمر احمد غازی پوری نے اس نظم میں بلنٹ کے جذبات کو درست طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی دل آویزی کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے بلنٹ کہتا ہے کہ:

I HAVE a thing to Say. But how to say it?
I have a cause to plead. But to what ears?
How Shall I move a world by lamentation---
A world which heeded not a Nation's tears?[۱۷۸]

(۱)

قصۂ غم مجھ کو کہنا ہے مگر کیوں کر کہوں
سننے والے ہوں تو کچھ دل کی کہانی کہہ چلوں
مستبد سے کس طرح انصاف کا ہوں خواستگار
شاہ ناحق کوش سے کب جز بدی ہو آشکار
کب سنے فریاد اپنی لاکھ ہو کوئی بڑا
بے اثر نقار خانے میں ہے طوطی کی صدا
کیا سناؤں میں غریبوں کو امیروں کا گلہ
عام ہوں یا خاص ہوں، ہے حال سب کا ایک سا
زر کی ہوتی ہے پرستش آج کل سرکار میں
جھوٹ پنہاں ہو رہا ہے کذب کے انبار میں
ہم نے یہ مانا مٹی اس سال بے نیل و مرام
نیل کی تحریک آزادی، نہ اب لے کوئی نام
کھو کے بینائی یہاں روئے گا ملتن زار زار
یہ وہ ماتم ہے کہ ہو گا ڈینٹے بھی بے قرار

جس نے یاں جیسا کیا اس کو وہیں ویسا ملا
نیل ہی میں دیکھ لو فرعون کو موسیٰ ملا

المدد اے چارہ ساز یکساں لے انتقام
خاک وخوں میں لوٹتے ہیں بے گناہ بسمل تمام

تیرے ناکردہ گناہ بندے پہ یہ جو رو جفا
گھونٹتے ہیں بندگان زر غریبوں کا گلا

دن ضعیفوں کے پھریں گے اک نہ اک دن بالضرور
سوچ او منعم! عبث دولت کا ہے تجھ کو غرور

بچ نکلتی ہیں زبردستوں سے اقوام ضعیف
آج وہ ہوں گے قوی، کل تک جو تھے زار ونحیف

غور سے سن لیں اسے جو ہیں جہاں میں چیرہ دست
اس مکافات عمل میں ایک دن ہوگی شکست

آنے والا ہے وہ دن جس دن سے ڈرنا ہے ضرور
ٹوٹ جائیں گے سروں کے کاسہ ہائے پرغرور

عرش ہل جاتا ہے بے کس قوم کی فریاد پر
چل نہیں سکتی حکومت بندۂ آزاد پر

یاد رکھنا خون ناحق رنگ لائے گا کبھی
فاتحوں کو خون کے آنسو رلائے گا کبھی

خون کے دریا بہا کر جو بنا ہے باوقار
خاک میں ایک روز ملنا ہے اسے شکل غبار

چھوڑ کر نیکی لیا ہے اپنے سر پر یہ وبال
تجھ کو انگلستان، مستقبل کا بھی کچھ ہے خیال

غم نہیں مجھ اگر خونیں ہے تیری داستاں
تجھ کو لازم ہے خدا کے خوف سے ڈرنا یہاں

حق کی لاٹھی میں نہیں آواز سن اے پرُغرور
سوچ لے انجام کو اپنے اگر کچھ ہے شعور

(۲)

سننے والے ہوں تو سن لیں اس دل محزوں کی بات
شرق میں چھایا سپیدہ صبح کا، جاتی ہے رات

دن نہیں نکلا شب تاریک کا ہے اختتام
جاگنے والی ہیں اب اقوام خوابیدہ تمام

رات گزری صبح ہوتی ہے یہ کہتے ہیں طیور
سونے والے اٹھ کے دیکھو صبح کا چھایا ہے نور

وہ زمین سخت وہ گہوارہ، رنج و محن
نیل گر یاں گور آزادی غریبوں کا وطن

وہ وطن ہے آزادی انسان کی خاطر بے قرار
ایسے حق کی فکر ہے فانی نہیں جو زینہار

(۳)

ہاں سنو مجھ سے نئی باتیں بتاؤں گا تمہیں
موسیٰ عمراں کا افسانہ سناؤں گا تمہیں

قوم کی تسکین کا باعث تھا وہ مرد حکیم
جبکہ تھا فرعون کے ہاتھوں ہراک کا دل دونیم

ہادی امت وہیں قومی مجاہد ہو گیا
دست قدرت نے بنایا دم کی دم میں کیا سے کیا

جز خدائے پاک غیروں کا اسے دھڑکا نہ تھا — حوصلہ یہ تھا کہ وہ فرعون سے ڈرتا نہ تھا
یوں ہوئے اک روز گویا ہے خدا میرا گواہ — لو مبارک ہو کہ چمکا مصر کا بخت سیاہ
یہ نہ قانون خدا ہے اور نہ بندوں کا کلام — کیوں رہے خوبصورت ملک غیروں کا غلام
کیوں رہیں محروم پیداوار سے یاں کے کسان — کیوں نہ دیکھیں یاں کے غم دیدہ مسرت کے نشان
ہاتھ سے غیروں کے ہم نے دکھ اٹھائے ہیں بہت — ناز برداری میں ان کے رنج پائے ہیں بہت
محنتیں کیں مفت ہم نے بن کے غیروں کے غلام — پاس تن ہوشی کو کپڑا تھا نہ کھانے کو طعام
بس یہی ثمر ملا اس جنت شداد میں — ہو کے آزادی پڑے ہیں جور میں بیداد ہیں
ہم نے غیروں اور شاہوں کی غلامی کی بہت — منہمک تھے حسن خدمت میں سلامی دی بہت
پیٹ کاٹے اپنے بچوں کے انھیں دیں روٹیاں — عیش وعشرت تھی وہاں رنج ومصیبت تھی یہاں
کیوں نہ تاریکی جہنم کی عیاں ہو بر ملا — جب ہو صدیوں سے یہاں ظلم وستم جور و جفا
سن رہے ہو کچھ یہ کس کی دکھ بھری آواز ہے — چیختا ہے کون کیا کوئی یہاں نا ساز ہے
قید میں بچے پڑے ہیں دکھ سے روتے زارزار — عورتیں بھی پنجۂ اغیار میں ہیں آہ خوار!
باغ کے نزدیک کیوں دریا میں اتنا جوش ہے — کس کا لاشہ تیرتا ہے کون یاں مدہوش ہے
پاؤں سے پتھر بندھا ہے سر سے لپٹا ہے کفن — سچ بتاؤ کون ہے یہ کشتۂ رنج و محن
پاکبازی ہے کہاں یونانیوں کو دیکھ لو — عزت وا خلاق کو اک قصۂ ماضی کہو
سیم و زر معبود ہیں ان کے یہ دولت کے غلام — سود لینا، سود کھانا، بس یہی ان کا ہے کام
اے خدائے دو جہاں یہ عرض ہو اپنی قبول — ان مصائب سے کہیں ہو جلد چھٹکارا حصول
بن کے یاور جو دلائے اس غلامی سے نجات — حامی حق وہ ہے جو سنتا نہیں باطل کی بات
ہاں بڑھو آگے بڑھو آگے بڑھاؤ اپنا ہاتھ — اس غلامی سے بچو ہو جاؤ آزادوں کے ساتھ
کام انسانی اخوت سے سنبھالو دوستو — دوسروں کو بھی بڑھاؤ اور خود آگے بڑھو
ہاں کرو کوشش کہ یہ رنج ومصیبت دور ہو — ہو خدا کی مہربانی رنج وغم کافور ہو

(۴)

آپ بیتی کون سنتا ہے کہاں صبر و شکیب — جس میں ہمت ہو سنے افسانہ، مکر و فریب

مکر سے لڑنا دغا بازی سے کر دینا ذلیل — زور و زر سے چھین لینا دولت ابنائے نیل
سخت گیروں کے طریقوں کو سمجھنا ہے محال — اہل حق کمزور ہو جاتے ہیں یاں بے قیل و قال
اے سیاست تجھ پہ لعنت اور ان کو کیا کہوں — جن کے باعث دہر میں جاری ہوئے دریائے خوں
خون بہتا ہے یہاں دامن بچا کہ اب چلو — ڈھانک لو منہ اپنا اور رہنے دو عریاں لاش کو
ہوش میں آؤ یہ آخر حد سے تم کیوں بڑھ چلے — ہم نے یہ مانا تمہارے بڑھ چلے ہیں حوصلے
تم نہ قاضی ہو نہ مفتی ہو عبث یہ جوش ہے — غور سے سن لو کہ آج دنیا ناحق کوش ہے
غیر قابض مصر پر مصری ہیں غیروں کے غلام — جب نہ ہو عزت تو کیوں کر کام دے گی جنگ عام
ثانی فرعون ہیں رفتار میں گفتار میں — لطف آتا ہے انھیں بھی مصر کے بازار میں
بن گئے فرعون خود تیرے ستانے کے لیے — کھینچ رہے ہیں مکر کے خنجر چبھانے کے لیے
صورت فرعون ہے زوروں پہ ان کی حرص و آز — لے چلے ہیں اپنی قوت کے لیے جنگی جہاز
صورت فرعون تن تن کر دباتے ہیں تجھے — اپنے مطلب کی غرض باتیں سناتے ہیں تجھے
کچھ سنا اے مصر تو اپنی زبان حال سے — کس طرح بچے مرے فرعون کے اعمال سے
وہ بلا طاعون کی اللہ کی بھیجی ہوئی — سچ ہے موجودہ حکومت سے نہ ہرگز سخت تھی

(۵)

لو سناتا ہوں تمہیں دنیا کے دل والو! سنو — ابتدائے موسم گرما میں اک دن صبح کو
خوف خالق سے نہ کچھ مخلوق سے آیا حجاب — توپ کے گولوں سے ان کے ہو گئے خانہ خراب
کرتی ہیں بر باد تم کو موت کی چنگاریاں — آہنی گولوں کے باعث سر یہاں تھے دھڑ وہاں
صبح سے تا شام تم مرتے رہے کٹتے رہے — بد نصیبی سے گریزاں ہو گئے چھوٹے بڑے
فتح پا کر رعب دکھلانا بہت آسان ہے — ہار کر قوت جو دکھلائے وہی انسان ہے
دست بستہ لے گئے غدار کے دربار میں — اور کہاں لائے غلاموں کو تری سرکار میں
کام کچھ ہمت سے لو ہے آج وقت انتقام — ہاتھ میں تلوار لو بچنے نہ پائیں یہ غلام
پھر تمہارے رہنما کو چن لیا بہر سزا — ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا دیکھ کر بے دست و پا
خوش ہوئے ہنستے رہے دیکھا جو یوں تم کو ذلیل — تاج کانٹوں کا پہنایا ٹھونک دی ہاتھوں میں کیل

جان لے بر طانیہ حق بات ٹل سکتی نہیں
عشوہ گر ! گندم نمائی تیری چل سکتی نہیں

کیا ملا اقوام عالم کو بھلا کر کے تباہ
ایک دن دیکھے گی تیری قوم بھی روز سیاہ

دوسروں کے گھر مٹے تیری تباہی ہے قریب
حق کے پردے میں برائی کب بھلائی ہو نصیب

تیرے باعث تلخ شیریں اور شیریں تلخ کام
روشنی رکھا ہے تو نے آہ تاریکی کا نام

نام عیاری میں تیرا ہو گیا ضرب المثال
تیرے ہمسایوں نے سمجھا تیری مکاری کی چال

تیرے ہر ہر فعل پر رہتی ہے لوگوں کی نظر
چاہ کن کو چاہ ہے درپیش سن اے بے خبر

پارہ پارہ ایک دن ہو گی ریاست بالضرور
نیک و بد کی جانچ ہو جائے گی سن اے بے شعور

منفعت اقوام سے بے جا اٹھائی ہے بہت
سود کے پردوں میں یوں دولت کمائی ہے بہت

آشکارا ہو گا سب لوگوں پہ مکرو فن ترا
اور کھل جائے گا بس اک روز اوچھا پن ترا

یہ حکومت اور سطوت خاک میں مل جائے گی
اک نئی بنیاد دولت خوبیاں دکھلائے گی

دور عدل و حق پرستی کا یہاں ہوگا ظہور
ایک ساں پھیلے گا سن لے مشرق و مغرب میں نور

یہ عقیدہ ہے مرا کہتا ہوں میں کھا کر قسم
بے گمان اقوام عالم میں ترقی ہے بہم

ہو نہیں سکتا ہے تجھ سے دور یہ زیر و زبر
چاہتا ہے زندگی تو ہوش میں آ، غور کر

ورنہ وہ پروردگار مالک کون و مکان
تجھ سے لے کر غیر کو بخشے گا طاقت بے گمان

مشرقی اقوام اب بچے نہیں ہیں زینہار
تو ہوا ہے پیر، ہے ان کی جوانی کی بہار

ان کے دم سے ہے روایات جہاں میں اب نمود
اور تو گو نگا رہے گا پائے گا راحت نہ سود

مغربی فرہنگ و دانش میں ہے اک زور جنوں
آبشاروں سے بہا کرتے ہیں یاں دریائے خوں

اب روانی ہو چکی لبریز پیمانہ ہوا
پھر سکون بحر حق موجوں کا کاشانہ ہوا

سارقوں کے ساتھ یاں مصلوب ہوتا ہے مسیح
اب تو رہ سکتے نہیں باقی ستم ہائے قبیح

جان دیدی قوم کی خاطر کسی نے خوب ہے
یعنی مظلوموں کو دنیا میں یہی اسلوب ہے

ساری دنیا پائے گی رنج و مصیبت سے نجات
آج تو مردہ ہے لیکن کل ملے گی پھر حیات

غم نہیں اس لیے اے مصر حالت پر تری
موت بھی تجھ کو مل جائے گی اعلیٰ زندگی

سن لیا برطانیہ تو نے جو تھا میرا کلام
بس یہی کہنا تھا مجھ کو اب تو ہے قصہ تمام

حوالہ جات وحواشی

۱- عبدالغفار، قاضی، ۱۹۴۰ء، ص،س
۲- معظم، انور، ص ۲۹
۳- عبدالغفار، قاضی، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ص ۶۵
۴- ایضاً
۵- ایضاً
۶- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۰
۷- احمد، رشید، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۸۱
۸- عبدالغفار، قاضی، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ص ۶۶
۹- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۱
۱۰- ایضاً، ص ۱۸۲
۱۱- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۸
۱۲- عقیل، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶
۱۳- حیدر، قرۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۳۲
۱۴- ایضاً، ص ۴۴، ۴۵
۱۵- پانی پتی، وحید الدین، مولانا، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۶
۱۶- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶
۱۷- واسطی، سید تنویر، س ن، ص ۹
۱۸- دلوی، میمونہ، ڈاکٹر، ستمبر ۱۹۷۰ء، ص ۳۴۲
۱۹- قریشی، محمد نعیم، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰
۲۰- ایضاً، ص ۳۲
۲۱- ایضاً
۲۲- ایضاً
۲۳- ایضاً

۲۴- ایضاً
۲۵- منگلوری، سید طفیل احمد، دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۲۸۹
۲۶- قریشی، ص ۳۳
۲۷- ایضاً، ص ۳۴
۲۸- شاہد، محمد حنیف، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۵
۲۹- ایضاً، ص ۲۸
۳۰- عزیز، کے کے، جون ۱۹۹۲ء، ص ۷۶
۳۱- ایضاً
۳۲- ایضاً، ص ۷۸
۳۳- ایضاً
۳۴- سعید، احمد، انجمن اسلامیہ امرتسر، ص ۱۹۰
۳۵- ایضاً، ص ۱۹۱
۳۶- ایضاً
۳۷- ایضاً، ص ۱۹۲
۳۸- ایضاً
۳۹- ایضاً
۴۰- عزیز، کے، کے، ص ۸۳
۴۱- ایضاً
۴۲- خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، جون ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۷
۴۳- ایضاً
۴۴- شاہ جہاں پوری، ابوسلمان، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱
۴۵- ایضاً
۴۶- قریشی، ۲۰۰۹ء، ص ۳۸
۴۷- حسن الاعظمی، نومبر ۱۹۴۸ء، محمد عبدہٗ اور پان اسلامزم، فاران لمیٹڈ کراچی، ص ۱۲۸
۴۸- Hirano Junichi، ۲۲-۲۴ نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۸
۴۹- ایضاً
۵۰- واسطی، ص ۲
۵۱- انصاری، مختار احمد، ڈاکٹر، ۱۹۳۸ء، ص ۱۸
۵۲- ماہنامہ آج کل، جنوری ۱۹۸۱ء، دہلی، ص ۱

۵۳- الہلال، ۱۱دسمبر۱۹۱۲ء، کلکتہ،ص۲
۵۴- آزاد، ابوالکلام، مولانا، ۲۰۰۷، ص۱۶-۱۷
۵۵- ایضاً، ص۲۰-۲۱
۵۶- ندوی، ابوالحسنات، ۱۹۲۱ء، ص۸۱
۵۷- ایضاً
۵۸- ندوی، سلیمان، سید، اکتوبر۱۹۲۱ء، ص۶۸
۵۹- ندوی، ۱۹۲۱ء، ص۸۱
۶۰- ایضاً
۶۱- ویمبری، آرمینیس، ۱۹۱۰ء، ص۱۳۳
۶۲- ایضاً
۶۳- Hirano Junichi، ص۹
۶۴- ایضاً
۶۵- عبدالغفار، قاضی، باراول۱۹۲۴ء، ص۵۵
۶۶- حیرت دہلوی، مرزا، ۱۹۰۴ء، ص۳
۶۷- ایضاً، ص۴
۶۸- ایضاً، ص۷
۶۹- ایضاً، ص۳۷
۷۰- ایضاً، ص۸۴
۷۱- ایضاً، ص۸۷
۷۲- ایضاً
۷۳- قیصر، رضوان، جنوری، فروری، مارچ، ۱۹۹۶ء، ص۱۷۲
۷۴- حیرت، ص۲۳۱
۷۵- ایضاً
۷۶- ایضاً، ص۲۳۶
۷۷- ایضاً
۷۸- ایضاً، ص۲۳۷
۷۹- اشرف بہاری، سید سلیمان، مولانا، سن ن، ص۵
۸۰- عبداللطیف، قاضی، ۱۳۳۰ء، ص۶
۸۱- ایضاً

۸۲- مصنف نامعلوم،۱۲۳۱ھ،ص۳

۸۳- رسالہ آج کل،جنوری۱۹۸۱ء،ص۳۰

۸۴- احمد،ص۱۸۹

۸۵- عباسی،قاضی عدیل،تحریک خلافت،ص۳۳

۸۶- ایضاً،ص۳۴

۸۷- قریشی،ص۳۶

۸۸- ایضاً

۸۹- عباسی،ص۳۴

۹۰- قریشی،ص۳۶

۹۱- عباسی،ص۳۴

۹۲- ارشد،آغا غلام حسین،اپریل۱۹۱۲ء،ص۵۳

۹۳- عباسی،ص۳۴

۹۴- احمد،ص۱۹۰

۹۵- خان،عبدالوحید،۱۹۳۸ء،ص۷۳

۹۶- قریشی،ص۳۶

۹۷- ایضاً

۹۸- ایضاً

۹۹- ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ،۱۹۸۰ء،ص۱؛یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں بلنٹ کے علمی اور ادبی خدمات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس کے پہلے باب میں بلنٹ کی مشرق کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور واقفیت کا محاکمہ کیا گیا ہے۔دوسرا باب اس کی شاعری کے نقد پر مبنی ہے۔بلنٹ ایک ایسا شاعر ہے جس نے کئی بڑے لوگوں پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔تیسرا باب بلنٹ کے لکھے گئے ان ڈراموں کی ادبی قدر و منزلت طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے محققین نے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔اس مقالے کا چوتھا باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں بلنٹ کے علمی،سیاسی و ادبی مضامین کے عربی تراجم کے مطالعات پر مبنی ہے۔بلنٹ کی ڈائریاں مسلمانان اسلام اور مصر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس کے مطالعے کے بنا انیسویں صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔اس کی شخصیت کے دورں ہائے خانہ کے تمام اسرار انھیں ڈائریوں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔اس مقالے کا پانچواں باب اس کی ڈائریوں کے مذہبی،سیاسی اور فکری رجحات کے مطالعے پر مشتمل ہے۔مقالے کا آخری باب اس کے سیاسی،مذہبی اور علمی عقائد سے بحث کرتا ہے۔

۱۰۰- اے،البرٹ قدسی زادہ(A. Albert Kudsi-Zadeh)،جنوری،مارچ۱۹۷۲ء،ص۲۵

۱۰۱- انشاءاللہ خان،۱۹۰۳ء،ص۱

۱۰۲- اکرام، شیخ محمد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱۸

۱۰۳- بلنٹ، ۱۹۰۹، ص ۱۲۳-۱۲۴؛ اردو ترجمہ: ضیاء الدین برنی، ۱۹۲۶ء، 'لارڈ رپن کا عہد حکومت'، مشمولہ: 'نگار'، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۲۹

۱۰۴- ایضاً، ص ۱۲۴؛ اردو ترجمہ: ص ۲۹-۳۰

۱۰۵- اردو ترجمہ: ایضاً، ص ۴۳؛ علی گڑھ میں بلنٹ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی وہ لکھتا ہے کہ: ''دوسرے مقامات کے مقابلے میں مجھے یہاں کامیابی نہیں ملی اور یہاں کا جلسہ بھی ناکام رہا۔ رات کو میرے اعزاز میں ایک جلسہ رکھا گیا جس میں سید احمد خان نے ''مستقبل ہند'' پر تقریر کی۔ میں نے سید احمد خان کو کہا کہ میں ہندستان میں شورش برپا کرنے کے ارادے سے نہیں آیا، بلکہ امن اور ہمدردی کے مقاصد کو ترقی دینے کے خیال سے آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انگریز اور مسلمان اتحاد و اتفاق سے زندگی بسر کریں، لیکن معاشرتی تعلقات کی پہلی شرط معاشرتی مساوات ہے۔ جلسہ کے تمام شرکاء سید احمد خان کے ہم خیال تھے''۔

۱۰۶- سید عبدالباری، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۵

۱۰۷- ایضاً

۱۰۸- ایضاً

۱۰۹- ضیاء الدین برنی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۶۰، ۱۶۱

۱۱۰- اے، البرٹ قدسی زادہ، ص ۲۶

۱۱۱- ایضاً

۱۱۲- ایضاً، ص ۲۷

۱۱۳- ایضاً

۱۱۴- ایضاً

۱۱۵- ایضاً

۱۱۶- ایضاً، ص ۲۶

۱۱۷- ایضاً، ص ۲۷

۱۱۸- ایضاً

۱۱۹- انور معظم، ص ۱۷

۱۲۰- ایضاً

۱۲۱- ضیاء الدین برنی، ۱۹۲۶ء، ص ۷۸

۱۲۲- بلنٹ، ۱۸۸۲ء، ص ۱۰۰

۱۲۳- ایضاً، ص ۱۰۸، ۱۰۹

۱۲۴- ایضاً، ص ۱۱۰

۱۲۵- ضیاء الدین برنی، ۱۹۲۶ء، ص ۵۳

۱۲۶- بلنٹ، ۱۹۲۲ء، ص ۷۶

۱۲۷- ایضاً

۱۲۸- جریدہ ۳۳، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۴

۱۲۹- ندوی، ابوالحسن، سید، دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۵

۱۳۰- برنی، ضیاء الدین، ۱۹۵۴ء، ص ۶۱-۶۲

۱۳۱- ایضاً، ص ۶۱

۱۳۲- ایضاً، ص ۶۱

۱۳۳- ایضاً ص ۶۱

۱۳۴- ایضاً ص ۶۱-۶۲

۱۳۵- روزنامہ، وکیل، مورخہ ۲۸ مئی ۱۸۹۶ء، بحوالہ: عہد حکومت سلطان عبد الحمید، یہ کتاب ''عہد نامجات برلن سین سیٹی فانو و پیرس۔ دول ثلاثہ کی پیش کردہ اصلاحات؛ مولوی محمد انشاء اللہ خان نے ۲۵ ستمبر ۱۸۹۵ء کو مرتب کیا۔ اس کتاب میں نپولین بوناپارٹ کی قید کیے جانے کی مختصر تاریخ اور اس کے ایک ہمراہی کا خط بھی ہے۔ اس کے علاوہ شورش آرمینیا کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں اس کتاب کی تیسری اشاعت ۱۹۰۵ء میں ہوئی ہے۔ افغانی کے متعلق 'وکیل' اخبار کا پیش کیا جانے والا حوالہ اسی کتاب کے حواشی سے لیا گیا ہے۔ دیکھیے ص ۱۲۳-۱۲۴

۱۳۶- براؤن، ای جی، (Edwar Granville Brown)، ۱۹۱۰ء، ص ۱۰

۱۳۷- ______ رسالہ، تمدن، جلد ۳۱ جون ۱۹۱۱ء، ماخوذ از: پروفیسر براؤن، اردو ترجمہ: سید شوکت صاحب دہلوی، ص ۲۴؛ براؤن نے اپنی کتاب میں مرزا آغا رضا کرمانی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ای جی براؤن، (Edwar Granville Brown)، ۱۹۱۰ء، *The Persian Revolution of 1905–1909*، ص xi

با یران مباد آنچنان روز بد — کہ کشور بہ بیگانگان او فتد
نخواہم زمانی کہ این نو عروس — بیفتد بزیرِ جوانانِ روس
بگیتی مباد آنکہ این حوردیس — شود ھمسر لردی از انگلیس

۱۳۸- عبد الغفار، قاضی، فروری ۱۹۳۲ء، ص ۲۴

۱۳۹- ھمدانی، رضا، ۱۹۶۲ء، ص ۵۱

۱۴۰- ایضاً، ص ۵۲

۱۴۱- ای جی براؤن، (Edwar Granville Brown)، ۱۹۱۰ء، ص ۸؛ رسالہ، تمدن، جلد ۳۱ جون ۱۹۱۱ء، ماخوذ از: پروفیسر براؤن، اردو ترجمہ: سید شوکت صاحب دہلوی، ص ۱۸

۱۴۲- معظم، انور، ص ۲۲

۱۴۳- بریلوی، محمود، جنوری ۱۹۴۱ء، ص ۸

۱۴۴- عبدالغفار، قاضی، فروری ۱۹۳۲ء، ص ۲۲

۱۴۵- ایضاً، ص ۲۹

۱۴۶- بلنٹ، ۱۹۲۲ء، ص ۱۸۷؛ بلنٹ کی کتاب میں ص ۱۰۵ پر اس کی پوری تفصیلات دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۴۷- ایضاً؛ اس کی پوری تفصیلات کے لیے دیکھیے: 'Triumph of the Reformers in Egypt'، مشمولہ: *Secret History of the English Occupation of Egypt Being a personal Narrative of Events*؛ اس کتاب میں عربی پاشا کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو اس نے قید کے دوران بلنٹ کو لکھے تھے۔

۱۴۸- عبدالغفار، قاضی، فروری ۱۹۳۲ء، ص ۳۰-۳۱؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں: *Secret Hsitory of the English Occupation of Egypt Being a personal Narrative of Events*، ص ۱۰۳

۱۴۹- ایضاً، ص ۳۱

۱۵۰- رسالہ، الہلال، ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۲۵

۱۵۱- ایضاً، ص ۳۲۵

۱۵۲- برنی، ضیاء الدین، ۱۹۲۶ء، مشمولہ: نگار اپریل ۱۹۲۶ء، ص ۷۶

۱۵۳- ایضاً، ص ۷۲

۱۵۴- ایضاً، ص ۷۷

۱۵۵- ایضاً

۱۵۶- قاسمی، انوارالحق، مولانا، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۷-۲۱۸

۱۵۷- حیدرآباد دکن مسلمانوں کی ایک ایسی ریاست تھی جو ترکی کے آخری خلیفہ سے راست خاندانی مراسم رکھتی تھی اور حیدرآباد کے مسلمان ترکی کی خلافت کو اسلامی خلافت بھی تسلیم کرتے تھے۔ بلنٹ جیسا عالی دماغ سیاست دان اس پورے عمل سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے ریاست کے تمام نوابوں سے رابطہ قائم کیا' اور خلافتِ عثمانیہ کے حوالے سے ان سے بحث تکرار کر کے ان کی جذباتی وابستگی کو تبدیل کرنا چاہا۔ اس کی ڈائری میں حیدرآباد میں گزارے گئے ایام کا مطالعہ کرنے سے کئی اہم پہلو کا سامنا ہوتا ہے۔ نواب سالار جنگ، رسول یار جنگ، ریاست میں مقیم شیعہ عالم سید علی شوستری، سید علی بلگرامی، سلطان نواز جنگ اور دیگر صاحبانِ علم و فضل سے ملاقاتوں کی روداد اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ بلنٹ ان صاحبان کو اس بات کی جانب آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ اب عالم اسلام کو ترکی سے کوئی رہ نمائی نہیں مل سکتی۔ دیکھیے: برنی، ضیاء الدین، ۱۹۲۶ء، لارڈ رپن کا عہد حکومت، اردو ترجمہ: *India under Ripon: A*

Private Diary: مشمولہ: نگار اپریل ۱۹۲۶ء، ص ۷۶
۱۵۸- الزبتھ لونگ فورڈ (Elizabeth Longford)، ۲۰۰۷، ص ۳۰۰
۱۵۹- ضیاء الدین برنی، ۱۹۲۶ء، مشمولہ: نگار اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۳۲
۱۶۰- ایضاً، ص ۳۲
۱۶۱- ایضاً، ص ۳۲
۱۶۲- الزبتھ لونگ فورڈ، ص ۱۹۸
۱۶۳- ایضاً
۱۶۴- ایضاً، ص ۱۹۲
۱۶۵- ایضاً
۱۶۶- بلنٹ، ۱۹۲۲ء، ص ۴۰۴، ۴۱۶
۱۶۷- الزبتھ لونگ فورڈ، ص ۱۹۲
۱۶۸- ایضاً، ص ۱۷۹
۱۶۹- برنی، ضیاء الدین، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۷
۱۷۰- ایضاً، ص ۱۸۸
۱۷۱- وارن ڈاکٹر (Warren Dockter)، آٹومن، ۲۰۱۱، ص ۱۷
۱۷۲- ایضاً، ص ۸۳
۱۷۳- ضیاء الدین برنی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۸
۱۷۴- الزبتھ لونگ فورڈ، ص ۱۹۱
۱۷۵- محی الدین، محمد توفیق (Mohammed Tawfiq Muheiddin El Bujairan)، ۱۹۸۰ء، *The Literary Achievement of Wilfrid Scawen Blunt* پی ایچ ڈی کا مقالہ، Sheffield University، انگلینڈ، ص ۱۰۹
۱۷۶- ایضاً
۱۷۷- ایضاً
۱۷۸- بلنٹ، ۱۸۸۳، ص ۵

باب سوم

سر سید احمد خان، جمال الدین افغانی اور بین الاسلامیت

سید احمد خان، جمال الدین افغانی اور بین الاسلامیت

۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کی قیادت جس فرد کے حصے میں آئی وہ سید احمد خان تھے۔ اس قیادت کو سب سے زیادہ سنگین مقابلہ اپنے سیاسی مشن کے حوالے سے ایک غیر ہندوستانی مسلمان جمال الدین افغانی کے نظریات و افکار سے کرنا پڑا[۱]۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے افغانی اور سید احمد خان دونوں کے نظریے اور فکر پر عمل کیا۔ یہی وجہ کہ ان صاحبان کو خاطر خواہ کامیابی ملی۔ افغانی اور سید احمد خان کے نقطہ ہائے نظر میں تین بنیادی اختلافات ہیں:

۱- افغانی، سید احمد خان کے انتہائی عقلیت پسندانہ خیالات سے اختلاف رکھتے تھے اور سید احمد خان کے علم الکلام کو کفر کا درجہ قرار دیتے تھے[۲]۔ حقیقتاً ان کی کتاب ردِ نیچریت سید احمد خان کے عقلی دلائل کے جواب میں ہے۔

۲- افغانی، سید احمد خان کے مذہبی خیالات اور تعلیمی لائحہ عمل کو برطانیہ کے مفادات کے ذیل میں سیاسی محکومی سے تعبیر کرتے تھے[۳]۔ ہندوستان کے مسلمان سر سید احمد کی تحریک سے وابستہ تو تھے مگر ان کے مذہبی عقائد کو تقریباً تمام رفقاء سر سید نے رد کر دیا تھا۔ جمال الدین افغانی کی رہ نمائی میں مسلمانوں کو بہ حیثیت ملت اس امر کا احساس ہوا کے ہم نہایت کمزور ہیں اور اپنی مدافعت نہیں کر سکتے اگر یہی حالات رہے تو یورپین اقوام ہمیں اپنا غلام بنا لیں گی اور پھر ہم اپنی انفرادی حیثیت ہمیشہ کے لیے دنیائے عالم میں کھو دیں گے[۴]۔ اسی وجہ سے انھوں نے اسلامی ممالک کو برطانوی سامراج کے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے عالمگیر اتحادِ اسلامی کا جذبہ پیدا کیا۔

۳- افغانی، سید احمد خان کو اپنا حریف اور مدِ مقابل اس لیے سمجھتے تھے کہ سید احمد خان اتحاد اسلامی کے مخالف اور ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں سے لاتعلق کرنے کے خواہش مند تھے[۵]۔ ان کے ایک اہم رفیق کار محسن الملک نے نہایت واضح انداز میں کہا تھا کہ عبدالحمید کا خلیفہ کے طور پر روحانی لحاظ سے بھی ہم پر کوئی اثر ورسوخ یا دباؤ نہیں ہو سکتا، اس کا یہ اثر اپنے ملک میں ہو تو ہو[۶]۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں

میں اتحاد بین المسلمین کے نظریے کو پروان چڑھتا دیکھ کر محسن الملک بھی تحریک اتحادِ اسلامی کے حامی ہو گئے انھوں نے علی گڑھ کالج میگزین میں سلطان عبدالحمید کو ہندوستان کے لیے اعزازی خلیفہ کہا[7]۔

افغانی نے انگریزی زبان کی تحصیل کو ہندوستان کے لیے از حد ضروری قرار دیا کیوں کہ معاشیات، صنعت وحرفت کے متعلق تمام علوم اس زبان میں موجود ہیں اور ان علوم سے آگاہی کے بغیر قومی ترقی محال ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تمام علوم وطنی زبان میں منتقل کر دیئے جائیں۔ گویا ایک وسیع پیمانے پر ترجمے کی مہم کا آغاز ہونا چاہیے۔ وطنی زبان میں تمام علوم کا ہونا اس لیے لازمی ہے کہ یہ علوم قوم کے مزاج میں راسخ ہو جائیں اور ہر ہر قدم پر غیر زبان کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ وطنی زبان کے لیے افغانی نے اردو اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کی ہمہ گیری کو مستحکم تر بنانے کے لیے اس نکتے کی طرف رہنمائی بھی کی کہ ہمیں اپنی زبان اور تہذیب پر فخر کرنا چاہیے[8]۔ سید احمد خان انگریزی زبان اور تہذیب کے مقابلے میں ہندوستانی زبان اور تہذیب کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جب کہ افغانی نے ہندوستان تہذیبی وحدت کے موضوع پر ہمیشہ مقامیت کو ترجیح دی تھی[9]۔

ادب کے حوالے سے سید احمد خان اور افغانی کے نظریات میں مطابقت پائی جاتی ہے: افغانی نے ادب کا بنیادی مقصد یہ بتایا کہ وہ لوگوں کے حقوق کی مدافعت کرے اور ان کی خدمت بجالائے، ان تصورات اور اندازِ نظر نے ادب کی ایک نئی تشکیل کی جو اپنے مواد کے اعتبار سے قومی ضرورتوں کے مطابق تھی۔ ان کے خیال میں ادب حقوق کے حصول کے لیے جد و جہد کرے اور حکمرانوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتا رہے۔ بحیثیت مجموعی افغانی نے انشاء پردازوں کے ایک مکتب فکر میں تازہ اور نئی روح پھونکی جس میں اسلامی قومیت کے عناصر اور اس کے اجزائے ترکیبی سے ایسا ادب تشکیل پایا جس کی کیفیت اس وقت کی تمام تر مروجہ اقدار و روایات سے جداگانہ تھیں[10]۔ اصل میں افغانی کے مساعی سے اردو ادب میں اسلامی تاریخ کے رجحانات پروان چڑھے اور اس کی اعلیٰ ترین شکل ہمیں شرر کے تاریخی ناولوں میں اور شبلی کی محققانہ تگ و دو کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

افغانی نے مصر میں اخبار بینی اور اخبار نویسی کا نہ صرف شوق پیدا کیا بلکہ بہت سے بے باک اخبار نویس بھی پیدا کیے۔ مصر، محروسہ اور مراۃ الشرق وغیرہ نے مصر میں اخبار نویسی کی بنیاد ڈالی۔ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء میں انھوں نے پیرس سے عروۃ الوثقی جاری کیا۔ اس کی صدائے اصلاح وحرمت نے مسلمانوں

کی تعلیمی وادبی فضامیں عالمی سطح کے اثرات مرتب کیے جس میں اخبار نویسی کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔

تہذیب الاخلاق اور عروۃ الوثقی کا معاملہ یہ ہے کہ دونوں اصلاحی نوعیت کے حامل پرچے تھے لیکن تہذیب الاخلاق کے اثرات نہایت گہرے اور تعمیری رہے جبکہ عروۃ الوثقی کسی ٹھوس تعمیری تحریک کی بنیاد نہیں ڈال سکا اور نہ ہی اس کے ذریعے بڑے مقاصد حاصل کیے جاسکے۔

ادبی ہم آہنگی اور مقاصد کی یکسانیت کے باوجود افغانی اور سید احمد خان کے مذہبی عقائد میں اختلافات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مذہبی اصلاحات کے معاملے میں افغانی کی تعلیم یہ تھی کہ ایسی اصلاحات ضروری ہیں جو اسلام کی تعلیم کے عین مطابق ہوں، وہ اپنے مواعظ میں کہا کرتے تھے کہ سائنس اور علم اسلام آپس میں بھائی بہن ہیں اور اس لیے ان میں کوئی تنازعہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اسلام میں بے حد لچک ہے اور اس کا دارومدار عقل پر ہے۔ اگر عقل اور روایت کے مابین کبھی کش مکش ہو تو روایت کے مقابلے میں عقل کا ساتھ دیں گے انھوں نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں سمجھا[11]۔

افغانی نے سید احمد خان کی تفسیر پر ایک مضمون تفسیر مفسر پر اپنے نقطہ ہائے نگاہ کو واضح کیا ہے لکھتے ہیں کہ: میں خود چوں کہ اس امر پہ ایمان رکھتا ہوں کہ حق تعالیٰ اس شریعت حق اور ناموس صادقہ کو زائل نہ ہونے دے گا لہٰذا دوسروں سے زیادہ اس بات کا متوقع ہوں کہ ایک حکیم دانا کی حکمت سے فیض پایا جائے[12]۔ پھر افغانی سید احمد خان کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

تفسیر کی ابتدا میں صرف سورۃ آیت اور حرف مقطعہ کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے بعد اپنی پوری ہمت اس پر صرف کی ہے کہ اس آیت کی جس میں ملائکہ، جن، روح الامین، وحی، جنت، دوزخ، معجزے وغیرہ کا ذکر ہے۔ ظاہری معنی کے سوا ایسی تاویل کی جائے کہ گذشتہ زمانے کے زندیقوں کی تاویلات سے مشابہ ہو۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ گذشتہ زمانے کے زندیق بھی علما تھے اور اس عہد کا مفسر بے چارہ محض عامی ہے۔ لہٰذا زندیقوں کے اقوال پر بھی بہ خوبی حاوی نہیں[13]۔

افغانی نے اپنے اس مضمون میں کئی سوالات اٹھائے ہیں: مفسر کا اس تفسیر سے مقصد کیا ہے؟ اصلاح قوم ہے تو ناموس اسلامی کے متعلق مسلمانوں کے اعتقادات کو زائل کرنے کی کوشش کیوں کی گئی ہے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ تمام مذاہب اس دین حق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں[14]۔ رسالہ الردعلی الدہرین کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانی، سید احمد خان کی انگریز دوستی سے بہت زیادہ خفا تھے۔ افغانی کا

خیال تھا کہ سرسید نیچریت کو اس لیے ہوا دے رہے ہیں تا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بنا سکیں [۱۵]۔ افغانی اور سید احمد کے مذہبی خیالات میں ایک اہم بات یہ تھی کہ سید احمد خاں اور افغانی اجتہاد کے قائل تھے۔ اور افغانی کی طرح سید احمد خان بھی اسلام میں علوم جدیدہ اور سائنسی اکتشافات کی بنا پر اجتہاد کے ذریعے تغیر پیدا کرنا چاہتے تھے [۱۶]۔

حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سید احمد خان ہمیشہ مصالحت اور انگریزوں سے مرعوبیت کا شکار رہے۔ افغانی بھی بادی النظر میں انگریز دشمن نہیں تھے وہ جمہوری اور اصلاحی عمل پر پختہ یقین رکھتے تھے اور انگریز عمل داروں سے ان کے نہایت قریبی تعلقات تھے۔ مگر وہ سید احمد خاں کے دینی عقائد کو قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے اس وجہ سے انھوں نے سید احمد خان کی تحریک کو رد کیا اور اس کی مخالفت کی [۱۷]۔

جہاں تک سید احمد خان کے مذہبی مسائل پر علم الکلام کی بنیادی باتوں کا تعلق ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے یہ عمل کسی ٹھوس منصوبے کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا، اصل میں ان کی بنیادی خدمت تعلیم سے وابستہ تھی۔ سید احمد خان نے اپنی رائے اور قیاس کے زور سے قرآنی آیات کو نیا مفہوم دے کر ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کی پیروی نے بعضوں کو بری طرح متاثر کیا اور انھوں نے ہر آیت یا حدیث کی تاویل کر کے حسب خواہش مراد لی ہے [۱۸]۔

سید احمد خان نے دینی مباحث کو روحانی سمت سے ہٹا کر عقلی سمت کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس رجحان کو ترقی دی ہے کہ زندگی کی مادی قدریں ہی قابل اعتنا ہیں باقی جو کچھ ہے ضمنی ہے [۱۹]۔ جب کہ مذہبی زندگی کی بنا روحانی تجزیہ اور مشاہدہ ہے۔ عقل و قیاس پر نہیں [۲۰]۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی حقیقتیں بھی اپنی جگہ مکمل ٹھوس نہیں ہوتیں، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے مگر دنیا کے تمام مذاہب جن حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہیں فی زمانہ اس کو حق مانا گیا ہے۔ سید احمد خان اسلام کے بنیادی نصوص کو تبدیل کر کے انھیں سائنس کے تابع بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس میں انھیں کوئی کامیابی نہیں ہو سکی ان کے ہم عصر رفقاء نے بھی ان کے مذہبی مشن میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ چناں چہ مولوی چراغ علی کے سوا ان کے اکثر ہم کار شبلی، محسن الملک، نذیر احمد، مولوی سمیع اللہ، حالی وغیرہ ان سے الگ رائے رکھتے تھے [۲۱]۔

افغانی نے کسی علم الکلام کی بنیاد نہیں رکھی، اصل میں افغانی کو جس چیز نے سب سے زیادہ مشغول رکھا وہ ان کی سیاست تھی [۲۲]۔ علم الکلام کی ناکامی کی ایک اصولی وجہ یہ ہے کہ متکلمین عقل کو ہر چیز پہ مقدم رکھ کر دلائل

اور قیاسات کے ذریعے اسلام کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دلائل خواہ کسی قدر موثر کیوں نہ ہو ان سے متشککین کی روحانی تسکین نہیں ہوتی [۲۳]۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے افغانی اور سید احمد خان کی راہیں جدا ہوتی ہیں اور علم الکلام کی بنیاد رکھنے کی وجہ سے سید احمد خان کی شخصیت اسلامی حلقوں میں معتبر نہیں ہو سکی، جب کہ ان کی تعلیمی خدمات افغانی کی مساعی سے بہت زیادہ بلند ہے کیوں کہ افغانی کسی ایک جگہ مستقل مزاجی کے ساتھ کام نہیں کرتے تھے لہٰذا فکری طور پر ان کی شخصیت کی جھلک تو تمام عالم اسلام میں نظر آئے گی لیکن کہیں بھی مربوط اور ہمہ جہت اثرات عالم اسلام کے کسی ایک بھی ملک میں نظر نہیں آئے گا خواہ وہ مصر ہی کیوں نہ ہو جس پر افغانی کی شخصیت کے گہرے اثرات مرتسم ہوئے تھے۔

سرسید کی تحریک عالم اسلام کی دوسری تحریکوں سے بعض اعتبار سے مختلف تھی۔ اس دور کی تقریباً بیش تر تحریکیں بین الاقوامی تھیں۔ ان کے اثرات کا دائرہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں تھا۔ افغانی کے اثرات بھی عالم اسلام کے کئی بڑے ممالک میں موجود تھے، اسی طرح وہابی تحریک بھی نجد کی چہار دیواری سے نکل کر اسلامی دنیا کے کئی علاقوں میں پھیل گئی تھی۔ کم و بیش یہی حال سنوسی تحریک اور دیگر تحریکوں کا بھی تھا۔ اس کے خلاف علی گڑھ تحریک خالصتاً ہندوستانی حالات کا نتیجہ تھی اور صرف ہندوستان تک محدود رہی اس کے رہنماؤں نے دوسری تحریک کے اثرات تو قبول کیے۔ اس تحریک کی انھوں نے دیگر اسلامی ممالک میں ترویج کی ضرورت محسوس نہ کی [۲۴]۔

یہ سچ ہے کہ مغربی طاقتیں اسلامی ممالک پر اپنا پنجہ جمانے کی کوشش بھرپور طریقے سے کر رہی تھیں اور ان کے خلاف افغانی کے نکتہ نظر کو تسلیم کرتے ہوئے متحدہ محاذ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے ایک مضمون وحدت اسلامیہ میں افغانی کے خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> میں یہ نہیں کہتا کہ تمام دنیائے اسلام کا صرف ایک بادشاہ یا ایک امیر ہو کیوں کہ یہ مشکل اور دشوار ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا۔ کہ تمام دنیائے اسلام کا سلطان قرآن مجید اور ساری آرزوؤں کا مرکز محور دین و مذہب ہو۔ ہر امیر یا سلطان اپنی دوسری اسلامی حکومت کی حفاظت وضمانت کے لیے اپنی ساری طاقت قربان کر دے [۲۵]۔

لیکن اس نقطہ نظر میں بھی سقم ہے کیونکہ نو آبادیات نے جس طرح اسلامی ممالک میں اپنی طاقتوں کے اقتدار کو قائم کیا تھا۔ اس کی نوعیت اور تسلط کا حلقہ ہر ملک میں مختلف تھا۔ اور وہاں کے سیاسی وسماجی اور معاشی حالات دوسرے ملکوں سے مختلف تھے۔ ایسی صورتحال میں بین الاقوامی تحریک کے بجائے معاصر مغربی

مدبروں کا یہ فارمولا ہیEvery Nation for itself and God for Us allمسائل کا علاج بن سکتا تھا۔ جمال الدین افغانی کی تحریک بنیادی طور پر اسلامی ممالک کے مسائل کا حل پیش کرنے میں ناکام رہی[۲۶]۔

تحریک علی گڑھ اور سر سید کے فکر وعمل میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کے سہارے علی گڑھ تحریک کو بین الاقوامی روپ دیا جا سکتا تھا لیکن انھوں نے اپنا نصب العین متعین کرنے میں حقائق کو پوری طرح پیش نظر رکھا۔ انھوں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ علی گڑھ تحریک میں بین الاقوامی عنصر نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس تحریک کا بانی بین الاقوامی حالات سے نابلد تھا۔ ان کو عالم اسلام کی زبوں حالی کا پورا ادراک تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے سید احمد خاں نے کہا تھا کہ "ترک و عرب و فارس آج کل اسی نتیجے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ جس نتیجہ کی ذلت وخواری ہم اٹھا رہے ہیں"[۲۷]۔

ان کو فواد پاشا، خیر الدین تیونسی، وغیرہ کی تحریکوں کا پوری طرح علم تھا۔ اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے فواد پاشا کی رپورٹ سے یہ جملے نقل کیے تھے اور ان کو اپنی کوشش کی بھی اساس قرار دیا تھا[۲۸]۔ "اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی انسانیت اور تہذیب اور رحم دلی کو کمال کے درجہ تک پہنچانے والی ہیں"[۲۹]۔ خیر الدین تیونسی کی کتاب اقوام المسالك کو انھوں نے جلسوں میں پڑھ کر سنایا تھا۔ اور قوموں کے عروج و زوال پر ان کے نظریات کو وضاحت سے بیان کیا تھا[۳۰]۔

ہندو مسلم سیاست کے متعلق سید احمد خان کی رائے کو مسلمانوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے سیاسی لائحہ عمل کے طور پر اپنایا گیا، لیکن جب ان کی وفاداری بین الاسلامی ہمدردیوں کے مدِ مقابل آنے لگی تو اسے مسترد کر دیا گیا۔ ۱۸۹۰ء کے دور کے اردو اخبارات کا اچھا خاصا بڑا حصہ اس رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بین الاسلامیت اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ ہمدردیاں ملکی حالات کی پیداوار تھیں حالاں کہ بعد میں وہ جمال الدین افغانی کی افسانوی شخصیت اور نام سے منسوب ہو گئیں[۳۱]۔

سید احمد خان کا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ ترکوں اور ترکی کے متعلق اپنے دل میں جو خیالات رکھتے تھے اس کا برملا اظہار نہیں کر پائے۔ ان کا دل مسلمانوں کا تھا۔ وہ مسلمانوں کی خدمت اس انداز میں کرنا چاہتے تھے جس سے انگریزوں کو کوئی تکلیف نہ ہو، اپنے مضمون یونان اور ترک میں ہندی مسلمانوں پر وہ اس لیے

برہم ہو گئے کہ ترکی کی فتح پر انھوں نے جشن منایا تھا[۳۲]۔ لکھتے ہیں کہ:

یونانیوں پر ترکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے بے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے۔ ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح کے عنوان سے پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا اور اسلام اسلام پکارنا، نہایت ناسمجھی کی بات ہے[۳۳]۔

سید احمد خان ترکوں کی امداد کے حق میں تھے لیکن اس کے باوجود ترکوں کے ساتھ تعلقات کو اتحادِ اسلامی یا مسلمان برادری کے احساسات کے ساتھ نہیں بلکہ انسانی اقدار پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ سید احمد خان اتحادِ بین المسلمین کے خلاف تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ عالمی سیاسیات میں حصہ لینے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند پر انگریزی عتاب زیادہ ہو سکتا ہے۔ وہ ترکی کے معاملے میں ششش و پنج کا شکار رہے اور کھل کر موافقت میں اظہار نہیں کر پائے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان ترکوں کے ساتھ معاونت کریں مگر اس حد تک کہ انگریز حکام اس سے نالاں نہ ہوں۔ اپنے ایک مضمون سلطان اور ہندوستان کے مسلمان میں لکھتے ہیں کہ:

سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی۔ اس سے کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہوا ہو۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا ہے لیکن جو ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا، بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے، ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے[۳۴]۔

سر سید نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں لفظِ قوم کا استعمال کئی مقامات پر کیا ہے۔ قوم سے ان کی مراد ایک مخصوص مذہبی ملت ہے۔ اس لیے جب کبھی انھوں نے ہماری قوم جیسے الفاظ کا استعمال کیا تو وہاں ان کا مطلب مسلمانوں ہی سے ہے۔ جب وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں وہ دو قومیں جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک قوم کہلانے کے لیے ایک مذہب کا پابند ہونا ضروری ہے[۳۵]۔

اگر ان خطوط پر سید احمد خان کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے نظریات جمال الدین افغانی کے تصورِ ملت کے لحاظ سے زیادہ بامعنی دکھائی دیتے ہیں اور سیاسی مصلحت اندیشی کا بھی یہ تقاضا تھا کہ تمام عالمِ اسلام کے مسلمان اپنے مخصوص ماحول میں رہ کر استبدادی قوتوں سے مقابلہ کریں۔ ان کا قومی نظریہ اس جدید تصور سے مختلف تھا جس میں ایک قوم کی تشکیل میں ملک، رنگ، نسل، زبان مشترکہ تاریخی ورثہ جیسے عناصر کو اہم جانا جاتا ہے۔ ایسی بات نہیں کہ وہ ان عناصر سے بے خبر تھے تاہم انھوں نے کہا ہے کہ ظہورِ اسلام سے تمام دنیاوی قیود ختم ہو گئیں اور دنیا کے تمام کلمہ گو ایک نئے روحانی بلکہ خدائی قومی رشتے سے جڑ گئے ہیں[۳۶]۔ انھوں نے اپنے اس نظریے کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

زمانہ دراز سے جس کی ابتداء تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے۔ قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کے باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تفرقہ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا۔ اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط ہے۔ تمام قومی سلسلے تمام قومی رشتے سب کے سب اسی روحانی رشتہ کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی رشتہ قائم ہو گیا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجک وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا بلکہ جس نے عروۃ الوثقیٰ کلمہ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہو گیا[۳۷]۔

سر سید نے یقیناً مذہب کو قوم کی بنیاد قرار دیا اور اس بنیاد پر دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم شمار کیا[۳۸]۔ اس لحاظ سے سر سید احمد خان کا نظریہ قومیت عالم گیر سوچ کا حامل ہے مگر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کو عالمی رخ پر ڈالنے کے لیے کسی حال میں راضی نہیں تھے۔ ان کے بعد ہندوستان میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب مسلمانوں کی ساری سیاست اسلامی ممالک کے گرد گھومنے لگی۔ ایسی صورت میں ہندوستانی مسلمان اپنے مسائل بھول کر عالم اسلام سے قلبی و ذہنی طور پر وابستہ ہو گئے۔ مگر وقت گذر جانے کے بعد جب عالمی صورت حال میں خلافت کے خاتمے سے ٹھہراؤ پیدا ہوا تو ان پوری تحریکات سے وابستگی کا دکھ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن و دل کو بری طرح متاثر کر گیا اور پھر موجودہ حالات میں وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔

سید احمد خاں اور افغانی کے مزاج میں اتنا ہی فرق تھا جتنا دو انسانوں میں ہو سکتا ہے۔ سید احمد خاں عزم کوہ کن تھے نامساعد حالات نے کبھی ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کی۔ اسی عزم اور پر سکون طبیعت کے نتائج وہ ہزارہا صفحات ہیں جو انھوں نے چھوڑے ہیں۔ افغانی آگ لگاتے تھے سید احمد خاں خود آگ میں جلتے تھے۔ افغانی نے برہم زن کے نعرے لگائے ہیں اور سید احمد خان نے اپنے خونِ جگر سے جہانِ تازہ کی تعمیر و تشکیل کا سامان پیدا کیا ہے[۳۹]۔

شبلی نعمانی اور سید احمد خان کے اختلافات:

شبلی کی بین الاسلامی مراجعت

سید احمد خاں کے تعلیمی ادارے علی گڑھ میں مذہبی تعلیمات میں توازن پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کالج میں روایتی اندازِ فکر کو بھی جاری رکھا جائے۔ چناں چہ علی گڑھ تحریک میں روایت کو فروغ دینے میں سب سے اہم نام شبلی نعمانی کا ہے۔ سید احمد خاں کے برعکس ان کے لیے بین الاسلامیت کے نظریے میں زیادہ کشش تھی۔ انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ترکی کا سفر کیا' اور سلطان عبدالحمید نے انھیں ''تمغۂ مجیدیہ'' سے بھی نوازا[۴۰]۔ ترکی میں انھوں نے عثمان پاشا سے ملاقات کی' اس نے پرتپاک استقبال کیا اور اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی' تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی دیا جو ان کے سفرنامے میں موجود ہے[۴۱]۔

شبلی، سید احمد خاں کے رفقا میں پہلے شخص تھے جنھوں نے جمال الدین افغانی اور ان کے شریک کار شیخ محمد عبدہٗ سے قاہرہ میں ملاقات کی اور باہمی روابط پیدا کیے[۴۲]۔ شبلی کا سیاسی شعور سید احمد کے سیاسی نظریات پر ایک اضافہ ہے۔ سید احمد خان کے ہاں قوم کا تصور تو ضرور ہے لیکن انگریزوں سے کسی آزاد وطن کا نہیں۔ شبلی نے انگریز دشمنی کے ساتھ قوم کا تصور بھی دیا۔ سید احمد جب کالج کھولتے ہیں تو اس کا نام ''اینگلو محمڈن'' رکھتے ہیں اور شبلی اس پُرآشوب دور میں بھی اپنے اسکول کا نام ''نیشنل اسکول'' رکھتے ہیں سید احمد علی گڑھ میں عمارتوں کے نام انگریزوں کے نام پر رکھتے ہیں اور ان کے یہاں وائسرائے اور گورنر مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں۔ شبلی کے ندوہ میں بین الاقوامی اسلامی اتحاد کے رہنما اور مشہور مصری اخبار المنار کے مدیر رشید رضا بلائے جاتے ہیں۔ سید احمد خان نے اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعادہ کیا کہ ''ہندوستان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہندو اور مسلمان حاکم ہوں اور امن قائم رہ سکے''[۴۳] لیکن مقالاتِ شبلی میں مسئلہ آرمینیا[۴۴] اور اسی قسم کے دوسرے مضامین میں اور شبلی کی بیش تر نظموں کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ شبلی

انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے [۴۵]۔

شبلی نے قوم کی اصلاح کے لیے جو نظامِ فکر و عمل ترتیب دیا اس میں دو باتیں نمایاں ہیں اوّل یہ کہ ملّتِ اسلامیہ ایک قوم ہے جو ابدی ہے جو مخصوص ماحول میں ہمارا طریق کار کتنا ہی محدود ہو نصب العین بہر حال عالم گیر ہونا چاہیے [۴۶]۔ دوم یہ کہ شبلی نعمانی نے بین الاسلامیت کے نظریہ کو فروغ دینے کے لیے ہندی مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی اشتراک عمل کو تاریخی حوالوں سے پُر کیا۔

ہندوستان میں افغانی کے نظریہ بین الاسلامیت کو ۱۹۱۲ء۔۱۹۱۳ء میں ابوالکلام آزاد نے ترقی دی جو المنار جماعت سے راست تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے الہلال اور البلاغ نامی رسالوں میں جو وہ کلکتہ سے شائع کرتے تھے مضامین کے ایک سلسلے میں اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد اپنے خطبات میں برابر اس کی ترویج کی بلکہ ان دونوں رسالوں کو انھوں نے تحریکِ اتحادِ اسلامی کے لیے مختص کر دیا مگر علی گڑھ تحریک کے خلاف انھوں نے جو کچھ لکھا' اسے افغانی اور شبلی کی شخصیت کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے [۴۷]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی اور ابوالکلام آزاد گہرے دوست تھے اور دونوں کے رجحانات میں کافی یکسانیت بھی پائی جاتی تھی۔

شبلی نے علی گڑھ سے الگ راہ کیوں اختیار کی اس سوال کا جواب اتنا پیچیدہ بھی نہیں، شبلی کی خاص طبیعت اور نفسیاتی ساخت کے دخل کے علاوہ بعض خارجی عوامل بھی ایسے تھے جس نے انھیں علی گڑھ تحریک سے دور کر دیا' اور ان میں ایک بڑی وجہ افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کی تحریک اور شخصیت کا اثر تھا [۴۸]۔

شبلی نعمانی علی گڑھ میں ہی تحریک اتحاد اسلامی سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جب مصر گئے تو شیخ محمد عبدہٗ سے ملے اور مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔ افغانی نے قیامِ حیدر آباد کے دوران ایک فارسی رسالہ ''ردِ نیچریہ'' سید احمد خاں کی تفسیر کے خلاف لکھا تھا' شیخ محمد عبدہٗ نے عربی میں اس کا ترجمہ ''رد دہرین'' کے نام سے کیا تھا اور اس کے شروع میں افغانی کے حالات بھی لکھے تھے شبلی نعمانی نے اپنے سفر نامے میں ان حالات کے اقتباسات کو بھی نقل کیا ہے۔ اور شیخ محمد عبدہٗ کی مہارتِ فن اور زورِ تحریر کی تعریف کر کے اربابِ فن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عبدہٗ کے طرز کی تقلید کریں [۴۹]۔ افغانی کے اسی اثر نے شبلی کو سید احمد خان سے زیادہ بدظن کر دیا اور محمد عبدہٗ نے انھیں ایک ایسا راستہ دکھایا جسے وہ احیائے دین اور اسلامی تعلیم کا واحد طریق کار سمجھنے لگے [۵۰]۔ آگے چل کر اسلامی ممالک پر انگریزوں کی چیرہ دستیوں، ہندوستان میں ہندو مسلم تفریق کی پالیسی اور مسلمانوں کو سیاست اور دیگر ترقی پسند عناصر سے الگ رکھنے کی ترکیبوں نے شبلی کو جمال الدین افغانی کے اتحاد اسلامی

کے جدید رجحانات کا اسیر بنا دیا۔

شبلی اسلامی جدوجہد اپنے مخصوص ماحول میں اسلامی سطح پر کرنا چاہتے تھے۔ علی گڑھ اور شبلی کا مطمح نظر قوم کی ذہنی تربیت اور طریق کار تعلیم و تدریس تھا۔ اس معاملے میں بھی شبلی نے دارالعلوم ندوہ پر اکتفا نہیں کیا۔ دارالمصنفین کے نام سے ایک دینی اور علمی درس گاہ کا نقشہ ترتیب دیا۔

شبلی کے تدبر اور بین الاسلامیت کی سب سے بڑی یادگار اور اسلامی جدوجہد کا مظہر یہی ادارہ قرار پاسکتا ہے جس کے کارناموں نے ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں میں بھی اسلامی علوم کے احیاء کا راستہ ہموار کیا، اور بعض معرکتہ الآرا تصنیفات کے ذریعے یہ ادارہ علمی نشاۃ ثانیہ کا ایک نشان بن گیا[۵۱]۔ شبلی کے اس ادارے کو ہندوستان کے جدید تر رجحانات کا حامل اسلامی اتحاد کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہے۔

دارالمصنفین اصل میں شبلی کے رجحانات کا صحیح عکاس معلوم ہوتا ہے۔ ندوہ جو جدید اور قدیم تربیتوں کے امتزاج کو بروئے کار لانے کے لیے بنایا گیا تھا، اس کا جھکاؤ روز بروز قدیم نظام کی طرف مائل ہوتا چلا گیا اس نے وہ امتزاج پیدا نہیں کیا جس کی خواہش شبلی کو تھی[۵۲]۔ یہ ادارہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک اردو کے دینیاتی ادب پر چھایا رہا اور اس نے بین الاسلامیت کو فروغ دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس ادارے کے بڑے بڑے رہ نما جو حقیقتاً اتحاد بین المسلمین کے بھی داعی تھے جن کی تحریروں میں شبلی کا قائم کردہ اصول جاری وساری رہا۔ ان کا ماننا یہ تھا کہ جدید علوم کی مدد سے مذہب کی حفاظت کی جائے، مگر بزرگان سلف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ بعد میں اقبال نے بھی اسی طریقہ کار سے روشنی حاصل کی، مگر وہ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید میں سید احمد خان کے زیادہ قریب چلے گئے[۵۳]۔

یادگارِ شبلی میں شیخ محمد اکرام نے سید احمد خان اور شبلی کے اختلافات کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور شبلی کے کام کو سید احمد خان کے کام کا تسلسل کہا ہے۔ شبلی کے کام کو سید احمد خان کے کام کا تسلسل کہنا کسی حد تک تو درست ہے مگر اختلافات کو بے بنیاد قرار دینا ٹھیک نہیں کیوں کہ دونوں کے اختلافات میں کوئی ایک امر بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

شبلی کو عالم اسلام سے جو دلی وابستگی تھی اس میں ایک نکتہ ایسا بھی ہے جس کی جانب محققین کی نگاہ کم پڑی ہے۔ ۱۸۸۴ء میں ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ جس کے افغانی سے خصوصی تعلقات تھے اور وہ *The Future of Islam* نامی کتاب کا بھی مصنف تھا، اپنے دورہ ہندوستان میں اس نے علی گڑھ کا بھی دورہ کیا۔ وہ سید

احمد خان کے طریق کار کے خلاف تھا۔ اور اس کا منصوبہ تھا کہ حیدر آباد دکن میں ایک قدیم طرز کی مشرقی یونی ورسٹی قائم کی جائے [54]۔ شبلی پر بلنٹ کے اثرات کا اگر اندازہ لگانا ہو تو اس کے دورہ علی گڑھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس دورے نے نہ صرف اتحادِ اسلامی کے ایک بڑے داعی کو سرگرم عمل کیا بلکہ وہ ان کی شخصیت میں تبدیلی کا محرک بھی بنا۔ شبلی کی شخصیت میں چوں کہ قدامت کا رجحان ہمیشہ غالب رہا ہے اس لیے وہ انگریز خواں طبقے سے دلی طور پر آزردہ تھے، مگر بلنٹ نے بھی انھیں قدامت کی جانب پیش قدمی کا مشورہ دیا تو یہ ان کی روح کی آواز معلوم ہوئی اور پھر انھوں نے کسی پس وپیش کیے بغیر اس جانب مراجعت اختیار کی۔

دورہ ہندوستان میں بلنٹ کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی جو خود بھی عربی زبان کے ماہروں میں شمار کی جاتی تھی۔ لیڈی بلنٹ کی نسبت شبلی نے اپنے بھائی مہدی حسن کو جس کے کافی اچھے مراسم بلنٹ سے استوار ہو گئے تھے، ایک خط میں لیڈی بلنٹ کی تعریف کی ہے یہ خط ۳۰ اپریل ۱۸۸۵ء کا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے بھی بلنٹ اور لیڈی بلنٹ سے شبلی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مہدی حسن کے خط کا حوالہ دیا ہے [55]۔ مگر بلنٹ کی ڈائری *India under Ripon* میں مہدی حسن کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے مگر شبلی کا ذکر کسی بھی مقام پر نہیں کیا گیا۔ لیکن شبلی جن صاحبان سے متاثر تھے ان میں افغانی، عبدہٗ شامل تھے اور بلنٹ کے ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ بلکہ افغانی لندن میں بلنٹ ہی کے گھر پر رہتے تھے [56]۔

علی گڑھ کے تعلیمی ادارے سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے بلنٹ نے لکھا ہے کہ ''دوسرے مقامات کے مقابلے میں یہاں جلسہ ناکام رہا، بہت سے قدیم وضع کے مولوی اس لیے نہیں آئے کہ یہ جلسہ سید احمد کی طرف سے کیا گیا تھا اس پر بھی میں نے عربی میں ایک لکچر پیش کیا، میں نہیں کہہ سکتا کہ سید احمد خان کو میرا لکچر پسند آیا کہ نہیں'' [57]۔ یہاں پر کئی ایسے سوالات ہیں جن کا جواب تاریخ کے صفحات پر تلاش کیا جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ بلنٹ آخر قدیم طرز کی یونی ورسٹی کیوں قائم کرنا چاہتا تھا، جب کہ اس کی کتاب مستقبل اسلام کا اردو ترجمہ اکبر الہ آبادی نے کیا تو حیران ہو کر کہتا ہے کہ مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ اس کتاب کو قدیم طرز فکر کے لوگوں نے پسند کیا ہے۔ شبلی پر بلنٹ کے اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے کیوں کہ بلنٹ اور شبلی کے خیالات میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اپنے ایک خط میں شبلی، مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں کہ ''مولوی عبدالماجد دریابادی سے کہو کہ وہ انگریزی کتابوں میں مسٹر بلنٹ کی ایک کتاب بھیج دیں'' [58]۔ غالباً یہ کتاب *The Future of Islam* ہی ہوگی۔

شبلی نعمانی تحریک اتحادِ اسلامی کے اصل داعی کے روپ میں ۱۸۷۷ء میں روس و ترک جنگ کے دوران ہی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگادی، ہر جگہ سلطان عبدالحمید کی فتح و نصرت کی دعا مانگی جانے لگی، زخمیوں کے لیے چندہ جمع کیے جانے لگے اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور و شور سے تقریریں کی جانے لگیں۔ یہ شبلی نعمانی کا شباب تھا۔ اس جنگ نے ان کے تمام قویٰ کو مشتعل کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڑھ میں چندہ جمع کرنا شروع کردیا اور بمبئی میں ترکی سفیر ''حسین حبیب آفندی'' کے ذریعے ترکی روانہ کیا[۵۹]۔ شبلی اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ:

> حسین حبیب آفندی جو کسی زمانے میں ترکش کونسل تھے اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں وہ مجھ کو اس ذریعے سے جانتے تھے کہ محاربہ روس میں، میں نے بہ حیثیت سیکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ ترکی روانہ کی تھی[۶۰]۔

اس سفرنامے میں عثمان غازی پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کی بقا کو عالم اسلام کے لیے کتنا اہم جانتے ہیں۔ ۱۸۹۲ء ان کے اس سفر کی تاریخ ہے جنگ پلونا ۱۸۷۷ء میں لڑی گئی اور اسی جنگ میں عثمان پاشا نے اپنے شجاعانہ کارناموں سے اہل اسلام کے دل جیت لیے تھے۔ شبلی نے جب یہ سفرنامہ لکھا تو انھوں نے عثمان غازی پاشا کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے کہ ان کے دل میں اسی طرح باقی ہیں[۶۱]۔

شبلی کے دل میں اسی زمانے سے اتحاد اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا اور آنے والے تمام واقعات جس میں سید احمد خان سے اختلافات شدید تر ہوگئے ان میں ایک بنیادی وجہ اتحاد اسلامی کا جذبہ بھی تھا جو شبلی میں کافی جڑ پکڑ چکا تھا[۶۲]۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سید احمد خان کے نزدیک مسلمانوں کی بیماریوں کا علاج یہ تھا کہ مذہب کے سوا ہر چیز میں مسلمان انگریز ہو جائیں اور شبلی کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اس سلسلے میں ندوۃ العلما میں وہ اپنے رفقاء کار کی مخالفت بھی گوارا کر چکے تھے جو انگریزی زبان سیکھنے اور سکھانے کے حوالے سے پیش آئی تھی[۶۳]۔

سید احمد اور شبلی کے اختلافات کے سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ شبلی نے ندوہ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں۔ آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں''[۶۴]۔

سید احمد خان کو یہ تقریر ناپسند آئی اور اس پر انھوں نے غصہ کیا' کیوں کہ ان کا یہ خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحت ان کے راستے سے پیچھے ہٹادے گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اس کے خلاف نہایت سخت مضمون لکھا[۶۵]۔

سید احمد خان کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انگریزی طور طریق اور وضع قطع اختیار کریں تا کہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو' مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ شیر کی کھال پہن کر کوئی شیر نہیں بن سکتا۔ دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی قوم سے دور ہوتے گئے کیوں کہ قدیم اور جدید کی ہم آہنگی سے ایسی صورتیں ظہور میں آئیں جو الم ناک اور مضحکہ خیز تھیں۔ غیر متوقع غلطیاں اور بے ربطیاں ایسی ہی صورت حال کو جنم دیتی ہیں۔ مسلمانوں نے جب مغربی رسوم وروایات کو اپنایا تو اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے[۶۶]۔

مسلمانوں میں انگریزوں کے طور طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کا نہیں رہا' اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ سید احمد خان کی صف میں موجود لوگوں نے اس رویہ کے خلاف آواز بلند کی[۶۷]۔ اس کا اظہار علی گڑھ کے تعلیمی مزاج سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سید احمد خان کے اس عمل اور خیال سے شبلی نے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ مولوی مسعود علی ندوی کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ''سید احمد سے مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے''[۶۸]۔ میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید احمد خان سکھا گئے ہیں''[۶۹]۔

یہی وجہ ہے سید احمد کی وفات پر ان کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا تو اس سلسلہ میں سر سید اور مذہب کا عنوان شبلی نعمانی کے لیے طے ہوا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ آخر لوگوں کے اصرار پر شبلی نے مجبور ہو کر سر سید اور اردو لٹریچر کا دوسرا عنوان اور پہلے عنوان پر حالی نے لکھا۔ یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڑھ میگزین کے مئی ۱۸۹۸ء کے نمبر میں شائع ہوئے[۷۰]۔

ان دونوں اصحاب کے مابین اختلافات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ جب ان کی سوانح عمری لکھنے کے لیے ان سے کہا گیا تو وہ اسے مختلف حیلے حوالے سے ٹالتے رہے[۷۱]۔ ان دونوں کے اختلافات کا دوسرا باب بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ تعلیمی نقطہ نظر کے حوالے سے وہ سید احمد خان سے کافی اختلافات رکھتے

تھے۔ سید احمد جدید تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کی ہر ایسی تعلیم کو دوراز کار سمجھتے تھے جو انگریزی نظامِ تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ اسی لیے پنجاب میں ۱۸۸۲ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام ترتیب پا رہا تھا اس کی مخالفت میں اتنے سخت ہو گئے کہ اس کے پرزے اُڑ گئے۔ ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد میں مشرقی امتحانات کے اجراء پر ایسی ہی مخالفت کی، بہر حال ان کو مشرقی علوم سے اور عربی علوم سے دل چسپی نہیں تھی [۷۲]۔ اس کا اظہار ان کے ایک مضمون میں بھی کیا گیا ہے [۷۳]۔

شبلی نعمانی کا اس معاملے میں عقیدہ یہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لیے جدوجہد ہو رہی ہے۔ ۱۸۹۴ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی عین تمنا کے مطابق تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا' بلکہ وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا [۷۴]۔ ایک بات دارالعلوم ندوہ کے حوالے سے انتہائی حیرت ناک بھی ہے اور شبلی کی شخصیت کے اثرات کو اتحاد بین المسلمین کے تناظر میں سمجھنے کے حوالے سے معاون بھی۔ خدا بخش جرنل میں شہزادہ جان میلکم کا شبلی نعمانی پر لکھا ہوئے مضمون کا اردو ترجمہ ملتا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کی اس مضمون کا جو اردو ترجمہ ہے اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے اور کس نے ترجمہ کیا ہے اس کا بھی ذکر اس مضمون میں نہیں کیا گیا۔ جان میلکم کے افغانی کے ساتھ نہایت گہرے مراسم تھے۔ ایران کے بادشاہ کے قتل میں اس پر بھی شکوک کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ دارالعلوم ندوہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''شبلی نعمانی ایک ایسے بڑے کام میں مشغول ہیں کہ اگر یہ کام مکمل ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ مشرق میں ایک نئے دور کا آغاز مسلمانوں پر ہو گا۔ اگر ندوہ فی الحقیقت کامیاب ہو گیا۔ دارالعلوم ندوہ مسلمانوں کا ایسا ادارہ ہے جس پر ٹھیٹھ اسلامی ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے'' [۷۵]

شبلی کی بین الاسلامیت کا مکمل اظہار ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ شبلی نے اردو میں اسلامی تاریخ نویسی کی جو روایت قائم کی اس میں بھی احیائے اسلام کا گہرا اقدامت پسندانہ رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے جن اصولوں کو مدِ نظر رکھا' وہ بہ حیثیت مجموعی روایتی اسلامی وقائع نگاری سے مرکب تھیں [۷۶]۔ شبلی کے پیش نظر بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کے بزرگوں کے کارناموں سے روشناس کیا جائے' تا کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے ماضی اور اخلاف پر فخر کر سکیں۔

شبلی نعمانی خلافتِ راشدہ کے اصولِ انتخاب کی بنا پر فطری طور پر جمہوری تھے۔ جب کہ سید احمد خان شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں شبلی نعمانی نے جمہوری طرزِ سلطنت کی

تائید میں ایک تقریر کی، جس کے زور بیاں سے متاثر ہو کر حاضرین نے تعریف کی۔ حاضرین میں سید احمد خاں بھی موجود تھے انھوں نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ ایک مضمون اس تقریر کے رد میں لکھا۔ جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۸ جون ۱۸۹۲ء کے پرچے میں ایشیائی اور اسلامی طرزِ حکومت کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس ایک معمولی واقعے سے بھی شبلی اور سید احمد کا سیاسی اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جو لڑائی ہوئی اور اس میں انگریزوں کی مرضی کے خلاف ترکوں کو جو فتح نصیب ہوئی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پر جوش بنا دیا تھا۔ سارے ہندوستان میں اس کی خوشی منائی گئی اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سید احمد خان کو اس پر اعتراض تھا اور انھوں نے اس جوش و مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضمون لکھے۔ جس کے عنوان یونان اور ترک اور سلطان اور ہندوستان کے مسلمان تھے [۷۷]۔ اتحادِ اسلامی کے حامی مسلمانوں کو یہ مضامین تیر کی طرح آ کر لگے' اور انھوں نے سید احمد کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کیے۔

شبلی کو ساری دنیا میں ترکی ہی وہ سلطنت دکھائی دیتی تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلامی شان و شوکت کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ ترکوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اسی محبت کے نتیجے میں انھوں نے اس ملک کا سفر بھی کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کی نگاہ میں بڑا جرم تھا۔ شبلی نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ ترکی کے سفرنامے کی ترتیب میں شبلی نے علمی و تعلیمی پہلو کو پیش کیا ہے' سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا' مگر یہ جرم بھی عفو در گزر سے نہیں دیکھا گیا، ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی [۷۸]۔

شبلی کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل و مناقب اور دل چسپ قصوں کے بیان سے خالی ہوتی تھی اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے تو بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے [۷۹]۔ ترکوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ترکی گئے تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی، وہاں کے اخبارات اور ان کی اشاعت سے متاثر ہو کر ترکی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے عرب تھے جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے مولانا نے ان سے ترکی سیکھنی شروع کر دی۔ اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے سیکھ لی وہ اب محفوظ نہیں ہے [۸۰]۔

۱۹۰۸ء میں جب انور بے نے ترکی میں دستوریت کا اعلان کیا تو شبلی خوشی میں آپے سے باہر

ہو گئے۔ ایک ایک نامور نوجوان ترک اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جاں باز رکن کی تعریفیں کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ وہ محمد علی شاہِ کجکلاہ ایران کی طرح اپنی ملک کو خانہ جنگی میں برباد نہیں کر دیا' بلکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا۔ انھیں اس انقلاب سے بڑی توقعات تھیں[۸۱]۔ شبلی زندہ نہ رہے ورنہ خلافت کے خاتمے میں اس انجمن نے وہ کردار ادا کیا کہ ساری دنیا کے مسلمان حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ درحقیت انجمن اتحاد و ترقی کے سرکردہ افراد مغربی طاقتوں کے آلہ کار تھے۔ بعد میں جو تحقیقات ہوئیں ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سلطان عبدالحمید کے خلاف اس انجمن کے ذریعے بھیانک سازش انجام دی گئی جو اس کی معزولی پر جا کر ختم ہوئی[۸۲]۔

۱۸۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے پورے سو سال بعد معاشرے میں پھیلی ہوئی آزاد خیالی، جمہوریت اور آئینی حکومت کے نظریات عثمانوی سلطنت میں جڑ پکڑ چکے تھے[۸۳]۔ انھیں عوامل کی بنا پر ۱۹۰۸ء میں ابراہیم تیمو کی قائم کردہ خفیہ جماعت ''انجمن اتحاد و ترقی''[۸۴] نے دستوریت کا حق مانگا' جس نے خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا' مگر اس وقت کے ہندوستانی مسلمان اس سازش کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو شبلی کے دل کو ٹھیس لگی اس زمانے میں انھوں نے اس جنگ کے حوالے کئی نظمیں لکھی ہیں[۸۵]۔ جنگِ بلقان کے دوران ڈاکٹر انصاری کا میڈیکل مشن مولانا محمد علی کے فراہم کردہ سرمائے سے جب ترکی گیا تو شبلی اس کی روانگی پر اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور بے اختیار جھک کر ڈاکٹر انصاری کو خراجِ عقیدت پیش کیا[۸۶]۔

اس زمانے میں بقرعید آ گئی' شبلی کی رائے یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند اس سال قربانی کی رقم ترکی فنڈ میں داخل کر دیں۔ فقہ کی رو سے انھیں اس امر میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا تھا۔ مفتی عبداللہ ٹونکی اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے بھی تائید کی۔ شبلی نے اپنا فتویٰ بھی اخبارات میں شائع کرایا[۸۷]۔ جس پر ڈھڑا ڈھڑ روپیہ اس فنڈ میں جمع ہونے لگا۔

شبلی کی سیاسی زندگی کا محور و مرکز خواہ کچھ بھی ہو' مگر ان کی مجموعی قدر و قیمت اور غرض و غایت یہی تھی کہ مسلمانوں کے علم و ادب سے دنیا کو روشناس کرایا جائے[۸۸]۔ شبلی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں جب کہ قومِ مغرب سے مرعوب ہو کر شدید ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکی تھی ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جس میں ایک طرف قدیم و جدید کی خوش گوار آمیزش تھی اور دوسری طرف علومِ اسلامیہ کے احیا کے ذریعے

ملک میں علمی اور ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا[۸۹]۔

سید احمد مغرب کے افکار جدید کے مخلص معتقد تھے۔ شبلی ان علوم سے اتنا ہی استفادہ کرنا چاہتے تھے جتنا کہ بدلے ہوئے حالات کے وہ متقاضی تھے۔ شبلی پرانی روشنی کو دوبارہ ضوافگن دیکھنا چاہتے تھے۔ نئی روشنی میں بیٹھ رہنا ان کا نصب العین نہ تھا۔ شبلی جدت کے منکر نہ تھے مگر ماضی کی روایات کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھے۔ سید احمد خان کا راستہ ان سے جدا تھا۔ شبلی نے پرانے علوم اور قدیم طرزِ فکر سے ازسرِ نو دلچسپی پیدا کی اور مغرب کی اندھی تقلید سے منہ موڑ لیا[۹۰]۔

روم وشام کے سفر میں شبلی جہاں جدید اثرات سے متاثر ہوئے وہاں مصر کی علمی لہر سے بھی استفادہ کیا۔ مفتی عبدہٗ، رشید رضا قدیم وجدید کے مابین جس پیوند کاری میں لگے ہوئے تھے شبلی نے وہی کام دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنفین میں انجام دینے کی کوشش کی[۹۱]۔ نئی قومی زندگی پیدا کرنے اور اس کو تاریخی بنیادوں پر حوالہ فراہم کرنے میں شبلی کا کردار بے مثل ہے اور ندوۃ العلما اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

سرسید احمد خاں کے رفقا کی تحریک اتحاد اسلامی سے قلمی وابستگی

سید احمد خان کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کو اپنا محور و مرکز مانتی تھی اس لیے سید احمد خان کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان عالمی سیاست میں حصہ لے کر اپنے ہندوستانی مقاصد سے انحراف کریں۔ ان کا دل ترکوں کے تعلقات کو اتحاد اسلامی یا مسلمان برادری کے احساسات پر نہیں انسانی ہمدردی پر دیکھتا تھا۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے بالکل خلاف بھی نہیں تھے مگر اس معاملے میں انھوں نے وقت اور حالات کو مدنظر رکھ کر اپنی رائے دی[92]۔ شبلی نے تو کھل کر ترکوں کی حمایت کی اور سید احمد خاں کے اختلافات کے باوجود اس تحریک سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ شبلی کے علاوہ حالی، آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں بھی ملت کا تصور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

مولانا حالی کا خیال تھا کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کو استحکام بخشنے اور سامراجی استیصال کا عمل جاری رکھنے کے لیے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو منقسم کر کے تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کی تا کہ ہندوستان کے مختلف مذہبی فرقے ایک دوسرے کے احترام کو ترک کر دیں انھیں اپنا دشمن تصور کریں اور باہمی طور پر لڑتے رہیں اور سامراجی قوت اپنے استیصال کے عمل کو جاری و ساری رکھ سکے[93]۔

حالی نے برطانوی کردار کو نہایت بصیرت کے ساتھ سمجھا تھا۔ برطانوی حکومت کے بارے میں حالی کا خیال تھا کہ وہ جو کہتی ہے اس کے برعکس ہی کرتی ہے[94]۔ انھوں نے سامراجی چہرے سے مسیحائی کا جھوٹا نقاب اتار پھینکا اور ہندوستانی محکوم عوام سے برطانوی حکومت کے اصل کردار کو پہچاننے کی تلقین کی اور غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی[95]۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے مسدس لکھی تو اس میں رقت انگیز مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

حالی چوں کہ سید احمد خان کی پالیسی پر کاربند تھے اس لیے حالی کے ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے یہاں تضاد پایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کی تعریف بھی کرتے ہیں اور پر تنقید بھی[96]۔ یہ

حقیقت ہے کہ حالی نے برطانوی حکومت کے اصلاحی اور ترقیاتی اقدام کے لیے جہاں تعریف کی، وہیں اس کی سامراجی ذہنیت پر تنقید بھی کی۔ انھوں نے ایک نظم تحفة الاخوان کہی تھی جس میں انھوں نے مسلمانوں کا ماتم کرنے کے ساتھ برطانوی حکومت کی تعریف بھی کی تھی[۹۷]۔

سامراجی ماحول کی یہی فہم ان کو ان کے عہد کے دوسرے مسلم دانش وروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس طرح حالی کے سیاسی میلان میں تبدیلی کے پیچھے کارفرما عوامل اور محرکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی سیاسی منظرنامے میں انگریزی سامراج کے آشکار ہو جانے کے بعد مسلم سیاست میں حالی کے نقطۂ نظر کو کچھ حد تک سید احمد خان سے مختلف بنا دیتا ہے۔ حالؔی نے عالمی حالات میں مسلمانوں کی بے بسی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس پر دکھ کا اظہار بھی کیا ہے۔ سید احمد خاں کی طرح خیر الدین تیونسی کی کتاب اقوا م المسالك پر تبصرہ بھی کیا[۹۸]۔ انھوں نے سید احمد خان کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے قوم کے دلوں کو اس کے مطالعے یا اشاعت کی طرف مائل کیا ہے[۹۹]۔

۱۸۷۸ء میں حالی نے اپنی نظم زمزمہ قیصری لکھی تو اس کے حاشیے میں انگریزوں کی قلعی کھولی ہے اور حق گوئی اس طرح کی ہے: ''انگریزی مؤرخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ کریں اور مسلمانوں پر غضب ناک اور برافروختہ ہوں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب نمک چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں''[۱۰۰]۔ اسی حاشیے میں انھوں نے انگریزوں کے دورخی کردار پر مزید لکھا ہے۔ ''مسٹر اسٹوک این انگریز مصنف نے دربار قیصری کے موقع پر ایک نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی ابتدا اور ترقی کا ذکر ہے۔ دوسرے میں ان کا تذکرہ ہے جو دربار قیصری میں شریک ہوتے تھے۔ تیسرے حصے میں مصنف نے مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہاں کی شائستہ قومیں جو آج اپنے سواد نیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی خطاب دیتی ہیں محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بہ مراتب زیادہ وحشت و خوں ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں''[۱۰۱]۔

مولانا حالی نے ایک مقالہ مدعیان تہذیب کی بد اعمالیاں میں انگریزی سرکار کو اور یورپ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا ہے کہ اگر کہیں آزادی تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر و

تعدی سے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم بھی سب کرنے کو موجود ہتی ہے[۱۰۲]۔

غرض ملت اسلامیہ کے زوال کا منظر وہ صدقۂ عظیم تھا جو حالی کے دل ودماغ پر بری طرح چھا گیا تھا اور ان کے کلام میں درد اور سوز بن کر سامنے آیا۔ مسدس حالی اسی جاں گسل درد اور سوز دروں کا آئینہ دار ہے۔ جس طرح ۱۸۵۷ء کی قیامت کے بعد حالی وہ حالی نہ رہے اسی طرح انگریزی جبر کے آشکار ہونے کے بعد ان کی شاعری وہ شاعری نہ رہی۔ اس میں تمام تر قوم کا درد رچا ہوا نظر آتا ہے[۱۰۳]۔

انگریزوں کے اقتدار کے بعد عیسائی مبلغین نے سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر بہت بڑا فتنہ پھیلا رکھا تھا، ان کی تردید میں ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی وغیرہ نے بڑی ہمت سے کام لیا اور شروع کے دو بزرگوں نے فنڈر پادری کو شکست فاش دے کر عیسائیت کو بہت نیچا کیا۔ تاہم وہ زمانہ ایسا تھا کہ مختلف پادریوں نے ہندوستان کی فضا کو بہت مسموم بنا دیا تھا۔ ایک مرتد عماد الدین پادری نے ہدایت المسلمین کتاب مسلمانوں کے خلاف لکھی تھی اس کے جواب میں مولانا حالی نے ۱۸۶۷ء میں جہانگیرآباد کے قیام میں رسالہ تریاق مسموم لکھا۔ اس رسالے کو انھوں نے مولانا شاہ عبدالغنی نقشبندی مجددی کی خدمت میں حج کے ایام میں مدینہ بھیجا تھا[۱۰۴]۔

۱۹۱۱ء سے دنیائے اسلام پر جو مصائب نازل ہوئے، طرابلس وبلقان میں جس طرح مسلمانوں پر تباہی آئی اور چھ سات برس تک بربادی کا جو دل ہلا دینے والا منظر رہا یہ اس صدی کے ایسے واقعات تھے جو مسلمانوں کو صدیوں خون کے آنسو رلائیں گے ان حالات میں ناممکن تھا کہ حالی بے خبر رہتے۔ وہ روزانہ مسلمانوں کی تباہی وبربادی کی خبریں سنتے اور بے قرار ہو جاتے اور دل کا درد آنکھوں سے اشک کے قطرات بن کر ٹپکتا۔ کئی مرتبہ زبان سے اس مظلومانہ آرزو کا بھی اظہار ہوا کہ ”الٰہی وہ وقت بھی آئے گا جب ترک اور ایرانی کے قتل وخوں کے بجائے ہم یہ سنیں گے کہ آج اتنے جرمن مارے گئے اور اتنے روسی کام آئے“[۱۰۵]۔ حالی نے مولانا فرید آباد کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا ہے: ”ترکی کی خبریں آج کل آرہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے۔ ایران اور مراکو کی تو فاتحہ خیر پڑھ چکے تھے اب ترکی کی بھی بظاہر خیر معلوم نہیں ہوتی ہے“[۱۰۶]۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں یورپ کی بڑی طاقتوں کی شہہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا اور مقدونیہ چھین لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چناں چہ ایک طویل محاصرے کے بعد ادرنہ بھی چھین لیا

گیا۔ مولانا حالی نے اسی اعلان جنگ کے زمانے میں ایک قطعہ لکھا تھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے [107]۔
یہ قطعہ پندرہ شعروں کا ہے جس میں حالی کے مجروح دل کے نالہ وشیون موجود ہیں۔ جو ان کے جذبات کی ملی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ان کا دل ہر اس شخص کی محبت سے معمور تھا جو ان مظلوموں کی ہمدردی اور اعانت میں کوئی آواز بلند کرتا، کوئی عملی تحریک لے کر سامنے آتا۔ ان ہی جذبات سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان کی ان کوششوں کی نسبت جو انھوں نے اس زمانے میں طرابلس و بلقان کے شہیدوں اور مجروحوں کی ہمدردی میں کی تھی، حالی نے شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور ان کی خواہش تھی کہ خود ہی ظفر علی خان کے سامنے پڑھیں لیکن اس کا موقع نہ ملا تو اخبار زمیندار میں برائے اشاعت بھیج دی [108] اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

جوہر ترے کر دیے نمایاں ہمدردیِ اہل دیں نے آخر
دامن ہوا چاک گریباں جمعیت و صبر کا سراسر
دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں پھیلے وہ بہ شکل سیل آتش
جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں [109] ڈالا یہ تری پکار نے غل

ظفر علی خان نے خود قسطنطنیہ جانے کا ارادہ کیا تو ۲۵ نومبر ۱۹۱۲ء کے خط میں حالی ان سے پوچھتے ہیں کہ ''مجھے یہ بھی لکھنا کہ ترکی کے لیے پانی پت سے کتنا چندہ وصول ہوا اور وہ کہاں بھیجا گیا'' [110]۔ حالی نے مولانا محمد علی جوہر کی ان کوششوں کی جو انھوں نے ترکی کی مجروحین کی امداد بالخصوص انصاری وفد کے متعلق کی تھیں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ۱۹۱۳ء میں جب جوہر نے ہمدرد اخبار جاری کیا تو اس کی عزت افزائی کے لیے انھوں نے مولانا سے کچھ عنایت فرمانے کی درخواست کی۔ حالی نے رباعی اور حیاۃ النذیر سوانح عمری نذیر احمد مولفہ افتخار عالم مارہروی پر ایک ریویو ارسال کی [111]۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کے واقعہ نے حالی کی طبعیت میں اضطراب پیدا کر دیا۔ اس واقعے پر انھوں نے تین رباعیاں لکھیں۔

دی قوم نے داد قوم بے رو دریا یاران وطن نے قوم کا ساتھ دیا
ہنگامۂ کانپور نے کام کیا [112] ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی

پھر انھوں نے اہل وطن کی اس واقعے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اتحاد کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا

تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے   جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا[113]

حالی کا ان رباعیوں میں یہ کہنا تھا کہ حق کی راہ میں جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ اپنے ساتھ کئی برکتیں لے کر آتی ہے سب سے پہلے تو یہی ہوتا ہے کہ وہ دل جو روٹھے ہوئے ہوں آپس میں مل جاتے ہیں۔

تائید کے حق میں جو بلا آتی ہے   ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے

بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے   روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے[114]

حالی جس طرح دنیائے اسلام کے حالات سے اثر پذیر ہوئے اس سے ان کے تاثرات نے معین صورت اختیار کر لی۔ اہل مغرب کے سیاسی چالوں کو انھوں نے نہ صرف سمجھا بلکہ ترقی کے مرد بیمار پر جب بھی حملے ہوئے اس پر انھوں نے اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعے جا بہ جا اشارے بھی کیے ہیں[115]۔

سید احمد خان اور ان کے رفقا نے اپنی تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کے مواقع پیدا کرنے تک محدود رکھا تھا مگر اس تحریک نے اسلامی ممالک سے رابطہ کبھی منقطع نہیں کیا، بلکہ کئی اہم نوع کے کام ایسے بھی ہیں جو ہمیں تاریخی تناظر میں وہ معلومات فراہم کرتے ہیں جو اسلامی ممالک سے جڑے ہونے کی مکمل دلیل ہیں۔ مثلاً Charles Rollin کی کتاب *Ancient History of Egypt* کا ترجمہ علی گڑھ سے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے مخزونے میں یہ کتاب موجود ہے اس کتاب کو سائنٹی فک سوسائٹی نے چھاپا تھا۔ اس رجحان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید احمد خان اور ان کے رفقا خواہ کتنی ہی مصلحت کا شکار رہوں، اتحاد اسلامی کے اثرات کئی حوالوں سے ان پر اپنے اثرات ڈالنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

اسی لیے حالی کے بعد محسن الملک نے بھی تحریک اتحاد اسلامی کے اثرات کو قبول کیا اور رد بھی۔ وہ عمر بھر سید احمد خان کی طرح پکے اطاعت شعار رہے اور بالعموم بین الاسلامیت اور مسلمانوں کے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت کے خلاف رہے لیکن مسلمانوں کی قومی تحریکوں اور ملی رجحانات سے ہمدردی بھی رکھتے تھے انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم میں شیخ محمد عبدہ، رشید رضا اور دیگر مصری علما کی تحریروں کو داخل نصاب کرنے کی سفارش کی[116]۔

جہاں تک محسن الملک کے نظریہ بین الاسلامیت کو رد کرنے کا سوال ہے اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ عزیز احمد نے تو محسن الملک کو پکا اطاعت شعار قرار دیا ہے مگر ان کی تحریروں کو اگر غور سے دیکھا

جائے تو یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ مصلحت کا شکار تھے اور بین الاسلامی معاملات میں ان کے نظریات بین بین کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ محسن الملک کی ادبی زندگی مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کے مضامین سے ان کی اسلام دوستی، ملی دردمندی اور علوم وفنون سے گہرے شغف کا پتا چلتا ہے[117]۔ ان کی مختلف تقریروں کا جائزہ لینے سے ان کے بین الاسلامیت کے نظریے کا مزید تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ۲۳ رمئی ۱۸۷۲ء کو مرزا پور کے ہائی اسکول میں تقریر کرتے ہوئے ہارون رشید اور برامکہ کی علمی مجالس کی مثالیں دیں۔ اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ موجودہ عہد کے مسلمانوں نے تحقیق وتفتیش کو چھوڑ دیا ہے[118]۔

محسن الملک نے ۱۸۸۵ء میں ایک مضمون روسی حملہ ہرات لکھا جس میں ہرات پر روسی حملے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ روس وترکی کو زیادہ دن نہ گزرے تھے، سوڈان میں مہدی سوڈان کا ظہور ہو چکا تھا۔ اس موقعے پر محسن الملک کا لکھا گیا یہ مضمون نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھا کہ روس نے ۱۸۷۱ء میں بحر اسود کے شرائط صلح کی پامالی کی، ۱۸۷۶ء کے حملہ ترکی، سرحد ہندوستان پر پیش قدمی کو وغیرہ کو بیان کر کے اس کے ہندوستان پر حملے اور قسطنطنیہ پر قبضے کے ارادے کو بیان کیا ہے[119]۔

پھر انھوں نے اس سوال پر بحث کیا ہے کہ کیا روس کبھی ہندوستان حاصل بھی کر سکتا ہے اس مضمون میں انھوں نے ترکی کی حمایت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ہم آج کل لارڈ ڈفرن سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس پالیسی کو جاری رکھیں گے کہ وہ ترکی اور ترکوں سے بہ خوبی واقف ہیں اور ایلچی ہونے کے زمانہ سے انھوں نے سب سے زیادہ کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی سلطنتوں میں انگریزوں کے ناموں کا وقار بڑھے[120]۔

مسلمانان ہند کی سیاسیات میں خارجی سیاست یعنی اسلامی حکومتوں اور سلطنتوں خصوصاً عثمانویوں کے ساتھ مذہبی تعلق ایک اہم سیاسی مسئلہ تھا جو ایک عرصے سے ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ کو جذب کیے ہوئے تھا لیکن ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جسے خلافت عثمانیہ کے عروج وزوال سے کوئی غرض نہیں تھا وہ اپنی زندگی کا محور ومرکز ہندوستانی مسلمانوں اور انگریزی حکومت کو سمجھتا تھا۔ محسن الملک بھی مؤخر الذکر طبقے سے کچھ حد تک وابستہ تھے مگر انھوں نے مسلمانوں کے ملی احساس سے مکمل روگردانی نہیں کی[121]۔

۱۹۰۶ء میں عقبہ کی سرحد کے متعلق مصر اور ترکی میں تنازعہ پیش آیا اور حکومت برطانیہ نے جب ترکی کو دھمکی دی تو مسلمانان ہند میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ محسن الملک نے اپنے مضمون میں سلطان عبد الحمید کو

خلیفۃ المسلمین ماننے سے انکار کر دیا مگر انھوں نے یہ ضرور کہا کہ: ’’کل مومن اخوۃ‘‘ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لیے ہم ہر ملک کے مسلمانوں کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں اور اس لیے ہم کو اگر خدانہ خواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے تو مثل قومی نقصان کے رنج ہوگا گو وہ نقصان کسی پولی ٹیکل سبب سے ہی ہو‘‘[۱۲۲]۔

سید احمد خان کے اہم رفقا میں ڈپٹی نذیر احمد شامل تھے جن کا عقیدہ آفاقی مذہب میں تھا۔ دوسرے مذہبی فرقوں اور ان کے رسم و رواج کی طرف تحمل اور بردباری کا رویہ اختیار کرنے کا درس دیتے تھے[۱۲۳]۔ انھیں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں تعلقات خراب ہوتے جارہے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد کی جو بنیادیں تھیں وہ بتدریج متزلزل ہونے لگی ہیں۔ اس نہایت ہی اہم مسئلے کو نہ صرف نذیر احمد بلکہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ تقریباً تمام ہی دانش وروں نے محسوس کیا ہے[۱۲۴]۔ اس سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی نظام تعلیم یہاں کے لوگوں پر فرقہ وارانہ اثرات مرتب کر رہی تھی۔

انھیں اثرات کو زائل کرنے اور مسلمانوں کو تحمل کا درس دینے والے نذیر احمد بھی آخر کار اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی رخ میں یہی درست ہے کہ وہ اپنے ملی شناخت کو بچانے کے لیے ایک علیحدہ سیاسی، تہذیبی اور تمدنی وجود قائم کریں۔ ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے خلاف تقریر کرتے ہوئے نذیر احمد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف عقیدوں، مختلف رسم و رواج اور عادات و اطوار کی قومیں بستی ہیں۔ جن کے اغراض و مقاصد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نذیر احمد کے نزدیک ہندوستان ایک قوم نہیں بلکہ قوموں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ان کے خیال میں ایسے اجزائے متضاد کو یکجا کر کے ایک معجون مرکب قوم واحد قرار دینا صریحاً مغالطہ ہے[۱۲۵]۔

۱۸۸۸ء میں نذیر احمد علی گڑھ تحریک کے مبلغ و مدبر کی حیثیت سے کھل کر سامنے آئے اور آتے ہی سید احمد خان، حالی، منشی ذکاء اللہ اور مولوی سمیع اللہ کے ساتھ اس تحریک کے علم برداروں کی اگلی صف میں شامل ہو گئے[۱۲۶]۔ نذیر احمد نے بعض ایسے نظریات بھی پیش کیے جو اس عقلیت اور اجتہاد فکر کے زمانے میں ایک نکتۂ غریب کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً انجمن حمایت اسلام کے دسویں سالانہ اجلاس ۱۸۹۴ء میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ’’اسلام کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک کامن برادر ہڈ Common Brotherhood قائم کرنا

چاہتا ہے"[۱۲۷]۔دنیا میں اسلام کے جاری کرنے سے خدا کا مطلب یہ تھا کہ ساری دنیا میں ایک Common Brotherhood قائم ہو۔تمام بنی آدم اس برادرہڈ کے ممبر بن جائیں اور جملہ اختلافات دور ہو کر ساری دنیا میں امن آجائے[۱۲۸]۔

اسی نظریے کی توسیع مسلمانوں کے معاملے میں بھی دکھائی دیتی ہے کیوں کہ ان کی نظموں میں تصورقوم محدود جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔انجمن حمایت اسلام، مدرسہ طبیہ دہلی اور دیگر جگہوں پر پڑھی گئی نظموں میں بین الاسلامیت کا رجحان نظر آتا ہے۔مثلاً ایک نظم میں انھوں نے مسلمانوں میں اخوت کی کمی کا شکوہ یوں کیا ہے:

بھائی ہیں اور رابطہ باہم نہیں — اخوت یوسف سے کچھ کم نہیں
بنتے ہیں کہنے کے لیے خیر خواہ — ان کی شرارت سے خدا کی پناہ[۱۲۹]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دسمبر ۱۸۹۲ء میں نذیر احمد نے اپنی تقریر کے ساتھ جو نظم پڑھی وہ اتحاد بین المسلمین کا درس دیتی نظر آتی ہے۔اس نظم میں جہاں اس وقت کی صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے وہیں نذیر احمد نے ماضی کے تاریخی واقعات کا سہارا لیا ہے۔نذیر احمد جدید رجحانات کے خواہ کتنے ہی حامی کیوں نہ ہوں ان کے یہاں ملت کا تصور بہت زیادہ جاندار ہے جو ان کی تقریروں اور نظموں میں واضح صورت اختیار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔وہ مسلمانوں کی سلطنتوں اور ان کی تباہی پر نوحہ کناں ضرور ہیں مگر ان کی تحریروں میں موجود عزم، تعمیر نو کے جذبات سے پُر دکھائی دیتا ہے۔اس نظم میں انھوں نے مسلمانوں کو اپنے حالات تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد کی تلقین کی ہے:

مسلمانوں اگر تم میں ہے کچھ فکر رسا باقی — تو بول اٹھو کہ ہے اسلام کے مٹنے میں کیا باقی
شجاعت تھی تو وہ ہم سے گئی گزری ہوئی بالکل — نہ اب وہ ملک گیری ہے نہ وہ حرب وغزا باقی[۱۳۰]

اسی نظم میں ایک اور قطعہ میں انھوں نے کہا ہے کہ مسلمانوں کو زمانے نے ایسا پکڑا ہے کہ مرنے کی بھی جگہ باقی نہیں بچی ہے اور ان کی سلطنتوں کا حال بالکل ایسا ہے جیسا کہ مسافر کے نقش پا کا ہوتا ہے۔

خدا جانے وہ کیسی سلطنت تھی کیا تھی کیوں کر تھی — کہ تاریخی کتابوں میں ہے جس کا تذکرہ باقی
یہ ٹوٹی پھوٹی گنتی کی ریاست ہائے اسلامی — جنھیں روئے زمیں پر دیکھتے ہو جابجا باقی[۱۳۱]

نذیر کے یہاں ملت کا تصور ان کے ناولوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے ان کا ناول ابن الوقت جہاں

جدید وقدیم کی آویزش کا نمونہ معلوم ہوتا ہے وہاں ہندوستانی مسلمانوں کی اسلام کے ساتھ وابستگی کی جھلک لیے ہوئے ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷۔۳۰ دسمبر ۱۸۹۱ء بہ مقام علی گڑھ انھوں نے کہا کہ:

> امسال کانفرنس کا کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے اس کو داہنی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو منی ایچر آف محمڈنزم یعنی نمونہ اسلام دکھائی دیتا ہے۔ اور بائیں آنکھ سے دیکھتا ہوں تو منی ایچر آف ہندوازم یعنی نمونہ مذہب ہنود سوجھ پڑتا ہے۔ اور منی ایچر آف محمڈنزم ہے اس لیے کہ ممبروں کی اکثر کرسیاں خالی ہیں جیسے مسلمانوں کی مسجدیں[۱۳۲]۔

نذیر احمد نے ابن الوقت میں انگریزی لباس پر جو لے دے کی ہے یا سید صادق کے خطوں میں علی گڑھ کالج کے غیر اسلامی ماحول کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ جدید انتہا پسندی اور غلو کے خلاف ایک ردِ عمل تھا مگر سیاسیات کے معاملے میں انھوں نے سید احمد خان کے رویے کی تائید کی تھی[۱۳۳]۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے ۱۸۹۷ء میں انھوں نے جو نظم پڑھی اس میں مسلمانوں کی ابتری اور غیر قوموں کی برتری کا احساس درد کی صورت ڈھل کر ظاہر ہوا ہے۔ انھوں نے یہاں غیر قوموں پر مسلمانوں کی برتری کی کہانی یوں سنائی ہے:

ہائے وہ دور موافق کے مسلمان کبھی — حشمت و سلطنت ویسرو غنار کھتے تھے
حاکم وقت تھے اور ملک سے لیتے تھے خراج — تاج شاہنشہی و چتر ولوا رکھتے تھے
طالب عزت دنیا تھے فقط دیں کے لیے — ورنہ دنیا کو وہ نظروں سے گرا رکھتے تھے[۱۳۴]

نذیر احمد کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں بھی بین الاسلامیت کا تصور موجود ہے۔ آزاد کا سیاسی سفر پان اسلامزم تحریک کو جلا بخشنے کے لیے تھا یا کسی اور مقصد کی تکمیل کے لیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں ایشیا کی دو بڑی طاقتوں روس اور برطانیہ کے اقتدار کے وسیع تر مفاد کا جائزہ لیا جائے۔ ان دو طاقتوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ بازی گاہ بن کر رہ گیا تھا[۱۳۵]۔ یہ دونوں حریف ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے راست نبرد آزما نہیں ہوئے مگر سیاسی کش مکش نے وسط ایشیا کی صورت حال میں جو تبدیلی پیدا کی اس کو جاننے کی خواہش برطانیہ کو تھی۔ اس لیے مولانا محمد حسین آزاد، پنڈت من پھول[۱۳۶] اور ڈاکٹر لائٹنر کے ہمراہ برطانیہ نے ایک جاسوسی وفد ان علاقوں میں بھیجا۔

آزاد کو حکومت ہند نے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنا سفر نامہ صیغہ راز میں رکھیں گے اور اس سفر کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اس انکشاف کو اپنے ذاتی وقار کے خلاف متصور کرتے تھے اسی لیے وہ اس معاملے میں اتنے

محتاط تھے کہ انھوں نے اپنی اہلیہ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا[137]۔ اسی لیے انھوں نے اپنی انشاء پردازی سے وسط ایشیا کے تمام تر دل کش مناظر کو ایران سے منسوب کر کے اس جاسوسی مہم کو ایک عمدہ سفر میں تبدیل کرنے کا عمل کیا لیکن خود آزاد کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آزاد کبھی ایران گئے ہی نہیں[138]۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آزاد ایک مقام پر موسم سرما کی شدت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا برفیں پڑ رہی تھیں۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا۔ دریائے سیحوں رستے میں ملا۔ اس پار سے اس پار تک ایک تختہ آئینے کا تھا شتری اور ایسے قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے[139]۔

کہاں ایران اور کہاں دریائے سیحوں جو ایران سے کوسوں دور خجند اور کوکان کے شمال سے ہوتا ہوا بحر رال میں گرتا ہے[140]۔ ڈاکٹر محمد صادق کا خیال ہے کہ آزاد نے سخن دان فارس میں ایران کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ انگلستان کے سفیر مقیم ایران مالکم کی تاریخ ایران کے ترجمے ہیں[141]۔

مولانا محمد حسین آزاد کا یہ سفر پان اسلامزم کی صورت حال کو جاننے کے لیے برطانوی حکومت کے نزدیک اہم تھا کیوں کہ کریمیا کی جنگ کے بعد روس کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے برطانیہ نے ہندوستان میں اتحاد اسلامی کے جذبے کو ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی اور اس کے سیاسی مدبرین بھی یہی چاہتے تھے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں میں موجود اس جذبے کا بھی مشاہدہ کیا جائے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے کس حد تک ان باتوں کا تجزیہ کیا اس کا درست اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس مہم جوئی کے نتیجے میں انھوں نے حکومت برطانیہ کو کافی معلومات فراہم کیں۔ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ روسی حملے کی وجہ سے خان خوجند اور امیر بخارا نے اپنا انجام دیکھتے ہوئے ہندوستان، انگلستان اور قسطنطنیہ سے مدد کی بے سود التجا کی تھی۔ خوخند کا ایک سفیر اکتوبر ۱۸۶۴ء میں لاہور آیا، جب لارڈ کارنوالس (Lord Cornwallis) نے وہاں عظیم دربار منعقد کیا تو وہ اس میں موجود تھا۔ جب کہ بخارا کا سفیر ۱۸۶۷ء میں ہندوستان وارد ہوا تو دونوں ریاستیں روس کے پنجہ استبداد کا شکار ہو چکی تھیں اور انھیں باقاعدہ زار کی سلطنت میں شامل کرلیا گیا تھا[142]۔

حکومت ہندان بیرونی معاملات میں دخل دینے کی خواہاں نہ تھی پھر بھی یہ مناسب خیال کیا گیا کہ خوانین کی سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک خفیہ مشن بھیجا جائے جس کی سربراہی ڈاکٹر لائٹنر کر رہے تھے[143]۔ کوئی بھی سیاسی مشن شاید ہی ایسا ہوگا جو ادبی لحاظ سے اس قدر مفید ثابت ہو۔ سخن

دان فارس میں آزاد نے اپنے مشاہدات کے ذریعے انشاپردازی کے جو نمونے پیش کیے ہیں اس نے اردو کی ادبی روایات میں ایسی جگہ بنالی جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولوی چراغ علی بھی خلافت عثمانیہ کو عالم اسلام کے لیے تسلیم کرتے تھے انھوں نے اسلام پر جتنی کتابیں لکھیں وہ زیادہ تر انگریزی میں ہیں۔ سید احمد خان کی تحریک سے وابستہ ہونے سے پہلے ہی مناظرے کا شوق رکھتے تھے اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے سب سے پہلے پادری عمادالدین پانی پتی کی کتاب تاریخ محمدی کے مآخذ کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کی رد میں تعلیقات کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۷۶ء میں لکھنو سے شائع ہوئی[۱۴۴]۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اسلام کو دوسرے مذہب پر کیوں ترجیح اور فوقیت دی جائے اور اسلام ہی دنیا میں اللہ کے نزدیک سچا مذہب ہے[۱۴۵]۔

انھوں نے ایک کتاب اسلام کی دینوی برکتیں کے نام سے لکھی جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس لیے وہ بار بار شائع ہوئی۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ قرآن کریم نے انسان کو اصلاح معاش کا سبق کس طرح دیا اور ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ پیش آنے کے کیا طریقے ہیں۔ اسلام نے معاشرتی اصلاح کے لیے کیا قدم اٹھایا اور مسلمانوں کو بنی نوع انسان کا احترام کرنا سکھایا۔ کس طرح طبقاتی فرق کو مٹایا اور کائنات میں بسنے والے تمام انسانوں کو صلح و آشتی کا پیغام دیا اور امن وامان کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کی[۱۴۶]۔

تحقیق الجہاد میں انھوں نے عیسائیت کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے دنیا میں پھیلا۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانے میں جتنی جنگیں لڑی گئیں ان کا مقصد کفار کو قتل کرنا نہیں تھا بلکہ تمام تر انسانی اور اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھ کر یہ جنگیں لڑی گئیں ہیں[۱۴۷]۔ اس کے علاوہ قدیم قوموں کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی۔ یہ تمام کام ان کے انگریزی زبان میں ہے جب کہ اردو زبان میں تاریخ بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ، تحقیق نیاز نامہ جیسی کتابیں ہیں[۱۴۸]۔

مولوی چراغ علی اور سید احمد خان کے رفقا نے ترکی اور روس کی جنگ میں اور ہندوستان کے والیان ریاست تک نے بڑی فراخی اور حوصلگی سے چندے دیے۔ ۱۸۷۹ء میں نواب شاہ جہاں بیگم والی ریاست

بھوپال نے گراں قدر مالی امداد سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کی تھی۔اس کے ساتھ نواب سید صدیق حسن نے اپنی ایک جدید تصنیف تفسیر فتح البیان کا ایک نسخہ ہدیہ میں بھیجا تھا[۱۴۹]۔ان چیزوں کے جواب میں ترکی خلافت سے ایک فارسی فرمان مورخہ ۱۸ ربیع الاول ۱۲۹۶ء بہ مطابق ۱۸۷۹ء بہ مہر خیرالدین پاشا صدر اعظم سے آیا تھا[۱۵۰]۔

خلافت عثمانیہ کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ۱۸۹۶ء میں جنگ روم و یونان میں بلند ہوئی۔ چوں کہ برطانیہ کی ہمدردی و اعانت یونان کے شامل حال تھی۔ اس لیے برطانیہ کے مقربین اس مسئلے کو نزاعی صورت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا میں چند اصحاب جس میں محسن الملک، مولوی ذکاء اللہ پیش پیش تھے انھوں نے انکار خلافت پر مضامین لکھے۔مگر کمال کی بات یہ ہے کہ مولوی چراغ علی کا نظریہ تحریک سرسید سے جڑے ہونے کے باوجود خلافت عثمانیہ کے حق میں تھا۔

ہندوستان کے کئی علما نے اس جنگ میں اخلاقی اور مالی شرکت کو جہاد سے تعبیر کیا۔بمبئی کے مسلمانوں نے فتح یونان کی خوشی میں جشن منایا تو سید احمد خان نے اس کے خلاف ایک مضمون لکھا۔مگر مسلمانان ہند نے اس زمانے میں ان کی بات کو اور ان کے نظریے کو یکسر مسترد کر کے رکھ دیا[۱۵۱]۔شبلی کا ذکر چوں کہ پہلے بھی کیا جاچکا ہے مگر تسلسل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ انھوں نے سید احمد خان کے اس عمل پر ایک ناتمام مضمون مسئلہ خلافت پر لکھا۔جس میں انھوں نے تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے ترکوں کی خلافت عالم اسلام کے لیے کیوں کر درست ہے[۱۵۲]۔شبلی نے ترکوں کی فتح پر جب وہ قسطنطنیہ میں موجود تھے ایک قصیدہ لکھا جس میں انھوں نے سلطان عبدالحمید کو خلافت اسلامیہ کے سربراہ کے طور پر دیکھا ہے۔اس قصیدے میں شبلی کی عقیدت نمایاں ہے۔

ہم الٹ دیتے ہیں دنیا کا مرقعہ دم میں — ہم سے پر شور تھا یہ گنبد مینا کیسا
ڈال دی کشور ایراں میں جو ہم نے ہل چل — گر پڑا خاک پہ تاج سر کسریٰ کیسا
روم و اٹلی کے مدرسے میں کئی صدیوں تک — تھا سند فلسفہ بو علی سینا کیسا
ہاں کمر بستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے — آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا

اے حریفو! تمھیں خالق کی قسم سچ کہنا
شبلی خستہ نے لکھا ہے یہ قصیدہ کیسا[۱۵۳]

ترکی میں ایک خطبے کے دوران جب سلطان عبدالحمید کا نام آیا تو علی گڑھ کے اس مضمون میں انھوں نے اپنے اثر کو یوں بیان کیا ہے۔

> خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش اللھم انصر ہذا السلطان السلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان السلطان الغازی عبدالحمید تو میرے بے اختیار آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ امڈا چلا آتا تھا[۱۵۴]۔

شبلی کی وفات سے پہلے چند روز پیش تر ترکوں نے جنگ عظیم میں شرکت کی تھی۔ شہر کے چند اہم لوگوں نے ان کے مکان پر ایک جلسے کا اعلان کیا اور جب لوگ جمع ہوئے تو ان کو اطلاع دی گئی اور مرضی دریافت کی اس وقت بستر موت پر ان کی زبان سے یہ دل سوز فقرہ نکلا کہ آہ میں تو خود کو اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ میری کھال سے ترک اپنے جوتوں کا تسمہ بنائیں[۱۵۵]۔

ہندوستانی مسلم دانش وروں کے علاوہ برطانیہ کے اہم مستشرق بلنٹ نے بھی انیسویں صدی کے نصف آخر میں عثمانیوں کے حوالے سے دنیا میں پائے جانے جذبات کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ حنفیوں کے علاوہ سلطان کو مالکی وشافعی بھی جو پہلے خلافت عثمانیہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے اب صدق دل سے خلیفہ اسلام تسلیم کرنے لگے ہیں۔۔۔ اور ہندوستان کے مسلمان ہر جگہ چاہے وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہی کیوں نہ ہو خلیفہ کے لیے مساجد میں اور عام جگہوں پر خصوصی دعائیں مانگی جاتی ہیں[۱۵۶]۔

سید احمد خان کی تحریک سے وابستہ وحیدالدین سلیم پانی پتی نے بھی اس تحریک میں قلمی سرمایہ کافی چھوڑا ہے۔ شعر کہنے پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ ۱۹۳۸ء میں افکار سلیم نام سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا۔ ان نظموں میں قوم کے نام تبلیغی پیغامات ہیں اور ملی تصور بھی نمایاں ہے۔

فرزند ہو تم ملت ذیشان کے اٹھو ملت کا جو ہے فرض وہ پہچان کے اٹھو
اللہ کا جو حق ہے اسے جان کے اٹھو جو حکم پیمبر ہے اسے مان کے اٹھو
دامن کو ذرا عزم کے گردان کے اٹھو جو دل میں ارادہ ہے اسے ٹھان کے اٹھو[۱۵۷]

وحیدالدین سلیم پانی پتی کا خاص میدان نثر ہے جہاں ان کی قوت متخلیہ شاعری سے زیادہ جولانی دکھاتی ہے۔ نثر کے باب میں ان کی نثری خدمات پر تحقیق موجود ہے۔

تحریک اتحاد اسلامی اور برعظیم کے علما کی علمی و ادبی خدمات

یورپی اقوام نے اسلام دشمنی کے باعث عیسائی اقلیتوں کو بغاوت پر اور بلقانی ریاستوں کو جنگ پر اکسانے یا ترکوں کی سرحدی صوبوں پر بلا جواز حملہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا، مثلاً فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجزائر فتح کر لیا اور ۱۹۰۹ء کے اختتام تک صحرا کے بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لے آیا، ترکوں کی ایک اور تابع ریاست تیونس پر ۱۸۸۱ء میں فرانس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مراکش جو ایک آزاد مسلم ریاست تھی۔ ۱۹۰۵ء میں فرانس اور اسپین نے اس پر چڑھائی کر کے اس کے حصے بخرے کر دیے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک اور دیگر اقوام نے مل کر ترکوں اور عربوں کے کئی علاقے ہتھیا لیے[۱۵۸]۔

ان حالات سے برعظیم کے علما بے خبر نہیں تھے ان میں اس صورت حال سے اضطراری کیفیت نمایاں تھی اور وہ مسلم امہ کی تمام اکائیوں کو متحد کر کے ایک ایسا احساس از سر نو پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جو دوبارہ احیا اسلام کے کام کو پوری دنیا میں پھیلا سکے۔ ان علما میں کئی نام ایسے ہیں جنھوں نے باقاعدہ اس کام کے لیے فعال مہم چلائی اور پھر سامراج کے ظلم و ستم کو بھی برداشت کیا۔ ان علما کا ہمیشہ یہ مؤقف رہا ہے کہ برطانیہ چوں کہ مسلم علاقوں پر قبضے کے لحاظ سے اپنی تمام سامراجی قوتوں میں سرفہرست ہے اس لیے اس کے کردار سے مسلم عوام کو باخبر رکھنا ضروری ہے۔ شبلی نعمانی جب قسطنطنیہ گئے تو یہ احساس ان میں اور گہرا ہو گیا اور انھوں نے پھر ڈٹ کر برطانوی سامراج کے مکروہ کردار کو اپنی تحریروں میں پیش کرنا شروع کر دیا۔

اتحاد اسلامی کا نظریہ خواہ یورپین اقوام کی نظر میں کتنا ہی خطرناک کیوں نہ سمجھا جائے، علما کے نزدیک یہ حیثیت جز و مذہب کی سی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد بین المسلمین سے مسلمانوں کو سیاسی، تہذیبی اور تمدنی قوت حاصل ہوتی ہے اس لیے جنوبی ایشیا کے بیش تر علما نے اسے اپنے فریضے کے طور پر انجام دیا۔ انھوں نے دینی رابطہ اسلامی کو پھر سے زندہ کیا اور مسلمانوں کو آپس میں متحد ہو جانے کی تلقین کی۔ انھوں نے مدارس اور مسجدوں میں اس سوچ کو عام کیا کہ مسلمان خواہ کسی بھی علاقے کے ہوں وہ آپس بھائی بھائی ہیں[۱۵۹]۔

لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اہم علما رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولوی عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب اور خیرالدین نے شاہ عبدالعزیز کے فتوے کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے کا خیر مقدم کرتے ہوئے مکہ اور استنبول کی جانب ہجرت کی [۱۶۰]۔ دوسرے وہ علما تھے جو ہندوستان کو دارالسلام تصور کرتے تھے۔ یہاں رہنے کو ترجیح دیتے تھے ان میں کرامت علی جونپوری، مولانا فضل علی، محمد عبدالروٗف۔ یہ لوگ برطانوی سامراج کی وفاداری کے حامی تھے اور انھوں نے برطانوی حکومت کو یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ یہ سلطان ترکی ہمارے مذہب کے سربراہ ہیں [۱۶۱]۔ ان لوگوں کی یہ بات بھی اپنی جگہ درست تھی کہ یہ وقت نہیں ہے کہ انگریزوں سے محاذ آرائی کی جائے۔

ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ ترکی کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو دانستہ یورپی قوتوں نے تسلیم کیا، جن میں برطانیہ قابل ذکر ہے۔ ترکوں کی بہادری کے بارے میں ایک غلط تاثر پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت سے ہمدردی کرنے لگ جائیں۔ ترکی کے خلیفہ کی شخصیت کو کافی حد تک افسانوی صورت میں ڈھال کر پیش کیا گیا [۱۶۲] مگر جب جنگ کریمیا میں ترکوں کو کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تو برطانوی سامراج نے سلطان ترکی کی شخصیت کو بہ حیثیت خلیفہ داغ دار کرنا شروع کر دیا تاکہ روسی توسیع پسندی کی راہ کو معلوم کیا جاسکے [۱۶۳]۔ ۱۸۵۷ء کے دوران برطانوی حکام نے سلطان عبدالعزیز سے ایک حکم نامہ حاصل کیا تھا جس میں اس کی تشہیر کی گئی کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی اتحادیوں کے حامی رہیں گے۔ یہ ایک چالاکی کی حکمت عملی تھی جو علما کے فتویٰ جہاد کے خلاف استعمال کی گئی [۱۶۴]۔

ہندوستانی علما میں علامہ رحمت اللہ کیرانوی کے عالم اسلام میں تعلقات نہایت وسیع تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنگ آزادی کے زمانے میں انھیں باغی قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے مولانا رحمت اللہ باغی کہلوائے۔ ان کے بارے میں ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ ''وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد کے صاحب تصنیف تھے انھوں نے دہلی جہاد میں بھرپور حصہ لیا'' [۱۶۵]۔

جب ہندوستان میں عیسائی اور مسلمانوں کے مابین مناظرے کی مجلسیں زوروں پر تھیں تو ایک پادری فنڈر (Pfander) ہندوستان سے انگلینڈ گیا۔ وہاں سے قسطنطنیہ پہنچا، یہ عبدالعزیز کا زمانہ تھا، ترکی اور انگلستان کے تعلقات خوش گوار تھے۔ اس نے سلطان سے بیان کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مذہبی مناظرہ ہوا تھا جس میں عیسائیت کو فتح اور اسلام کو شکست ہوئی۔ سلطان عبدالعزیز کو مذہبی معاملات

سے کافی شغف تھا۔ان کی خواہش تھی کہ پادری فنڈر کے اس دعوے کی صداقت معلوم کی جائے۔اس لیے سلطان نے شریف مکہ کے نام فرمان روانہ کیا۔شریف مکہ نے کہا کہ مولانا مکہ میں ہیں۔سلطان عبدالعزیز نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو مناظرے کے مفصل حالات معلوم کرنے اور ہندوستان میں جدید دور حکومت اور انقلابات کے چشم دید واقعات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے قسطنطنیہ طلب کیا۔

رحمت اللہ کیرانوی وہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے گئے۔سلطان نے ان سے ملاقات کی۔اس ملاقات میں خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم اور شیخ الاسلام و دیگر اکابرین موجود تھے۔سلطان نے مناظرے کی پوری تفصیلات سنیں اور انھیں ردِ عیسائیت کے کام کے حوالے سے تمغۂ مجیدی اور گراں قدر وظیفے سے سرفراز کیا۔اسی طرح دو مرتبہ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے بھی انھیں قسطنطنیہ میں طلب کیا تمغہ مذکور کے ساتھ مرصع تلوار اور علمی مرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے، پایہ حرمین بھی عطا کیا[۱۶۶]۔

رحمت اللہ کیرانوی نے سلطان عبدالعزیز اور امام المحد ثین زینی وحملان کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد میں مناظرے کی کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت شرح وبسط کے ساتھ ایک کتاب اظہار الحق میں پوری صورت حال بیان کی۔اس کتاب کو پہلے پہل قسطنطنیہ میں چھاپا گیا۔ایک ترک عالم نے عربی سے اس کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا اور وہ ابرار الحق کے نام سے شائع ہوا۔نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گئے۔مولوی سلیم اللہ نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا مگر اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی[۱۶۷]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے روایتی علما سے ہٹ کر مولانا ابوالکلام آزاد نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔وہ ہندوستانی مسلمانوں میں جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کی مذہبی اصلاحات سے متاثر ہوکر عالم گیر اسلامی شعور اور پان اسلامزم کی تائید وترویج چاہتے تھے۔ان کا رسالہ الہلال اور البلاغ کی موثر خطابت آمیز صحافت کا مرکز بھی اسلام اور اس کی ہمہ گیریت تھی[۱۶۸]۔انھوں نے احیائے اسلام کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے تمام کاموں کی بنیاد تعلیم الٰہی پر رکھیں نہ کہ محض کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید واتباع پر۔انھوں نے ایسی سیاست کی بھی مخالفت کی جس کی بنیاد وطنیت پر مبنی ہو[۱۶۹]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں کلکتہ کے مقام پر اتحاد اسلامی کے عنوان سے ایک تقریر کی۔جس میں یورپ والوں کو بتایا کہ اسلام نے ایک عالم گیر

اخوت کا پرچار کیا ہے اور یورپ جس پان اسلامزم کو ہوّا بنا کر مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ دراصل یورپ کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔ اپنی تقریر میں وہ کہتے ہیں کہ:

> پان اسلامزم کا فرضی فطرہ جس غرض مخفی سے دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے، بہت کم مسلمان ہیں جن کی نظر اس حقیقی علت پر ہوگی۔ اس خطرہ کے اعلان پر بریت اور احتیاط کی کوشش بالکل بے فائدہ ہے کیوں کہ اس کی بنیاد جہل نہیں بلکہ ایک نہایت سخت ابلیسانہ حکمت عملی ہے۔ قبل اس کے مسلمان پان اسلامزم کے جرم سے کانوں پر ہاتھ دھریں ان کو خود یورپ سے پوچھنا چاہیے کہ مسئلہ مشرقی کی حقیقت کیا ہے[۱۷۰]۔

آزاد مسلمانوں کی حالت زار پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں پان اسلامزم کا تصور درست حالت میں موجود ہی نہیں، اگر ہوتا تو یورپ کو کسی بھی اسلامی ملک میں دست درازی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر پان اسلامزم کا اصلی وجود ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ ہمارے سامنے ایران پر قیامت گزر جاتی، مراکش کا خاتمہ ہو جاتا، طرابلس میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتیں اور ہمارے قلوب میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوتی''[۱۷۱]۔

انھوں نے مزید کہا کہ ہم مسلمان اپنے اصلی پان اسلامزم کو کھو چکے ہیں اور یہی علت اسلام کا اصلی ضعف اور انحطاط ہے، مگر چوں کہ اس کا بیج اب بھی ہم میں موجود ہے گو برگ و بار نہیں اس لیے یورپ چاہتا ہے کہ اس طرح کے انتشار سے سہا اور ڈرا کر ہم کو آئندہ کی ہوشیاری اور بے داری سے بھی باز رکھے اور رہی سہی قوت کا بھی نشو و نما سے پہلے خاتمہ کر دے[۱۷۲]۔ ترکوں کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کو بیان کرتے ہوئے آزاد کا کہنا تھا کہ ''ترکوں سے محض دینی اخوت ہی کا نہیں بلکہ اس سے بھی مقدم تر رشتہ خلافت اسلامیہ کے دینی احترام کا ہے۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی قوم بغیر کسی سیاسی مرکز کے زندہ نہیں رہ سکتی اور اسلام کا سیاسی مرکز اگر ہے تو صرف خلافت آل عثمان ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو، اس کا فرض ہے کہ اسلام کی بقا کا خواست گار ہو، تو یہ فرض دینی ہے کہ خلافت آل عثمان کے تعلق کو ایک خالص دینی رشتے کی طرح اپنے دل میں محفوظ رکھے[۱۷۳]۔

ابوالکلام آزاد نے خلافت عثمانیہ کے مذہبی ہونے کی حیثیت سے کئی مواقع پر اس کی شرعی دلیلیں پیش کر چکے تھے۔ ان کی کتاب مقام خلافت میں اس کی مذہبی بحثوں پر کافی مواد ملتا ہے۔ ہندوستان میں جتنی کتابیں اس کے مذہبی ہونے پر لکھی گئی ہیں اس میں نہایت قوی دلائل موجود ہیں۔ جنگ روم و روس کے

موقع پر خلافت عثمانیہ کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر ہندوستان میں جو کچھ کیا گیا اس کا اندازہ ان فتووں سے لگایا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے جید علما کرام نے اس وقت دیے تھے اگر خلافت عثمانیہ کا مذہبی پہلو مسلمانانِ ہند کے سامنے نہ ہوتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جنھوں نے جنوبی ایشیا میں جذبات کی یہ لہر پیدا کر دی تھی۔ اس وقت کے مسلمانوں نے سلطان ترکی کی جو مالی خدمت کی اس تہہ میں خلافت عثمانیہ کی اطاعت و فرماں برداری کا ہی جذبہ کام کر رہا تھا[174]۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پرچے الہلال کے ذریعے برطانوی سامراج مکر و فریب اور استبدادی پالیسی کو بے نقاب کیا۔ ۲۸ جنوری ۱۹۱۴ء میں شاکر آفندی کے خط کو شائع کیا جو برطانوی کردار کی وضاحت کرتا ہے۔ شاکر آفندی ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں کہ:

> اسلام کے عاشق، حریت کے پرستار، میں تسلیم کرتا ہوں کہ تو اپنی ملت مظلوم کی خدمت کر رہا ہے۔ جسم سے ہی نہیں بلکہ روح سے کر رہا ہے اپنے آرام کی فکر نہیں مگر اپنے وطن کی راحت کا تو خواہاں ہے۔ پیروان اسلام کو ان کی ابتدائی حریت و مساوات میں دیکھنے کے لیے تیری آنکھوں میں اضطرار کی چمک ہے[175]۔

ابوالکلام آزاد نے اپنی نثری تحریروں میں ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو خطابت آمیز تھا انھوں نے اس ذریعے سے مسلمانوں کو متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھتے ہیں کہ:

> میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بے دار کر دے میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جن کی سینہ کوبی سے سرکشتگان خواب موت آور ہوشیار ہو جائیں[176]۔

اس کے برعکس جب کبھی آزاد کے مجموعی کاموں اور ان کے کمالات کے بارے میں غور و فکر کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں کوئی تسلسل نظر نہیں آتا۔ انھوں نے ہمیشہ سابقہ کو چھوڑ کر ایک نئی راہ اپنائی، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کئی حصوں میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر حصہ ایک مطالعے کا متقاضی ہے۔ جس پان اسلامزم کے نظریے کے وہ حامی تھے اور جس وطنیت کے نظریے کو انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں رد کیا آگے چل کر یہی انکار اقرار میں تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ان کے اس انوکھے پن اور نظریات کی مسلسل تبدیلی نے انھیں حقیقی معنوں میں اسلامی احیا پر درست طریقے سے کام نہیں کرنے دیا[177]۔

ان ساری باتوں کے باوجود آزاد نے عالمی اتحاد بین المسلمین کی دعوت کو ہمیشہ جاری رکھا، ۱۹۱۳ء میں جب یورپین ترکی پر اتحادی فوجوں نے حملہ کر دیا اور خلافت عثمانیہ کو مجبور کیا کہ وہ ایڈریانوپل سے دست بردار

ہو جائے تو اس وقت مسلمانان ہند کا جذبہ و جوش اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت دو آتشہ ہو چکا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے اس موقعے پر مسلمانوں سے کہا کہ ایڈریانوپل پر اتحادی فوجوں کا حملہ اسلام کے خلاف علی الاعلان جنگ ہے اس لیے یورپ کی طاقتوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون دشمنان اسلام کے ساتھ تعاون ہے[۱۷۸]۔

مولوی محمد فقیر حسین دہلوی نے بھی پان اسلامزم کے نظریے کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۱۲۹۴ھ میں استنبول تشریف لے گئے اور حضرت ظافر مدنی جو سلطان عبدالحمید کے پیر و مرشد تھے ان سے بیعت کی[۱۷۹]۔ ان سے کئی منظوم رسالے یادگار ہیں۔ اردو ادب میں ان کا ایک مختصر رسالہ رسالہ اظہار الحلال و الحرام کا تعارف ایوب قادری نے اپنی کتاب اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ میں کرایا ہے[۱۸۰]۔ جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو انھوں نے ایک منظوم رسالہ جہاد نامہ بھی جاری کیا تھا اور مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ بدیسی چیزوں کا استعمال ترک کر دیں اور دیسی چیزوں کو اپنے طرز زندگی میں ڈھال لیں[۱۸۱]۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی فقیر حسین دہلوی اور اس قسم کے دیگر علما جس وقت نہایت جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان حالات میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان سے زیادہ ٹھوس قدم اٹھا رہے تھے۔ لکھنؤ کے سب سے بڑے دینی مدرسے کے عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے جنگ بلقان سے پیدا ہونے والی صورت حال سے دل چسپی لینی شروع کی۔ مشیر حسین قدوائی نے تجویز پیش کی کہ ترکی ہلال احمر کو زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال میں ایک ہندوستانی طبی وفد بھیجنا چاہیے۔ علی برادران، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور ابوالکلام آزاد نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی۔ مگر تمام عملی تدابیر مشیر حسین قدوائی، علی برادران اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہی اختیار کی[۱۸۲]۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ان کاموں کے ساتھ انجمن خدام کعبہ کی بھی بنیاد رکھی۔ مگر ان تمام کاموں سے قبل مولانا عبدالباری فرنگی محلی جب نوجوان تھے تو انھوں نے ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس میں جابہ جا وعظ کہے۔ دیہات میں دورہ کیا، لوگوں کو امداد کی ترغیب دی، جس سے ایک کثیر چندہ ترکی روانہ کیا گیا انھوں نے نہایت رازداری سے مجاہدین کا ایک جتھہ بھی اس جنگ میں بھیجا[۱۸۳]۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مسلم دنیا اور ہندوستانی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا رخ

عوام کی جانب موڑ لیا۔ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے اپنی حمایت پان اسلامزم کی تحریک کے لیے وقف کر دی۔ جب ۱۹۱۰ء میں لکھنو میں مسلم لیگ کا ہیڈ کوارٹر قائم ہوا تو انھوں نے مجلس معید الاسلام کی دوبارہ اساس بھی رکھی جوان کے دادا اور والد اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے ۱۸۷۰ء میں قائم کی تھی۔ اس مجلس کا مقصد فرنگی محل کے علما کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ دوسرے علما کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی مدد کریں اور دنیاوی معاملات میں ان کی مدد اور پیش رفت میں ان کے اس طرح ساتھ رہیں کہ ان کے ذہن سے شریعت کا تصور مٹنے نہ پائے[۱۸۴]۔

عبدالباری فرنگی محلی کی سیاست کے بارے میں جو رائے دی جاتی ہے وہ ان کے سوانح نگار اصغر علی سے معلومات حاصل کر کے اخذ کیا گیا ہے۔ اصغر علی ان کے خاندانی دوست تھے اور CID کے شعبے میں کام کرتے تھے[۱۸۵]۔ انھوں نے ترکوں کے ادارے میں ایک اہم عہدہ حاصل کر لیا تھا اور انور پاشا کی انجمن اتحاد و ترقی نوجوان کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے تسلسل سے مولانا عبدالباری سے مراسلت جاری رکھی۔ ۱۹۱۱ء۔۱۲ء میں جب اصغر علی ہندوستان کا دورہ کرنے آئے تو انھوں نے فرنگی محل میں ہی قیام کیا[۱۸۶]۔

۱۹۱۲ء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اپنے تیسرے حج پر روانہ ہوئے تو انھوں نے ترکی سلطنت کے اہم دنوں کا مشاہدہ کیا جس میں انھیں کچھ خوف اور توقعات بھی تھیں۔ ترکی اور مکہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے دمشق، بیروت، اسکندریہ اور قاہرہ کا بھی دورہ کیا۔ اصغر علی کے دفتر کی کوششوں کی وجہ سے شریف حسین مکہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جس نے ۱۹۱۶ء میں عرب بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ عبدالباری کی کبھی کبھار اس سے مراسلت بھی ہوتی تھی[۱۸۷]۔ اس پورے سیاسی و تہذیبی سرگرمی نے مولانا عبدالباری کے تجربے کو بہت وسعت دی اور وہ برطانوی سامراج کے تاثرات کے بارے میں اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔ اس عمل نے ان کی زندگی میں ترکی سلطنت کے معاملات اور جزیرہ نمائے عرب سے تعلق کو اتنا مضبوط کر دیا کہ وہ ان کی باقی زندگی کے ایام پر بھی حاوی رہا۔ انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو ایک خط میں لکھا تھا کہ " آج جو کچھ ترکوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس سے تمام دنیا کے مسلمان متاثر ہوں گے۔ ہمارے حلیف روئے زمین کے مسلمانوں کے حلیف ہو جائیں گے اور جو دشمنوں کے تابع مسلمان ہیں وہ غیر ہو جائیں گے"[۱۸۸]۔

اس خط میں موجود الفاظ سے مولانا عبدالباری کے تصور اتحاد بین المسلمین کی تشریح با آسانی کی جاسکتی

ہے۔وہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ہمہ گیر تصور رکھتے تھے جو قرآن میں موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۳ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو عوامی مسائل کے حل تلاش کرنے میں مشغول ہو گئے۔اور پانچ سالوں میں ہی قومی سطح پر معروف ہو گئے۔اسی سال انھوں نے اپنے روحانی شاگرد مشیر حسین قدوائی کے ساتھ مل کر انجمن خدام کعبہ میں ایسی روح پھونک دی جس نے مسلمانوں میں ایک بار پھر ملت کے تصور کی تجدید میں سرگرمی پیدا کر دی۔

اس انجمن کا بنیادی مقصد عرب کے مقامات مقدسہ کی حفاظت تھی۔عبدالباری فرنگی محلی نے محمد علی جوہر کی تحریک ہلال احمر فنڈ میں بھرپور حصہ لیا اور انجمن خدام کعبہ سے بھی اس کی اعانت کرتے رہے۔انھوں نے فرنگی محل کے طالب علموں کو اودھ کے مضافات میں مالی امداد کے حصول کے لیے روانہ کیا اور کئی ہزار روپے ترکوں کی امداد میں روانہ کیے۔مشیر حسین قدوائی نے اپنے خط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۱۴ء لکھا ہے:''میں دیوانوں کی طرح عرصہ سے پکار رہا ہوں کہ پان اسلامزم کو کام میں لانا چاہیے اور ایک ایسی مستقل انجمن قائم کر دینی چاہیے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو رشتہ اخوت میں منسلک کر دے''[۱۸۹]۔

جب ۱۹۱۴ء کے اواخر میں جنگ عظیم چھڑ گئی تو مولانا شوکت علی نے عبدالباری فرنگی محل کو خط لکھا کہ حجاج کرام کو حج سے واپسی پر کافی مشکلات کا سامنا ہے برطانیہ نے جدہ پر گولہ باری شروع کر دی ہے اس لیے ضروری ہے کہ انجمن خدام کعبہ کو حرکت میں لایا جائے اور حجاج کی مشکلات دور کرنے کی سعی کی جائے[۱۹۰]۔

یہ انجمن مسلمانوں میں اتنی زیادہ فعال ہو چکی تھی کہ اس کا اندازہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ (Lord Hardinge) کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے برطانوی حکومت کو ہندوستان کے حالات سے مطلع کرنے کے لیے سیکریٹری آف اسٹیس کو لکھا تھا، اس میں اس نے کہا کہ:''ترکی کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کے باعث ہندوستان کی پان اسلامک پارٹی فطری طور پر مضطرب ہے اور ہمیں اطلاع یہ ہے کہ اب وہ پنجاب کے شورش پسندوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انجمن خدام کعبہ کے صدر نے اس تحریک کی بھی مخالفت کی ہے جس کا مقصد جنگ میں برطانوی حکومت کے حق میں فتوے کا اجرا تھا[۱۹۱]۔اس خط کے مندرجہ جات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تحریک بھی ترکی کو مضبوط دیکھنا چاہتی تھی اور اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ خلافت اسلامیہ کا یہ مرکز کسی نہ کسی طرح اس پرآشوب حالات سے اپنے آپ کو نکال لے۔اس ضمن میں اقبال شیدائی کی آپ بیتی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ اس

نجمن کے پس پردہ جہاد کرنا بھی شامل تھا کیوں کہ خدام کعبہ حجاز اور عراق وشام اور تمام مقامات مقدسہ کو غیر مسلموں کے عمل دخل سے محفوظ کرنے کی خواہاں ہی نہیں تھی بلکہ ان مقامات کے دفاع کا منصوبہ بھی پیش نظر رہا تھا۔

بہرنوع اس انجمن کے ذریعے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مسلمانوں میں سلطان ترکی کے ساتھ ساتھ دیگر مقامات مقدسہ اوران ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق کومزید مستحکم کیا۔ عالمی سیاست میں دل چسپی لینے کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب میں بھی ہمیشہ شریک رہے۔کان پور کی مسجد کے واقع میں وہ شروع سے آخر تک مسلمانوں کی آواز سے آواز ملاتے رہے[۱۹۲]۔

علی برادران اور عبدالباری فرنگی محلی کے مابین پان اسلامزم کی تحریک کی وجہ سے ایک خاص تعلق استوار ہوا تھااور مولانا شوکت علی تو انھیں باقاعدہ اپنا پیر مانتے تھے۔شوکت علی نے جو خطوط مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھے اس میں عقیدت ومحبت کا پہلو نمایاں ہے۔مگر اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان دونوں رہنماؤں کے درمیان اختلافات بھی رونما ہو گئے تھے جو بعد میں پھر دوستانہ عمل میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۸ مئی ۱۹۱۹ء کے اس خط کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے جو شوکت علی نے عبدالباری فرنگی محلی کے نام لکھا تھا جس میں انھیں اسلام کا سچا شیدائی قرار دیا گیا[۱۹۳]۔مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی علی برادران کے خلوص اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے روابط کے قائل تھے انھوں نے لکھا ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا خاص طور پر ان سے پہلی ملاقات نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

۱۹۱۴ء میں راجہ محمود آباد کے ساتھ عبدالباری نے ترکی سلطان کو پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حلیف بننے سے منع کیا۔۱۹۱۵ء میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر ترکی سلطنت کو کچھ نقصان ہوتا ہے تو اس کا اثر مسلمانوں کے مذہبی تاثرات پر پڑے گا۔۱۹۱۶ء میں انھوں نے اپنے دوست شریف حسین مکہ کی عرب بغاوت کی سختی سے مذمت کی۔۱۹۱۷ء میں انھوں نے معید الاسلام کی دوبارہ سربراہی کی اور سیکریڑی آف مانٹیگو کو چند ضروری تجاویز پیش کیں جو آئندہ ہونے والی اصلاحات کے تعلق سے معلومات اور شواہد جمع کر رہا تھا[۱۹۴]۔

انھوں نے مسلمانوں میں اخوت کو پروان چڑھانے کے لیے ایک پرچہ اخوت جاری کیا جو اسلامی معاملات میں مسلمانوں کی رہ نمائی کرتا تھا۔ ان کا یہ رویہ رہا کہ مسلمان برطانوی سامراج اور ان کی مصنوعات سے خود کو دور رکھیں۔ان کی سیاسی سرگرمیاں اس قدر متنوع تھیں کہ وہ اپنی علمی سرگرمیاں جاری

نہیں رکھ سکے جس میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی ایک عربی تصنیف ۱۹۰۶ء میں آثار الاول من علمائے فرنگی محل ہے، جس میں انھوں نے فرنگی محل کے شجرہ نسب کو موضوع بنایا ہے[۱۹۵]۔

مسلم لیگ نے جب ترکوں کے حق میں آواز بلند کی تو عبدالباری فرنگی محلی نے اس آواز کو اپنے مکتبہ ہائے فکر سے تقویت پہنچائی۔ ان میں مفتی کفایت اللہ اور مولوی عبد اللطیف نے دہلی کے انجمن علما کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ مولانا عبداللہ وفا ثناء اللہ نے اہل حدیث اور عبدالقادر آزاد سبحانی نے کانپور کے علما کی حیثیت سے اس اجلاس میں ترکوں کی بحالی کے حوالے سے کئی اہم بیانات دیے۔ اس اجلاس میں علمائے دیوبند نے شرکت نہیں کی کیوں کہ ریشمی رومال کی سازش کے منظر عام پر آنے سے محتاط ہو گئے تھے اور مولانا حسین احمد مدنی کے تصور قومیت میں وطنی قومیت کو اہمیت دی گئی تھی[۱۹۶]۔

دیوبند نے اس کانفرنس میں شرکت تو نہیں کی مگر ماضی میں اس نے پان اسلامزم کی تحریک کو جس طرح پروان چڑھایا اس نے ہماری ملی تاریخ میں کچھ ایسے نقش قائم کیے جنھیں کسی طور بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ اسی مکتب فکر کے ایک عالم مولانا عبیداللہ سندھی بھی ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے کابل پہنچے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا منصوبہ تشکیل دیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی ہندوستان کی آزادی کا ایک انقلابی منصوبہ لے کر افغانستان گئے تھے۔ انھوں نے وہاں ہندوستان کی پرووینشل گورنمنٹ میں حصہ لیا، جنود ربانیہ کے نام سے ہندوستان کی نجات دہندہ فوج قائم کی، برٹش انڈیا پر افغانستان کے حملے میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ افغانستان کی کامیابی اور آزادی میں ان کا حصہ نمایاں تھا۔ جب افغانستان اور برطانیہ میں معاہدہ طے پا گیا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ عبیداللہ سندھی وہاں بیٹھ کر ہندوستان کی آزادی کی تحریک پر کام جاری رکھتے[۱۹۷]۔ مولانا عبیداللہ سندھی جذباتی شخص تھے وہ ابتدا ہی سے مسلمانان ہند کے بجائے بیرون ہند کے سیاسی مسائل سے دل چسپی رکھتے تھے۔ جنگ طرابلس اور بلقان میں انھوں نے انجمن ہلال احمر کی اعانت کے لیے کافی تگ و دو کی اور کہا کہ ''اُس میں شک نہیں کہ یورپ کی واحد اسلامی سلطنت پر ریاست ہائے متحدہ کے ظلم و تعدی کے حملوں نے مسلمانان عالم ہی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں رحم دل انصاف پسند غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا''[۱۹۸]۔ انھوں نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے روم و روس کی جنگ میں جس طرح چندہ اکٹھا کیا تھا تر کی پر اس نئی افتاد میں اس سے بڑھ کر مالی معاونت کی ہے۔

عبیداللہ سندھی نے جہاد کے لیے جنود ربانیہ گروہ کی تشکیل میں ترکی حکومت کی تائیدکو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ اس میں انور پاشا، عباس حلمی پاشا نے خصوصی تعاون کیا اور دل چسپی لی۔ مکاتیب عبید اللہ سندھی میں ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اس گروہ سے منسلک تمام عہدیداروں کی تفصیلات فراہم کی ہیں[199]۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلی جنگ کے شروع ہونے کے ساتھ ہی افغانستان ہندوستان پر حملہ کردے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے آزاد قبائل کو حاجی ترنگ زئی اور مولانا فضل حق ولی کے ساتھ مل کر آمادہ جہاد کیا۔ انھوں نے شیخ الہند کو اس پورے معاملے میں رابطے میں رکھا ہوا تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خلاف کھڑا ہونا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اندرونی بغاوت اور بیرونی یورش مل کر ہندوستان کی آزادی کو یقینی بنادیں گے[۲۰۰]۔

اس پورے عمل میں راجہ مہندر پرتاب کو سربراہ بنایا گیا تا کہ ہندوستان کی اکثریتی آبادی ان معاملات سے لاتعلق نہ رہے[۲۰۱]۔ اس منصوبے کی کئی اہم چیزوں کا علم اقبال شیدائی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے خطوط سے ہوتا ہے جو اس منصوبے کے مختلف مراحل کے حوالے سے لکھے گئے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں اور مولانا عبیداللہ انصاری کی مرتب کردہ کتاب مولانا عبید اللہ سندھی کی سر گزشت کابل میں ان سرگرمیوں کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔

کابل میں جو سرگرمیاں جاری تھیں ان میں ہندوستان کے ایک اور عالم دین جنھیں نقیب انقلاب کہا جاتا ہے مولانا برکت اللہ بھوپالی بھی تھے جو جمال الدین افغانی کے فکری و عملی کاموں کے سلسلے میں بھی کافی سرگرم رہے۔ انھوں نے عالم اسلام کے مسلمانوں کی خدمت کرنے کا طریقہ یہی اختیار کیا کہ تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کو ایک سیاسی مرکز پر جمع کیا جائے جو افغانی کا لائحہ عمل تھا[۲۰۲]۔ جب وہ لندن میں مقیم تھے تو ۲۴ ستمبر ۱۸۹۶ء میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا اس میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے انگریزوں کی منافقانہ روش اور تاریخی تناظر کو بیان کیا اور ایسے شواہد پیش کیے جس سے برطانوی سامراج کی عالمی پالیسی کا جو ہمیشہ سے دوطرفہ رہی ہے پردہ چاک ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ترکی خلافت کے بارے میں کہا کہ یہی برطانیہ کسی زمانے میں ترکوں کے آگے کشکول گدائی پھیلا کر ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا آج اس مملکت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے تباہ و برباد کرنا چاہ رہا ہے[۲۰۳]۔

انھوں نے اس حوالے سے کئی اہم مضامین بھی لکھے۔ ہندوستان میں حسرت موہانی کے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے۔ فروری ۱۹۱۱ء اردوئے معلی میں انھوں نے سلطان محمد خامس پر ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے عالم اسلام کے مسلمانوں کو متحد ہونے کی دعوت دی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

> اسلامی ممالک کو یورپین خطرے کے مقابلے میں متحد ہو جانے کی جو قابل قدر صلاح دی گئی ہے اس پر کاربند ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حریت، مساوات اور برابری کو اسلام کا اصل اصول سمجھنا چاہیے۔ جب مسلمانوں نے اس اصول کی پابندی ترک کردی تو اس وقت سے تنزل اور یورپی طاقتوں کا عروج شروع ہو گیا[۲۰۴]۔

برکت اللہ بھوپالی نے جاپان میں اسلامک فریٹرنٹی جیسا ادارہ قائم کیا۔ ترکی سے اخبار الخلافت عربی اور ترکی زبان میں جاری کیا، جب کہ مصر میں بھی انھوں نے اہم صحافتی خدمات انجام دیں[۲۰۵]۔

پان اسلامزم کی تحریک کو عوام الناس کے طبقے میں زیادہ مقبولیت اسی لیے ملی کہ اس وقت کے تمام مکتبہ ہائے فکر کے علما اس میں شریک تھے اور انھوں نے جس علمی انداز کی خدمات انجام دیں اس نے مسلمانوں میں بھائی چارے کو کافی فروغ دیا۔ مسلم لیگ کی تحریک کو اس سے کافی معاونت ملی اور اتحاد بین المسلمین کی سوچ کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان مقامی سطح پر اتحاد و اتفاق کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کرنے میں کامیاب ہو پائے۔

اتحاد بین المسلمین کی تحریک میں علما کے کردار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دلی کے مفتی کفایت اللہ جو اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہندوستان میں اہم مقام رکھتے تھے انھوں نے بھی اس نظریے کی توثیق کی تھی کہ ''اسلام کی ہمہ گیریت کی وجہ سے دنیا کے مسلمان خواہ کسی بھی رنگ و نسل اور علاقے سے متعلق ہوں، مذہب عقائد اور مذہبی تعلیمات کی بنا پر ایک دوسرے سے رشتہ اخوت میں جڑے ہوئے ہیں[۲۰۶]۔ انھوں نے عیدالضحیٰ کے موقعے پر مسلمانوں کو قربانی موقوف کرنے اور قربانی کی رقم کو طرابلس و بلقان کے مجروحین میں امداد کرنے کے حوالے سے فتویٰ دیا۔ انھوں نے کہا کہ:

> جن مسلمانوں پر قربانی واجب ہے ان کو تو قربانی ہی کرنا ضروری ہے قیمت دے دینا جائز نہیں۔ مگر قربانی کی کھالیں اور نفلی قربانیوں کی قیمت وہ اس مصیبت زدہ قوم کی اعانت میں دے سکتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی جانیں دے رہے ہیں بلکہ بہتر یہی ہے کہ نفلی قربانیاں اس سال ملتوی کریں اور اس کی مقدار نقد ترکی مجروحین و یتامیٰ کے لیے بھیج دیں[۲۰۷]۔

مفتی کفایت اللہ دہلوی کی مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے ساتھ خط و کتابت تھی۔ اور انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ بھی لیا اور مشترکہ حکمت عملی بھی اختیار کی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علما میں اختلافات کو کم کرنے کی تحریک ملتی رہی۔

ملت اسلامیہ میں علما کا کردار اور مرتبہ ایسا رہا ہے جس نے ہماری ملی اور تاریخی زندگی پر کافی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی، علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی میں بر پا ہونے والے مختلف رجحانات میں علما کا جو کردار رہا ہے اس سے مسلمانوں کی تاریخ کو سمجھنے میں کافی معاونت ملتی ہے اور جس انداز میں علما نے مسلمانوں کی رہ نمائی کی ہے اس سے پان اسلامزم ہی نہیں بلکہ عقائد اور دینی رجحانات میں بھی ہر موقعے پر ان کی خدمات نظر آتی ہے۔ اسی لیے کسی بھی تحریک کے مطالعے میں علما کے کردار کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱- احمد، عزیز، ۲۰۰۵، ص ۸۴
۲- ایضاً، ص ۸۴
۳- جامعہ ملیہ کے استاد کے قلم سے، ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۲
۴- احمد، عزیز، ۲۰۰۵، ص ۸۴
۵- اوکے، میم کمال، ۱۹۹۱ء، ص ۳۵
۶- ایضاً، ۳۵
۷- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸، ص ۱۱۲
۸- انور، معظم، ۱۹۵۹ء، ص ۱۷۰-۱۷۱
۹- ایضاً
۱۰- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸، ص ۱۱۲
۱۱- رفعت، مبارز الدین، سید، ۱۹۴۴ء، ص ۱۵۲
۱۲- ایضاً
۱۳- ایضاً، ص ۱۵۵
۱۴- ایضاً، ص ۱۵۲
۱۵- سرور، محمد، اکتوبر ۱۹۶۸ء، ص ۲۸۹، ۲۹۰
۱۶- عبدالغفار، قاضی، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ص ۱۰
۱۷- رزاقی، شاہد حسین، ۲۰۱۰ء، ص ۷۸، ۷۹
۱۸- عبداللہ، ڈاکٹر سید، ۱۹۹۸ء، ص ۲۹
۱۹- اکرام، شیخ محمد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۵
۲۰- عبداللہ، ص ۲۹
۲۱- ایضاً
۲۲- برنی، ضیاء الدین، ۱۹۵۴ء، ص ۱۳۲
۲۳- اکرام، ص ۱۱۵
۲۴- نظامی، خلیق احمد، جنوری ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۵
۲۵- عبدہٗ، مفتی محمد، ۱۹۱۳ء، ص ۶
۲۶- نظامی، ص ۲۷۵

۲۷- ایضاً،ص ۲۷۶، ۲۷۷

۲۸- ایضاً،ص ۲۷۷

۲۹- ایضاً،ص ۲۹۹

۳۰- ایضاً،ص ۲۹۸

۳۱- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء ص ۱۸۵

۳۲- خان، سید احمد، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱۱

۳۳- ایضاً،ص ۲۱۱، ۲۱۳

۳۴- ایضاً،ص ۴۰۶، ۴۰۹

۳۵- مہدی، مظہر، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۵

۳۶- ایضاً،ص ۱۸۵

۳۷- خان، سید احمد، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۱

۳۸- مہدی، ص ۱۸۶

۳۹- نظامی، ص ۲۷۵

۴۰- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء ص ۱۲۱

۴۱- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۱۱

۴۲- اکرام، شیخ محمد، سن ندارد، ص ۲۱۴

۴۳- ایضاً

۴۴- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۳۸ء، ص ۱۸۵

۴۵- نعمانی، احمد اسحاق، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۳۶۸، ۳۶۹

۴۶- عبدالمغنی، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۷

۴۷- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۶

۴۸- اکرام، شیخ محمد، س ن، ص ۲۱۴

۴۹- ایضاً،ص ۲۱۵

۵۰- ایضاً،ص ۲۲۰

۵۱- عبدالمغنی، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۹

۵۲- قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۴

۵۳- عبداللہ، ڈاکٹر سید، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۳

۵۴- اکرام، شیخ محمد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱۸

۵۵- بلنٹ، نومبر ۱۹۲۶ء، ص ۴۲

۵۶- ایضاً، ص ۴۳

۵۷- ایضاً- ص ۴۳

۵۸- ندوی، سید سلیمان، طبع اوّل ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۲

۵۹- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۹۵

۶۰- شبلی، علامہ، س ن، ص ۹۵

۶۱- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۹۶

۶۲- ایضاً، ص ۹۶

۶۳- اکرام، شیخ محمد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۴

۶۴- ایضاً

۶۵- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹۰

۶۶- قریشی، ص ۳۳۲

۶۷- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹۰، ۲۹۱

۶۸- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۸۹ء، ص ۴۰

۶۹- ایضاً، ص ۱۴۰

۷۰- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹۲

۷۱- ایضاً، ص ۲۹۲

۷۲- ایضاً، ص ۲۹۲

۷۳- پانی پتی، شیخ اسماعیل، اکتوبر ۱۹۶۲ء، ص ۶۵

۷۴- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹۳

۷۵- جان ملکم، ۱۹۷۸ء، ص ۶۵، ۶۶

۷۶- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۲

۷۷- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹۵

۷۸- ایضاً، ص ۵۶۷

۷۹- ایضاً، ص ۵۷۷

۸۰- ایضاً، ص ۲۰۳

۸۱- ایضاً، ص ۵۸۸

۸۲- طوق آر، خلیل، جولائی ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۴

۸۳- یٰسین، مزمل، ۱۹۷۳ء، ص ۴۳

۸۴- ایضاً، ص ۴۳

۸۵۔ قریشی، ص ۳۳۳

۸۶۔ جعفری، رئیس احمد، ۱۹۷۱ء، ص ۳۱۶

۸۷۔ ایضاً، ص ۳۱۷

۸۸۔ عبداللہ، ص ۲۲۳

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۹۰۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۹۱۔ ایضاً

۹۲۔ طوق آر، ص ۶۸

۹۳۔ مہدی، مظہر، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۵

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۹۵۔ ایضاً

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۹۸۔ مصطفٰے خان، غلام، ڈاکٹر، ۲۰۰۳، ص ۳۸

۹۹۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۰۰۔ حالی، الطاف حسین، ۲۰۰۳، ص ۴۴

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۰۳۔ زبیری، محمد امین، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۹

۱۰۴۔ مصطفٰے خان، ص ۱۵

۱۰۵۔ زبیری، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۱۰۶۔ مصطفٰے خان، ص ۱۵۸

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۰۸۔ زبیری، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۱۰۹۔ حالی، الطاف حسین، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۱۱۰۔ مصطفٰے خان، ص ۱۵۹

۱۱۱۔ زبیری، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰

۱۱۲۔ حالی، الطاف حسین، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۱

۱۱۳۔ ایضاً

۱۱۴- ایضاً

۱۱۵- زبیری، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۱۱

۱۱۶- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۵

۱۱۷- خان، عبیداللہ، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۱۰

۱۱۸- ایضاً، ص ۲۱۲

۱۱۹- زبیری، محمد امین، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۶

۱۲۰- محسن الملک، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۸

۱۲۱- زبیری، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۴

۱۲۲- ایضاً، ص ۱۷۶

۱۲۳- مہدی، ص ۱۹۲

۱۲۴- ایضاً، ص ۱۹۳

۱۲۵- نذیر احمد، ڈپٹی، ۱۹۱۸ء، ص ۲۲، ۲۳

۱۲۶- صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، نومبر ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۴

۱۲۷- ایضاً، ص ۱۷۵

۱۲۸- نذیر احمد، ڈپٹی، ۱۹۱۸ء، مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۶۲۴، ۶۰۲

۱۲۹- ایضاً، ص ۲۹

۱۳۰- ایضاً، ص ۳۴

۱۳۱- ایضاً

۱۳۲- ایضاً، ص ۳۱

۱۳۳- عبداللہ، ڈاکٹر سید، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۹

۱۳۴- احمد، نذیر، ڈپٹی، ۱۹۱۸ء، مجموعہ نظم بے نظیر، ص ۹۶

۱۳۵- فرخی، اسلم، ڈاکٹر، ۱۹۶۵ء، محمد حسین آزاد، جلد اول، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۱۶۵

۱۳۶- پنڈت من پھول ذات کے برہمن دلی کے رہنے والے اور دلی کالج کے قدیم طلبہ میں سے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کے ہم جماعت اور ماسٹر رام چند کے شاگرد تھے۔ کالج کی رپورٹوں میں ان کا ذکر تعریف کے ساتھ آیا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی ہو گئے تھے، انھی کی سعی سے مولانا محمد حسین آزاد سر رشتہ تعلیم کے دائریکٹر کے دفتر میں اول اول پندرہ روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: مولوی عبد الحق، ۱۹۸۹ء، مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو ہند، ص ۱۷۶؛ پنڈت من پھول کا مولانا آزاد سے مربیانہ سلوک تھا آزاد کی تصنیف 'نصیحت کا کرن پھول' میں ان کے نام کی رعایت ہے۔

۱۳۷- صادق، محمد، ڈاکٹر، جنوری ۱۹۵۸ء، ص ۱۱

۱۳۸- صادق، محمد، ڈاکٹر، نومبر ۱۹۷۶ء، ص ۵۶
۱۳۹- آزاد، محمد حسین، مولانا، نومبر ۱۹۷۶ء، ص ۵۴
۱۴۰- صادق، نومبر ۱۹۷۶ء، ص ۵۵
۱۴۱- ایضاً
۱۴۲- ایضاً، ص ۴۵
۱۴۳- ایضاً
۱۴۴- خان، عبید اللہ، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۱۵
۱۴۵- ایضاً
۱۴۶- ایضاً
۱۴۷- ایضاً، ص ۲۱۶
۱۴۸- ایضاً
۱۴۹- ندوی، سید سلیمان، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۰
۱۵۰- ایضاً
۱۵۱- ایضاً، ص ۲۷۱
۱۵۲- ایضاً
۱۵۳- شبلی، علامہ، ۱۹۸۹ء، ص ۶۸، ۶۹
۱۵۴- ندوی، ص ۲۷۶
۱۵۵- ایضاً
۱۵۶- ایضاً
۱۵۷- خان، عبید اللہ، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۱
۱۵۸- قریشی، اشتیاق حسین، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۲۸۲
۱۵۹- حسن الاعظمی، نومبر ۱۹۴۸ء، ص ۱۲۸
۱۶۰- قریشی، نعیم، ۲۰۰۹ء، ص ۸
۱۶۱- ایضاً، ص ۹
۱۶۲- ایضاً
۱۶۳- ایضاً
۱۶۴- ایضاً
۱۶۵- صابری، امداد اللہ، مولانا، جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۲۳۴
۱۶۶- ایضاً

۱۶۷- ایضاً،ص۲۳۵
۱۶۸- خان،رشید الدین،۲۰۰۰ء،ص۲۸
۱۶۹- ایضاً
۱۷۰- آزاد،ابوالکلام،مولانا،۲۰۰۷ء،ص۱۶،۱۷
۱۷۱- ایضاً،ص۲۰
۱۷۲- ایضاً،ص۲۱
۱۷۳- ایضاً،ص۲۳
۱۷۴- ندوی،ابوالحسنات،۱۳۳۹ھ،ص۸۱
۱۷۵- الہلال،۲۸جنوری۱۹۱۴ء،کلکتہ،ص۱۰
۱۷۶- الہلال،۱۰جنوری۱۹۱۳ء،کلکتہ،ص۵
۱۷۷- احمد،اعجاز،جولائی،دسمبر۱۹۹۹ء،ص۱۰۴
۱۷۸- فہد،عبداللہ،اگست۱۹۸۹ء،ص۱۵۱
۱۷۹- نگرامی،محمد اویس،مولوی،۱۸۹۷ء،ص۷۶
۱۸۰- قادری،محمد ایوب،۲۰۱۰ء،ص۳۳۵
۱۸۱- قریشی،نعیم،۲۰۰۹ص۳۶
۱۸۲- قریشی،اشتیاق حسین،جولائی۱۹۹۴ء،ص۲۹۰
۱۸۳- صابری،جنوری۱۹۴۹ء،ص۲۸۲
۱۸۴- روبنسن،فرانسس،(Francis Robinson)،۲۰۰۲ء،ص۱۵۳
۱۸۵- ایضاً
۱۸۶- ایضاً
۱۸۷- ایضاً،ص۱۵۴
۱۸۸ فرنگی محلی،عبدالباری،مولانا،س ن،بنام پنڈت موتی لال نہرو،ص۱۰
۱۸۹- قدوائی،مشیر حسین،۱۷پریل۱۹۱۴ء،بنام مولانا عبدالباری فرنگی محل،ص۸۰
۱۹۰- شوکت علی،مولانا،۹نومبر۱۹۱۵ء،بنام مولانا عبدالباری فرنگی محل،ص۴۳۶
۱۹۱- ابوسلمان،شاہ جہاں پوری،۲۰۰۹ء،ص۵۵
۱۹۲- روبنسن،ص۱۴۹
۱۹۳- ابوسلمان،شاہ جہاں پوری،۲۰۰۹ء،ص۱۳۶
۱۹۴- روبنسن،ص۱۴۹
۱۹۵- انصاری،مفتی رضا،مولانا،جنوری۱۹۸۴ء،ص۴۳

۱۹۶- قریشی، ۲۰۰۷ء، ص ۶۵
۱۹۷- ابوسلمان، ۲۰۰۹ء، شاہ جہاں پوری، ص ۳۱۳
۱۹۸- ______ ۱۹۹۴ء، ص ۲۲۳
۱۹۹- سندھی، عبیداللہ، مولانا، اگست ۱۹۹۴ء، ص ۳۲
۲۰۰- ایضاً، ص ۸۲
۲۰۱- ایضاً
۲۰۲- رضوی، شفقت، جون ۲۰۰۷ء، ص ۲۱
۲۰۳- ایضاً، ص ۴۲
۲۰۴- بھوپالی، برکت اللہ، مئی ۱۹۱۱ء، ص ۱۶
۲۰۵- رضوی، ص ۹۰
۲۰۶- ابوسلمان، شاہ جہاں پوری، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۵
۲۰۷- ایضاً، ص ۱۷۹

باب چہارم

تحریک اتحاد اسلامی:
معاصر علمی و ادبی تحریکوں پر اثرات

تحریک اتحاد اسلامی: معاصر علمی وادبی تحریکوں پر اثرات

علی گڑھ تحریک:

علی گڑھ تحریک اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے ہندوستان میں نشاۃ اوّلین کا درجہ رکھتی ہے[1]۔ اس میں موجود صاحبان علم وفن نے کئی حوالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری تعمیر میں چاہے وہ مقامی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس تحریک نے بیرونی دنیا کے اثرات کو جذب کر کے نئی توانائی حاصل کی۔

جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ اگر چہ سید احمد خان کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی، لیکن اس کی داغ بیل وہ پہلے ہی ڈال چکے تھے[2]۔ اس تحریک سے قبل تحریک مجاہدین، بنگال کی فرائضی تحریک بھی مسلمانوں کی بے داری میں اہم کردار ادا کر چکی تھی[3]۔ سید احمد خان چوں کہ انگریزی حکمت عملی کا شکار ہو گئے تھے اس لیے ان کی نگاہ کافی حد تک انگریزوں کے اختلاف کے معاملے میں محدود ہوتی گئی[4] مگر انھوں نے علی گڑھ تحریک کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم بھی دیں اور عقائد مذہبی سے بھی روشناس کرائیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو ان کو فرائض مذہبی کا پابند رکھیں[5]۔

سید احمد خان چوں کہ علمی تحریک کو لے کر اٹھے تھے اس لیے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں میں علمی شوق کو بڑے پیمانے پر پیدا کیا بلکہ اس کی وجہ سے مسلم قومیت کا سرچشمہ اور مسلمانان ہند کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی غرض ہر قسم کی تحریکوں کا مرکز علی گڑھ بن گیا[6]۔ لیکن یہاں یہ بات اہم ہے کہ سید احمد خان چوں کہ مسلمانوں کے معاملے میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ تھے اس لیے انھوں نے ہمیشہ اپنی پالیسی کو سرکار برطانیہ کے رخ پر متعین کیا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے یہ بھلا دیا تھا کہ یہی انگریز مشرق قریب اور مشرق وسطی کے مسلمانوں کا خون چوس لینا چاہتے ہیں[7]۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں وہابیوں کے علاوہ جمال الدین افغانی کی انگریز دشمن تعلیمات بھی پھیل رہی تھیں۔ سید احمد خان اور ان کے رفقا جن میں حالّی بھی شامل تھے انھوں نے افغانی کے خیالات کی تائید کی انھوں نے سید احمد خان کے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا کہ وہ اپنے سیاسی تحفظ کے لیے مقتدر قوتوں سے ہمدردی کریں۔ ان لوگوں کی ہمدردی اسلام کے ساتھ تھی اور یہ لوگ اس کے لیے جاں بازی سے بھی دریغ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس میں انھیں ذرا سا شک بھی نہیں تھا کہ اس جدید دور میں سلطان عبد الحمید مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ کسی شخص نے بھی سلطنت عثمانیہ اور خلافت پر کسی قسم کے شک کا اظہار نہیں کیا[8] حتیٰ کہ محسن الملک جو پہلے خلاف تھے مگر بعد میں اس کے حامی ہو گئے۔

اجتماعی طور پر سر سید احمد خان کا رویہ تحریک اتحاد اسلامی کے بارے میں سرکار برطانیہ کے رویے کے مطابق تھا جب برطانوی حکومت خلافت عثمانیہ کی حمایت میں تھی تو سید احمد خان تحریک اتحاد اسلامی کی حمایت کرتے تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کے لیے فنڈ جمع کرتے تھے ترکی کی فوجیں جو بلغاریہ میں برسر پیکار تھیں ان کے لیے امدادی کام میں حصہ لیا۔ روس اور ترکی کی جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستانی مسلم معاشرے نے عالمی سطح پر حتمی سیاسی کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی شناخت اتحاد بین المسلمین کے ذریعے منوائی۔ مسلمانوں کی نئی قیادت جس میں نواب عبد اللطیف، سید احمد خان، بدر الدین طیب جی جو کہ برطانیہ کے بھی ہمدرد تھے انھوں نے ترکی کی بھی حمایت کی[9]۔

سید احمد خان چوں کہ ہندوؤں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے انھوں نے برطانوی سامراج کا اعتماد حاصل کیا۔ تحریک اتحاد اسلامی کی جو تحریک جنوبی ایشیا سے مشرق وسطیٰ تک پھیل چکی تھی اس تحریک کے تمام لوگ سید احمد خان کے اقدامات کی نہ صرف تعریف کرتے تھے بلکہ ان کی خدمات کو تسلیم کرنے کے علاوہ ستائش بھی کرتے رہے[10]۔ علی گڑھ تحریک اور اتحاد اسلامی کے تعلق سے سید احمد خان کی پالیسی اور نکتہ نظر کا مطالعہ کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ عزیز احمد نے کئی ثبوت اپنی کتاب بر صغیر میں اسلامی کلچر میں فراہم کیے ہیں جس سے سید احمد خان کے ترکوں سے محبت کے رویے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں سید احمد خان دیگر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ترکوں کے حامی رہے اسی وجہ سے انھوں نے علی گڑھ میں ترکی ٹوپی کو مقبول بنایا[11]۔ انھوں نے اپنی کتاب خطبات احمدیہ سلطان عبد العزیز کو ایک خط کے ساتھ ارسال کی جس کے آخر میں یہ الفاظ موجود ہیں: ''کہ آپ کی سلطنت تا دیر قائم

رہے اور خلیفہ کے تخت کا دفاع اور اسے مضبوط کرتے رہیں''[۱۲]۔

ترکوں کے حوالے سے سید احمد خان نے کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے نہایت ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے بعض مقامات پر جب سیاسی محاذ آرائی ترکوں اور برطانویوں میں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو اس موقعے پر سید احمد خان خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں انھوں نے اپنے ایک مضمون ترک میں ترکی عورتوں کی صبر و استقامت کی مثال یوں دی ہے۔ ''یونانیوں نے جب ترکی عورتوں پر ظلم کیا۔ امیروں کی عورتوں کو رزیل قوم میں ملا دیا۔ ان کے مرد رشتہ دار ذبح کر ڈالے' تاہم جس صبر و قناعت کے ساتھ ان عورتوں نے اس تکلیف کو گوارا کیا نہایت قابل تعریف ہے''[۱۳]۔

اسی طرح سید احمد خان نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں ۱۷؍مارچ ۱۸۷۶ء کو ایک مضمون ترکوں کی تہذیب کے بارے میں لکھا' جس میں انھوں نے ترکوں کے اخلاق و عادات کی نہ صرف تعریف کی بلکہ ان کے خانگی معاملات کو عالم اسلام کے حوالے سے مثالی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> جو تہذیب ترکوں کے خانگی معاملات میں ہے اگر اس کو وہ لوگ دیکھیں جو انگشت نمائی کرتے ہیں تو حیران ہو جائیں' ترکوں کو اپنے والدین کا خیال اور ادب بہت رہتا ہے اور یہاں تک کہ حضرت سلطان اپنی والدہ کے روبرو کبھی نہیں بیٹھتے جب تک انھوں نے اجازت نہ دی ہو[۱۴]۔

ترکوں کے متعلق سید احمد خان کا رویہ متضاد رجحانات کا حامل رہا ہے۔ انھوں نے جہاں کہیں بھی ترکوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا' وہاں ہمیشہ سیاسی معاملات میں ترکوں کے رویے کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے غلط قرار دیا ہے مگر ان کی معاشرت، تہذیب و تمدن اور طرز فکر کو قابل تعریف کہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک قوم جو تہذیبی اور معاشرتی حوالے سے دنیا میں نمایاں خوبیوں کی حامل ہو' تو کیا سیاسی حوالوں سے نکمّی ہوگی؟ جیسا کہ سید احمد خان کا ایک مضمون سلطان روم اور ہندوستان کے مسلمان میں ان کے متضاد رویے کی پوری جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی' اس سے کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہوا ہو لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا۔ بلا اجازت اور گورنمنٹ مرضی کے اس کو ہم اچھا نہیں سمجھتے[۱۵]۔

اسی طرح انھوں نے ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہم دردی میں غازی عثمان پاشا کے

کردار کو سراہا ہے۔ اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے فراخ دلانہ کردار کی بھی تعریف کی ہے۔ انھوں نے یہ کہا کہ روسی جب قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچے تھے تو یہ برطانیہ ہی تھا جس کے جنگی جہازوں نے اس کے قدم روکے[16]۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے یونانیوں کی لڑائی میں ادہم پاشا کی دلاوری اور بہادری کی بہت زیادہ تعریف کی ہے جب کہ غازی عثمان پاشا نے اس سے کہیں زیادہ بہادری کا مظاہرہ جنگ پلونا میں کیا تھا اس کی اتنی تعریف کیوں نہیں کی گئی[17]۔ سید احمد خان کا یہ کہنا بھی درست نہیں' اس وقت کے اخبارات و رسائل اور اردو کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غازی عثمان پاشا کی بہادری کے گرد ایک اساطیری ماحول قائم ہو گیا تھا خود شبلی جب قسطنطنیہ گئے تو ان کی ملاقات اس بہادر انسان سے ہوئی تھی اردو ادب میں اس شخص کے جرات مندانہ کردار پر کئی ناول اور ڈرامے لکھے گئے۔

سید احمد خان چوں کہ برطانوی پالیسی سے انحراف کرنا کسی صورت گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے تحریک اتحاد اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کے طرز عمل کو غلط قرار دیا' بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ "ترکوں کی فتح کو اسلام کی فتح پکارنا سوائے ناسمجھی کے اور کچھ بھی نہیں ہے[18]۔ جنگ روم و روس کے دوران ملك يمين مضمون میں انھوں نے روسیوں کے کردار کو بہت برا کہا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو رنج و غم ہے کیوں کہ روسیوں نے جس طرح بلگیریا کے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور شیر خوار بچوں کو زندہ ان ہی لاشوں میں ڈال دیا کہ وہ چلا چلا کر اور جانوروں کے پنجوں سے زخمی ہو کر سسک سسک کر مر جائیں[19]۔

سید احمد خان کے مضامین کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمی سطح پر ترکوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویوں کا قریبی مشاہدہ کر رہے تھے۔ تحریک علی گڑھ کا دائرہ صرف ہندوستانی مسلمانوں تک محدود تھا' اس لیے سید احمد خان نے ان مضامین کے علاوہ بہت زیادہ عملی جدوجہد اس سلسلے میں نہیں کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی اعانت سے نہیں روکا۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۶ء میں ترکوں کے یتیموں اور زخمیوں کے لیے چندہ مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اس میں بھرپور شریک ہوں[20]۔

سید احمد خان چاہتے تھے کہ ترک دوبارہ دنیا میں وہی مقام حاصل کر لیں جو ان کی دنیا پر برسوں قائم رہی ہے چوں کہ مصلحت آمیزی کی وجہ سے یہ بات انھوں نے کھل کر نہیں کی۔ بعض مقامات پر انھوں نے

برطانوی رویے پر بھی چوٹ کی ہے انھوں نے مسٹر گلیڈسٹون اور دیگر اراکین برطانیہ کی زبان درازی کو بے جا قرار دیا ہے جو انھوں نے ترکوں کے متعلق اختیار کی ہوئی تھی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس پورے عمل سے ہندوستانی مسلمانوں کو رنج ہوا ہے[21]۔ سید احمد خان نے روسیوں کے کردار کو شرم ناک قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ روس نے بلا وجہ سرویا اور بوسنیا جیسے ملکوں میں سازش کر کے بغاوت کروائی اور ہزارہا افراد کا خون بہایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں کو کس قدر دشمنی ترکی کی اسلامی سلطنت سے اور مسلمانوں سے تھی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی روسیوں سے نفرت کرتے ہیں[22]۔

سید احمد خان ترکی تنظیماتِ اصلاحات کی بھی حمایت کرتے رہے اپنے دوست محسن الملک کو ایک خط میں سلطان عبدالمجید، سلطان عبدالعزیز اور سلطان محمود کو سماجی اصلاح کار کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی اتباع ہندوستان اور اس کے علاوہ کئی اور ممالک میں بھی ہونی چاہیے[23]۔

سید احمد خان کا تحریک اتحاد اسلامی کے ساتھ جو رویہ رہا اس کی ایک مثال Azmi Ozcan نے اپنی کتاب *Pan-Islamism: Indian Muslims, the Ottomans and Britan* میں وہ لکھا ہے کہ احمد حمدی سروانی جو افغانستان کے لیے خلافت عثمانیہ کے مشن کا ایک رکن تھا یہ مشن ہندوستان سے ہوتے ہوئے ۱۸۷۷ء میں افغانستان پہنچا۔ سروانی نے اپنے سفرنامے میں واضح کیا ہے کہ مشن کا وفد سید احمد خان سے سرہند اور دہلی کے درمیان سفر میں ریل کی بوگی میں ملا[24]۔ سرسید احمد خان نے اس وفد کو ایم۔اے۔او کالج کا دورہ کرنے کے لیے کہا اور اس وفد نے اس کالج کا دورہ بھی کیا۔ برطانوی وائسرائے لارڈ لٹن (Lord Lytton) کا خیال تھا کہ سرسید احمد شاید مشن کے ساتھ شریک تھے مگر سید احمد خان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سید احمد خان نے ترکوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا[25]۔ حمدی سروانی کے الفاظ یہ ہیں:

> سرہند سے دہلی کے سفر سے واپسی پر جب ہم ریل میں داخل ہوئے تو ہم نے بوگی میں سفید داڑھی والا مہذب شخص دیکھا۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے فراہم کردہ مخصوص ریل میں ایک اجنبی شخص کا داخل ہو جانا ہمارے لیے ہیجان انگیز تھا لیکن تھوڑی دیر میں ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ شخص سید احمد خان ہیں جو انگریزوں کے یہاں بھی ایک اچھے عہدے کے حامل ہیں۔ انھوں نے ہمیں مسلم کالج کا دورہ کرنے کے لیے مدعو کیا جسے انھوں نے علی گڑھ میں قائم کیا تھا اور اس کے لیے انھوں نے مجاز اداروں سے اجازت بھی حاصل کی تھی[26]۔

علی گڑھ میں ممالک اسلامیہ کے مشاہیر اہل علم، والیان ریاست، علمی وفود اور دیگر اعلیٰ افسران دورہ کرتے رہتے تھے اور اکثر اہل علم نے وہاں کے طلبہ سے دینی و علمی معاملات پر خطاب بھی کیا ہے [۲۷]۔ پرنس آف ویلز ۱۹۰۶ء میں اور امیر حبیب اللہ خاں والئی افغانستان ۱۹۰۷ء میں تشریف لائے [۲۸]۔ امیر افغانستان نے جو طلبہ کے مذہبی عقائد کی طرف سے بہت بدگمان کر دیے گئے تھے اپنے انتخاب سے چند طلبہ کا امتحان لیا اور نتیجہ سے بے انتہا متاثر و مطمئن ہوئے۔ اس تاثر اور اطمینان کو اپنی تقریر میں انھوں نے پیش بھی کیا۔ بیس ہزار روپیہ عطیہ اور چھ ہزار سالانہ مستقل امداد مقرر کرنے کے علاوہ طلبہ کے عقائد کی نسبت ایک تحریری سند دستخط کر کے مرحمت کی [۲۹]۔

اسی طرح ۱۹۳۴ء میں امیر البحر رؤف بے کی آمد اس ادارے کا یادگار واقعہ ہے۔ انھوں نے مرحوم عبدالرحمٰن صدیقی نامی ایک طالب علم کے سکونتی کمرہ نمبرے میں ممتاز ہاؤس کے دروازے پر ایک یادگاری کتبہ نصب کیا اور یونی ورسٹی کو رؤف بے اسپورٹس چیمپئن شپ کپ دیا [۳۰]۔ عبدالرحمٰن صدیقی جنگ بلقان کے زمانے میں علی گڑھ سے ترکی چلے گئے تھے [۳۱] وہاں انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد میں بہ حیثیت منیجر کے اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کی واپسی کے بعد عبدالرحمٰن صدیقی قسطنطنیہ میں ٹھہر گئے جہاں انھوں نے مہاجرین کی نو آبادیوں کے متعلق کافی کام کیا۔ صاحب موصوف ان خوش قسمت اشخاص میں سے تھے جو ایڈریانوپل میں ترکی افواج کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔ ان کے دل چسپ اور معلوماتی مضامین کامریڈ اور ہمدرد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے [۳۲]۔ عبدالرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> تسخیر ایڈریانوپل میں ترکی افسروں کی بہادری اور پابندی فرائض پر سوائے تعریف اور حیرت کے اور کچھ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ایڈریانوپل میں صرف چار روز تک ٹھہرے، لیکن اس قلیل عرصے میں، میں نے اس قدر چیزیں دیکھی ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان سب کو آپ کے روبرو کس طرح بیان کروں۔ کم سے کم دو یا تین باتیں صاف اور صریح ہیں اول یہ کہ تمام آبادی اپنے بلغاری حاکموں سے سخت عاجز اور نالاں تھی اور یہ کہ انھوں نے نہایت صدق دل سے اور ایمان داری کے ساتھ اپنی رہائی دینے والوں کا استقبال کیا۔ جنھوں نے ان کو خوف اور دیگر تکلیفات سے آزادی دلائی۔ یورپ اور اس کے ماہرین سیاست جس طرح چاہیں فیصلہ کریں لیکن اگر ایڈریانوپل کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کیا گیا تو وہ یک زبان ہو کر نہایت شکریہ کے ساتھ رحم دل ترکوں کی تائید میں رائے دیں گے جنھیں اس قدر نشانہ الزامات بنایا جا رہا ہے [۳۳]۔

انیسویں صدی کے آغاز میں تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات جس تیزی سے منظر عام پر آئے اور علی گڑھ کے طلبہ نے جس پر جوش انداز میں اس میں شمولیت اختیار کی اس کی کچھ وجوہات ہندوستان میں برپا ہونے والے سیاسی واقعات بھی ہیں، جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے اندر انگریز مخالف رجحانات پیدا ہوئے۔ ان واقعات میں سرفہرست تقسیم بنگال کا کالعدم کیا جانا تھا[۳۴]۔

اس حادثے سے قبل ۱۹۰۵ء کی جاپانی فتح اور روس کے انقلاب کے بعد ایک نئی سیاسی فضا ہندوستان اور بالخصوص ترکی، ایران اور مصر میں پیدا ہوئی۔ چوں کہ شبلی نعمانی اس معاملات سے پہلے ہی اسلامی ملکوں کی سیاحت کر چکے تھے چناں چہ ان کے تعلقات ترکی میں انجمن اتحاد و ترکی اور مصر میں دستور پرست جمال الدین افغانی کے پیروؤں سے مستحکم ہو گئے تھے اسی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں اتحاد و ترقی کا انقلاب برپا ہوا تو شبلی نے اسے سراہا۔ چناں چہ ان روابط کو مضبوط کرنے کے لیے علامہ رشید رضا ہندوستان آئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ کے سلسلے میں علی گڑھ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سامنے محسن الملک بھی لاچار نظر آرہے تھے[۳۵]۔ دوسری طرف علی گڑھ کا نوجوان طبقہ اپنے آپ کو اتحاد اسلام کی تحریک سے جوڑنے کے لیے سرگرم تھا ان نوجوانوں میں محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، آفتاب احمد خاں، مظہر الحق، افضل الحق، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ پیش پیش تھے[۳۶]۔

لہٰذا شبلی کی بدولت علی گڑھ میں اتحاد اسلامی کی تحریک اور ایران، ترکی، مصر کی قومی تحریکوں سے اتحاد کی صورت نظر آنے لگی۔ یوں سمجھیے کہ ہندوستان کی اسلامی تحریک کا یہ بین الاقوامی محاذ قرار پایا[۳۷]۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ خلافت عثمانیہ کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ۱۸۹۶ء کی جنگ روم و یونان کے موقع پر علی گڑھ سے ہی بلند ہوئی تھی چوں کہ برطانیہ کی ہمدردی و اعانت یونان کے ساتھ تھی اس لیے برطانوی حکومت کے مقربین نے خلافت کے مسئلے کو نزاعی صورت میں تبدیل کرنا چاہا۔ سرسید اور ان کے رفقا میں چند احباب جن میں محسن الملک پیش پیش تھے انھوں نے انکار خلافت پر مضامین لکھے۔ ہندوستان کے کئی علما نے اس جنگ میں اخلاقی اور مالی شرکت کو جہاد سے تعبیر کیا۔ بمبئی کے مسلمانوں نے فتح یونان کی خوشی میں جشن منایا تو سید احمد خان سے اس جشن کی مذمت میں ایک مضمون لکھا مگر علی گڑھ اور مسلمانان ہند نے ان کے نظریات مسترد کر دیے[۳۸]۔

شبلی نے ۱۸۹۹ء کے علی گڑھ میگزین میں ایک نا تمام مضمون مسئلہ خلافت پر لکھا جس میں انھوں نے

تاریخی حوالے دے کر یہ بات ثابت کرنا چاہا تھا کہ ترکوں کی خلافت تمام عالم اسلام کے لیے کیوں کر درست ہے[39]۔ مولانا حالی کی مسدس نے بھی علی گڑھ تحریک سے وابستہ مسلمانوں کے ملی احساسات میں عالم گیر اخوت کا ایک نیا ولولہ پیدا کیا، ان کی یہ نظم اتحاد اسلامی کی تحریک کا شدید ترین اظہار تھی اور اس نے علی گڑھ کی سیاسی فضا میں برطانوی مخالف جذبات پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کے رہ نماؤں کی یہ کوشش تھی کہ ایم۔ اے او کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دیا جائے کیوں کہ اب تک یہ کالج اپنے ارتقائی سفر میں اس مقام کو پہنچ چکا تھا جہاں اسے یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا جانا چاہیے تھا، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے علی گڑھ کے رہ نماؤں نے انگریز سرکار کی حمایت کی وکالت کی مگر اس رویے سے بھی مسلمان کافی متنفر ہوئے۔ یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے صفحات میں ایم۔ اے۔ او کالج کی اس ناکام کوشش کی دو زاویوں سے مذمت کی: ایک تو یہ کہ وفاداری کی سیاست سے مسلمانوں کو کبھی کچھ ملنے والا نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس وقت مسلمانوں کو ترکی کی مدد کرنی چاہیے[40]۔ لہٰذا علی گڑھ پر اتحاد اسلامی کے رجحانات نے بہت زیادہ زور پکڑ لیا اور اس پر فیصلہ کن اثر محمد علی جوہر اور کامریڈ کا پڑا[41]۔

جب انصاری وفد نے بلقان کے مجروحین کے لیے طبی وفد لے جانے کا اعلان کیا تو علی گڑھ کے طلبہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور یہ رقم زخمیوں کی امداد و اعانت کے لیے بھیجی گئی[42]۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڑھ کی چار دیواری اتحاد اسلام کے نعروں سے گونج رہی تھی اس وفد میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عبدالرحمٰن صدیقی کا کردار کلیدی ہے اس کے علاوہ شعیب قریشی، خلیق الزماں، عبدالرحمٰن پشاوری قابل ذکر ہیں یہ تمام اصحاب علی گڑھ سے وابستہ تھے[43]۔ نواب وقار الملک نے بھی مختار احمد انصاری کے طبی وفد کی تائید کی اور جب یہ وفد ترکی سے واپس آ رہا تھا تو وقار الملک نے ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں ایک مضمون مختار احمدا نصاری کی مراجعت پر لکھا۔ اس میں انھوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ جنگ بلقان ختم ہو جانے کے بعد اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترکوں کی اعانت ختم ہو جانی چاہیے تو یہ بات غلط ہے ان کا یہ کہنا تھا کہ اس عمل کو جاری و ساری رہنا چاہیے کیوں کہ ڈاکٹر انصاری جب دہلی آئیں گے تو ساری صورت حال سے قوم اچھی طرح واقف ہو جائے گی[44]۔

وقار الملک بھی اتحاد اسلامی کے قائل تھے۔ ویسے تو محسن الملک، جن کے دور میں شبلی اور ابوالکلام آزاد

نے مسلمانوں میں ترکی کے لیے جوش و خروش پیدا کر دیا تھا وقتی رجحانات کا ساتھ دینے اور جذبات کے آگے مصلحتوں کو دبانے پر مجبور ہو گئے تھے[45]۔ انھوں نے مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے لیے جس میں سیاسی مزاحمت کے باعث تاخیر ہو گئی تھی یونی ورسٹی کے قیام کے لیے جو چندہ جمع کیا گیا اس میں سے ایک ہزار روپیہ ترکی حکومت کے تمسکات خریدنے میں لگا دیے[46]۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اندرون خانہ اختلافات کو پس پشت ڈال دیا تھا اور حکیم اجمل خاں کی کاوشوں سے دیو بند اور علی گڑھ میں اتحاد اسلام کی تحریک کے نتیجے میں اختلافات بہت کم ہو گئے تھے۔ حکیم اجمل نے 'ادارہ نظارۃ المعارف' قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی فارغ التحصیل طلبہ اس ادارے سے دینیات اور عربی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ حکیم اجمل کے اس منصوبے میں دیو بند اور علی گڑھ شانہ بشانہ تھے۔ حکیم اجمل خاں، قاضی عبدالغفار کے اس ادارے کی سرپرستی دیو بند سے مولانا عبیداللہ سندھی اور علی گڑھ سے نواب وقارالملک کر رہے تھے[47] جن کے اتحاد اسلامی کے رجحانات کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔

جب مولانا شوکت علی جو خود بھی علی گڑھ تحریک کے رکن تھے انجمن خدام کعبہ کی تحریک شروع ہوئی تو علی گڑھ کے کئی نوجوان اس میں شریک ہوئے اور جان محمد جونیجو کی طرح اپنی جائے داد بیچ کر افغانستان چلے گئے[48]۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ، ترکی اور عالمی طاقتوں کے علاقے میں ہو رہی ہے مگر ہیجان ہندوستان کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں بپا ہے کیوں کہ ہندوستانی مسلمان یہ سوچ رہے تھے ترکی جو عالم اسلام کا پایہ ہے وہ عیسائی قوتوں کی وجہ سے امتداد زمانہ کا شکار ہو رہا ہے اس سوچ نے علی گڑھ میں اسلامی جذبات کو انتہا درجے تک ہوا دی اور علی گڑھ تحریک نے مقامیت کے تمام مسائل سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے اپنے رخ کو عالمی سیاست میں ڈھال لیا[49]۔ اس بات کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسلمانوں کی عالمی سیاست میں دل چسپی نے تقسیم بنگال کو کالعدم کرنے کی راہ ہموار کی۔

جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا طرز احساس یہ تھا کہ برطانیہ نے ہی اسے اکسایا ہے[50]۔ کیوں کہ ماضی کے کئی تجربات سے مسلمانوں نے برطانیہ کے کردار پر یقین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح ۱۸۷۰ء میں انگریزوں نے روس کے مقابلے میں ترکی کی مدد کی تھی جس سے روسی خطرہ ٹل گیا تھا اس وقت خود انگریزی حکومت نے ہندوستان میں چراغاں کرایا تا کہ مسلمان خوش ہوں لہٰذا طرابلس کی جنگ

کے سلسلے میں یہ سمجھنا کہ انگریزوں نے کسی لاعلمی کی بناء پر اٹلی کو اکسایا، مسلمانان ہند اس عذر لنگ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے[۵۱]۔

حسرت موہانی اردوئے معلی کے ایڈیٹر تھے اور علی گڑھ کے طالب علم بھی۔ انھوں نے اپنے رسالے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اس کے علاوہ وہ خلافت عثمانیہ ہلال احمر فنڈ اور عثمانی ترکوں سے محبت وعقیدت کے نقیب تھے۔ انھوں نے اس رسالے کے ذریعے مسلمانوں میں خلافت عثمانیہ سے ہم دردی پیدا کی اور انگریزوں کی بنائی ہوئی چیزوں کا استعمال نہ کرنے کی تحریک کو تقویت بخشی۔ سودیشی کپڑوں اور کھدر کے کرتوں کی پہلی دوکان انھوں نے رسال گنج میں علی گڑھ میں کھولی اور وہاں کے طلبہ کو بھی ان چیزوں کے استعمال کی ترغیب دی[۵۲]۔

علی گڑھ کے طلبہ روز بعد نماز مغرب مسجد میں جلسے کر کے انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے[۵۳]۔ اس وقت علی گڑھ کے طلبہ کی قیادت نورالدین، پرنس حمید اللہ، عبدالوحید خاں کر رہے تھے ان طالب علموں نے برٹش قیادت پر کھل کر تنقید کی[۵۴] مثلاً تصدق حسین صدیقی علی گڑھ میں وہ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف تقریر کی اور اس تقریر کے نتیجے میں انھیں ایک سال کی سزا ہوئی[۵۵]۔ نینی تال جیل بھیجے گئے۔ علی گڑھ ہی کے ایک طالب علم نثار احمد شروانی نے جوایس پی کے عہدہ پر فائز تھے ان کے بھائی فدا احمد شروانی نے انگریزی اداروں سے بائیکاٹ کیا[۵۶]۔ اور اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ سید محمود کو بھی مصر کے موضوع پر ایک مضمون لکھنے پر گرفتار کیا گیا اور ۲ سال کی سزا ہوئی[۵۷]۔

ڈاکٹر سید محمود کے قیام برطانیہ کے دوران دو انگریز مؤرخین مسٹر براؤن اور مسٹر بلنٹ سے ان کے گہرے روابط تھے[۵۸]۔ بلنٹ کے کردار پر گزشتہ باب میں تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ بلنٹ نے اپنے روزنامچے میں علی گڑھ کے دورے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں صاحبان اس وقت کی سیاسی حالات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور دونوں نے جمال الدین افغانی کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں کے افغانی سے تعلقات بھی تھے۔ علی گڑھ تحریک کی وابستگی اتحاد اسلام سے کچھ اس نوع کی تھی کہ اسے صرف سیاسی تناظر میں ہی نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ علی گڑھ کے مسلمان طلبہ ہمیشہ مسلمانوں کے احساسات وجذبات کی آبیاری میں اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں اس ادارے نے مسلمانوں کی جس طرح ملی خدمت کی ہے، شاید ہندوستان کی تاریخ میں جب برطانیہ کے یہ زیر نگیں تھا کسی نے علی گڑھ سے بڑھ کر انجام نہیں دی، اس کا

متوازی رویہ ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے وقت دیکھا جا سکتا ہے، اس وفد کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے خود باریابی کا موقع دیا ایک طرف برطانوی حکومت کا سیاسی کردار یہ تھا کہ وہ خود بلقانی ریاستوں کو ترکی پر چڑھائی کے لیے ہوا دے رہا تھا دوسری طرف طبی وفد کے لیے انگریزوں کی فراہم کردہ ٹرک کاروان انصاری طبی وفد کو خیر باد کہنے کے لیے پیش کیا گیا[59]۔

علی گڑھ تحریک کو سیاسی اور تعلیمی تحریک خیال نہیں کیا جانا چاہیے[60] اس تحریک سے وابستہ افراد اپنے شعبہ زندگی میں کئی حوالوں سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ انگریزی اور ترکی حکومت کے خوش گوار تعلقات کے زمانے میں علی گڑھ میں ترکوں کا لباس اختیار کیا گیا تھا جو یورپ کے لباس اور تمدن سے قریب تر تھا[61]۔ مگر انگریزوں اور ترکوں کے درمیان ۱۸۸۶ء میں اختلال مصر کے حوالے سے جو بدمزگی پیدا ہوئی، سید احمد خان نے اس موقعے پر انگریزوں کی تائید کی اور ان کی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو جو علی گڑھ کالج قائم کرنے میں ان کے دست راست تھے حکومت کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور انھوں نے مصری نو جوانوں کے خیالات انگریزوں کی طرف سے درست کرنے اور سیاسی امور میں لارڈ کرومر (Lord Cromer) کا ہاتھ بٹانے میں نمایاں حصہ لیا۔ جس کے صلے میں انھیں سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا[62]۔ ان تمام سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے یہ تحریک مسلمانوں میں عالمی اثرات کی حامل رہی ہے۔

علی گڑھ سے وابستہ ڈاکٹر سید محمود کی انگریزی تصنیف *Khilafat and Islam* اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصنیف اس زمانے میں سامنے آئی جب برطانیہ نے ایران میں بلیوجیکٹ فوج اتار دی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود کو ولفرڈ بلنٹ نے بلایا اور کہا کہ انگریزوں کے اس اقدام کی مذمت کرنی چاہیے۔ چناں چہ ایک احتجاجی جلسہ بلایا گیا۔ جس میں دو ہزار ہندوستانی مسلمان اور انگریز شریک ہوئے۔ سید امیر علی بھی اس وقت برطانیہ میں تھے انھیں بھی مدعو کیا گیا مگر انھوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا[63]۔ ڈاکٹر سید محمود نے پروفیسر براؤن کی مدد سے ایک ریزولیوشن تیار کر کے بلنٹ کو دکھائی وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے براؤن انگریز کو نہیں جانتا یہ پھسپھسا ہے انگریزوں کی سخت مذمت کرو۔ گالیاں دو تب اس پر اثر ہوگا۔ بہر حال جلسہ ہوا اور ڈاکٹر سید محمود اس جلسہ کے روح رواں تھے۔ انھوں نے بلنٹ کی ترمیم کے ساتھ دوسری قرارداد اس جلسے میں پیش کی اور شرکا جلسہ اس سے بے حد خوش ہوئے[64]۔ *Times of London* نے اسے ملک کے شہریوں کی مملکت سے عدم وفاداری قرار دی[65]۔

علی گڑھ کے طلبہ نے جنگ طرابلس میں جس جذبہ اخوت کا اظہار کیا تھا وہ ایک مثال ہے[٦٦]۔ ڈاکٹر سید محمود لندن ہی میں تھے۔ براؤن نے ایک میٹنگ منعقد کی اس میں بلنٹ نے اپنا موقف سخت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حکومت خود سازشی ہے، یہ خود اٹلی کے ساتھ شریک جنگ ہے ورنہ اگر یہ چاہے تو فی الفور اٹلی کو واپس ہونا پڑے[٦٧]۔ جنگ بلقان سے جب طبی وفد واپس آیا تو ترکی پر پہلی جنگ عظیم میں شمولیت کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ طبی وفد کے اراکین نے ۱۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو علی گڑھ میں ایک جلسے میں اپنے سفر کی روداد اور ترکی کے تاثرات سنائے[٦٨]۔ مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ترکی میں انگورہ حکومت کی مزید مالی امداد کی جائے تا کہ وہ یونانیوں سے جنگ کر سکیں[٦٩]۔ اس شورش کے زمانہ میں علی گڑھ اور عام ہندوستانی مسلمانوں نے ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کا بائیکاٹ کیا[٧٠]۔

اس زمانے میں حالات اس قدر نازک ہو گئے تھے کہ وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے اپنی حکومت کو لکھ دیا کہ اگر ترکوں کے خلاف پالیسیوں میں ترمیم نہیں کی گئی تو ہندوستان پر حکمرانی دشوار ہو جائے گی[٧١]۔ اس پوری سرگرمی کا اثر علی گڑھ میں مسلمان طلبہ میں بالعموم دیکھا جا سکتا ہے مگر علی گڑھ سے وابستہ انگریز اساتذہ کرام بھی ان سرگرمیوں میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کے چھڑ جانے پر سر والٹر رائے جو انگریزی کے پروفیسر تھے جنگ عظیم اوّل پر انھوں نے متعدد لیکچر دیے جنھیں جمع کر کے ۱۹۱۸ء میں *England and the war* کے عنوان سے شائع کیا گیا[٧٢]۔

علی گڑھ تحریک نے حقیقتاً تحریک اتحاد اسلامی کے فروغ کے لیے افراد کار ہندوستان میں اور اس سے باہر بھی فراہم کیے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ شوکت علی کو مئی ۱۹۱۵ء میں ترکی کی حمایت میں پہلی بار قید و بند کا مزا چکھنا پڑا۔ شوکت علی نے انجمن خدام کعبہ کی تحریک چلائی جس کے پس پردہ مقاصد میں برطانوی حکومت کے خلاف جہاد بھی شامل تھا[٧٣]۔

علی گڑھ ہی کے ایک طالب علم راجہ غلام حسین نے زمانہ طالب علمی میں ہڑتال میں حصہ لینے والوں میں تھے اور اتحاد اسلام کے داعی تھے۔ آزادی کی علم برداری میں مسز بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کو زور و شور سے چلایا۔ علاوہ ازیں جب مولانا محمد علی جوہر کا کامریڈ اخبار بند ہو گیا تو لکھنؤ سے انھوں نے *New Era* ہفتہ وار پرچہ نکالا جو مکمل طور پر کامریڈ کے طرز کا تھا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا[٧٤]۔

علی گڑھ سے طبی وفد میں شریک چوہدری خلیق الزماں صدیقی کی کتاب شاہراہ پاکستان کے مطالعہ سے اس زمانے کے علی گڑھ میں تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات کی واضح تصویر کھل کر سامنے آتی ہے۔نوجوانوں میں یہ جذبہ تھا کہ بلقان جا کر جہاد کریں تا کہ انگریز کی سامراجیت سے چھٹکارا ملے جو آئے دن باقی ماندہ مسلمانوں کی سلطنت کو تباہی سے دوچار کر رہے ہیں۔اسی زمانے میں ہاشمی فرید آبادی نے علی گڑھ کی مسجد میں آکر اپنی نظم چل بلقان چل سنا کر علی گڑھ کی پوری فضا میں چل بلقان چل کی آرزو جگا دی تھی[۷۵]۔

علی گڑھ تحریک نے جس طرح مدبر اور منتظم پیدا کیے،اس تحریک نے مسلمانوں کی ملی زندگی میں جس انداز میں اپنے تاثرات ڈالے اس کی مثال اگر تلاش کرنی ہے تو اس تعلیمی ادارے کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی انداز میں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔علی گڑھ نے صرف ہندوستانی مسلمانوں میں حرکت پیدا نہیں کی بلکہ ایسے عزائم بھی تشکیل دیے اور ایسی شخصیات پیدا بھی کیں جنھوں نے اپنے کردار و عمل کے ذریعے شوق، مستعدی، قربانی اور ارادے کی پختگی سے پوری دنیا میں اپنی مثال قائم کی۔اگر تحریک اتحاد اسلامی کے تناظر میں دیکھا جائے تو حالی، شبلی، وقار الملک ایسے نام ہیں جنھوں نے ملت کی نشوونما میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔علی گڑھ کا یہ عطیہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک روشن مثال ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا علی گڑھ سے جو دیرینہ تعلق ہے اور اس کو جس طرح وہ اپنی تعمیری صلاحیتوں اقدار اعلی کی پیروی اور وطن اور ہم وطنوں میں دیرینہ یگانگت کا محرک سمجھتے ہیں اور مظہر بھی، اس کی مثال علی گڑھ کے صدر دروازے وکٹوریہ گیٹ پر وہ عربی اشعار ہیں جو اس ادارے کے قیام کے دن سے آج تک علی گڑھ تحریک کی ترجمانی کرتے چلے آرہے ہیں[۷۶]۔اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

> قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے[۷۷]۔

اس کے علاوہ علی گڑھ میں موجود مسجد قرطبہ کی محراب پر دو آیات نقش ہیں ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

> اور البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ ﷺ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی جو خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتا ہے[۷۸]۔

دارالعلوم دیوبند:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد دارالعلوم دیوبند مسلمانانِ برصغیر کا علمی اور دینی مرکز بن کر ابھرا۔ اس مدرسے نہ صرف مسلمانوں کی دینی تربیت ہوئی بلکہ عالم اسلام میں بھی چند سالوں میں اس مدرسے نے اپنی علمی خدمات کے ذریعے روشن مثالیں قائم کیں اور اس کے طفیل کئی ایسی تحریکیں بھی پروان چڑھیں جس نے دورِ غلامی میں آزادی کی شمع روشن کر دی۔ تحریک اتحاد اسلامی اور دارالعلوم دیوبند پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا مقصود ہو تو علمائے دیوبند کے حالات و واقعات کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا اور صحیح اثرات کے مطالعے کے لیے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی زندگی اور ان عوامل پر نظر ڈالنی ہوگی جس نے دیوبند کو عالمی سیاسی و دینی رجحانات میں ایک ملت کی آواز بن جانے پر مجبور کیا۔ مولانا محمود الحسن اس تحریک کی واحد شخصیت تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ اعانت کرنے کے لیے نہ صرف ابھارا' بلکہ ایک جمعیت بھی قائم کی جس کا نام ثمرۃ التربیت تھا[۷۹]۔ یہ انجمن خود ایک لائحہ عمل کی خبر دیتا ہے۔ اس انجمن کے قیام کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ تمام انقلابی جماعتیں ایک بنیاد پر اکھٹی ہو جائیں[۸۰]۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے سرحد، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کو ایک نظریے پر متفق ہو جانے کی تجویز بھی پیش کی۔ ۱۸۵۷ء سے پیش تر شاہ ایران نے بھی اس کی دعوت دی تھی[۸۱]۔

سول اور سیکولر عوامی اداروں کے برعکس دیوبند کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی سوچ پیدا ہوئی جو صدیوں سے مذہبیات اور مابعد الطبیعیاتی مباحث سے منسلک رہی ہے[۸۲]۔ ان ہی عوامل کی وجہ سے مسلم ہند میں علمائے دیوبند کی جماعت کو نمائندہ حیثیت میں دیکھا گیا جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکوں سے روابط استوار کیے اور ایسی حکمت عملی اختیار کی جو ہندوستان سے برطانیہ کو اکھاڑ پھینکنے پر مبنی تھی[۸۳]۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلافت عثمانیہ کے اتحادی یعنی ہندوستانی مسلمان برطانیہ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرا سکتے تھے؟ اس گرفت سے نجات پانے کی کوششیں ہندوستان میں کئی مواقع پر دکھائی دیتی ہیں۔ سلطان ٹیپو کی شہادت سے لے کر جنگ آزادی تک ہندوستانی مسلمانوں کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ برطانوی حکمرانوں سے نجات حاصل کریں اور دوبارہ اپنی ملی شناخت کو زندہ کریں۔ اس خواہش کے حصول کے لیے بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں کئی مذہبی ادارے بہ شمول دیوبند اور فرنگی محل نے مسلمانوں کی عوامی رائے تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان اداروں نے برطانوی سیاسی پروپیگنڈے کی بھرپور مخالفت

کی [84]۔

برطانوی حکومت کے سیاسی و تہذیبی پروپیگنڈے کو توڑنے کے لیے دارالعلوم دیو بند نے شعبہ اشاعت اسلام و صیغہ تالیف دارلعلوم بھی قائم کیا۔اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دینی خدمات کو ہر شعبہ زندگی میں جاری کیا جائے۔وہاں ایسے عالم تیار رہتے تھے جو ہر قسم کی دینی خدمات انجام دے سکتے تھے [85]۔ہندوستان اور اس سے باہر اشاعت اسلام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دارالعلوم دیو بند نے چند علما کی جماعت تیار کی جو اشاعت اسلام کی غرض سے ہندوستان سے باہر بھی اپنے گہرے اثرات رکھتی تھی۔

دارالعلوم دیو بند کا مسلم دنیا کو ایک مرکز پر متفق کرنے سے پہلے ایک قدم جو انقلابی بھی تھا اور وقت کی اہم ضرورت بھی اٹھایا گیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان کسی ایک نکتے پر مرتکز ہو کر عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کریں۔اسی مبارک جذبے کے تحت ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد جیسے مدبرین کو شیخ الہند کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا اور کوشش یہ کی جارہی تھی کہ علوم شرقیہ اور علوم مغربیہ کی دونوں عظیم الشان یونی ورسٹیوں یعنی دارالعلوم دیو بند اور علی گڑھ میں مفاد ملت کے اصول پر آئینی اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم ہو جائے [86]۔

سید احمد خان اور دارلعلوم دیو بند میں خواہ کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو، سید احمد خان نے ہمیشہ اسے مسلمانوں کا ادارہ تسلیم کیا اور اس حوالے سے اخلاقی امداد بھی فراہم کرتے رہے۔مولانا قاسم نانوتوی کے انتقال پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مؤرخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں لکھا ہے کہ:

> دیو بند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے [87]۔

دارالعلوم دیو بند نے مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی بربادیوں کے علاوہ ہندوستان میں مسیحی مشنریوں سے وابستہ پادریوں کی جماعتوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں سات ہزار علما کو شہید کر دیا گیا یا پھر انھیں جزائر انڈمان میں قید کیا گیا ان اسباب کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی محافظت جس انداز میں علمائے دیو بند نے علمی اور تحریکی سرگرمیوں کے تحت کی اس کے اثرات عالم گیر تھے اور اس اثرات نے اس تحریک کو جغرافیائی حدود سے بہت جلد باہر نکال کر عالمی اثرات ڈالنے پر مجبور کر دیا۔مدرسہ دیو بند میں فارغ التحصیل طالب علموں میں حریت رچی بسی تھی۔ہندوستان سے برطانوی سامراج کو نکالنے کی خواہش

ہندو کانگریسیوں کی خواہش سے فایق تھی [۸۸] کیوں کہ انگریزوں کا ہندوستان چھوڑنا فقط ہندوستان چھوڑنا نہیں تھا تمام اسلامی ملکوں میں جو انگریزوں کے پنجہ استبداد میں گڑے ہوئے تھے اس سے گلوخلاصی تھی [۸۹]۔

علی گڑھ اور مدرسہ دیوبند کے دل ملت کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ ترکی پر آفت آئی تو ادھر نواب وقارالملک بہادر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر انگریز حکومت نے مسلم یونی ورسٹی بنانے کی اجازت نہ دی تو جو روپیہ مسلم یونی ورسٹی کے واسطے جمع کیا گیا ہے سارا ترکی روانہ کردوں گا۔ ادھر مولانا محمودالحسن نے ترکی سے جس جذباتی اور عملی اور والہانہ محبت کا اظہار کیا وہ دیوبند تحریک کی ایک تاریخ ہے [۹۰] جو ہندوستانی مسلمانوں کی عالم اسلام سے وابستگی کی روشن دلیل ہے۔

مولانا محمودالحسن تحریک اتحاد اسلامی کے لیے عملی طور پر سرگرم رہے تھے۔ جنگ بلقان میں مولانا نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوبند کے مدرسے میں طلبہ کی چھٹی کردی اور مدرسین کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجا کہ وہ ترکوں کی امداد کے لیے چندہ اکھٹا کریں اس پر مستزاد یہ کہ مدرسین سے بھی درخواست کی کہ وہ اپنی تنخواہوں میں سے ترکوں کے لیے انفاق کریں۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ ترکی بھیجا گیا۔ جس کے صلے میں ترکی حکومت نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور وہ رومال جس میں آں حضرت ﷺ کا پیراہن مبارک رکھا رہتا ہے دارالعلوم دیوبند کو بہ طور تبرک اور عطیہ بھیجا جو آج بھی دارالعلوم دیوبند کے خزانے میں تبرکاً موجود ہے [۹۱]۔

جنگ بلقان کے دوران مولانا محمودالحسن نے ترکوں کی امداد کے متعلق ایک فتویٰ بھی دیا جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کی گئی کہ معرکہ بلقان میں ترکی مجروحین و یتیموں و بیوگان اور ترکی لشکر کی مدد کی جائے۔ صرف مولانا محمودالحسن نے فتویٰ نہیں دیا تھا بلکہ خلافت عثمانیہ کے حوالے سے لاکھوں کی تعداد میں فتاویٰ اور اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچائے گئے۔ اساتذہ اور طلبہ نے ملک کے اطراف و جوانب میں دورے کر کے عام جلسوں میں اس کی اہمیت بیان کی اور امدادی تحریک کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا گیا۔ جگہ جگہ انجمن ہلال احمر کی امداد واعانت کے لیے جو انجمنیں قائم ہوئیں ان کے ذریعے دیوبند کے طلبہ واساتذہ نے لاکھوں روپیہ چندہ کر کے بھیجا۔ اس کے علاوہ خود طلبہ نے اپنی حمیت ملّی کا یہ ثبوت دیا کہ سالانہ انعام میں ملنے والی کتابوں کی پوری رقم ہلال احمر کی نذر کردی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ضروری استعمال کی اشیاء تک چندہ میں دے ڈالیں۔ اس امدادی سرگرمی کے علاوہ ان حضرات کی

کوششوں سے ملک کے مختلف مقامات سے چندہ کر کے بھیجا گیا، خود ان کے ذاتی چندوں اور دیگر عطیات سے ۶۵ ہزار کی گراں قدر رقم دارالعلوم دیوبند سے روانہ کی گئی[۹۲]۔

دارالعلوم دیوبند تحریک کے عالمی اثرات صرف تحریک اتحاد اسلامی سے وابستگی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ علمی خدمات میں اس ادارے نے جو کام کیا اس کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اس نے عالمی سطح پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا ہندوستان میں تشریف لائے تو ہندوستان کے کئی علمی اداروں جن میں علی گڑھ، ندوۃ العلما اور دیوبند شامل ہیں دورہ کیا۔ دیوبند کے دورے کے بعد رشید رضا بمبئی چلے گئے جہاں پہنچ کر انھوں نے دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا[۹۳]۔ رشید رضا نے اس خط میں اس تعلیمی ادارے کو مسلمانان ہند کا اسلامی مرکز قرار دیا۔ انھوں نے وہاں کے طالب علموں اور اساتذہ کے خلوص کو دیکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تحریک سے نہ صرف دل چسپی لی بلکہ اس امر پر شدید زور دیا کہ مسلمانوں کی دینی، علمی، ادبی اور تہذیبی تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ ادارہ دین اسلام کی محافظت میں اپنا کردار ادا کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں افسوس ناک امر یہ ہے کہ غریب عام مسلمان بھیڑ بکریوں سے زیادہ مہمل چھوڑ دیے گئے ہیں، ہم میں سے کوئی شخص ان کی خبر نہیں لیتا، اور ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کی ہدایت کا کون متکفل ہوسکتا ہے؟ آپ یا آپ جیسے علما کرام سے امید کی جا سکتی ہے کہ اسے مسلمانوں کی ہدایت اور تلقین کے لیے ایک تحریک اور ایک ادارے میں ڈھال دیں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لیے کمربستہ ہوں اور ان کے متعلق کوئی مستقل انتظام کریں[۹۴]۔

رشید رضا نے ہندوستانی علماء سے کہا کہ پورے عالم اسلام کی حالت تقریباً یکساں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مصر اور ہندوستان کے مسلمان متفق ہو کر علمی افلاس کو دور کرنے کی کوشش کریں کوئی ایسا انتظام ہو کہ آپ ہماری تجاویز سے واقف ہوں اور ہم آپ کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھائیں[۹۵]۔

۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کے نتیجے میں مولانا محمود الحسن نے سفر حجاز کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں حکیم عبدالرزاق، ڈاکٹر انصاری نے بہت زیادہ مدد دی۔ حکیم عبدالرزاق نے جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ ہر قسم کا سامان سفر نہایت فراخدلی سے مہیا کیا[۹۶]۔ مولانا محمود الحسن نے مکہ معظم میں وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرایا۔ غالب پاشا نے شیخ الہند کو ایک مکتوب بصری پاشا گورنر مدینہ منورہ کے نام لکھا جس میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کرنے کی تفصیل موجود تھی۔ مدینہ میں ان دونوں صاحبان سے شیخ الہند کی

ملاقات ہوئی جن کی تفصیلات سفر نامہ شیخ الہند میں دیکھی جاسکتی ہے[97]۔

انور پاشا اور جمال پاشا سلطنت عثمانیہ کے اہم افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ انور پاشا تمام محاذوں کی محافظت کہ نہ صرف ذمہ دار تھے بلکہ اپنے محاذ کی خبر گیری بھی کرتے رہتے تھے۔ شیخ الہند کا مدینہ منورہ میں نہایت شاندار استقبال کیا گیا جس میں اہل شہر کے تمام مذہبی اور دینی طبقات نے شرکت کی[98]۔ اس ملاقات میں جمال پاشا نے آزادی کی تحریک کو ہندوستان میں جاری رکھنے کی تلقین کی اور سلطنت عثمانیہ کی جانب سے یقین دلایا کہ ہم اہل ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے[99]۔ انور پاشا نے چند خطوط دیے جس میں آزاد قبائل کو امداد دینے کا اطمینان دلایا گیا تھا[100]۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ مولانا محمود الحسن کا منصوبہ یہ تھا کہ برٹش حکومت پہ کاری ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مولانا یہ سمجھتے تھے کہ اس سے آزادی کی منزل نہایت قریب آجائے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مجاہدین کے مرکز یاغستان کو جہاں مولانا سیف الرحمٰن، حاجی ترنگ زئی وغیرہ حضرات موجود تھے اور عرصے سے اس جماعت کی ضروریات پوری کر رہے تھے، پیغام بھیجا کہ اب سکون کے ساتھ کام کرنے کا وقت نہیں ہے، سربکف ہو کر میدان میں آجانا چاہیے[101]۔ غازی انور پاشا سے ملاقات انگریزوں کے خلاف کارروائیوں کے تیز کرنے کے منصوبے کو ذہن میں لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مناسب یہ جانا کہ وہ خود آزاد قبائل کے پاس پہنچیں۔

اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی رومال خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت برطانیہ کو اس سازش کا علم ہوا[102]۔ اس سے منصوبے کو مضبوط قابل عمل بنانے کے لیے مولوی عبیداللہ سندھی نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبیداللہ دیوبند ضلع سہارن پور کے مدرسے میں تعلیم مکمل کر کے مولوی بنے۔ وہاں انھوں نے اپنے باغیانہ خیالات اور برطانیہ کے خلاف جہاد کو چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلا دیا، جن لوگوں پر انھوں نے اپنا اثر ڈالا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود الحسن کی تھی۔ مولانا عبیداللہ چاہتے تھے کہ دیوبند کے مشہور ومعرف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں ایک عالم گیر پان اسلامزم کی تحریک چلائیں[103]۔

یہاں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ گورنر حجاز نے شیخ الہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں عام ہندوستانیوں کو متحد کر کے آزادی کی تحریک کا راستہ ہموار کریں۔ سید حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب نقش

حیات میں شیخ الہند کی تحریک کو ہندو مسلم اور سکھوں کے اتحاد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ان کا تجزیہ ان کے نظریات کے طابع معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس تحریک کو عالم اسلام سے وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ترکی کی خلافت اور برطانوی راج کے خلاف جدجہد کو استوار کرنے کے لیے عالمی سطح پر جو کوشش مولانا محمود الحسن نے انجام دی اسے بھی اتحاد اسلامی کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے اگر ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ عالمی سطح پر نہیں تھا تو پھر اس تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے جمال پاشا اور غالب پاشا نے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کیوں کیا؟

مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا محمود الحسن پر جس طرح اپنے اثرات مرتب کیے[۱۰۴] اس نے دیوبند میں بے چینی پھیلا دی۔ عبید اللہ سندھی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ دیوبند کو اپنے کام کا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے[۱۰۵]۔ اور اتحاد اسلامی اور برطانیہ دشمنی کی اپنی اس تحریک کو ان مولویوں سے کام لے کر پورے ہندوستان میں پھیلا دیں گے جو دیوبند کے مدرسے میں تعلیم پا کر مذہب اسلام کے پرچار اور تبلیغ کے لیے ہندوستان میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار بھی قائم ہوئی اس کو دیوبند کے قدیم طلبہ نے کامیاب بنایا[۱۰۶]۔

مسلم ہند میں علمائے دیوبند کی اس جماعت نے جنگ عظیم اوّل میں عثمانویوں سے روابط کی حکمت عملی تیار کی اور سرحدی قبائلیوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ برطانوی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے میں وہ علماء کا ساتھ دیں[۱۰۷]۔ علمائے دیوبند نے برطانوی حکومت کو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں بھی پوری قوت کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں تحریک ریشمی رومال وجود میں آئی۔ شریف حسین مکہ کی بدعہدی کے نتیجے میں یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکی ورنہ برطانوی حکومت کو جنگ عظیم اوّل میں ہی ہندوستان کا ایک نیا اور گرم محاذ کھلا ہوا ملتا اور شاید اس کے نتائج خلافت عثمانیہ کی بقا کی صورت میں ظاہر ہوتے۔

جنگ بلقان کے دوران ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں جو طبی مشن بھیجا گیا اسے علمائے دیوبند کی سرپرستی حاصل تھی۔ کیوں کہ اس جنگ میں جو بھی مالی امداد ہو رہی تھی اس کے حوالے سے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کا فتویٰ موجود ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اپنے فتوے میں لکھتے ہیں کہ:

اس میں شک نہیں کہ یورپ کی واحد اسلامی سلطنت پر ریاست ہائے متحدہ کے ظلم اور تعدی کے

حملوں نے مسلمانانِ عالم کو ہی نہیں ہلایا بلکہ رحم دل انصاف پسند غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا ہے[108]۔

جنگ بلقان کے دوران دارالعلوم دیوبند نے صرف چندہ اکٹھا نہیں کیا۔ بلکہ ۱۸۷۸ء۔۸۸ء کی جنگ روس وروم کے موقع پر بھی چندہ جمع کرنے کی سعی کی اور لاکھ روپیہ بمبئی کونسل کے ذریعے اس جنگ میں پہنچایا تھا[109]۔ تحریک اتحاد اسلامی ہندوستان میں حقیقی معنوں میں اتحاد بین المسلمین کی روح کے ساتھ اپنے زمانے میں موجود تھی۔ اس کی اعلیٰ مثال شیعہ دانشوروں کی تحریریں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں ہر جگہ خلافت عثمانیہ کی نتیجہ خیز حمایت کی جسے امیر علی نے شیعی اماموں کی معصوم روحانی امامت اور پوری مسلم قوم کی دینی یا دنیاوی خلافت کی شاہانہ قیادت کو باہم موافق اور متجانس قرار دیا[110]۔ جب کہ ۱۸۷۹ء میں شیعہ بوہرہ رہنما بدرالدین طیب جی نے بمبئی گزٹ میں ایک خط لکھا اور اس میں برطانوی اخبارات کے ان مفروضوں پر مبنی الزامات کی تردید کی جو انھوں نے بلغاریہ پر ترکی کے نام نہاد مظالم کے ضمن میں لگائے تھے اور ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی وہ روس کے مقابلے میں ترکوں کا ساتھ دیں[111]۔ اسی طرح مولوی چراغ علی نے اپنی سیاسی ومذہبی اصلاحات کے سلسلے میں اسلامی سلطنتوں میں ترکی کو شیعی فارس سے بہتر سمجھتے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خان کے خیالات کے خلاف انھوں نے عثمانوی خلافت کا دفاع کیا۔ وہ بلنٹ کے خیالات کے مخالف تھے کہ خلافت خاندان قریش کو منتقل کر دی جائے[112]۔

ترکی میں دستوری حکومت کے قیام کے بعد انجمن اتحاد وترقی کے ارکان نے ۱۹۱۱ء میں ایک کانفرنس سالونیکا (Solonica) میں منعقد کی اور اس میں طے کیا گیا کہ تمام ممالک اسلامیہ کے مندوبین ہر سال قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر ان مسائل پر بحث کریں گے جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اتحاد اسلامی کے سفراء پھر ان سب ملکوں میں بھیجے گئے جہاں کے مسلمان یورپین حکومتوں کے ماتحت تھے نیز ان ملکوں میں جہاں مسلمان مغربی تسلط سے ابھی آزاد تھے، سنی، شیعہ کے اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ چناں چہ متعدد عثمانی اور ایرانی علماء نجف میں جمع ہوئے اور بیان شائع کیا کہ دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دونوں سلطنتوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل پر زور دیا اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہو گئی، ترکی جو خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز تھا اب تمام دنیائے اسلام کی ہمدردی کا مرکز بن گیا اور کئی ملکوں کی اسلامی صحافت نے اتحاد اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کے اعلان

پر متفق تھا [۱۱۳]۔یوں ہندوستان میں شیعہ اور سنی بھی اس معاملے میں یکجا دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا محمود الحسن کے روابط صرف ہندوستانی مسلمانوں سے نہیں تھے بلکہ جب وہ مالٹا میں اسیر تھے تو غازی انور پاشا کے والد غازی احمد پاشا التوائے جنگ کے بعد استنبول میں موجود تھے اور جب قسطنطنیہ پر اتحادی قبضہ ہوگیا تو انھیں شیخ الاسلام خیر الدین آفندی، حبیب بے، کرنل جواد بے، فائق بے، مفتی حسن فہمی وغیرہ کے ہمراہ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ یہاں مولانا محمود الحسن پہلے سے موجود تھے مولانا کے متعلق جب انھیں معلوم ہوا تو ان سے بے حد عقیدت ہوگئی۔اس محبت وارادت نے یہاں تک تعلق بڑھا دیا کہ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے مولانا سے بیعت کی درخواست کی مگر مولانا محمود الحسن نے عجز وانکسار کی بنا پر اسے قبول نہ کیا [۱۱۴]۔کرنل جواد بے نے بطور یادگار ایک حمائل شریف نہایت عمدہ اور خوب صورت طبع شدہ مولانا کی نذر کی۔غازی احمد پاشا معمر اور سادہ آدمی تھے۔لیکن مولانا سے انھیں بھی بے حد عقیدت تھی وہ مولانا محمود الحسن کے پاس جیل میں تشریف لایا کرتے تھے [۱۱۵]۔

۱۹۱۴ء میں یورپ کی عالم گیر جنگ شروع ہوگئی۔ترکی جنگ سے علیحدہ رہنا چاہتا تھا لیکن اس نے جرمنوں کا ساتھ دیا۔اس جنگ میں ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درہ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لیے بند کر دیا تھا۔برطانیہ اور فرانس نے اس کو کھولنے کے لیے کئی حملے کیے مگر انھیں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔مولانا محمود الحسن نے اس واقعے کی تاریخ بھی نکالی ہے جو ۱۳۳۴ھ ہے۔یہ سنہ ہجری ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء کو شروع ہوا تھا [۱۱۶]۔اس موقع پر شیخ الہند نے ایک نظم درہ دانیال بھی لکھی [۱۱۷]۔جس کے چند اشعار یہ ہیں:

کیا کہوں اللہ اکبر کیا ہے درد شان نیل
سجدہ گاہ اشقیا ہے درد شان نیل
رستم و سہراب کے قصے ہیں تقویم کہن
ہم سے سن لے کوئی آ کر داستان درد نیل [۱۱۸]

پھر ترکوں کی بہادری اور جفاکشی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دم کے دم میں ہوگئی کیسے خزاں رشک بہار
کون ہے ہم کو بتا دو باغبان درد نیل

دیکھ لیوے طلعت و انور کو آکر یک نظر
دیکھنے ہوں جس کو شیران نیستانِ دردنیل[119]

اہل یورپ کی ملک ہوس گیری پر اس انداز میں تنقید کی ہے اور انھیں اسلامیوں کا دشمن قرار دیا ہے:

روس محسود فرانس اور وہ محسودِ فرنگ
رحمت باری سدا ہو سائبان دردنیل
بھیڑیے یورپ کے بسم اللہ آئیں شوق سے
حب اسلامی سے جو ہوں مدح خوان دردنیل
کٹ کے سر انگریز کا تاریخ نکلی بے بدل
سجدہ گاہ اشقیا ہے آستان دردنیل[120]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمان تہذیبی اور فکری اعتبار سے پسماندگی کا شکار ہو گئے تھے اور انگریزوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر عیسائیت کو پروان چڑھانے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لیے عیسائی پادریوں کو بھیجنا شروع کر دیا۔ مسلمان علماء اس صورت حال سے اچھی طرح واقف تھے انھوں نے اس مہم کو جس کی سرپرستی خفیہ طور پر برطانوی حکومت انجام دے رہی تھی روکنے کے لیے مناظرہ شروع کر دیا، یہ مناظرہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوا کرتا تھا اگر اس مناظرے کی تاریخ مرتب کی جائے تو یہ نہایت وقیع تحقیقی مطالعہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند نے بھی عیسائی مشنریوں کو روکنے کے لیے نصاب تعلیم کو عربی اور فارسی زبان میں جو اس وقت کی علمی زبان تھی اختیار نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے طول وارض میں بولی اور سمجھے جانی والی زبان اردو کو ہی اپنے نصاب میں اوّلین جگہ دی[121]۔ حالات کے تناظر کو سمجھتے ہوئے اکابرین دیوبند کا یہ فیصلہ نہایت دوررس تھا اس فیصلے نے ہندوستان کی مسلم تاریخ میں اسلامی ادب کی نہایت جامع راہ ہموار کی اور اسلامی علوم کی اشاعت بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہونے لگی بلکہ کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی ہوئے جس سے اسلامی ادب میں اردو زبان کی ترویج کا معیار بہت بلند ہو گیا۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے دیوبند کی تحریک نے کئی اہم انقلابی اقدامات کیے۔ مولانا قاسم نانوتوی کی اردو تصانیف، مجموعۂ مکاتیب اور البیلی شاعری اردو زبان کے توسیعی پروگرام کا حصہ تھیں[122]۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی سوانح جو اوّلین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے انھوں نے مولانا قاسم نانوتوی کی سوانح اس وقت لکھی جب اردو زبان میں سوانحی مواد کی مثالیں محدود تھیں [۱۲۳]۔ مولانا مظہر الدین جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور دلّی سے الامان اخبار نکالتے تھے انھوں نے ترکی کے کئی ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا [۱۲۴]۔

دارالعلوم دیوبند کی اردو ادب کی خدمت فروغ اردو کے لیے کی جانے والی کوششیں مطالعے کی متقاضی ہیں۔ برما، بنگال، دکن، رنگون، کابل، بخارا، ایران، سماٹرا، جاوا، کشمیر اور دیگر اسلامی ممالک سے جو طالب علم بھی تحصیل علم کی غرض سے آتے تھے انھیں اردو زبان لازماً سیکھنی پڑتی اور چوں کہ یہ صاحبان یہاں کے علمی کاموں سے استفادہ بھی کرتے تھے اس لیے اردو زبان سے اچھی واقفیت بتدریج ان میں پیدا ہو جاتی تھی [۱۲۵] جس کی وجہ سے اردو کی ترویج واشاعت اسلامی ملکوں میں ہوئی اور عالم گیر اتحاد اسلامی کے تصورات کو پنپنے کا بہترین موقع ملا۔ اس دور میں اردو زبان اشاعت اسلام کا باعث بنی اور اعلیٰ درجے کی مذہبی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ یہ زبان خاص طور پر مذہبی ادب کی زبان تھی۔ اس ادب نے ایک ایسی مثال قائم کی جس سے اردو نثر کو فروغ ملا۔ اس دور کے اردو اخبارات سادہ نثر کی مثال فراہم کرتے ہیں۔ مذہبی رسالوں میں اردو میں تبصرے بھی کثرت سے ہوا کرتے تھے [۱۲۶]۔ ۱۸۷۰ء میں اودھ اخبار لکھتا ہے کہ ''مذہبی کام جس کا عرصہ پچاس سال پر محیط ہے ان سب کو اردو میں جمع کر لیا گیا ہے'' [۱۲۷]۔

اردو زبان کو علما نے اس لیے بھی استعمال کیا کہ یہ زبان عوام کے وسیع طبقے میں فارسی کی نسبت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم یافتہ افراد اردو جانتے تھے جو صاف ستھری اور شستہ ہوتی تھی۔ جو مسلمان دربار سے وابستہ تھے وہ تو فارسی اور رسمی طرز گفتگو کو جیسا کہ انھوں نے ان اسالیب کو خود فارسی میں ڈھالا تھا بیان کرتے تھے [۱۲۸]۔ لہٰذا دارالعلوم دیوبند سے رسالہ القاسم اور الرشید کا بھی اجراء کیا گیا جو اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ جب سرکاری سطح پر عدالتوں سے فارسی زبان کا خاتمہ کر دیا گیا تو علماء نے اس صورت حال میں دیگر افراد کی طرح دھمکی آمیز ردعمل کا اظہار نہیں کیا، انھوں نے اپنی ثقافتی، سیاسی اور مذہبی حیثیت کو اردو کے استعمال کے فروغ میں اہم جانا۔ انھوں نے نہ صرف علمی وعملی انداز میں اپنے نقطۂ نظر کو اس زبان میں فروغ کے لیے استعمال کیا بلکہ اس خطے کے مسلمانوں کو یکجا کرنے کے لیے بھی اس زبان کا استعمال کیا تھا۔ اس مکتب فکر کے علما جن طالب علموں کو اردو پڑھاتے تھے وہ ایک تحتی یا دوسری زبان بولتے تھے۔ جس کی وجہ

سے مذہبی اشرافیہ کے مابین ابلاغ کی بنیادیں اردو زبان میں رکھی گئیں۔اس کے بعد ان علماء کرام کے شاگرد اپنے علاقوں میں پہنچ کر اردو کی تدریس کا کام کرتے تھے۔اس کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام طبقات میں انیسویں صدی اور اس کے بعد اردو زبان کو وسیلہ اظہار بنانے کے حوالے سے ایک شعوری تبدیلی نظر آتی ہے [۱۲۹]۔اردو کے استعمال نے ایک ایسا پر اثر ثقافتی ماحول پیدا کیا جو صرف مسلمانوں تک محدود تھا اور اردو ایسی علامت کے طور پر ابھری جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی شناخت ظاہر ہوتی تھی۔اردو کے اس کردار کو مستحکم بنانے میں علما اور دوسرے طبقات کی تصنیفات اساسی نوعیت کی حامل رہی ہیں [۱۳۰]۔

علما کرام نے اتحاد بین المسلمین کی تحریک کو ہمیشہ مد نظر رکھا۔اور دیوبند کی تاریخ تو اس مساعی سے بھری پڑی ہے لیکن سیاسی کوششوں کے علاوہ ادبی کاوشیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔انھیں میں ایک ڈائری مولانا جناب محمد صادق صاحب کی بھی ہے جس میں دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پرانے زمانے کی ڈائریاں مخصوص انداز کی ہوتی تھیں۔اکثر اہل ذوق ڈائری یا بیاض لکھتے تھے۔جس میں کچھ خاندانی حالات، روزمرّہ کے واقعات اور مختلف چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ذکر صادق بھی اسی طرز کی ایک بیاض ہے جس کا نام بھی بیاض صبح صادق ہے [۱۳۱]۔

صبح صادق میں جنگ آزادی کے سلسلے میں سیاسی نظمیں ہیں۔جو مولانا صادق صاحب کی کہی ہوئی ہیں۔ادب تخلص تھا۔ان اشعار میں زیادہ تر یونان و ترکی کی لڑائی کا ذکر ملتا ہے۔روس و انگلستان سے نفرت کا اظہار ہے، آزادی حاصل کرنے کا جوش و جذبہ ہے۔پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور ارتقا کے لیے برعظیم پاک و ہند میں جو تحریک اتحاد اسلامی چلی اس کے حوالے بھی اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں [۱۳۲]۔

جنگ کرنا ترک سے کب جرات تھی یونان کی
یہ تو جو کچھ بھی ہے سب سازش ہے انگلستان کی
ہے ہر اک فرعون ظالم کے لیے موسیٰ ضرور
ترک لے لیں گے یقیناً سلطنت یونان کی [۱۳۳]

اس نظم میں ترکوں کے ساتھ جس والہانہ انداز میں مولانا صادق نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اس سے اُس وقت کے دیوبند مدرسے کی عالمی دلچسپی کا بھرپور اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انھوں نے عثمانوی خلافت

کے حوالے سے برطانوی سازش کا ذکر جابہ جا کیا ہے اور ترکوں کی جفاکشی و بہادری کا ذکر اپنی نظم میں مختلف جگہوں پر کیا' ایک جگہ کہتے ہیں:

آرہا ہے طیش میں ترکوں کا لشکر اس طرح
کل کو سن لینا حکومت مٹ گئی یونان کی
ہو چکے دو سو برس ہے اب تو آزادی کا شوق
اب غلامی ہم نہیں کر سکتے انگلستان کی
صبح کو پڑھتے ہیں اللھم شتت شملھم
صفحہ ہستی سے مٹے گی سلطنت یونان کی
جو لڑا ترکوں سے اس نے منھ کی کھائی چت ہوا
مٹ گئی ساری حکومت روس بے ایمان کی
جو مٹائے گا کسی کو خود ہی مٹ جائے گا
صاف کہتا ہوں ادبؔ جو بات ہے ایمان کی [۱۳۴]

مدرسۂ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ اطراف ہند میں پہلے ہی سے موجود تھے اس کے علاوہ اس تحریک نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے دور میں ہی کئی اسلامی ممالک میں اپنے سلسلۂ فیض کو پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ مدرسہ دیوبند کا پہلا دور جو رشید احمد گنگوہی کے وفات پر ختم ہوتا ہے صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لیے مخصوص رہا۔ ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے علماء کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کیا جس کا اظہار تحریک ریشمی رومال اور پان اسلامزم کی صورت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے آپ نے اس ضمن میں ہندوستان کی ان مسلم اکائیوں کو جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے ان سے بھی اپنے تعلقات کو استوار کیا۔ اس سلسلے میں محمد علی جوہر، شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری قابل ذکر ہیں۔ ان تعلقات کے استوار ہونے سے اسلامی ہند میں جو تفرقہ تعلیم یافتہ گروہوں اور مدرسوں کے مابین تھا اس میں کافی کمی واقع ہوئی اور ملت اسلامیہ منظم ہو کر ایک قیادت کے ماتحت اسلام کی بقا اور آزادی وطن کی جانب نہایت مضبوطی سے بڑھنے لگی۔

دولت عثمانیہ کے حق میں اور جنگ عظیم اوّل کے خلاف مولانا محمود الحسن کی مساعی اور ترکوں کی اعانت

نے دیوبند تحریک کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا۔ چناں چہ اس جماعت کو مجبوراً اپنا مسلک بدلنا پڑا اور اس کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ بین الاقوامی دائرے سے نکل کر ہندوستان کی آزادی کی خاطر جدو جہد کی جائے۔ اس خیال کے تحت مولانا محمود الحسن نے اپنی جماعت کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۰ء کا ہے اور یہاں سے اسلامی ہند کی تاریخ میں دیوبند کے کردار کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے[۱۳۵]۔

ندوۃ العلما:

جنوبی ایشیا انیسویں صدی کی نصف دہائی کے بعد تہذیبی اور شعوری سطح پر مسلمان جدید تصورات کا علمی لحاظ سے مقابلہ کرنے سے قاصر نظر آ رہے تھے۔ اس بات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے چند علما پر مشتمل ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ہندوستانی مسلمانوں میں کمزور اور قدیم طرز تعلیم کے نقائص کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس پر غور کر کے ان خامیوں کو دور کرنے کا خواہش مند بھی تھا۔ چناں چہ ہم خیال علما کا ایک طبقہ ۱۸۹۴ء میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے بیٹھا جس نے ندوۃ العلما کا نام اپنے لیے تجویز کیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں یہی تھا کہ علی گڑھ اور قدیم علما کے درمیان ایسا نصاب تشکیل دیا جائے جو ان میں دوریوں کو ختم کر دے[۱۳۶]۔

علما کرام کے حوالے سے یہ اعتراض عام تھا کہ معمولی مذہبی اختلافات اور جزئیات کی بنا پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، چناں چہ ندوہ نے اس نزاعی مسئلے پر بھی اتحاد بین المسلمین کی تحریک کو فروغ دیا اور مختلف الخیال علما کو ایسا مشترکہ لائحہ عمل دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کے لیے تھا[۱۳۷]۔

یہ اغراض و مقاصد اتنے عمدہ تھے کہ اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نواب محسن الملک اور وقار الملک نے بھی اسے پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے اس کا خیر مقدم کیا۔ سر سید احمد خان نے ندوہ کے ناظم محمد علی کو ایک خط میں لکھا کہ ''ایک عمدہ کام ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔۔۔ اگر چہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما متفق ہوں۔ الا کوشش ضرور ہو''[۱۳۸]۔

اس ادارے کا تجربہ مسلمانان ہند کی سیاسی اور مذہبی زندگی میں بڑا اہم ہے کیوں کہ یہاں سے فارغ التحصیل طالب علموں کا ایک ایسا گروہ تیار ہوا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی ملی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان اثرات کا جائزہ علمی، تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر کیا جانا ضروری ہے مگر یہاں صرف اتحاد اسلامی کے تناظر میں اس ادارے کی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا تا کہ اس کے مقاصد میں شامل

اس اہم ترین جزو کی تشریح ہو جائے۔

مولانا محمد علی کی صدارت میں حاجی محمد کفایت اللہ کے گھر میں ندوہ کے حوالے سے کانپور میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں صاحب الرائے علما نے چند تجاویز بہ غرض استصواب پیش کیں۔ اس میں ایک ایسی تجویز بھی شامل تھی جو اتحاد اسلامی کے لیے ناگزیر تھی۔ ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک جماعت ایسے علما کی بھی موجود ہونی چاہیے جو دور دراز ممالک اسلامیہ کا سفر کرے۔ وہاں کے مسلمانوں سے مل کر تبادلہ خیال کرے، اسلام کی اشاعت کی تدبیریں سوچے، وہاں کے مفید تجربوں کو اپنے ملک میں دستور العمل بنائے، جہاں اسلام کی حکومت نہیں ہے وہاں وعظ کرے تا کہ اسلام کی اشاعت لوگوں میں ہو سکے[۱۳۹]۔

ندوہ کے پہلے ناظم محمد علی کانپوری مصر و قسطنطنیہ کا سفر کر چکے تھے وہاں کے تعلیمی رجحانات اور نصاب تعلیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ندوۃ العلما میں اسے رو بہ عمل لانے کی جستجو کرتے تھے انھوں نے اس دار العلوم کا جو خاکہ تیار کیا اس کو پڑھنے کے بعد لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مصنف قسطنطنیہ میں کھڑا ہو کر مسلمانان ہند کی ذہنی آبیاری کا کام انجام دے رہا ہے[۱۴۰]۔

مولانا شبلی نعمانی بھی اس ادارے کے تاسیسی ارکان میں سے ہیں مگر بعد میں اس ادارے سے اختلافات کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے ان کا مضمون ندوۃ العلما کیا کر رہا ہے نہایت اہم ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس تعلیمی ادارے کی کوششوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> بے شبہ ندوہ کو جو کچھ کرنا چاہیے اس میں اس نے ابھی من میں چھٹانک بھر بھی نہیں کیا لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ خود اسلامی سلطنتوں میں جہاں اسلام کی شاہنشاہی قائم ہے اس قسم کی کوششوں کا شائبہ تک نظر نہیں آتا جو کچھ اب تک ندوہ نے کیا اس کو کسی طرح نگاہ حقارت سے نہیں دیکھا جا سکتا[۱۴۱]۔

بہر حال اس ادارے نے مسلمانان ہند کی ملی مقاصد کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں میں گروہی عصبیت کم ہو گئی۔ اس تحریک کے ذریعے اعتدال پسندی کو فروغ ملا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو باہم شیر و شکر ہونے کا موقع مل پایا۔ اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے کے علاوہ اسلام اور اسلامی تمدن و تاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کیے جا رہے تھے ان کی روک تھام کے لیے اس ادارے نے کئی اہم علمی کام انجام دیے۔ یہ عمل ایسا احسن قدم تھا کہ جس نے نعرے بازی سے زیادہ دور رس اثرات مرتب

کیےاور اس نے مستشرقین کے الزامات کو دلائل کے ذریعے رد کر دیا[۱۴۲]۔

ان ہی علما میں سید سلیمان ندوی بھی تھے جنھوں نے مستشرقین کے سوالوں کا جواب نہایت مدلل انداز میں دیا۔اس کے علاوہ انھوں برعظیم کی سیاسی اور ملی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ان کا مقالہ خلافت اور ہندوستان مسئلہ خلافت اور تیمور کے خاندان سے قبل ہندوستان کے تاریخی پہلوؤں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کا آغاز خلافت سے ہوا ہے مصر کی آخری عباسی خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کے کس طرح کے سفارتی تعلقات تھے اس کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کے دوسرے حصے میں انھوں نے خاندان آل عثمان اور ہندوستان کے مغل فرماں رواؤں کے مابین تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کا عثمانیوں کے ساتھ جو تعلق تھا وہ صرف سیاسی نہیں بلکہ اسلامی اور روحانی بھی تھا[۱۴۳]۔ان کا کہنا ہے کہ:

> خلافت عثمانیہ کی مخالفت میں فتنہ پردازی کا آغاز جنگ روم وروس ویونان سے ہوا۔چوں کہ اس وقت برطانیہ کی ہمدردی واعانت یونان کے شامل حال تھی اس لیے مقربان بارگاہ کو حصول خوش نودی کی فکر ہوئی۔سرسید اور ان کے ساتھ چند خطاب یافتوں نے انکار خلافت میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا[۱۴۴]۔

سید سلیمان ندوی چوں کہ ندوۃ کے فارغ التحصیل تھے اس لیے ان کی سوچ اور فکر میں کسی خاص مسلک کی ترقی وترویج نہیں تھی۔ندوہ کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلکی بنیادوں پر اپنی درسگاہ کی بنیاد نہیں رکھی، یہی عمل اتحاد بین المسلمین کی علامت ہے۔سید سلیمان ندوی بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان خواہ کہیں کے بھی ہوں آپس میں ایک رشتہ باہمی سے جڑ کر ایسی حکمت عملی ترتیب دیں جو وقت اور حالات میں مسلمانوں کی درست سمت میں رہ نمائی کر سکے۔ان کی تعلیمی خدمات میں یہ بات ضرور شامل تھی کہ طلبہ کو موجودہ زمانے کی قوموں اور دنیائے اسلام کے حالات اور سیاست سے باخبر کیا جائے۔طلبہ میں یورپی زبانوں کے سیکھنے کی جستجو اور شوق پیدا کی جائے تا کہ وہ مفتریوں کے لگائے گئے الزامات کا جواب دے سکیں[۱۴۵]۔

سید سلیمان ندوی کا علمی کارنامہ تحریک اتحاد اسلامی کے تصورات کے عین مطابق ہے۔۱۹۱۴ء میں جب وہ ابوالکلام آزاد کے الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے تو انھوں نے کئی ایسے مضامین بھی لکھے جو برطانوی سامراج کے لیے کسی طور قابل قبول نہیں تھے۔مثلاً ان کا مضمون مشہد اکبر، الحریتہ

الاسلام نے مسلمانوں میں ملی جوش وولولے کوفروغ دیا[۱۴۶]۔

مشہد اکبر کی اشاعت پر اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ اس مضمون میں سید سلیمان ندوی کا انداز جارحانہ تھا وہ لکھتے ہیں کہ:

> زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہیے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا۔ طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے۔ مغرب اقصا کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے؟ مسلمانوں کا؟ آخر کار سرزمین کان پور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی[۱۴۷]۔

سید سلیمان ندوی کے اس مضمون سے اور ان کی قومی خدمات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اپنے نظریے کو کسی محدود علاقائی تصور کا پابند نہیں بنایا۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان برطانوی سامراج کی جڑوں کو کمزور کرنے کے لیے تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ ساز سیاسی جدوجہد کو مزید تیز کردیں تاکہ آزادی کا حصول ممکن ہوسکے۔

ان کے خطوط کا مجموعہ برید فرنگ بھی مسلمانوں کے ملی اور مذہبی احساس کی تفسیر ہے۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو لکھا گیا خط جس میں دنیائے اسلام کے سیاسی حالات کا محاکمہ کیا گیا ہے ان کے تصور ملت کا شاہد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> مجھے یہاں آکر جس بات سے تسکین ہوئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ترکی پھر سے جی اٹھے گا بلکہ اس سے ہوتی ہے کہ بوڑھے اسلام کے بجائے اب ایک نوجوان اسلام پیدا ہوتا میں دیکھ رہا ہوں۔ ممالک اسلامیہ کی حریت طلبی اور آزادی کے لیے سربکف کوششوں کے آثار صاف نظر آرہے ہیں[۱۴۸]۔

دارلعلوم ندوہ سے رسالہ الندوہ میں انتخاب الاخبار کی تمام خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا یہ خبریں زیادہ تر ممالک اسلامیہ کے بارے میں ہوتی تھیں خاص کر ترک جس جنگی جنون کا شکار تھے ان خبروں پر رسالے کے مدیر تبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔ الندوہ میں بلغاریوں اور ترکوں کے حوالے سے جاری ایک جنگ کی خبر پر سید سلیمان ندوی نے ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

> ایک انگریز مسٹر بلنٹ نامی شخص نے ایک طویل مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ وزارت انگلستان ہی کی سازشوں سے اٹلی اور طرابلس پر دن دہاڑے عہد بین الاقوامی کی مٹی پلید کر کے ڈکیتی کی اور جب اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا تو دول بلقان کو آمادہ جنگ کیا گیا[۱۴۹]۔

ہندوستان کی جتنی بڑی تحریکیں بیسویں صدی سے پہلے منظر عام پر آئیں ان میں اتحاد اسلامی کی تحریک کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔صرف ہندوستانی مسلمانوں نے اس تحریک کو کامیاب نہیں بنایا۔ بلکہ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی وہی صورت حال تھی جو ہندوستان میں دیکھی گئی۔لیکن ۱۸۷۰ء تک یہ تحریک صرف رجحان کی سطح پر تھی مگر اس کے بعد یہ ایک شعوری عمل بن کر پوری دنیا میں مسلمانوں کی یکجہتی کی علامت بن گئی۔یہی وہ وقت تھا جب ترکوں کے خلیفہ نے مختلف دباؤ کے تحت جو فوجی، سیاسی اور معاشی تھے مسلمانوں پر عمومی تسلط کا زیادہ گرم جوشی سے اظہار کرنا شروع کردیا۔

چوں کہ مسلمانوں میں خلیفہ کی تعظیم پہلے ہی روحانی طور پر موجود تھی اس عمومی دباؤ کے تحت انھوں نے دنیا کے مسلمانوں کو مرکز اسلامیہ کے تحت متحد ہونے کے لیے سیاسی لائحہ عمل بھی دیا اور ہر ملک کی اسلامی تحریکوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا۔ندوۃ العلما کے کئی طالب علم تو ایسے تھے جنھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کئی اہم علمی کام انجام دیے ان میں مولانا ابوالحسنات ندوی کا کام بھی غیر معمولی ہے۔

مولانا ابوالحسنات ندوی نے خلافت اسلامیہ اور ترک نامی ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے مسئلہ خلافت کے تاریخی اور سیاسی اہمیت پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی حکومت کی یادگار یعنی ترکی میں تباہی و بربادی کے اصل محرکات کیا تھے؟ اور یہ بربادی تاریخ میں کن خامیوں کی وجہ سے ہورہی ہے؟ پھر انھوں نے اس کتاب میں یہ بھی شواہد پیش کیے ہیں کہ ترکی خلیفہ کیوں اسلام میں مرکزی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور ہندوستانیوں سے ان کا رشتہ کتنا قدیم ہے۔

چوں کہ ہم پہلے ہی ان امور پر کافی بحث کرچکے ہیں اس لیے یہاں مزید مثالیں دینا تکرار کے سوا کچھ نہیں مگر اس کتاب سے یہ اندازہ با آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ندوۃ العلما کے طلبہ اور اساتذہ دونوں ترک خلیفہ کو خلیفہ اسلام تسلیم کرتے تھے۔ابوالحسنات ندوی نے اس کتاب میں ایک ضمیمہ مسئلہ ترکی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ پر شامل کیا ہے اس میں انھوں نے مختلف گزٹ کی مثالیں دے کر ترکی کو تقسیم کرنے کے یورپی منصوبوں پر روشنی ڈالی ہے۔اور اس امر پر لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تھی کہ کیوں ترکی نے برطانیہ سے دوستی چھوڑ کر جرمنی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مضمون خاصا طویل ہے مگر بہت زیادہ معلومات کا حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

ترکی کے متعلق برطانیہ کا طرزِ عمل غیر دوستانہ ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے ترکی کے دو زیرِ تعمیر جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی نے برطانیہ کے بجائے جرمنی سے دوستی پیدا کی[۱۵۰]۔

دارالعلوم ندوہ کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا اعتراف شبلی نعمانی نے بھی کیا ہے۔ اس ادارے میں مسلمانوں نے مذہبی احساس کو مٹنے نہیں دیا۔ شبلی یہ سمجھتے تھے کہ اگر ملک میں اس قسم کے مذہبی ادارے بند ہو جائیں گے تو مسلمانوں کی حریت اور شعوری فکر کی آبیاری ممکن نہیں رہے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

جب مذہبی احساس فنا ہو جائے گا، جب انگریزی تعلیم مذہبی تعلیم کو بالکل دبا لے گی، جب ہر ہاتھ میں قرآن کے بجائے ڈارون اور ہکلے کی تصنیفات ہوں گی، جب ایسے لوگ کثرت سے پیدا ہو جائیں گے کہ اگر کعبہ اور مدینہ پر کسی یورپین سلطنت کا قبضہ ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو[۱۵۱]۔

شبلی کے یہ خیالات ٹھیک تھے اگر ندوہ اور مسلمانوں کے دیگر بڑے تعلیمی ادارے انیسویں صدی میں مذہبی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا نہیں کرتے تو بچی کچھی جدوجہد بھی نابود ہو جاتی اسی لیے شبلی نے ندوہ ہی کے جھونپڑے کو اپنے لیے موزوں قرار دیا تھا[۱۵۲]۔

حوالہ جات وحواشی

۱- حسین، سید احتشام، ۱۹۵۳ء، ص ۱۷
۲- محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۲
۳- حسین، سید احتشام، ۱۹۵۳ء، ص ۲۵
۴- ایضاً، ص ۳۴
۵- فرید آبادی، ہاشمی، ۱۹۵۳ء، ص ۴۸۱
۶- محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۶
۷- حسین، سید احتشام، ص ۳۴
۸- شاہ، محمد، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء، ص ۵۵
۹- واسطی، سید تنویر، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۵۳۱
۱۰- ایضاً، ص ۵۳۳
۱۱- ایضاً، ص ۵۳۱
۱۲- ایضاً، ص ۵۳۵، ۵۳۶
۱۳- پانی پتی، اسماعیل، مولانا، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۴۰۹
۱۴- ایضاً، ص ۴۲۲
۱۵- ایضاً، ص ۴۲۷، ۴۲۸
۱۶- ایضاً، ص ۴۳۱
۱۷- ایضاً، ص ۴۳۲
۱۸- ایضاً، ص ۴۱۱
۱۹- ایضاً، ص ۴۴۷
۲۰- ایضاً، ص ۴۵۸
۲۱- ایضاً، ص ۴۲۹
۲۲- ایضاً، ص ۴۶۳
۲۳- واسطی، ص ۵۳۶؛ ترکی تنظیمات اس تحریک کا نام ہے جس کے اثرات سے ترکی مین کئی انقلابی تبدیلیاں برپا ہوئیں۔ اس تحریک نے جدید اسکولوں کی بنیاد ڈالی مگر پرانے مدرسوں کو جوں توں رہنے دیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے :ترکی تعلیم ،نومبر ۱۹۳۷، مشمولہ: 'جامعہ'، دہلی، جلد ۲۸، نمبر ۵، ص ۹۳۴، یہ مضمون 'ایشاٹک ریویو' سے لیا گیا ہے مگر مصنف کا حوالہ اس میں موجود نہیں۔

۲۴- ایضاً
۲۵- ایضاً
۲۶- سید تنویر واسطی کا یہ مضمون جس کا حوالہ اوپر درج ہے آزمی اوزکان کی کتاب سے لیا گیا ہے ان کے مقالے کے صفحہ ۵۴۲ میں یہ حوالہ موجود ہے۔ واسطی صاحب کا کہنا ہے کہ سید احمد خان کے کسی بھی ترکی ماخذ میں یہ پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ اردو میں بھی سید احمد خان اور ترکی وفد کی ملاقات سے حوالے سے میرے علم کے مطابق یہ حوالہ کہیں نہیں ملتا۔
۲۷- زبیری، محمد امین، س ن، ص ۲۱
۲۸- ایضاً
۲۹- ایضاً
۳۰- ایضاً
۳۱- ایضاً
۳۲- جعفری، سید رئیس احمد، علی بر ادران، جوہر اسپیشل نمبر، علی برادران اکیڈمی، کراچی، ص ۳۱۴؛ عبد الرحمٰن صدیقی علی گڑھ کے ایک طالب علم ہی نہیں تھے انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں سیاسی لحاظ سے کئی اہم کام انجام دیے۔ ترکوں کے ساتھ جنگ بلقان میں شریک ہو کر مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی ساکھ بنالی تھی مسئلہ فلسطین کے حوالے سے انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ جینیوا جائیں گے اور مجلس اقوام کے سیکریٹری جنرل سے ملاقات کریں گے اور انگریزوں کے مخالفت کریں گے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: خلیق الزماں، چودھری، کاش وہ جانتے، کراچی۔
۳۳- ایضاً، ص ۳۱۰؛ یہ خط عبد الرحمٰن صدیقی نے رسالہ ہمدرد میں لکھا تھا جسے سید رئیس احمد جعفری نے اپنے رسالے میں شائع کیا۔
۳۴- قیصر، رضوان، جنوری، فروری، مارچ، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۳
۳۵- اشرف، محمد، ڈاکٹر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۳
۳۶- ایضاً، ص ۱۶۴
۳۷- ایضاً
۳۸- ایضاً
۳۹- عبد المغنی، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۹
۴۰- قیصر، ص ۱۷۴
۴۱- اشرف، ص ۱۲۴
۴۲- ایضاً، ص ۱۶۵
۴۳- ایضاً

۴۴- جعفری، سید رئیس احمد، ص ۳۱۸

۴۵- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸، ص ۱۴۵

۴۶- احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، ص ۹۴

۴۷- قریشی، اشتیاق حسین، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۳۰۴

۴۸- اشرف، ص ۱۶۵

۴۹- قیصر، ص ۱۷۴

۵۰- ایضاً

۵۱- صدیقی، خلیق الزماں، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۴۴

۵۲- فہد، عبداللہ، اگست ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۱

۵۳- صدیقی، ص ۲۴۴

۵۴- ایضاً

۵۵- عبدالباری، سید، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۴

۵۶- ایضاً

۵۷- ایضاً

۵۸- ایضاً

۵۹- صدیقی، خلیق الزماں، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۵

۶۰- عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ۱۹۹۸ء، ص ۴۵

۶۱- منگلوری، سید طفیل، نومبر ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۸

۶۲- ایضاً، ص ۲۸۸، ۲۸۹

۶۳- عبدالباری، ص ۱۱۵

۶۴- ایضاً

۶۵- ایضاً

۶۶- صدیقی، خلیق الزماں، نومبر، ۱۹۶۵ء، ص ۸

۶۷- عبدالباری، ص ۱۱۵

۶۸- اوکے، میم کمال، اگست ۱۹۹۱ء، ص ۴۴

۶۹- صدیقی، خلیق الزماں، نومبر، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶

۷۰- ایضاً

۷۱- ایضاً، ص ۱۷

۷۲- انصاری، اقبال، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴۹

۷۳- فریدی، قمر الہدیٰ، مولانا شوکت علی، ص ۲۴
۷۴- برنی، ضیاء الدین احمد، راجہ غلام حسین، ص ۵۱
۷۵- صدیقی، شاہراہ پاکستان، ص ۲۵۴
۷۶- صدیقی، رشید احمد، نیا دور، شمارہ نمبر ۵۷-۵۸، ص ۲۵
۷۷- ایضاً
۷۸- قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت نمبر ۲۰
۷۹- میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۲۷؛ ۱۲۹۵ھ میں ثمرۃ التربیت کا قیام دیوبند میں ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ عالم دین جو اس ادارے سے تعلیمی سرگرمیاں پوری کر چکے ہیں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہیں ان پر اس مادر علمی کا بڑا حق ہے' اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ سال میں کم از کم ایک بار اپنی ایک ماہ کی آمدنی کا چوتھائی حصہ دار العلوم کو دیں۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں، تاریخ دار العلوم دیوبند نمبر ۱۹۸۰ء اشاعت خصوصی رسالہ' الرشید'، ساہیوال، پاکستان، ص ۱۷؛ مولانا محمود الحسن نے اسی ثمرۃ التربیت کو جمعیۃ الانصار میں تبدیل کر دیا۔ دیکھیں ماہنامہ الرشید، ۱۹۷۶ء، دار العلوم دیوبند نمبر، لاہور
۸۰- ایضاً، ص ۱۲۹
۸۱- ایضاً، ص ۱۳۰
۸۲- واسطی، سید تنویر، س ن، ص ۱
۸۳- احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۳
۸۴- واسطی، ص ۱، ۲
۸۵- ابن الحاج، محمد رفیع، ۱۳۳۵ھ، ص ۱۷
۸۶- ایضاً، ص ۱۷
۸۷- میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۳۰
۸۸- پانی پتی، اسمٰعیل، اکتوبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۸
۸۹- واحدی، ملا، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۳۵، ۳۶
۹۰- ایضاً، ص ۳۶
۹۱- عزیز الرحمٰن، مولانا، مفتی، اگست ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۴
۹۲- تاریخ دار العلوم دیوبند نمبر، ۱۹۸۰ء، مشمولہ: 'الرشید'، ساہیوال، ص ۸۴-۸۵
۹۳- دار العلوم دیوبند نمبر، فروری ۱۹۷۶ء، مشمولہ: 'الرشید'، لاہور، جلد ۲، ۳، ص ۲۳۵
۹۴- ایضاً، ص ۲۳۱
۹۵- ایضاً، ص ۲۳۳
۹۶- میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۴۲

۹۷- ایضاً
۹۸- میاں، سید محمد، مولانا، ۱۹۹۱ء، ص ۸۱
۹۹- ایضاً
۱۰۰- میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۴۲
۱۰۱- شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴
۱۰۲- مدنی، حسین احمد، فروری ۲۰۰۷ء، ص ۷۶۳
۱۰۳- ایضاً ص، ۷۶۴
۱۰۴- میاں، سید محمد، مولانا، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۱
۱۰۵- ایضاً ص ۱۹۲
۱۰۶- ایضاً
۱۰۷- احمد، عزیز، ص ۱۹۳
۱۰۸- شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ص ۲۲۳
۱۰۹- ایضاً ص ۲۲۴
۱۱۰- احمد، عزیز، ص ۱۸۹
۱۱۱- ایضاً
۱۱۲- ایضاً
۱۱۳- عزیز، محمد، ۱۹۴۳، ص ۴۳۶
۱۱۴- عثمی، حکیم عبدالمجید، س ن، ص ۱۱۳
۱۱۵- ایضاً
۱۱۶- شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۸
۱۱۷- ایضاً
۱۱۸- ایضاً
۱۱۹- ایضاً ص ۱۱۹
۱۲۰- ایضاً
۱۲۱- قاسمی، انیس الاسلام، نومبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۷
۱۲۲- شاہ جہان پوری، ابوسلمان، دسمبر ۱۹۱۸ء، ص ۴۲
۱۲۳- قاسمی، ص ۱۷
۱۲۴- بزم، عبدالصمد صبا، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۳
۱۲۵- ایضاً

۱۲۶- مٹکاف، باربراڈلی، (Babara Daly Metcalf)، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۶
۱۲۷- ایضاً
۱۲۸- ایضاً، ص ۲۰۷
۱۲۹- ایضاً، ص ۲۰۹
۱۳۰- ایضاً، ص ۲۰۹، ۲۱۰
۱۳۱- صدیقی، ظہیر احمد، ڈاکٹر، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۶۳
۱۳۲- ایضاً، ص ۶۴
۱۳۳- ایضاً، ص ۵۵
۱۳۴- ایضاً، ص ۵۶
۱۳۵- سرور، محمد، پروفیسر، اکتوبر ۱۹۴۵ء، ۳۳۹
۱۳۶- اکرام، شیخ محمد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۲
۱۳۷- منگلوری، سید طفیل احمد، نومبر ۱۹۳۷ء، ص ۲۱۱
۱۳۸- اکرام، ص ۱۳۲
۱۳۹- علی، محمد، مولانا، س ن، ص ۲
۱۴۰- تنہا، محمد یحییٰ، مولوی، ۱۹۲۸ء، ص ۲۱۶
۱۴۱- شبلی، علامہ، ۱۹۳۸ء، ص ۶۶
۱۴۲- ندوی، حافظ مجیب اللہ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۵۷
۱۴۳- ردولوی، خورشید نعمان، پروفیسر، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۵
۱۴۴- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۱
۱۴۵- دلی، شہباز حسین، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۳
۱۴۶- دسنوی، سید شہاب، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۸
۱۴۷- ندوی، سید سلیمان، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۹
۱۴۸- ______، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۷
۱۴۹- ______، ۱۹۱۲ء، ص ۳۱
۱۵۰- ندوی، ابوالحسنات، ۱۳۳۹ھ، ص ۷۹
۱۵۱- شبلی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۷
۱۵۲- ایضاً، ص ۱۱۸

maablib.org

باب پنجم

تحریک اتحاد اسلامی: اردو ادب کا نثری سرمایہ

تحریک اتحاد اسلامی: اردو ادب کا نثری سرمایہ

مسلمانوں سے انگریزوں کے معاندانہ سلوک کی کئی وجوہات تھیں۔ اسلامی تعلیمات وعقائد کو یورپ میں صدیوں سے جس طرح مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا اس سے مغربی اذہان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات فطری طور پر پیدا ہو چکے تھے اور ان سے انگریز بھی محفوظ نہ تھے۔ پھر انھیں مسلمانوں سے جو خاص بدگمانی صلیبی جنگوں کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھی وہ صدیاں گزرنے پر بھی نہ مٹیں[1]۔ ان عمومی مخاصمت پر جب بھی غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ مغرب کے معاملے میں مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کئی صدیوں سے حربی اور علمی طور پر برسر پیکار رہی ہے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے اپنی حربی شکست کے باوجود کئی ایسی تحریکات کو جنم دیا جس نے مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے بھی عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے تاثرات ان کی تحریروں میں جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں ۱۸۷۰ء میں وائسرائے لارڈ میو (Lord Mayo) نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr William Hunter) سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ تیار کریں[2]۔ اور بتائیں کے مسلمان مذہباً برطانوی حکومت کی مخالفت پر مجبور تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر ہنٹر نے ہمارے ہندوستانی مسلمان کے نام سے ایک مفصل جائزہ پیش کیا[3]۔ اس میں انھوں نے وہابیت اور بغاوت کو مترادف قرار دیا اور لکھا تھا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق وشوق سے سنتے ہیں[4]۔

ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور وہابیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تردید سید احمد خاں نے اس تبصرے میں کر دی جو انھوں نے ہمارے ہندوستانی مسلمان پر لکھا تھا۔ سید احمد خان نے اس تبصرے میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی تھیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصول بیان کیے تھے اور صاف صاف اقرار کیا تھا کہ میں خود وہابی

ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے[۵]۔لہٰذا انیسویں صدی کے آخری سے مسلمانوں کی قومی جدوجہد نے ایک نیا موڑ اختیار کیا اور اردو ادب بھی اس بدلتے ہوئے رجحان سے متاثر ہوا۔اردو ادیبوں نے اپنے مضامین اور نظموں کے ذریعے ہندوستان کے عوامی حلقوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔اسی دور میں پریم چند کی پانچ وطنی کہانیوں کا ایک مجموعہ سوز وطن شائع ہوا جسے حکومت نے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے ضبط کرنے کا حکم دیا[۶]۔

بہر حال ہندوستان کی سیاسی فضا اس صورت حال میں نہایت ہنگامہ خیز رہی، ہندوؤں میں پروان چڑھتے ہوئے وطنیت کے جذبات نے اپنی جداگانہ شناخت کو ظاہر کر دیا تھا،اس صورت حال میں مسلمانوں نے اس سوچ کو اپنایا کہ ہم مسلمان خواہ کہیں بھی رہیں اسلامی برادری کا حصہ ہیں۔اس سوچ اور فکر کو اردو زبان وادب سے وابستہ لوگوں نے نہ صرف توانا کیا تھا بلکہ ادبی فن پاروں میں کئی ایسی مثالیں پیش کیں جو اتحاد اسلامی کے رجحانات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔خاص طور پر شاعری کا پیرایہ اظہار ایسا ہے جس میں اس رجحان کو بھرپور طریقے سے دیکھا جاسکتا ہے۔برعظیم کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ میں عالم اسلام کی روح موجود دکھائی دیتی ہے خاص کر خلافت عثمانیہ کے حوالے سے مغل سلطنت نے ہمیشہ اسے مرکز کے طور پر دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری نثری اصناف میں بھی ملی تصور نمایاں رہا ہے۔

داستان:

اردو کی کئی داستانوں میں مرکزی کردار ترکی سے تعلق رکھتے ہیں۔سب سے زیادہ مشہور ہونے والی داستان میر امن کی باغ و بہار ہے۔جس میں جابجا ترکی کے تشخص کے نشانات ملتے ہیں۔مثلاً:

> اب میں آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے،روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیروان کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ اس کا پایۂ تخت تھا[۷]۔

میر امن نے باغ و بہار میں جس طرح دانستہ طور پر ترکی کے مثبت تناظر کو پیش کیا ہے[۸] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ترک اور ان کی تہذیب کے حوالے سے ایک اساطیری ماحول قائم تھا۔لہٰذا اس اساطیری ماحول نے ہمارے اردو کے ادیبوں کو عالمی اسلامی برادری کے احساس سے بہت کم باہر نکلنے دیا۔یوں بھی اردو کی داستانیں عربی یا فارسی زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ان داستانوں کو

مقامی صورت حال میں بھی تناظر وسط ایشیا اور ترکی کا ہی دکھائی دیتا ہے۔

سرشار کی داستان فسانہ آزاد اس زمانے میں لکھی گئی جب ہندوستان میں اتحاد بین المسلمین کے جذبات بہت نمایاں تھے۔ یہ داستان نما ناول اودھ اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوتا تھا۔ اس کا پلاٹ کافی ڈھیلا ڈھالا ہے جس میں قدیم داستانوں کا انداز نمایاں ہے۔ ہر فن میں طاق ایک نا قابل تسخیر ہیرو کی مہمات اس کا موضوع ہے۔ ناول کا ہیرو آزاد ایک ذہین، بانکا اور خوبرو نوجوان ہے جو ہر علم وفن میں مہارت رکھتا ہے۔ آوارگی اس کی فطرت ہے لکھنؤ اور اس کے نواح کی سیر کرتا ہوا اچانک لکھنؤ کے ایک مہذب گھرانے کی دوشیزہ حسن آرا کو دیکھتا ہے اور دل و جان سے اس کا عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ شادی کا پیغام بھیجتا ہے حسن آرا کہتی ہے کہ وہ پہلے دنیا میں کچھ شہرت اور نام وری حاصل کرے، وہ شادی کے لیے یہ شرط رکھتی ہے کہ آزاد روس کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے جنگ کریمیا میں شریک ہوں۔ آزاد یہ شرط مان لیتے ہیں اور اپنے رفیق خوجی کے ساتھ جنگ کریمیا میں شریک ہوتے ہیں[9]۔

رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد میں سیاسی اور سماجی طور پر برسر پیکار ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کو پیش کیا ہے آزاد جو محیر العقول شخصیت کا مالک ہے وہ روم کے سفر کی تیاری کرتا ہے اور لکھنؤ تک ٹٹو پر سواری کر کے پہنچتا ہے یہاں پر لکھنؤ کی تہذیب اور اس کے خدوخال پر کافی گہری روشنی ڈالی گئی ہے جب آزاد قسطنطنیہ پہنچتا ہے تو اس کی شہرت پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتی ہے۔

> اب سنیے آزاد کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا اور اکثر لوگ ان کی ملاقات کے شائق تھے۔ مالٹا کے اخبار میں تو ان کی تعریف درج ہو ہی چکی تھی۔ اسکندریہ کے اخبار بھی ان کی توصیف سے مالا مال تھے۔ جس اخبار کو کھولو جس میگزین کو پڑھو آزاد ہی آزاد کا ذکر خیر ہے۔ اسکندریہ کے ایک ہوٹل میں میاں آزاد مع خوجی فروکش ہوئے کھانا کھانے کا وقت آیا تو خوجی رنگ لائے[10]۔

اس اقتباس میں آزاد کے ذریعے رتن ناتھ سرشار نے ہندوستانی مسلم معاشرے کی ذہنی اور فکری کیفیت کو نمایاں کیا ہے۔ یہ کیفیات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھے بلکہ ہندو مدیران کے اخبارات نے بھی ترکوں کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ سرشار لکھتے ہیں کہ:

> اسی ہال میں دو ترک سپاہیوں سے میاں آزاد کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ دونوں اسے کاؤنسل میں لے کر جاتے ہیں جہاں پہلے ہی سے آزاد کی شہرت موجود تھی۔ لہٰذا کاؤنسل اور آزاد کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی ہندوستانی مسلمانوں ہی کی گفتگو ہے۔

"آزاد: اب جنگ کا کیا حال ہے؟

کاؤنسل: اب روس نے اشتہار جنگ دے دیا ہے۔ دریائے پرتھ سے روسی لشکر عبور کرتا ہے اور ہمارے باٹری اکثر مقامات پر ان آگ برساتی ہے۔ خصوصاً اڈیسہ کے آس پاس۔

آزاد: اف جی چاہتا ہے فوراً پہنچوں۔ اب ایک منٹ کا قیام بھی شاق گزرتا ہے۔

کاؤنسل: ہاں جلدی جائیے۔

آزاد: دیکھیے جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے۔

کاؤنسل: اکثر وزرائے سلطنت عثمانیہ کو یقین ہے کہ برٹن سے مدد ملے گی مگر مشکل ہے کہ ہمیں اس کی امید نہیں۔ انگلستان کی حکمت عملی یہ ہے کہ جب تک اپنا نقصان مقصود نہ ہو کسی کا جنبہ نہ کرے۔

آزاد: اور روس بھی تو تنہا ہے۔

کاؤنسل: ہاں مگر فرق یہ ہے کہ وہ حملہ کرتا ہے اور ہم حملہ روکتے ہیں ہمارے اعضاء و جوارح ہی ہمارے دشمن ہو گئے۔

احمد: سرویا کو روس ہی نے ورغلایا تھا۔

آزاد: یہ تو ظاہر ہے۔

احمد: ہمارے وزرا میں صرف ایک مدحت پاشا قابل وزیر ہے مگر معتوب۔

آزاد: افسوس۔

عبداللہ: لیکن ترک جان دینے پر آمادہ ہیں اور دیکھ لیجیے گا خوب لڑیں گے، چھکے چھڑا دیں تو سہی۔

آزاد: ان شاء اللہ

کاؤنسل: ہمارا ایک ایک سپاہی جان ہتھیلی پر لیے ہے۔

آزاد: خدا ان کو مدد دے گا۔

احمد: جرمنی اور روس کی سازش بری ہے۔

آزاد: اور آسٹریا بھی در پردہ انھیں کا جنبہ کرے گا"[11]۔

اس مکالمے میں سرشار نے جنگ کریمیا کے سیاسی پس منظر کو بھی بیان کیا ہے کہ عالمی سطح پر وہ کون سے عوامل تھے جس نے مسلمانوں کو ترکوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ ہندوستان کے پس منظر میں مسلم ملی احساس کے تمام تر رویے کو مدنظر رکھ کر سرشار نے اس داستان کو ناول کی کڑی سے جاملایا ہے اور ایک اساطیری ماحول میں رہ کر اس وقت کے کئی اہم سیاسی ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آزاد بے شک ملت اسلامیہ کی سربلندی کی خاطر ترکوں کے شانہ بشانہ روسیوں کے خلاف جنگ لڑنے جاتے ہیں۔ تاہم مذہب و ملت اسے رشتہ انسانیت سے دور نہیں کرتے۔ پھر وہ سپاہ پیشہ کم اور عشق پیشہ زیادہ ہیں[12]۔ اسی لیے اس جنگ میں آزاد عشق بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک یورپین لیڈی مس میڈا

ہرمزجی کی کوٹھی پر جہاں ترکی میں آزاد کا قیام تھا ان سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس پر فدا ہو جاتی ہے[13]۔

آزاد ہی نہیں سرشار کے نزدیک ترکی سپاہ بھی انسان دوستی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ جب اس کے ہاتھ روسی سپاہی لگتا ہے تو ترکی سپاہ کے حسن سلوک سے متاثر ہو جاتا ہے[14]۔ اس کے علاوہ جب ترکی سپاہیوں کو روسی رہا کرتے ہیں تو وہاں کی عورتیں ان کے ساتھ جانے پر بضد ہو جاتی ہیں۔

> روسی اس وقت بہت ہی جھینپے جب ریل کے اسٹیشن پر ستر اسی جوان اور نوخیز لیڈیاں نکھر نکھر کر ڈٹ گئیں اور کہا کہ ان ترکوں کے ساتھ ہمیں بھی جانے دو۔ ہمارا ان پر دل آیا ہے۔ بعض بعض ڈاڑھیں مار مار کر روئیں اور اکثر آبدیدہ ہو گئیں ان ترکوں کے دل کی اس وقت عجیب کیفیت ہو گئی[15]۔

یوں تو عام ہندوستانی مسلمان ملت اسلامیہ اور بالخصوص سلطنت عثمانیہ کی آزادی کی خاطر اپنے اندر والہانہ جذبہ رکھتا ہے، تاہم فسانہ آزاد کی ہیروئن حسن آراء اور اس کا ہیرو آزاد اس مقصد کی راہ میں جاں بکف ہیں۔ حسن آراء آزاد پر سو جان سے فدا ہے مگر خلافت عثمانیہ کی سلامتی اور آزادی اسے بھی عزیز ہے[16]۔ جنگ روم و روس میں آزاد کی شرکت اور حسن آرا کا اس دلچسپی لینا، ہندوستانی معاشرے میں خواتین کا سیاسی حالات سے باخبر ہونا بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس جنگ میں ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے علماء نے جب ترکوں کی امداد کی درخواست کی تو خواتین نے خلافت عثمانیہ کی امداد میں اپنے زیور تک دے ڈالے تھے۔ آزاد اس جہاد کی خاطر میدان عمل میں نکل پڑتا ہے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہوئے وہ حسن آراء کو جو خط لکھتا ہے وہ اس وقت کے مسلمانوں کی آرزوؤں کا مظہر ہے۔

> میں کچھ اس وجہ سے روم جاتا نہیں ہوں کہ بہشت میں جگہ ملے۔۔۔ میں تو اس لیے جاتا ہوں۔۔۔ اپنے پیارے مسلمانوں کا ہاتھ بٹاؤں۔ اس کوشش میں چاہے آزاد مرہی کیوں نہ جائے مگر روم پر آنچ نہ آنے پائے[17]۔

اس جنگ میں شرکت کی وجہ سے آزاد کے کردار کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ ہندوستان میں تو وہ آزاد کم اور آوارہ زیادہ تھا۔ بانکا، تلنگا، عیار اور موقع پرست تھا[18] مگر اس نے اس جنگ میں جس طرح اپنی بہادری کا مظاہرہ کیا اس نے اسے پوری ملت اسلامیہ کا شہسوار بنا دیا تھا جو آزادی کی خاطر اپنی جان دینے سے گریز بھی نہیں کرتا۔ لہذا ایک قلعے کی حفاظت میں آزاد مصروف ہیں اور اپنی جواں مردی کا روسی افواج کے سامنے یوں مظاہرہ کرتے ہیں:

> ترکی اس قلعے کو نہ چھوڑتے۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ جب نوے ہزار روسیوں کے دریائے ڈینیوب کے

> اس پار آجانے کی خبر آئی تو اس قلعے کی فوج کو حکم ہوا کہ فوراً اس لشکر کی مدد کو آجائے۔ جس فوج کو روس سے لڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔۔۔ترکی فوج ظفر موج آن پہنچی اور سامان جنگ سب لیس تو روسیوں کے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی[19]۔

قومی وملی آزادی کا ایک موہوم سا تصور فسانہ آزاد سے اخذ ہوتا ہے۔ موہوم اس لیے کہ خلافت راشدہ کے بعد خلافت عثمانیہ اور ریاست کے تصورات باہم خلط ملط ہو گئے تھے۔ ترکی کا حکمران خلیفہ بھی تھا اور سلطان بھی[20]۔ پھر ہندوستان چوں کہ برطانوی سلطنت کے زیراثر تھا اس لیے رتن ناتھ سرشار کھل کر عثمانوی سلطنت کو مسلمانوں کی واحد مرکزی قوت گردانتے میں تامل کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر اس کہانی کے مخاطب چوں کہ مسلمان تھے اس لیے اس وقت کے قومی رجحان کو موضوع بنانا ان کے لیے شاید ضروری تھا۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود اس داستان میں آزاد ایک ایسا فرد تھا جو ملک وملت کی جنگ لڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور مسلمانوں کے تصور اتحاد اسلام کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ داستان سے اس کی مماثلت کے باوجود اسے داستان نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس میں خواب وخیال کی دنیا کی ترجمانی کے بجائے سرشار نے گردوپیش کی حقیقی زندگی بھی پیش کی ہے[21]۔

ناول:

اردو ناول نگاری میں عالم اسلام کے حالات کو ابتدا میں جن ناول نگاروں نے موضوع بنایا، ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو نوآبادیاتی ذہنیت سے روشناس کرایا جائے جو وہ اپنی نوآبادیاتی رعایا سے برت رہے تھے۔ اس لیے اردو میں ابتدا میں ان ناولوں کے تراجم پر خصوصی توجہ دی گئی جو نوآبادیاتی فکر کو عیاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ رینالڈس (George William Mac Author Reynolds) کے *Mysteries of the Court of Paris* یعنی دربار پیرس کے اسرار کے عنوان سے انگریزی ناول کا اردو ترجمہ غلام قادر فصیح نے ۱۸۹۸ء میں کیا۔ یہ ناول بھی اس عہد کے مسلم اور عیسائی نزاع کے علاوہ فرانس کے محلاتی سازشوں، وہاں عمال حکومت کی مسلم دنیا کے حوالے سے ہونے والی سازشوں کو بیان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ رینالڈس نے *Mysteries of the Court of London* کے نام سے ناول شائع کیا پھر اسی نام سے روس پر بھی ناول لکھا گیا۔ اس کے ایک حصے کا ترجمہ جو لندن سے تعلق رکھتا ہے مولوی ظفر علی خان نے بھی کیا تھا[22]۔ اس ناول کی اشاعت کے لیے ظفر علی خان

نے حیدر آباد سے ۱۹۰۶ء میں ایک ماہ وار رسالہ افسانہ جاری کیا جو تقریباً ایک سال تک نکلتا رہا۔ پھر ۱۹۰۴ء کے شروع میں حیدر آباد دکن سے دکن ریویو جاری کیا۔ اس میں بھی بالاقساط اسرار لندن شائع ہوتا رہا۔ بعد میں یہ ترجمہ تین جلدوں میں چھپا اور پھر نایاب ہو گیا[۲۳]۔

رینالڈس نے اپنے ناول میں فرانسیسی حکومت کی ان ریشہ دوانیوں کو بھی پیش کیا ہے جو وہ مسلم نو آبادیات پر کر رہے تھے[۲۴]۔ غلام قادر فصیح نے *Mysteries of the Court of Paris* کا ترجمہ نہایت سلیس انداز میں کیا ہے اس کے علاوہ غلام قادر فصیح نے ناول *Mysteries of the Court of Russia* از رینالڈس کا بھی اردو میں دربار روس کے اسرار کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ روس اور ترکی ۱۸۷۷ء میں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے اور روس دنیا میں اس وقت ایک عالمی قوت کے طور پر جانا جاتا تھا، اس لیے اردو زبان وادب میں روس کو کئی حوالوں سے دیکھا گیا۔ اس ناول میں ترکی اور روس کے مابین جنگ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے[۲۵]۔ ناول میں وزیر جنگ ترکی اور اس کے چالاک جاسوس کبروف کو باغیوں کا پتا لگانے کے لیے بھیجا جاتا ہے[۲۶]۔

غلام قادر فصیح نے رینالڈس کے تیسرے ناول دربار لندن کے اسرار جو *Mysteries of the Court of London* کا ترجمہ ہے اس ناول میں بھی رینالڈس نے لندن کے سرکاری معاملات کو موضوع بناتے ہوئے عالمی صورت حال میں انگریزوں کے کردار کو پیش کیا گیا ہے[۲۷]۔ مسلمانوں کو انگریزوں سے کبھی اچھی توقعات نہیں رہیں یہ ناول بھی چوں کہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور سازشوں کا پردہ چاک کرتا ہے اس لیے اسے غلام قادر فصیح نے اردو کا موضوع بنایا ہے تا کہ مسلمانان ہند کے سامنے تین بڑی طاقتوں کو بے نقاب کیا جائے۔

ان رجحانات کے علاوہ ان موضوعات کو ضرور دیکھنا چاہیے جو عام مذاق سے ہٹ کر تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں نے اس وقت مسلمانوں کے ملی احساس کو اردو میں جگہ دی، مگر کچھ لوگوں نے اس احساس کے خلاف بھی لکھا تھا اس لیے ان تحریروں کا بھی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ لہذا ایک ناول شہیدان گارتھیج بھی ہے جس میں ترکوں کے مظالم کو دکھایا گیا ہے۔ یہ ناول ایک مسیحی خاتون ویویہ پرپیتوا کے حالات پر مبنی ہے۔ اس میں قدیم زمانے میں رومی سلطنت نے جو عیسائیوں پر ظلم وزیادتیاں کی تھیں اس کو بیان کیا ہے[۲۸]۔ اس ترجمے کو بھی تحریک اتحاد اسلامی کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ الگ

بات ہے کہ اس میں سلطان روم کے کردار کو ایک ظالم کے طور پر پیش کیا گیا۔

منشی موہن لال نے انقلاب قسطنطنیہ نامی ناول لکھا۔ اس ناول کے علاوہ انھوں نے سیلاب خون، محاصرہ پیرس نامی ناول بھی لکھے تھے۔ انقلاب قسطنطنیہ میں انھوں نے ترکوں اور اتحادیوں کے جان توڑ مقابلوں کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ ناول اس وقت تازہ ترین واقعات کی قلمی تصویر پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ساتھ ہی مصنف نے عشقیہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔[۲۹] ناول کا مرکزی کردار رامز طہماز سے اتحاد بین المسلمین کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> رامز: تمھاری رائے بہت صائب ہے اسلامی دنیا ہم خیال ہو کر ایک ہو جائے تو ہو سکتا ہے۔
> طہماز: مگر ہونا ہی محال ہے۔
> رامز: ہم خیال ہونا کیا معنی، ضرور ہوں گے۔ جب ہماری عدل وانصاف کی گردن پر کند چھری چلائی جارہی ہے، جب ہزاروں معصوم ترکی عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کے خون آلود اعضاء دکھائی دے رہے ہیں، جب خون آشام سنگ دلی سے ترکوں پر ظلم کیا جارہا ہے تو کیا ان کی بے چینی اور اضطرابی کا اثر برقی روشنی کی طرح اسلامی دنیا میں پہنچنا محال ہوگا[۳۰]۔

منشی موہن لال کا ناول سیلاب خون ۱۸۵۷ء کے عبرت ناک واقعے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارکان کے رویے کی بھی پردہ کشائی کرتا ہے۔ اس ناول میں چند فرانسیسیوں اور انگریزوں کی انقلاب انگیز کارروائیوں کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی میں باقر خان، جو انگریزوں کا جاسوس تھا، اس کی حیرت انگیز سراغ رسانی کے حالات بھی موجود ہیں[۳۱]۔

۱۹۱۴ء میں ایک اہم ناول نازنین مراکش لکھا گیا۔ اس ناول میں مراکو میں سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی اور یورپ پرستی کے منظر کو دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی فرانسیسیوں کی سیاسی چالوں اور اس کی بدولت مراکو میں خانہ جنگیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس پر تاریخی انداز سے نظر ڈالی گئی ہے۔

ناول میں فرانس کی دورخی پالیسی کو بھی پیش کیا گیا ہے جس سے نوآبادیاتی ذہن کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیوں کہ فرانسیسیوں نے عبدالعزیز کی کھلم کھلا حمایت جاری رکھی ہوئی تھی تو دوسری جانب باغیوں کی بھی پیٹھ ٹھونکنے کا کام در پردہ انجام دیا۔ اس ناول میں یہودی النسل فرانسیسی جاسوس کی عیارانہ چالوں کا نقشہ نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس جاسوس نے محب وطن کا روپ دھار کر ایسی چالیں چلیں اور نہایت حکمت کے ذریعے مسلمانوں میں پھوٹ پیدا کی۔ جس کے نتیجے میں قتل وغارت گری کا ایک طوفان

برپا ہوا۔اس ناول میں اس غارت گری کے نہایت دل شکن واقعات بیان کیے گئے ہیں مسلمانوں کا یہ ملک کس طرح فرانسیسی عمل داری میں آیا اس کی پوری داستان اس ناول کا حصہ ہے۔منشی محمد مبین نازش بدایونی کا یہ ناول یورپی سازشوں کا تاریخی خاکہ پیش کرتا ہے اس ناول کے ذریعے انیسویں صدی میں یورپ کی سازشی ذہنیت کو بھی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے[۳۲]۔

میر ارشاد علی کا ناول یوسف پاشا جس میں اسلامی تہذیب، ترکوں کی شجاعت وشرافت کا خوب صورت مرقع پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی وہ یورپ جسے مدعیان تہذیب ہونے کا دعویٰ ہے اس نے کس طرح درپردہ طور پر اس عظیم سلطنت پر ڈاکہ زنی کی اس کی پوری تاریخ اس ناول میں موجود ہے[۳۳]۔

اردو ادب کا سرمایہ ایسی شخصیات سے پُر دکھائی دیتا ہے جنھوں نے انیسویں صدی میں اتحاد بین المسلمین کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔اردو کے ادیبوں نے یورپ کی جارحانہ پالیسی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اسلامی ممالک میں ان افراد پر بھی ناول لکھے جنھوں نے ملک وملت کی جاری جنگ میں اپنے کردار کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دیے۔عربی زبان میں محمد علی پاشا پر نسیب آفندی نے ناول لکھا، اس کا ترجمہ محمد بشیر منڈیالوی نے مولوی انشاء اللہ خان کے کہنے پر کیا تھا[۳۴]۔

سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے تراجم کے علاوہ ترکی کے مشہور اور مقبول ناول نگار احمد مدحت کے ایک ناول سر کیشیا کا ترجمہ بھی کیا۔یہ ناول کوہ قاف اور سرکیشیا کے رسم ورواج اور وہاں کے عجیب و غریب مناظر کے ذکر سے پُر ہے۔احمد مدحت کا یہ ناول ترکوں کی ناول نگاری کی قابلیت کا موثر اظہار ہے[۳۵]۔اس ناول میں ترکوں کی عالم اسلام سے دلی وابستگی کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

۱۹۰۶ء میں یلدرم نے تین ترکی ناولٹ زہرا، ثالث بالخیر اور مطلوب حسینہ کے ترجمہ کیے، جن کو کالج بکڈپو علی گڑھ نے شائع کیا۔زہرا ثروت وفنون گروپ کے جواں ادیب بنی زادہ ناظم کا مختصر ناول تھا۔اس کے متعلق مخزن جنوری ۱۹۰۳ء میں ایک مختصر نوٹ چھپا۔اس مختصر نوٹ میں لکھا ہے کہ: ''سید سجاد حیدر بی۔اے علی گڑھ کالج نے جو کوشش کی ہے اردو لٹریچر کو ترقی دینے کی بذریعہ ترکی کتابوں کے ترجموں کی ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔اس ناول میں ترکی محاورات کو ایک حد تک قائم رکھنے کا التزام کیا گیا ہے تاکہ ترکوں کا انداز تحریر معلوم ہو جائے''[۳۶]۔مارچ ۱۹۰۳ء کے مخزن میں غلام بھیک نیرنگ کا تنقیدی مضمون اسی ناولٹ کے متعلق بعنوان اردو زبان اور افسانہ نگاری چھپا۔زہرا سجاد حیدر یلدرم کا

عمدہ ناول ہے۔اس ناول میں ڈرامے کی طرز پر مکالمہ نویسی کا دقیانوسی طریقہ بھی موجود ہے۔اگر دیکھا جائے تو ناول میں مکالمہ نویسی کا چلن اردو ادیبوں جن میں نذیر احمد، سرشار اور ہادی رسوا کے یہاں بھی موجود ہے[۳۷]۔

ممحی خانم عہد عثمانوی کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں۔انھوں نے ترک عورتوں پر اپنے خیالات کے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ان کا ایک مضمون ایک ترکی خاندان اور اس کی گذشتہ و موجودہ حالات ترکوں کی معاشرتی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون کا بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا۔اس مضمون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترکوں میں قدیم روایات کو ترک کر کے جدید رجحانات کس طرح معاشرے میں پروان چڑھ رہے تھے[۳۸]۔

جدید اردو ناول نگاری میں عبدالحلیم شرر کے نیم تاریخی ناولوں کو جو مقام حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور ناول نگار کے حصے میں آئی۔شرر ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے ان کے ناولوں نے مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کی اہمیت سے روشناس کرایا[۳۹]۔تاریخ سے خاص دل چسپی کی بناء پر انھوں نے اپنے فن کو ان مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک کی سیاحت نے شرر میں اسلامی عناصر کو مزید بے دار کر دیا۔دوران سیاحت شرر نے والٹر اسکاٹ (Walter Scott) کے تاریخی ناول جس میں عربوں کا مذاق اڑایا گیا اور عیسائیت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی تھی، ان ناولوں کے مطالعے نے شرر کے مذہبی جوش میں اضافہ کر دیا انھوں نے اسی جذبے کے تحت والٹر کی رد میں مسلمانوں کے تاریخ کے احیاء کے خیال سے اسلامی ناول لکھنا شروع کیا[۴۰]۔انھوں نے قوم کو اسلاف کے کارناموں کی یاد اس لیے بھی دلانی چاہی کہ مسلمان قوم جس کرب اور بے یقینی کی صورت حال سے گزر رہی تھی اس سے نکل کو اپنی ملی شناخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔

شرر کا کہنا تھا کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے جو دنیا میں محبت کی حکومت قائم کرنے آیا ہے۔اس کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلافات و تعصبات کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا ہے۔اس نے فقر میں خودداری اور جدوجہد میں فیاضی اور سخاوت، خداترسی اور حق شناسی سکھائی ہے۔اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا ہے۔اسلام کی برکت سے مسلمانوں نے فکر و عمل کو حاصل کر کے اپنا نام اور مقام بنایا مگر ملت اسلامیہ میں موجودہ نااتفاقی کی وجہ سے جو بحران پیدا ہوا ہے اس نے افراد اور

جماعتوں کے تعلقات میں توازن ختم کر دیا ہے عمل کی جگہ جمود اور بے حسی کا دور دورہ ہے[41]۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں پائی جانے والی بے عملی کو ختم کرنے کے لیے اور روشن مستقبل کی جدوجہد پر آمادہ کرنے کے لیے شرر نے اپنے رسالے دلگداز میں تاریخی ناول لکھنا شروع کیا۔ جس میں مسلمانوں کے عظیم کارناموں کو پیش کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو تحرک پر آمادہ کیا۔ ان کا پہلا ناول ۱۸۸۸ء میں رسالہ دلگداز میں قسط وار ملك العزيز و رجنا کے نام سے چھپنا شروع ہوا۔ اسی ناول سے اردو زبان میں صحیح معنوں میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز ہوا[42]۔ اس ناول کا موضوع تیسری صلیبی جنگ ہے جس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو دلچسپی تھی۔ شرر نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کی عظمت کو دہرا کر کئی حیثیتوں میں مسلمانوں کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے خواہاں تھے وہ اپنے ناول کے ذریعے مسلمانوں میں حمیت اسلام کو زندہ کرنا چاہتے تھے[43]۔

عبدالحلیم شرر کا دوسرا ناول حسن انجلینا ۱۸۸۹ء میں دلگداز میں قسط وار شائع ہوا۔ شرر کے مطابق اس ناول کا زمانہ جنگ کریمیا کے بعد ۱۸۷۶ء کا ہے جب روس نے صلح نامہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحر اسود میں اپنے بحری بیڑے کا عمل دخل بڑھانا شروع کر دیا تھا[44]۔ حسن انجلینا ایسا ناول ہے جس میں بیک وقت تین مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اول اس میں حسن اور انجلینا کے ہجر وصال کا بیان ہے دوسرا ایرانیوں اور ترکوں کے شیعہ سنی اختلافات کے باعث مجموعی طور پر جو انتشار کی کیفیت تھی اس کا بیان ہے، تیسرا روسیوں کے خلاف چند محاذوں پر ترکوں کی شجاعانہ بہادری کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں شرر نے دوسرے اور تیسرے مقصد کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ غالباً ان کا مقصد سنی، شیعہ اختلافات کے برے نتائج اجاگر کر کے قوم کو فروعی اختلافات سے بچانا اور باہمی اتحاد کا درس دینا تھا[45]۔

شرر نے ۱۸۸۹ء کے رسالہ دلگداز میں اس ناول کے بارے میں خود لکھا تھا کہ " دلگداز کے ساتھ اس سال جو ناول شروع کیا گیا تھا وہ بھی اب پورا ہو گیا جس کا نام شہزادہ حسن اور انجلینا ہے۔ اس ناول کے ذریعے زیادہ اسی امر پر زور دینا مقصود تھا کہ شیعوں اور سنیوں کے باہمی تعلقات کا نمونہ دکھایا جائے اور ان خرابیوں کو ظاہر کر کے موقع دیا جائے کہ ہر شخص اس ناول کو ملاحظہ کرنے بعد اپنے باہمی تعلقات کو عمدہ اور شائستہ بنائے۔ اس امر میں ہم کو بے شک کامیابی ہوئی اور ہم نے بتا دیا کہ ایک دوسرے کی عداوت سے کیسے خراب نتیجے پیدا ہوتے ہیں"[46]۔

شرر کے تقریباً ناولوں کا موضوع اسلامی واقعات پر مبنی ہے انھوں نے اپنے ناول میں جذبات و کیفیات سے کام لیتے ہوئے مسلم قوم کی داستان عروج و زوال کو بیان کیا۔۱۸۹۰ء میں دلگداز میں منصور موہنا شائع ہوا جس کا موضوع محمود غزنوی کے حملہ ہندوستان کے پس منظر میں اجمیر کے ایک راجہ کی لڑکی اور ایک مسلمان سردار منصور کی داستان محبت بیان کی گئی ہے[۴۷]۔اس ناول کے ضمنی واقعات میں محمد بن قاسم کے عہد کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے[۴۸]۔اس ناول کا انجام المیہ انگیز ہے۔اسی سال شرر نے ایک تاریخی رسالہ مہذب کے نام سے جاری کیا۔جس میں اسلام کی مشہور ہستیوں کی سوانح عمریاں شائع ہوئیں مگر اس رسالے کو ایک سال کے اندر ہی مالی مشکلات کی وجہ سے دم توڑنا پڑا[۴۹]۔

شرر لکھنوی کا سب سے اہم ناول جسے تاریخی ناولوں میں انفرادیت کا درجہ حاصل ہے وہ فردوس بریں ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخی واقعے پر مبنی ہے جو مسئلہ خلافت کے اختلاف پر پیدا ہو گیا تھا اور اسی مسئلے کی وجہ سے اسلام میں فرقہ بندی کی بنیادیں مضبوط ہوئیں[۵۰]۔اس ناول میں فرقہ باطنیہ کے عروج کے آخری دور کے کئی اہم ماخذ کو مدنظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔اس فرقے کے نظریات مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے کافی مہلک ثابت ہوئے[۵۱]۔اس ناول کی مقبولیت صرف ادبی حلقوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اسے مذہبی طبقے میں بھی پسند کیا گیا۔اردو زبان سے وابستہ مختلف طبقہ ہائے زندگی کے لوگوں نے شرر کے اس طلسماتی واقعات سے بھری ہوئی کہانی سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔یہ ناول بقول علی عباس حسینی شرر کے کوہ خزف میں کوہ نور کی حیثیت رکھتا ہے[۵۲]۔

فلورا اور فلورنڈا شرر کا ایک ایسا ناول ہے جسے ۱۸۹۳ء میں انھوں نے لکھنا شروع کیا مگر رسالہ دلگداز اسی سال بند ہو گیا اور شرر یورپ کے سفر پر چلے گئے اس ناول کو انھوں نے ۱۸۹۹ء میں یورپ کی واپسی پر مکمل کیا۔اس ناول میں انھوں نے اندلس کے اسلامی دور کے عروج کی منظر کشی کی ہے اور اسلام کے خلاف سازشوں میں راہبوں اور پادریوں کے کردار کو دکھایا ہے۔علاوہ ازیں راہبوں کی بدکاریوں کے متعلق بھی اہم چیزیں پیش کی گئی ہیں[۵۳]۔

شرر ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے لیکن بعد میں ہندوؤں کے طرز عمل سے مایوس ہو کر ہندوؤں سے مسلمانوں کے علاقوں کی علیحدگی کو ضروری سمجھنے لگے تھے[۵۴]۔مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں سے پورے طور پر واقف تھے اور اصلاح کی خواہش بھی رکھتے تھے۔اسلام کے احیاء کا

جذبہ ان کے ناولوں میں موج زن ہے۔ اسی جذبے کے تحت فتح اندلس نامی ناول ۱۹۰۴ء میں لکھا۔ جس میں اندلس میں مسلمانوں کی آمد اور وہاں کی صدیوں کی اسلامی حکومت کے قیام کی پوری تفصیلات ملتی ہیں [۵۵]۔

اصل میں ان ناولوں کو نو آدیاتی ہندوستان میں اس لیے پیش کیا گیا کہ مسلمان قوم جس انحطاط کا شکار ہے وہ اپنے اسلاف کے ان کارناموں کو دیکھ کر جدوجہد کے راستہ پر دوبارہ چل پڑے۔ شرر لکھنوی اور ان کے دور کے دیگر اہل قلم نے جس طرح اصلاحی کام کا آغاز کیا اس میں یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی عمدہ روایات کا اعادہ کیا جائے ورنہ فاتح قوم کی تہذیب جس تیزی سے ان میں سرایت کر رہی تھی اس کو روکنا مشکل ہو جاتا۔

تحریک اتحاد اسلامی نے ترکی تراجم کے ذریعے اردو زبان میں افسانوی ادب کی روایت میں اسلامی عناصر کو شامل کرنے کا جو انداز اپنا وہ ہمیں شرر کی ناول نگاری میں دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستانی دانش وروں کا رجحان اگر اتحاد اسلامی کی تحریک سے متاثر نہ ہوتا تو اردو کے افسانوی ادب میں اسلامی عنصر کی اثر پذیری کا اتنا گہرا نقش ابھر کر سامنے نہیں آتا۔

مارماڈیوک پکھتال (Marmaduke Pickthall) بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے انھوں نے جنگ عظیم اول کے تعلق سے کئی ناول لکھے۔ ان کا ایک ناول *The Early Hours* کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا ترجمہ مولانا مظہر الدین نے صبح ترکی کے نام سے کیا تھا۔ ترکی، مصر و شام کے طویل سفر، مسلمانوں کی زندگی کے عمیق مطالعے اور ان میں موجود سیاسی، سماجی اور نفسیاتی کیفیات جو نو آبادیات کے تسلط کی وجہ سے ان کے ذہنوں پر قائم ہوئیں، ان تمام مشاہدات و تاثرات کا خاکہ اس ناول میں پیش کیا گیا [۵۶]۔ صبح ترکی محض ایک دل کش ناول نہیں ہے بلکہ اس میں ترکی کے تاریخی انقلاب، معاشرت، اخلاق، شجاعت، صداقت، تمدن، طریقہ جنگ اور ولولہ جہاد کی نہایت عمدہ انداز میں تفصیلات ملتی ہیں۔ اس ناول کے پہلے باب کا آغاز ہی جہاد سے شروع ہوتا ہے۔ ناول کا ہیرو قمر الدین اپنے گھر کے پاس ایک ثمر دار درخت کے نیچے جو اس موسم میں پھولوں سے لدا ہوا ہے بیٹھا ہوا اپنی گائے ابلق کو چرا رہا ہے اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھتی ہے اور صدائے انقلاب کی صبح نمودار ہونے لگتی ہے۔ اس ناول کے تمام تر پہلوؤں میں مصنف نے جذبہ جہاد کو پروان چڑھانے کے لیے جذباتیت سے کام لیا ہے۔

مثلاً ناول کا ہیرو قمر الدین کہتا ہے کہ:

> ہم نے اللہ کی وحدانیت کی قسم کھائی ہے کہ ہم اپنے آبائی وطن کو نجات دلانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ قوم تم سے یہ امید رکھتی ہے کہ تم عثمانی بہادری کی ایک روشن مثال قائم کرو، ایسی مثال جو قرن ہا قرن تک قابل تقلید رہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو کہ اپنے مکانات کو اس وقت تک نہ دیکھو جب تک کہ تمھارا ملک محفوظ و مامون نہ ہو جائے، تم اس کے لیے تیار ہو کہ اپنے ملک کے لیے خوشی سے گردنیں کٹاؤ[۵۷]۔

افسانہ:

ان ناولوں کے علاوہ اردو افسانے میں بھی اتحاد اسلامی کے واضح اثرات موجود ہیں۔ اردو افسانے کی روایت کو مستحکم کرنے میں ترکی افسانوں کے تراجم کا عمل دخل کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سجاد حیدر یلدرم اردو میں اس حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ترکی کے ادبی رجحانات کو اردو زبان میں متعارف کروایا۔ وہ خود بھی ترکوں سے بے حد متاثر تھے۔ ترکی ادب سے ان کی واقفیت اور دلچسپی نے سر سید احمد خان کی خشک عقلیت پرستی میں رومانویت کا ایک نیا دور شروع کیا[۵۸]۔ یلدرم ترکی ادب میں نامق کمال بے سے متاثر تھے۔ انھوں نے رسالہ معارف اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ترکی ادب کے نئے دور کے بانی پر ایک مضمون لکھا جو نامق کمال بے پر تھا[۵۹]۔ نامق کمال بے نے مشرق و مغرب کے اسلوب کو ملا کر ترکی ادب میں ایک نیا انداز ایجاد کیا تھا جس سے یلدرم خاصے متاثر ہوئے اور یہی اسلوب ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے[۶۰]۔

رسالہ معارف میں ترکی مضامین کے عربی تراجم مغربی اخباروں سے مولوی عبد العلی خان اور مولوی عزیز الرحمٰن بہاول پوری کیا کرتے تھے جب کہ ترکی سے ترجمہ کرنے کا کام حاجی اسمٰعیل خاں اور ان کے شاگرد سجاد حیدر یلدرم کیا کرتے تھے[۶۱]۔ اسی رسالے سے سجاد حیدر یلدرم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ترکی سے ہندی مسلمانوں کو جو مذہبی عقیدت تھی اور مسلمان دانش وروں نے اس سے جس عقیدت کا اظہار کیا تھا، اس کی وجہ سے ان برطانوی ناولوں کا اردو میں ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا جس میں جنگ و جدل کو خاص موضوع بنایا جاتا تھا۔ ان میں ایک ناول عمر پاشا فاتح کریمیا بھی ہے جسے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا[۶۲]۔ ان جیسے ناول جو اردو میں ترجمہ ہوئے وہ ادبی لحاظ سے دوسرے درجے کے ہوتے تھے۔ لہٰذا سجاد حیدر یلدرم نے اردو کی ناگفتہ بہ حالت پر اکتوبر ۱۸۹۸ء میں معارف میں ایک مضمون لکھا جس میں

انھوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ ان دوسرے درجے کے ناولوں کے سیلاب کی روک تھام کے لیے معارف میں ہر ماہ ایک عدد پاکیزہ یعنی ترکی ناول بالاقساط پیش کیا جائے گا لہذا دسمبر تا جنوری ۱۹۰۰ء میں بہشت شداد نامی ناول جس کا ترکی سے اردو ترجمہ حاجی اسمٰعیل خاں نے کیا، پیش کیا گیا [۶۳]۔ سجاد حیدر یلدرم نے اردو میں نشے کی ترنگ کے عنوان سے پہلی بار ترکی زبان کے افسانے کا ترجمہ پیش کیا۔ اسے رسالہ معارف اکتوبر ۱۹۰۰ء کے شمارے میں پیش کیا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے اس کی صراحت میں لکھا تھا کہ ''حتی الوسع ترکی طرز بیان اور ترکیب عبارت کا خیال رکھا گیا ہے'' [۶۴]۔

اسی طرح ثالث بالخیر احمد حکمت مفتی اوغلو کا ڈراما ہے۔ یلدرم نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ثالث بالخیر ایک ایسی کہانی ہے جو ترکوں میں روایتی اقدار کی تبدیلی پر طنز کرتی ہوئی نظر آتی ہے اس میں موجود کردار مشرقی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس لیے اس کہانی کا کردار اور دیگر لوگوں کی طرح نمائش سے گریز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ احمد حکمت اوغلو کی یہ کہانی یورپ پرستی پر چوٹ کرتی ہوئی نظر آتی ہے یلدرم نے اسے اردو میں منتقل اس لیے کیا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی روایتی اقدار کا تحفظ کر سکیں۔

یلدرم کے اردو ترجموں سے منتقل ہوتی ہوئی ترکی روایات کو دیگر مصنفین نے بھی اپنایا [۶۵]۔ یلدرم کے تو راست ترکی کے لکھنے والوں سے روابط تھے اور نامق کمال بے کے اثرات انھوں نے اپنے اسلوب میں جذب کیا [۶۶]۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں انھوں نے ۱۹۲۰ء میں شعبہ اردو قائم کیا اور اس کے ساتھ ترکی پڑھانے کا بھی انتظام کیا جس میں مدرسی کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتے رہے [۶۷]۔

ترکوں سے بے پناہ محبت وانسیت کے نتیجے میں انھوں نے ترکی کی ادبی تحریروں اردو ترجمے کے ذریعے منتقل کیا ان تحریروں کے علاوہ ترکوں پر دول یورپ سے ہونے والی ہنگامہ خیزی کو انھوں نے جب بھی سنا اپنی بے کلی کا اظہار کیا ہے۔ جنگ بلقان کے دوران ۵/جون ۱۹۱۳ء میں انھوں نے محاربہ بلقان کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

> اسلام کے لیے اس لڑائی کو پچھلے سو برس بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ زمانہ کی سب سے بڑی فلاکت سمجھتا ہوں۔ ۱۸۴۸ء کی جنگ روم وروس میں بھی اسلام کو سخت ضربہ پہنچا تھا۔ لیکن وہ اسلام کو اکھاڑ دینے والے دھکے کے مقابلے میں بہت کم تھا [۶۸]۔

انھوں نے مزید لکھا کہ:"اس معرکے میں پیکر اسلام بے جان تو نہیں ہوا مگر اس سے بڑھ کر ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ مسلمان اپنی عزت نفس کھو بیٹھے اور کتنے دل ہیں جو اسی فلاکت کی وسعت اور اس زخم کی گہرائی کا اندازہ کر سکتے ہیں"[۶۹]۔ یلدرم نے ترکوں کی جنگ کو اسلامی تاریخ کی عظیم جنگ کے مترادف قرار دیا اور یورپی کردار پر افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> اس مرتبہ رنگ بالکل دوسرا تھا علی الاعلان مسلمانوں کے خلاف مذہبی جذبات برانگیختہ کیے جاتے تھے۔ ان کے مصائب سن کر یورپ کے چہرے پر مسرت کی سرخی آتی تھی[۷۰]۔

یورپی اخبارات کا کردار دیکھ کر یلدرم نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ:

> اس لڑائی کے زمانے میں تمام یورپ کے اخباروں میں جہاں جہاں کارٹون نکلے، ایک بھی ہمدردی کا نہ تھا۔ بلکہ استہزاء، ہنسی اور سلطنت عثمانیہ کی شکستوں پر بغلیں بجانے کا ہے[۷۱]۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے ذہنوں سے ترکی کا طلسم کم ہو گیا تھا مگر یلدرم کے ذہن نے کبھی اسے فراموش نہیں کیا[۷۲]۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کے روز خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر اسی سال یلدرم نے انگلستان، یورپ اور ترکی کی سیاحت کی اور اس سیاحت میں انھوں نے ترکوں کے ساتھ ایک بار پھر اپنی دیرینہ وارفتگی کا اظہار کیا[۷۳]۔

یہاں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ اردو افسانوں کے آغاز و ارتقاء میں انگریزی افسانوں کے اثرات علاوہ ترکی افسانہ نگاروں کے اثرات بھی اردو کے تخلیق کاروں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں سجاد حیدر یلدرم کی رفیق حیات نے بھی یلدرم کے نقطہ نظر کو تقویت پہنچائی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ عراق، ایران اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں میں گئیں اور ترکی زبان بھی سیکھی۔ انھوں نے اصلاح خواتین کے لیے ناول لکھے۔ جس میں ثریا کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے ناول نجمہ میں مغرب کی کوری تقلید کا خاکہ اڑایا گیا ہے جب کہ جان باز ایک ایسی تخلیق ہے جس میں نذر سجاد نے اپنے ملک کی سیاسیات کا ذکر کیا ہے۔ جان باز کا پس منظر خلافت اور عدم تعاون کی تحریک پر دکھائی دیتا ہے[۷۴]۔

نذر سجاد کے یہ ناول اس طبقے کے پس منظر کی بہت عمدہ عکاسی کرتے ہیں جس نے پچھلی صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے بالائی طبقے کی طرح مغربی تہذیب اختیار کرنی شروع کر دی تھی[۷۵]۔ چوں کہ یلدرم قدیم وابستگیوں کو عزیز رکھتے تھے اور مشرقی روایات پر فخر کرنا اور ترکی کی تہذیب سے جو خصوصی شغف ان میں تھا اس نے ان کی تصانیف کو یورپی لیبل سے بچا کر ترکی لیبل میں

ڈھال دیا۔

یلدرم نے جولائی ۱۹۰۱ء میں خلیل رشیدی کا افسانہ جواب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ افسانہ خودکلامی پرمبنی ہے اور اس میں رومانیت بہت زیادہ حاوی دکھائی دیتی ہے۔ صحبت ناجنس بھی احمد حکمت اوغلو کی ترکی کہانی کا ترجمہ ہے مگر اسے یلدرم نے ہندستانی رنگ میں ڈھالا ہے۔ احمد حکمت اوغلو کی ایک اور کہانی خارستان و گلستان کو بھی یلدرم نے اردو کے ماحول میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی ایک بڑھیا عورت کی ہے جو مردوں کے ظلم وستم سے تنگ آ گئی تھی۔ لہذا اس نے اپنی پانچ سالہ بچی نسرین کو ایک جنت نما جزیرے گلستان میں لے جا کر پالنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف ایک اور جزیرہ ہے خارستان جہاں ایک لڑکا بچپن سے ایک کشتی کے غرق ہو جانے کی وجہ سے پرورش پاتا ہے کہانی کا اختتام یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی آپس میں مل جاتے ہیں۔ یلدرم نے اس کہانی کو بھی ہندوستانی ماحول میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اس میں مناظر بھی تبدیل کر دیے ہیں[۷۶]۔

یلدرم کی طرح راشد الخیری نے بھی اتحاد اسلامی کے زیر اثر کئی افسانے لکھے ہیں۔ ان کی ایک کہانی شہید مغرب رسالہ تمدن فروری ۱۹۱۲ء میں چھپی۔ یہ کہانی دراصل ترکی کی اندرونی و بیرونی سیاست کا آئنہ دار ہے۔ اس کہانی میں راشد الخیری نے ترکی خواتین میں جو انقلاب برپا ہوا اس کو بھی خاص موضوع بنایا ہے انجمن اتحاد ترقی اور ترکی کے نام ور لوگوں کی کارگزاریاں بھی اس افسانے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ خواتین میں روشن خیالی کے حوالے سے راشد الخیری لکھتے ہیں کہ:

> اس میں شک نہیں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی آزادی نسواں کی گھٹا ترکی پر بھی چھا گئی۔ قسطنطنیہ کے بازار قسم کھا سکتے ہیں کہ پچھلی صدی میں سوا خاص ضرورتوں کے کبھی کسی جوان یا حسین عورت کے قدموں سے آشنا نہ ہوئے[۷۷]۔

بہر حال اس کہانی میں ترکی کو مغربی قوتوں سے برسر پیکار دکھایا گیا ہے اور کہانی میں راست ان کرداروں کو جو کسی نہ کسی حوالے سے مغربی قوتوں سے معرکہ آرا ہیں ان کے اصل نام لیے گئے ہیں۔ اس کہانی میں سلطان عبدالحمید کی معزولی کا ذکر بھی موجود ہے جس کے بارے میں ملی جلی رائے ہندوستان کے مسلم دانش وروں میں پائی جاتی ہے، لکھتے ہیں کہ:

> سلطان عبدالحمید معزول ہو کر سالونیکا پہنچے انجمن اتحاد و ترقی کا دور دورہ ہو گیا۔ غازی انور کے گیت گائے جانے لگے قسطنطنیہ کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا[۷۸]۔

راشد الخیری اس انقلاب کو ترکی کے حق میں بہتر سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اتحاد اسلامی سے متاثر تمام تر ہندوستانی دانش وروں نے اس انقلاب کو ترکی کے حق میں بہتر جانا۔ اسی طرح ان کی ایک اور کہانی دو آسمانی مسافر جنگ طرابلس کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ راشد الخیری نے اس افسانے میں طرابلس کے مسلمانوں کی غم انگیز تصویر کشی کی ہے اور یورپ کی مذمت کرتے ہوئے اسے سنگ دل اور ظالم قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> سرزمین طرابلس کا ہر ذرہ اور طرابلس پر چھایا ہوا آسمان قیامت تک خون کے آنسو روئے گا۔ ان معصوموں پر جو اطالیہ کے ظالم ہاتھوں نے ماں کی گود سے جدا کر دیے اور نخلستان میں ان کی لاشیں بے گور و کفن سڑتی رہیں [۷۹]۔

افسانوی انداز میں راشد الخیری نے اٹلی کے ظلم و بربریت کی مذمت بھی کی تھی اور ہندوستانی مسلمانوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان واقعات میں جو عکس آپ لوگ دیکھ رہے ہیں وہ طرابلسی مسلمانوں پر اطالیہ کے ہاتھوں پیش آ رہا ہے مگر ان نخلستانوں میں جہاں کارزار طرابلس برپا ہے ہر حصے سے آہ و فغاں کی آوازیں آ رہی ہیں اور مغرب کے رویے پر قہقہے کی صورت برس رہی ہیں [۸۰]۔

شہید طرابلس میں عورتوں کو موضوع بناتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ آج جس طرح طرابلس میں عورتوں کے سہاگ لٹ رہے ہیں اسی طرح میں نے ۱۸۵۷ء میں بھی قیامت خیز مناظر کو پڑھا ہے۔ یہ کہانی ارجمند بانو پر لکھی گئی ہے اور اطالیہ کے ظلم و جبر سے اس عورت نے کیسے مقابلہ کیا اس کو پیش کیا گیا ہے [۸۱]۔ راشد الخیری کا افسانہ طرابلس سے ایک صدا بھی ایک مسلمان عورت کی کہانی بیان کرتا ہے جو طرابلس کے ایک پہاڑ پر کھڑی ہوئی تھی اس نے اسی پہاڑی چوٹی پر کھڑے ہو کر پیغام جہاد اور اطالیہ کی فوجوں کے ظلم و جبر کی داستان سنائی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ:

> ہندوستانی مسلمانو! اس لیے اور صرف اس لیے کہ میں بھی تمھارے کلمہ شریک ہوں اگر تمھارے لحاف اور توشکیں اجازت دیں تو میری حالت ذرا دیکھ لو بھائیو! برس کا برس کا سن ایک دور افتادہ بہن کی مبارک باد قبول کرو، وہ بہن جس کی ایک چھاتی سے خون اور دوسری سے دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ دودھ ان بچوں کی یادگار ہے جو مہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر لوٹے اور جو طرابلس میں میرے حکم سے کلمہ طیبہ کی حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے [۸۲]۔

ان کی کہانی روضہ اطہر پر ایک عرب سیدانی میں مقدس مقامات کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی اس زمانے میں لکھی گئی جب عالم اسلام کے مسلمان اس خوف میں مبتلا تھے کہ نو آبادیاتی قوتیں

ان کے مقدس مقامات کوتاراج نہ کر دیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اس حوالے سے کافی تشویش پائی جاتی تھی اور انھوں نے اس اقدام سے یورپی قوتوں کو روکنے کے لیے انجمن خدام کعبہ کی تحریک کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ راشد الخیری کی کہانیوں میں مسلمان عورتوں کا کردار ملی اور شعوری لحاظ سے کافی توانا دکھائی دیتا ہے اس لحاظ سے افسانہ ماما ترکن میں بھی ترک عورتوں کی اسلام سے وابستگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ماما ترکن جو ہندوستان کے امیر گھر میں ملازمت کرتی ہے اس کی داستان بیان کی گئی ہے جو قسطنطنیہ سے پچیس کوس دور مقام صفرجہ میں رہتی تھی۔ اس ماما کے خاندان والوں کو بلغاری افواج نے ایڈریانوپل کی فتح کے وقت قتل کر دیا تھا۔ یہ کہانی عید کے موقعے پر لکھی گئی ہے اس لیے اس عورت کو اپنے خاندان والوں سے بچھڑ جانے کا غم دگنا ہو کر کہانی کا حصہ بنتا ہے۔ وہ عورت کہتی ہے:

> آج برس کا برس دن ہے دنیا بھر کے مسلمان خوشیاں منا رہے ہیں خدا سب کی مامتا ٹھنڈی رکھے۔۔۔ میں نے آنسوؤں کے دو قطرے اپنے لالوں کو عیدی دی۔ بیگم جو مال خدا کی راہ میں لٹا چکی اب اس کا ملال کیا[۸۳]۔

راشد الخیری ان افسانوں کے ذریعے عورتوں میں بے داری کا جذبہ پیدا کرنے کے علاوہ قربانی دینے کا حوصلہ بھی پروان چڑھانا چاہتے تھے۔ چوں کہ وہ غلام ہندوستان میں زندگی گزار رہے تھے، اس لیے وہ ہندوستانی عورتوں میں جذبہ حریت کے خواہش مند تھے تا کہ آئندہ نسلوں کی تربیت یہ خواتین اس نہج پر کریں کہ اگر دشمن کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کی نوبت آجائے تو وہ بھی اپنی تربیت شدہ اولادوں کے ذریعے علمی، دینی اور معاشرتی سطح پر مذہب اسلام کی محافظت کو عمدہ طریقے سے انجام دے لیں۔

راشد الخیری کا ایک اہم افسانہ سیمونہ بھی جنگ طرابلس کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس افسانے میں ترکوں کی بہادری اور اٹلی کی بے حمیتی کا منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں صلیبی جنگوں کی تاریخی واقعات کا ذکر ہے۔ صلیبی جنگوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے افسانہ نگار نے لکھا ہے کہ:

> جب تک یورپ کا وجود دنیا میں ہے یہ لڑائیاں ہوتی رہیں گی، رچرڈ کے وہ خوں ریز حملے جن کو تاریخ کروسیڈ کے نام سے تعبیر کر رہی ہے۔ سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی پیش نظر ہیں اور! وہ قدسی نفوس جن کی پاک روحوں نے صلاح الدین ایوبی کی صدائے عام پر لبیک کہی، جو اپنے خون گرا کر بیت المقدس کو دشمنوں سے بچا گئے[۸۴]۔

خیری کے یہ افسانے جہاں پان اسلامزم کی فکری رجحانات کے حامل ہیں وہیں ان افسانوں میں

مسلمانوں کی درخشاں روایات کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ عالمی سیاسی منظرناموں سے متاثر ہو کر لکھے گئے ان افسانوں میں جہاں عالمی قوتوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے وہاں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے مسلمانوں میں عدم اتفاق کے بڑھتے ہوئے رویے کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ انھوں نے مسلمانوں کے حالات پر جس آزردگی اور کرب کا اظہار کیا ہے وہ ان کی ان کہانیوں میں موجود ہیں۔

یلدرم اور راشد الخیری کی کہانیوں کا اثر اردو کے ادیبوں پر خاطر خواہ دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً سلطان حیدر جوش، ل۔ احمد اکبر آبادی، سجاد انصاری، مجنوں گورکھ پوری، میاں بشیر احمد وغیرہ نے کئی زاویوں سے یلدرم کے انداز کو اپنایا ہے۔ یلدرم ترکی کے اس معاشرے سے اثرات لے رہے تھے جو نیم یورپین تھا اور اسی طبقے متاثر یلدرم نے ہندوستانی نوآبادیاتی ادیبوں پر اپنے اثرات مرتب کیے، یہی وجہ ہے کہ نیاز فتح پوری کے افسانے بھی یلدرم کے اثرات سے خالی دکھائی نہیں دیتے۔ حتیٰ کہ نیاز نے اپنا رسالہ نگار ترکی شاعرہ کے نام پر جاری کیا[۸۵]۔

ڈراما:

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نوآبادیاتی ہندوستان علمی و ادبی روایات میں عالمی سیاسی اثرات کے وسیع تناظر میں گھرا دکھائی دیتا ہے۔ فکری اور نظریاتی مباحث اپنی جگہ اہم تھے مگر سیاسی و معاشرتی تفریحات بھی عالم اسلام میں جاری کش مکش اور نوآبادیات کے پھیلاؤ جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما جیسی خالص تفریحی صنف بھی تحریک اتحاد اسلامی کا وسیع تناظر پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سب سے بڑی مثال آغا حشر کاشمیری میں دیکھی جا سکتی ہے جو مشہور ڈراما نگار تو تھے ہی مگر اتحاد بین المسلمین کے بھی داعی تھے۔ ان کی ابتدائی ڈراما نگاری ایک خاص سیاسی، تہذیبی اور تاریخی تناظر کی حامل ہے۔ بمبئی میں الفرڈ کمپنی سے وابستہ تھے اور یہیں ان کی ملاقات ابوالکلام آزاد سے ہوئی[۸۶]۔ اور یہ ملاقات پھر گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ابوالکلام آزاد نے اتحاد اسلامی کی تحریک میں خاصا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا ان کی شخصیت کا اثر حشر کاشمیری پر بھی پڑا اور انھوں نے اپنے ڈراموں میں اس وقت کی عالمی صورت حال میں مسلمانوں پر برپا عیسائی دنیا کی یلغار کو موضوع بنایا۔

آغا حشر کاشمیری نے اسلام کا مطالعہ کیا اور پھر ابوالکلام آزاد کے ساتھ مل کر انگریز پادریوں سے مناظرے شروع کر دیے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے لیے اسلام کی معلومات ضروری تھی اور ساتھ ہی

دوسرے مذاہب کو سمجھنا بھی ضروری تھا۔ آغا حشر کاشمیری نے اس پورے عمل کو جاری رکھتے ہوئے معجزات القرآن کے عنوان سے انجمن ضیاء الاسلام بمبئی میں ایک طویل لیکچر دیا۔ ان کی تقریر درد، جوش اور تاثیر کے احساسات سے لبریز ہوا کرتی تھی [۸۷]۔

آغا حشر کاشمیری نے انجمن ضیاء الاسلام سے کئی موضوعات پر تقریریں کیں۔ البلاغ میں ان کی تقریریں چھپ چکی ہیں جو اس جلسے کی ہیں جس میں آغا حشر کاشمیری کو صدر بنایا گیا تھا۔ البلاغ نامی رسالہ آغا حشر کاشمیری خود بمبئی سے نکالتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے بارے میں البلاغ لکھتا ہے کہ:

> آغا حشر اسٹیج پر تشریف لائے آپ نے اول افغانستان کا جغرافیہ و تاریخ اور اقوام کی زندگی سوشل حالات و خصوصیات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد موجودہ حکومت کی ابتداء، تدریجی ترقیوں، اصلاحوں اور نظام سلطنت کا ذکر کیا ہے۔ گورنمنٹ افغانستان کے پولی ٹیکل تعلقات کا تذکرہ بھی کیا ہے [۸۸]۔

آغا حشر نے کئی پادریوں سے مناظرہ کیا اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ایک دفعہ ابوالکلام آزاد بہت بری طرح گھر گیا مقابلہ چار نہایت ہٹ دھرم عیسائی مشنریوں سے تھا میں پہنچا تو آزاد کے جان میں جان آئی اس نے بے چارے مشنریوں کو میرے حوالے کر دیا میں نے دو تین ایسے اڑنگے دیے کہ بوکھلا گئے میدان ہمارے ہاتھ رہا [۸۹]۔

آغا حشر کاشمیری نے انگریزی تہذیب و تمدن کے خلاف ڈرامے ہی نہیں لکھے بلکہ شاعری بھی کی ہے ان کی دو نظمیں موج زم زم اور شکریہ یورپ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ شکریہ یورپ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی۔ ۱۹۱۳ء کا دور جنگ بلقان کا ہے اور مسلمانان ہند اس حوالے سے سخت ہیجان میں مبتلا تھے۔ اس نظم میں حشر نے یورپ کے خلاف طنز کے تیر چلائے۔ اسی وجہ سے اس نظم کو ضبط کر لیا گیا [۹۰]۔ یہ وہ جلسہ تھا جس میں علامہ اقبال بھی موجود تھے مگر اقبال نے اپنا کلام نہیں سنایا [۹۱]۔ حشر کاشمیری کی دوسری نظم موج زمزم ہے۔ یہ بھی انجمن حمایت اسلام کے ایک سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ اس میں بھی قومی اور ملی معاملات کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس نظم کے بارے میں کہا تھا کہ ''ہندوستانی احرار اس لطیف و پر معنی نظم میں اپنے درد کی دوا نہیں تو تیمارداری کی سراپا تسلی ادائیں تو بہت سی پائیں گے'' [۹۲]۔

ہندوستان میں لارڈ کرزن گورنر جنرل تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک انگریزی حکومت کا یہ

بدترین دور تھا۔ آغا حشر نے اس ماحول سے بری طرح خود کو محکوم تصور کیا۔ ان کا ڈراما اسیر حرص لارڈ کرزن کی حکومت کے استبداد کو پیش کرتا ہے اور قوم کے سامنے برطانوی کردار کو کھول کو رکھ دیتا ہے[۹۳]۔

اس ڈرامے میں ظالم چنگیز کے پردے میں انگریزی حکومت کے جبر کو اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ عوام میں خود شناسی کا جذبہ پیدا ہو[۹۴]۔ اس ڈرامے کے دو کردار ناصر اور چنگیز اصل میں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی کش مکش کا استعارہ ہیں۔ ڈرامے میں چنگیز کی معافی اور ناصر کی تاج پوشی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر خود شناسی کا جوہر کسی قوم میں موجود ہے اور اس میں جذبہ حمیت زندہ ہے تو ظالم چنگیز جیسی قوتیں بھی شکست فاش سے دوچار ہوتی ہیں[۹۵]۔ اسیر حرص میں ناصر کے بہادر سپہ سالار صفدر کے لڑکے کا سر کاٹ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ مگر اس کے قدموں میں لغزش نہ ہوئی اور ظالم چنگیز کے سامنے جب اسے پیش کیا گیا تو اس نے کتنی بہادری سے اپنی قوم و وطن کی محبت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

''سپاہی:

کس قدر گستاخ پیدا ہیں اس گفتار سے　　　اس کی باتوں کا جواب اب دیجیے تلوار سے

صفدر: ٹھہرو! ٹھہرو! اپنی تلوار کو اپنے میان کے گھونگھٹ میں چھپا لو نہیں تو اس پر زنگ آجائے گا۔ کیوں کیا ایسے ایسے بہادروں سے ملک فتح کیا جائے گا۔ جو ایک بے دست و پا پر تلوار اٹھاتے ہیں۔ شیر کو زنجیروں میں جکڑ کر لومڑیوں سے ڈراتے ہیں۔ جاؤ انھیں ڈراؤ جو ڈرنے والے ہیں۔ ہم نے تم جیسوں کو تو اپنی ٹھوکروں سے اڑا اڑا لا ہے[۹۶]۔

جب ہندوستان کے لوگوں کے کانوں میں یہ مکالمے پڑتے ہوں گے تو ان کے حوصلوں کو بڑی تقویت ملتی ہوگی اور قوم کے دلوں میں ملت پر مر مٹنے کا جذبہ یقیناً ابھرتا ہوگا[۹۷]۔ حشر کاشمیری کے ایک ڈرامے شہید ناز میں پان اسلامسٹ جذبات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کیوں کہ یہ ڈراما ہندوستان میں نئی سیاسی بے داری بالخصوص ترکی، ایران اور مصر کی وجہ سے جو حالات پیدا ہو رہے تھے اس کے پس منظر میں لکھا گیا تھا[۹۸]۔ حشر کاشمیری کا لکھا ہوا ڈرامہ یہودی کی لڑکی ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابوالکلام آزاد، شوکت علی اور مولانا محمد علی نے مسلمانوں کو بے دار کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس مرحلے پر حشر کاشمیری کا لکھا گیا یہ ڈراما ترکی میں آباد یہودیوں پر ترکوں کے عمدہ اخلاق کی تصویر کشی کرتا ہے[۹۹]۔ غرض یہ کہ آغا حشر کاشمیری نے اپنے ڈراموں کو ملت کے وقار کی بحالی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے کئی اہم ڈرامے ایک خاص سیاسی تناظر کے حامل ہیں جن کا جائزہ لیے بغیر ان

ڈراموں کا صحیح تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ممکن نہیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک اردو ادب میں مذہبی مسائل، تحریکات اور سیاسی موضوعات کو خصوصی جگہ دی گئی ہے[۱۰۰]۔ لہٰذا اردو کے افسانوی ادب بھی ان رجحانات کو پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے جہاں ترکی ناول اور افسانوں کے ترجمے پیش کیے وہاں انھوں نے ترکی ڈراموں کو بھی اردو زبان میں منتقل کیا۔ ڈراما طارق جو رسالہ نگار لکھنؤ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ترکی کے نامور شاعر عبدالحق حامد کا لکھا ہوا تھا جسے یلدرم نے اردو میں ترجمہ کیا۔ ترکی شاعر عبدالحق حامد نے یہ ڈراما طارق ۱۸۷۹ میں تصنیف کیا تھا[۱۰۱]۔

ڈراما خوارزم شاہ کو یلدرم نے ترکی زبان سے اردو میں منتقل کیا[۱۰۲]۔ اس ڈرامے کے بارے میں یلدرم نے خود لکھا ہے کہ: ''نامق کمال بک ترکی ادبیات جدیدہ کے زندہ جاوید بانیوں میں سے ہے وہ وہ ہے جس کے معنی آفریں قلم نے بقول پروفیسر براؤن وطن کے عام لفظ کو محض زاد بوم کے مفہوم سے بلند کر کے عشق ملک وملت، دین و مذہب کا حامل کر دیا۔ میں اس ڈرامے سے جتنا متاثر ہوا ہوں، اگر اس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی ناظرین کے دل میں پیدا کر سکا۔ تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی''[۱۰۳]۔

اردو ڈراما نویسوں اور اس دور کے مصنفین نے مسلمانوں کا رجحان تھیٹر کی جانب دیکھ کر نیم تاریخی اور جذباتی ڈرامے لکھنے شروع کر دیے۔ ان ڈراموں میں عبدالوہاب خاں عاصم کا ڈراما خالد بن ولید، حکیم فرخ دہلوی کا غازی صلاح الدین، دل لکھنوی کا غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور نیر انبالوی کا ڈراما مصطفےٰ کمال اہمیت کے حامل ہیں نیز منظر بریلوی کا بچہ سقہ بھی اہم مانا گیا ہے[۱۰۴]۔

طالب بنارسی کا ڈراما کرشمہ قدرت عرف اپنی یا پرائی اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اس سے نیم تاریخی لڑائیوں کا دور ڈراما نگاری میں شروع ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں بت پرستوں کے مظالم اور ترکمان خدا پرستوں کی تبلیغی کوششوں کو نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں خدا پرستوں کی کامیابی دکھائی گئی ہے[۱۰۵]۔ اردو ڈراما نگاروں نے نظریاتی اور فکری مباحث کو جس طرح اپنے ڈراموں میں پیش کیا اس کی وجہ سے اسلام اور عیسائیت کے صلیبی معرکہ آرائی پر بھی کئی ڈرامے منظر عام پر آئے ان ڈراموں کا مرکزی نکتہ یہی ہوتا تھا کہ مسلمان اسلام کی تبلیغ کے لیے ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرتے ہیں اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں[۱۰۶]۔ ان ڈراموں میں اجتماعی قربانیاں بھی بڑے پیمانے پر

دکھلائی گئی ہیں یہ قربانیاں اس نوع کی ہیں کہ ایک مسلم حکمران یہ سن کر کہ غیر مسلم حکومت نے ایک اسلامی حکومت پر حملہ کر دیا فوراً مدد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے[۱۰۷]۔

دل لکھنوی کا ڈراما غازی مصطفی کمال پاشا روس اور ترکی کے مابین کش مکش کو پیش کرتا ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ کچھ یوں ہے کہ زار روس کو پتا چلتا ہے کہ ترکی سرحد پر بغاوت کا اندیشہ ہے وہ اپنے فوجی افسروں کو طلب کرتا ہے ان میں ایک ترکی افسر شوکت بے بھی ہے۔ زار روس ترکوں کی برائی کرتے ہوئے اسلام پر بھی ناپاک حملے کرتا ہے۔ شوکت بے اس پر معترض ہوتا ہے۔ زار روس اس کو سائبیریا کے سنگین جیل خانے میں بھیج دیتا ہے[۱۰۸]۔

ایک روسی سردار مصطفیٰ کمال پاشا مسلمانان روس کی اس ناگفتہ بہ حالت پر ترکوں کو مطلع کرتا ہے۔ لہٰذا قلعہ باطوم پر سخت معرکہ بپا ہوتا ہے اور روسی افواج کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ڈرامے کو رنگون میں بھی پیش کیا گیا تھا[۱۰۹]۔ سید اصغر علی اصغر نظامی کا ڈراما شان اسلام عرف ترکی تلوار کے نام سے جے۔ ایس۔ سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا[۱۱۰]۔ اس ڈرامے میں ترکی مسلمانوں کی کش مکش دول یورپ کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔

عبدالحلیم شرر لکھنوی نے جہاں تاریخی ناولوں کے ذریعے مسلمانوں میں باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں انھوں نے اس کام کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں ان کا لکھا ہوا ڈراما شہید وفا بھی مسلمانوں کے زوال کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ ڈراما اندلس کے زمانہ زوال کی ایک جگر خراش داستان سے ماخوذ ہے ڈراما ۱۸۹۰ء میں دلگداز پریس سے شائع ہوا[۱۱۱]۔ شہید وفا تین ایکٹ اور بائیس مناظر پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما اسپین کے زمانہ زوال کی ایک سچی داستان سے ماخوذ ہے قاضی ابویحییٰ کی لڑکی صفیہ پر یوسف عاشق ہو جاتا ہے۔ لیکن ابویحییٰ کی شرط ہے وہی لڑکا صفیہ سے بیاہا جائے گا جو ملکی لڑائی میں شامل ہو کر نام پیدا کرے گا۔ یوسف امیر عبداللہ کی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اور عیسائی فوجوں سے زبردست مقابلہ کر کے افسران اعلیٰ کی خوش نودی، حکومت سے انعامات اور خلیفہ سے تلوار حاصل کرتا ہے۔ قاضی ابویحییٰ کو خوشی ہوتی ہے اور وہ شادی کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ مگر یوسف کے پاس روپیہ نہیں وہ روپے کی تلاش میں نکلتا ہے راستے میں عیسائی دستے کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اسے پھانسی ہو جاتی ہے۔ صفیہ کو جب یہ خبر ملتی ہے تو وہ خودکشی کر کے اپنی محبت کو غیر فانی بنا دیتی ہے[۱۱۲]۔

شرر کا ایک اور ڈراما ترکی خون بھی میں اتحاد بین المسلمین کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ڈراما ترکی خون میں ترک احمد آفندی نے اپنے بیٹے مجید اور بیٹی حمیدیہ کو جو سرکس میں کام کرتے ہیں اسپین کے ولی عہد کی پست فطرتی سے آگاہ کرتا ہے۔ آخر میں اس ڈرامے میں کئی کردار اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں[113]۔ چوں کہ یورپ اور اس کے اتحادیوں نے اسلام کے کردار کو انیسویں صدی میں مسخ کر دیا تھا اس لیے ان ڈراموں میں مسلم کرداروں کی صحیح تصویر پیش کرنا اردو کے ادیب نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔لہذا ان ڈراموں کو یورپی پروپیگنڈا مہم کا ردعمل بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس ضمن میں مولانا ظفر علی خان کے کردار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے قیام حیدر آباد میں کسی یورپین تھیٹر یکل کمپنی نے ڈراما کیا۔جس میں نیم برہنہ عورتوں کا رقص بھی شامل تھا۔مولانا ریاست کی طرف سے کمپنی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اٹھے تو اظہار تبریک کے بجائے اظہار ملامت کر ڈالا[114]۔اس واقعے کی وجہ سے دل میں گرہ پڑ گئی تھی آخر کار حیدر آباد دکن سے نکلنا پڑا[115]۔اس ڈرامے کے مناظر نے ظفر علی خان کے دل میں بے کلی پیدا کر دی تھی لہذا مسلمانوں میں اسلامی حمیت بے دار کرنے کے لیے عالمی حالات کو مد نظر رکھ کر انھوں نے تین چار ڈرامے لکھے جس میں سیاسی، تہذیبی کش مکش کو خاص اہمیت حاصل رہی۔

ظفر علی خان کا ڈراما جنگ روس و جاپان تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔یہ ۱۰/نومبر ۱۹۰۵ء میں لکھا گیا ہے۔تمہید مولوی عبد الحق نے لکھی۔اصل میں اس ڈرامے کو یورپی کمپنی کے ڈرامے کا ردعمل کہا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں جاپانیوں کی وطن کے ساتھ محبت اور اس کے لیے دی جانے والی قربانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے[116]۔ڈراما نگار نیر انبالوی نے بھی اتحاد اسلامی کے اس قوی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ڈراما ترکی فرشتہ لکھا۔جس کے آخری صفحے پر یہ شعر لکھا ہوا ہے کہ:

لکھانے والا مظلوموں کی قسمت کا نوشتہ ہے   تباہی سے بچانے والا یہ ترکی فرشتہ ہے

اس ڈرامے میں جنگ سمرنا کو موضوع بنایا گیا ہے۔یونانی سمرنا پر حملہ کرتے ہیں۔ترکان احرار ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔اس طرح ایک خوں ریز جنگ کے بعد یونانی پسپا ہوتے ہیں۔مفتوحہ علاقوں پر پھر ترکی پھریرا لہراتا ہے۔اور یونانیوں کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے[117]۔اسی طرح وحشت دہلوی نے بھی ڈراما ترکی خاتون عرف جنگ طرابلس لکھا۔اس ڈرامے میں بھی اٹلی اور ترکوں

کے مابین ہونے والی جنگ کو پیش کیا گیا ہے [118]۔

مرزا محمد کاظم نے یونان اور ترکی کے مابین جاری کش مکش کو دیکھتے ہوئے ایک ڈراما ناران عرف ترازوئے اعمال یا جنگ بلغاریہ لکھا یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی نے یونان کو شکست دے کر ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا تھا۔علی گڑھ کے طالب علم عبدالرحمٰن صدیقی ترکی فوج کے ساتھ تھے [119]۔اسی جنگ کو موضوع بناتے ہوئے کاظم نے یہ ڈراما تحریر کیا۔اس ڈرامے میں فیاض وزیر اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے بادشاہ قیصر شاہ ایڈریانوپل کے دشمن انور پاشا والئی یونان سے ساز باز کرتا ہے اور اپنے سرداروں کو ملا کر اسے میدان جنگ میں شکست دیتا ہے [120]۔یوں ایک طویل ترین جنگی معرکہ اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔چوں کہ ڈراموں میں عوامی انداز کو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا اس لیے یہ ڈرامے رجحانات سیاسی اور تاریخی تو تھے مگر ان میں عوامی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہیرو اور ہیروئن کو کسی نہ کسی موڑ پر شامل کر کے ان کی شادی کرادی جاتی تھی۔

مرزا محمد کاظم کا ایک اور ڈراما البرٹ بل ۱۸۹۳ء میں پیش کیا گیا۔یہ بل ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے بھی اپنی کتاب *India Under Rippon* میں اس بل کے حوالے سے ایک مضمون لکھا ہے [121]۔اس ڈرامے میں گپتا بابو، بارایٹ لا۔کچھار کے مجسٹریٹ بنا کر بھیجے جاتے ہیں لیکن انھیں انگریزوں کے مقدمات پر فیصلے کا اختیار نہیں،اس غیر یقینی صورت حال میں انگریز ان کا مذاق اڑاتے ہیں لہٰذا وہ عدالت سے چھٹی لے کر گھر آتے ہیں اور حکومت بنگال کو ایک شکایت نامہ ارسال کرتے ہیں۔وائسرائے کی کونسل میں اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوتی ہے اور یوں البرٹ بل پاس ہو جاتا ہے۔انگریز حکام اس پر خوب نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اس میں تھوڑی تبدیلی کے بعد اسے دوبارہ کونسل سے پاس کرا دیا جاتا ہے [122]۔

اردو ڈراما نگاروں نے صرف عالمی سیاسی حالات پر ڈرامے نہیں لکھے بلکہ انھوں نے ہندوستانی تاریخ کے ان بادشاہوں اور سپہ سالاروں کو بھی اپنے ڈراموں میں پیش کیا جو انگریزوں کے خلاف جدو جہد میں پیش پیش تھے۔ان ڈراموں کے عنوانات میں سراج الدولہ، سلطان ٹیپو اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی شامل ہے۔۱۹۱۴ء کے بعد چوں کہ خلافت تحریک زوروں پر تھی اس لیے خلافت کے تعلق سے کئی اسلامی ممالک کے کرداروں پر ڈرامے تشکیل دیے گئے۔تحریک اتحاد اسلامی کے اثرات ان

ڈراموں کی کہانیوں میں جا بہ جا موجود ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو ڈراما نویسوں نے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور تہذیبی روایات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

سفر نامہ:

مشرق و مغرب اور عالم اسلام کے مابین پائی جانے والی اشتراک کا مطالعہ سفر ناموں کے بغیر ادھورا ہے انیسویں صدی کے مسلم دانش وروں نے صرف اس غرض سے عالم اسلام کا سفر کیا تا کہ وہاں کے حالات و واقعات کو سمجھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی و فکری تربیت کی جا سکے۔ اردو کے اخبار و رسائل اس حوالے سے متنوع ہیں۔ ان اخبارات و رسائل نے نہ صرف قومی رہ نماؤں کی سفری روداد شائع کیں بلکہ عالم اسلام سے ہندوستانی مسلمانوں کو جوڑنے کا کام بھی انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں امیر حبیب اللہ خان کے ۱۹۰۷ء کے اسلامی ممالک کے دورے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دورے میں وہ ہندوستان بھی آئے اور یہاں پر اسلامی رہ نماؤں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ منشی محمد آدم تمکین نے جو جام جمشید حیدر آباد دکن کے اڈیٹر تھے انھوں نے امیر حبیب اللہ کے سفر نامے کو موضوع بناتے ہوئے سیاحت امیری کے نام سے ان کے سفر نامے کی پوری تفصیل قلم بند کی ہے۔

منشی محمد آدم نے امیر حبیب اللہ کے سفر کی روداد پیش کرنے کے علاوہ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ اس سیر و سیاحت کے نتیجے میں عالم اسلامی پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں اور خارجی سطح پر مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے [۱۲۳]۔ ہندوستانی نوآبادیاتی مسلمانوں حکمرانوں کے طرز عمل سے خائف تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلم حکمراں آپس میں متحد ہو کر عالم اسلام کو نوآدیاتی تسلط سے آزاد کروائیں۔ منشی محمد آدم تمکین نے خود اس سفر نامے کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> امیر حبیب اللہ ایک عظیم الشان سلطنت کے تقریباً ہر حصہ کا ایک وسیع النظر مدبر دور اندیش و جز و رسم صلح اور ترقی و استحکام سلطنت کے عاشق بادشاہ کی حیثیت سے زمانہ کی موجودہ ترقیات کے اسباب و لوازم سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے سفر فرمارہے ہیں۔ جو قرن ہا قرن یادگار اور سالہا سال مؤثر رہے گی۔ مصر بھی بدگمانیوں کی زد سے بہت کچھ نکل چکا ہے اور عرب کی حالت بھی نسبتاً بہت کچھ تسلی بخش ہے ہندوستان کے مسلمان بھی صدیوں کے خواب سے کچھ نہ کچھ چونک پڑے ہیں اب اگر ضرورت ہے تو اس امر کی کہ جس طرح افغانستان اور انگلستان میں رابطہ اتحاد دن بدن مضبوط ہوتا جارہا ہے اسی طرح دنیا کے عظیم ترین طاقت کا رشتہ اتحاد ترکی، ایران، مراکو وغیرہ

اسلامی سلطنتوں سے بھی مستحکم ہو کر مسلمانان عالم کی ترقی و مامونیت کا باعث بنے"[۱۲۴]۔

امیر حبیب اللہ علی گڑھ میں بھی گئے تو انھوں نے باقاعدہ طور پر کلاسوں کا معائنہ کیا بلکہ علی گڑھ کے مذہبی حالات پر طالب علموں سے کئی اہم امور پر ایک گھنٹے سوال و جواب پوچھتے رہے جب انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ یہاں شیعہ طالب علم بھی تحصیل علم کرتے ہیں تو باقاعدہ طور پر ان کی جماعتوں میں بھی تدریس کے مراحل کا مشاہدہ کیا۔ علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "کیا تم ہندو کو ایک سنّی پر ترجیح دے سکتے ہو نہیں تو پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ اتحاد و اتفاق کو اپنے درمیان جگہ دو"[۱۲۵]۔ کالج کے تعلیمی ماحول کو دیکھتے ہوئے کہا کہ "کالج کو برا کہنے والوں کی زبان خاموش کرنے میں حصہ لوں گا"[۱۲۶]۔

اس دورے میں امیر حبیب اللہ نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے علمی و ادبی مراکز اور شہروں کے دورے کیے۔ جس میں ممبئی، دہلی، آگرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ کانپور کے بھی مسلمانوں سے خطاب کیا۔ یہ سفرنامہ ہندوستانی مسلمانوں اور افغانستان کے تعلق سے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ تحریک ریشمی رومال، اور تحریک ہجرت کا جب آغاز ہوا تو افغانستان کے مسلمانوں کے قرب کی وجہ سے باقاعدہ طور پر ایک جنگی حکمت عملی ترتیب دیے جانے کے امکانات پیدا ہوئے۔ گو کہ ان تحریکوں کے نتائج مسلمانوں کی دلی خواہشات کے برعکس تھے۔

اسی طرح ایک سفرنامہ گل گشت فرنگ نواب مہدی حسن خان فتح نواز جنگ کا بھی ہے جو انگریزی زبان میں *An Indian Passage to Europe: The Travels of Fatah Nawaz Jang* لکھا گیا تھا[۱۲۷]۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد عزیز مرزا نے کیا۔ اس سفرنامے میں بھی ہمیں اس وقت کے مسلم ممالک کے حالات سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً مصنف نے جب جامع ازہر کا دورہ کیا تو اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

> ہماری آنکھوں نے ایک عجیب تکلیف دہ تماشا دیکھا۔ قریباً دس ہزار مسلمان طالب علم تعلیم و تربیت کے لیے دنیا کے مختلف ممالک سے آ کر جمع ہوئے ہیں اور یہاں آ کر کاہلی اور پست ہمتی کا سبق پڑھ رہے ہیں اور تعلیم بھی دقیانوسی حاصل کر رہے ہیں[۱۲۸]۔

نواب مہدی حسن خان انگریزی تہذیب و تمدن سے متاثر تھے اور وہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے اختلافات کو مٹانا چاہتے تھے اور تہذیبی و تمدنی زندگی کو یورپ جیسا بنانے کے خواہاں تھے[۱۲۹]۔ مگر جہاں تک ازہر کے نصاب پر ان کی تنقید کا معاملہ ہے تو افغانی اور عبدہٗ نے بھی اس پر تنقید کی ہے۔ یورپ کے حالات کو

اس سفرنامے میں ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ قسطنطنیہ کی مسجد صوفیہ کا بھی ذکر موجود ہے [۱۳۰]۔ چوں کہ مصنف حیدر آباد دکن کی ریاست کے اہم عہدے پر فائز تھے اس لیے لندن میں تمام وزراء نے ان کی خاصی مدارت کی اور کئی اہم لوگوں سے ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ مصنف نے مولوی عبدالحق کے بارے میں اس سفرنامے میں بڑا عجیب انکشاف کیا ہے۔اسے مصنف کے الفاظ میں پڑھیں:

> حیدر آباد میں مولوی عبدالحق کے معطّل کیے جانے سے یہاں ہل چل پڑی ہوئی ہے۔لندن کے سب سے بڑے اخبار ان کی بری طرح خبر لے رہے ہیں۔ عبدالحق ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ لندن اور انڈیا آفس میں اس کی وقعت ہے [۱۳۱]۔

مولوی عبدالحق نے بھی تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے کئی مضامین حیدر آباد سے نکلنے والے ایک رسالے دکن ریویو میں لکھے ہیں۔ بہر حال یہ سفرنامہ اس وقت کے سیاسی حالات اور اس کے محرکات کو سمجھنے میں نہایت اہم ماخذ ہے۔

سیاحت سلطانی نواب سلطان جہاں بیگم جو بھوپال کی نواب تھیں ان کا سفرنامہ ہے اس میں سلطان جہاں بیگم نے لندن، پیرس اور دیگر یورپی علاقوں کی سیر کی، وہیں ترکی کا بھی سفر کیا ہے، ترکی کے قیام والا حصہ اس سفر کا نکتہ عروج ثابت ہوتا ہے، یہاں ان کی ملاقات سلطان عبدالحمید اور ان کی بیگم سے بھی ہوئی۔ سلطان عبدالحمید کے بارے میں لکھتی ہیں ''سلطان المعظم فارسی خوب جانتے ہیں سلطان ہم سے فارسی میں اور سلطانہ ترکی میں اپنا مطلب بیان کرتی ہیں'' [۱۳۲]۔ ترکی کے مساجد کے احوال نہایت عمدگی سے لکھے گئے ہیں اس کے علاوہ ترکی کے ان خلفا کا ذکر بھی ہے، جنھوں نے ترکی کے تاریخی مساجد میں توسیع کا کام کیا ہے۔ موصوفہ علی گڑھ سے وابستہ تھیں اور سفرنامہ بھی علی گڑھ گرلز کالج کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس لیے ترکی کی عورتوں کے بارے میں کئی تفصیلات ہمیں ملتی ہیں [۱۳۳]۔ یوں بھی ہندوستان میں عورتوں نے جس تجدد کی راہ کو اپنایا اس میں ترکی میں برپا ہونے والی روشن خیالی کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ نواب سلطان جہاں اسلامی جذبات رکھتی تھیں اس لیے انھوں نے ان تبرکات کی بھی زیارت کی جو ترکی کے شاہی توشے خانے میں محفوظ ہیں [۱۳۴]۔ سفرنامے میں ترکوں سے والہانہ عقیدت و محبت جھلکتی ہے وہ لکھتی ہیں کہ ''ہم لوگ جنیوا میں تھے تو اطلاع ملی کہ استنبول میں نہایت سخت آتش زدگی ہوئی ہے یہ خبر سن کر تین ہزار پاونڈ مصیبت زدگان آتش زدگی کے لیے عطا فرمائے'' [۱۳۵]۔ لندن میں ان کی ملاقات آغا خان اور سید امیر علی سے بھی ہوئی۔ آغا

خان نے انھیں باقاعدہ ظہرانے پر بھی مدعو کیا[۱۳۶]۔

موصوفہ کی ملاقات علمی وادبی لوگوں سے بھی ہوتی رہی۔ پروفیسر آرمینیس ویمبری کے حالات اکثر اردو رسالوں اور اخباروں میں چھپتے رہے ہیں ان سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ عربی، فارسی، ترکی کے عالم تھے، ایشیا اور یورپ کی کئی زبانوں کے ماہر بھی جانے جاتے ہیں۔ عرصے تک قسطنطنیہ میں ملازمت کرتے رہے۔ ایران کی بھی سیاحت کر چکے ہیں[۱۳۷]۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا رابطہ قدیم ہے۔ مسلمانوں کی سلطنتوں کے بارے میں کئی مضامین بھی لکھ چکے ہیں[۱۳۸]۔

ویمبری کا ایک سفر نامہ منشی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار جو خود بھی تحریک اتحاد اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے کئی خدمات انجام دے چکے ہیں، انھوں نے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ اس سفرنامے کو پان اسلامزم کی تحریک کو سمجھنے کے لیے اہم ماخذ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اس میں انھوں نے خیوا، بخارا اور کردستان کے حالات بیان کیے ہیں۔ منشی محبوب عالم نے اسے انگریزی سے اردو میں پروفیسر ویمبری کے سفر نامہ کے نام سے شائع کیا[۱۳۹]۔

اس سفرنامے کو مسلمانوں کے سیاسی حالات کو خصوصی موضوع بنایا گیا ہے: اوّل یہ کہ روس نے جب وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں پر چڑھائی کر دی تو وہاں کے مسلمانوں کے حالات کو جاننے کے لیے دیگر مسلم دنیا کے مسلمان بھی بے چین تھے۔ ہندوستان سے تو مولانا محمد حسین آزاد بھی گئے[۱۴۰]۔ مگر ان کا مشن صرف جاسوسی تک محدود تھا۔ آزاد کے سفرنامے میں ترکستان کے حالات بھی ملتے ہیں۔ جب کہ ویمبری نے اپنے سفرنامے میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی حوالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جنگ زدہ معاشرے کا مطالعہ کیا ہے۔

وسط ایشیا کے معاشرتی حالات کا روس کی جنگ کے دوران انیسویں صدی میں مطالعہ اس سفرنامے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، چوں کہ ویمبری اسلامی دنیا کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں مسلم معاشرے میں رہنے کا تجربہ بھی تھا اس لیے انھوں نے مشرق وسطی کے حالات وواقعات کا تجزیہ کافی حد تک دیانت دارانہ کیا ہے۔ ان کی ایک کتاب کا اردو میں ترجمہ ظفر عمر نیلی چھتری والے نے اردو میں مستقبل اسلام کے نام سے کیا ہے[۱۴۱]۔ ویمبری نے سولھویں صدی عیسوی میں امیر البحر ترکی سیدی علی رئیس کے سفرنامے کو ترکی زبان سے انگریزی میں منتقل کیا تھا جسے مولوی انشاء اللہ خان نے اردو میں ترجمہ کیا سیدی علی رئیس کا یہ سفرنامہ ۱۸۹۵ء میں ترکی سے شائع ہوا تھا[۱۴۲]۔ اس نے اس سفرنامے میں ہندوستان کے حالات

بھی بیان کیے ہیں۔ یہ اس زمانے کا فرد ہے جب سلطنت عثمانیہ کا عروج نصف النہار پر تھا اور تمام عالم میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے ترکوں کے ساتھ جو پرانے رشتے ہیں اس کو اس کتاب میں بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمایوں اس امیر البحر سے کافی متاثر تھا۔ اس نے چوں کہ شاعری کا بھی ذوق پایا تھا اس لیے ہمایوں نے اسے شیر ثانی کا لقب دیا جو ترکی زبان کا مشہور شاعر ہے[۱۴۳]۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانان ہند کی ترکی سے دلی وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے کئی ناشرین نے ترکی کے تعلق سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ تیز کر دیا۔ حافظ احمد علی خان شوق جو مطبع احمدی ریاست رام پور کے مالک تھے۔ انھوں نے بھی شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ نامی کتاب لکھی جس میں جرمنی کے بادشاہ کے ترکی کے سفر کے حالات ملتے ہیں۔ اس تصنیف کے حوالے سے مصنف خود لکھتے ہیں کہ حکیم اجمل خان نے جو حکم دیا کہ شہنشاہ جرمنی کے سیر و سفر کے تمام حالات انگریزی، ترکی اور اردو اخبارات سے جمع کروں اور کتاب کی صورت میں ترتیب دو۔ لہٰذا میں نے ان تمام حالات کو جمع کر کے اردو میں منتقل کر دیا ہے[۱۴۴]۔

ان کا کہنا ہے کہ ''اسلامی سلطنت کی بربادی کے بعد ترکوں کی حکومت مسلمانوں کا مرکز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس کے رنج کے ساتھ ملال اور اس کی خوشی کے ساتھ شادمانی کے نقارے بجاتے ہیں[۱۴۵]۔ یورپ کی روز افزوں ترقی نے اہل اسلام کو سلطنت قسطنطنیہ کی طرف سے جس اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس میں شہنشاہ جرمنی کی دوستی نے ایک طرح کی ڈھارس بندھائی ہے''[۱۴۶]۔ اس کتاب میں جرمنی کے بادشاہ نے جن جن مقامات کا دورہ کیا اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ درۂ دانیال وہ جگہ ہے جس نے روس، ترکی اور برطانیہ کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ جرمنی کے بادشاہ نے ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں باسفورس کا دورہ کیا[۱۴۷]۔ علاوہ ازیں جہاں جہاں وہ گئے اس کے سیاسی ثمرات کیا ہو سکتے ہیں اسے بھی مصنف نے بیان کیا ہے۔

۱۸۹۵ء میں مرزا عرفان علی بیگ جو ہندوستان کے ایک ضلع کے ڈپٹی کلکٹر تھے انھوں نے سفر نامہ حجاز نامی ایک سفر نامہ لکھا۔ حج چوں کہ اتحاد بین المسلمین کا اعلانیہ مظہر ہے اس لیے اس سفر نامے کو بھی کئی حوالوں سے تحریک اتحاد اسلامی کے رجحان کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی خلیفہ خادم حرمین الشرفین کہلایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں حج کا سفر مشکلات سے پُر تھا۔ عالم اسلام کی حالت دگرگوں

تھی۔ مصنف نے اوّل تا آخر سفر کی پوری روداد بیان کی ہے جس سے اس زمانے میں سفر حج کے دوران پیش آنے والے مسائل سامنے آجاتے ہیں[۱۴۸]۔

انیسویں صدی میں حج کے سفر ناموں میں مولوی انشاء اللہ خان نے کپتان رچرڈ فرانسس برٹن (Richard Francis Burton) کے سفرِ حج *Personal Narrative of a pilgrimage to Al-Madina and Mecca* کا ترجمہ سفر دارلمصطفیٰ کے نام سے کیا ہے۔ یہ حج کا سفر نامہ ایک غیر مسلم فرد نے کیا تھا مگر تحریک اتحاد اسلامی کے مطالعے کے ضمن میں اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے وسط میں عرب دنیا کے حالات کو سمجھنے میں یہ کتاب نہایت کارآمد ہے۔ برٹن کی یہ کتاب ۱۸۵۵ء میں لندن میں شائع ہوئی اور اس کتاب نے دنیا کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیا۔ مصنف نے اپنے آپ کو نومسلم بھی ظاہر نہیں کیا۔ انھوں نے ایک پیدائشی مسلمان کی طرح سفر کیا اور تمام مناسک حج ادا کیے، لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے اس پورے عمل میں کوئی بھی ان کی قومیت نہیں پہچان سکا۔ کپتان برٹن کئی زبانوں کے ماہر تھے صوبہ سندھ میں پیائش کے کام پر بھی مامور رہے[۱۴۹]۔

کپتان برٹن کو اس سفر میں یہ معلوم کرنا تھا کہ عرب میں دریا اور چشمے کتنے ہیں پانی کے بہاؤ کا رخ کیا ہے۔ ہمیشہ رواں رہنے والے دریاؤں کی موجودگی یا عدم موجودگی کی کیا کیا کیفیات ہیں۔ اس سفر نامے سے پہلے برطانوی سامراج کے ذہنوں میں عرب دنیا کے حوالے سے قومیت کا واضح تصور موجود نہیں تھا۔ برٹن نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے لکھا ہے کہ عرب میں تین مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں۔ یہ تینوں اقوام خدوخال، عادات و اطوار، سیرت و کردار میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں[۱۵۰]۔ یہ تحقیق برطانوی سامراج کے لیے ایک ایسی کڑی تھی جس نے آگے چل کر عثمانوی سلطنت کو ٹکڑے کرنے پر نہ صرف مجبور کر دیا بلکہ عرب دنیا کی تقسیم کا منصوبہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا اور پھر ۱۸۵۵ء کے بعد عرب دنیا کو قومی سطح پر جدا کرنے کے حوالے سے منصوبے پر نہایت عرق ریزی سے کام کیا جانے لگا اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد پورا مشرق وسطیٰ دنیا کے نقشے پر کئی ٹکڑیوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

غرض یہ کتاب ایک سفر نامہ نہیں بلکہ انیسویں صدی کی عرب دنیا کے حالات و واقعات کی ایک ایسی کنجی تھی جس کے ذریعے بیسویں صدی کے اوائل میں تصور قومیت کے ذریعے مشرق وسطیٰ کئی جغرافیاؤں کی

صورت میں تقسیم ہو چکا ہے۔ان ہی خدمات کے صلے میں برٹن کو حکومت برطانیہ نے ۱۸۸۵ء میں کے۔سی۔ایم۔جی کا معزز خطاب دیا۔اور اواخر عمر میں جب وہ آسٹریا کے بندرگاہ ٹریسٹ موجودہ اٹلی میں ۲۰/اکتوبر ۱۸۹۰ء میں مرا تو اس کی نعش کو حنوط کر کے انگلستان بھیجا گیا۔اور وہاں قصبہ مارٹلیک میں اسے دفن کیا گیا[۱۵۱]۔

کپتان برٹن کا مشاہدہ بلاشبہ گہرا تھا۔برٹن نے تعصبات سے بالاتر ہو کر عرب دنیا کے حالات بیان کیے ہیں اور کئی جگہوں پر نہایت عمدہ تجزیہ بھی کیا ہے جو اس کی سیاسی بصیرت کا پتا دیتا ہے۔مولوی انشاء اللہ خان نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے اردو کے نثری سرمائے میں نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ کئی مقامات پر حواشی اور تعلیقات کے ذریعے اہم واقعات کی درست نشاندہی بھی کر دی ہے۔اس طرح یہ کتاب اردو زبان میں اہمیت کی حامل ہے۔انشاء اللہ خان نے خود اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

> میں نے برٹن کے سفر نامے کو بہت شوق سے دیکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ واقعی کپتان برٹن نے اپنے سفر نامے کو نہایت تحقیق اور جاں فشانی سے لکھا ہے۔یہ سفر نامہ اس قابل ہے کہ اردو زبان کی خدمت و ترقی کے لیے اس کا ترجمہ اس زبان میں کیا جائے[۱۵۲]۔

حج کے سفر ناموں میں حافظ احمد حسن کا حج بیت اللہ بھی انیسویں صدی کے اوائل میں اہمیت رکھتا ہے۔حافظ احمد حسن ریاست ٹونک کے دستور الملک کے اہم عہدے پر فائز تھے۔انھوں نے یہ سفر نامہ انگریزی میں Pilgrimage to the Cabba and Charing Cross کے نام سے لکھا تھا۔پہلی بار ۱۸۷۱ء مین یہ لندن سے شائع ہوا۔جنوری ۱۸۷۰ء میں انھوں نے یہ سفر کیا تھا[۱۵۳]۔

اردو ادب میں سرزمین حجاز اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے موضوع پر سفر ناموں کی تعداد دوسرے سفر ناموں کی نسبت کہیں زیادہ ہے اس کی واحد وجہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دوسرے مقامات مقدسہ سے دلی عقیدت اور گہری محبت ہے[۱۵۴]۔دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان ہر سال جس تعلق کی خاطر اور مذہبی جوش و جذبے سے سرشار ان مقامات میں حج کرنے یا زیارت کرنے آتے ہیں شاید ہی کسی اور قوم میں کسی ایسی مذہبی مثال دیکھی جا سکتی ہے۔لہذا جب یہ صاحبان اپنی عقیدت میں ڈوبے ہوئے تاثرات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں تو خود بہ خود جذبہ ملی اور اتحاد بین المسلمین کا جذبہ ان کے قلم سے مترشح ہو جاتا ہے۔

مگر پھر بھی ایسے سفر ناموں کی تعدا بہت قلیل ہے جو زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری اور واقعات کی دلچسپی سے مالا مال ہوں۔ایسے سفر ناموں میں خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ حجاز و مصر و شام جو

۱۹۱۱ء میں شائع ہوا سر فہرست ہے۔ خواجہ صاحب کی البیلی زبان میں لکھا ہوا یہ سفر نامہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ایک محدود عرصے تک ہندوستان کو دارالحرب کہتے رہے [۱۵۵]۔ انھوں نے مسلم دنیا کے حالات اور مسلمانوں میں پائی جانے والی یگانگت کو بھی بیان کیا ہے اس لیے ان کا سفر نامہ بھی اسی ضمن میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی میں یہ سفر نامہ تیسری بار شائع ہوا۔ بیروت سے دمشق کے درمیان سفر جو ۲۸ر جولائی ۱۹۱۱ء میں انھوں نے کیا اس کی کیفیت کو یوں پیش کیا ہے:

> بیروت سے دمشق تک جو پہاڑ ہیں ان کی دل فریبی کا کیا کہنا۔ جب ریل کسی اونچی چوٹی پر چڑھتی ہے تو غاروں اور وادیوں کی سرسبزی انگوروں کی بیلوں کا لہلہانا۔ بادلوں کا نیچے گھرا ہوا نظر آنا، سامنے کوسوں سمندر کی سطح ایسے نظارے ہیں کہ جی سیر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شامی پہاڑ ہیں جن کے تذکرے توریت، انجیل اور قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ ہندوستان کے ہریالے پہاڑ بھی میں نے دیکھے۔ سبحان اللہ اپنی شان میں یہ بھی نمونہ قدرت ہیں۔ مگر شامی پہاڑوں میں غالباً خدا نے تخلی حسن کا جلوہ بکھیرا ہے۔ درخت اور سبز پتے تو درکنار جنگلی کانٹوں تک کی رنگینیاں اور شوخیاں آنکھوں میں چبھتی جاتی ہیں [۱۵۶]۔

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کا سفر نامہ سفر نامہ بلاد اسلامیہ میں مصر و روم و شام کے باشندوں کے عادات و اطوار، طریق معاشرت، طرز تعلیم اور سلطان عبدالحمید کے زمانے کی گئی ترقیاتی کاموں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس دور میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان میں برپا تحریکوں نے ہندوستانی سیاحوں کے مزاج میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ یورپی ممالک کے بجائے ان کے یہاں عروج و زوال کے اسباب دریافت کرنے کی خواہش نے مسلم ممالک بالخصوص ترکی کی طرف سفر پر گامزن کر دیا [۱۵۷]۔ اپنے سفر نامے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان کے دانش وروں نے بلاد اسلامیہ کے سفر نامے کو شائع کرنے پر خصوصی توجہ دلائی۔ خصوصاً وہاں کے ملکی و جنگی حالات اور سلطان المعظم کی موجودہ ترقیات کے اندراج کو بہت اہم قرار دیا۔ فی الحقیقت یہ ایسے امور ہیں جن پر کسی ہندوستانی سیاح نے آج تک قلم نہیں اٹھایا [۱۵۸]۔

اسلامی ممالک کے ان سفر ناموں میں بلاد اسلامیہ کے تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی حالات پر سفر نویسوں کی توجہ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ عبدالرحمٰن امرتسری کے اس سفر نامے کا مطالعہ جنگی حالات کے تناظر میں کیا جاسکتا ہے جس کا سامنا کئی عشروں سے ترکوں کو رہا اور اس کے اثرات ترک معاشرے نہایت منفی انداز میں پڑتے رہے۔ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری نے ۱۸۹۸ء میں سفر کا آغاز کیا۔ آغاز سفر میں انھوں نے ندوۃ العلماء کے

پانچویں اجلاس میں شرکت بھی کی۔ اس تعلیمی ادارے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

ندوۃ العلما کے اجلاس کی کارروائی تقریباً ختم ہو چکی تھی مگر علمائے کرام اور رؤسائے عظام جو دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں ان کی بے تکلف ملاقاتوں اور آزادانہ گفتگو سے اسلامی شان کا ایک ایسا نقشہ وہاں نظر آتا ہے جو فی الواقع نہایت دل خوش کن اور آئندہ اسلامی بہبود کی امید دلانے والا تھا[159]۔

عبدالرحمٰن امرتسری کے سفرنامے میں ترکوں کے حالات نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اہم تاریخی مقام اور علما کے درمیان پائی جانے والی نظریاتی کش مکش کے احوال سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ترکی کی سیرگاہیں، تمدن، تعلیمی نظام اور ملکی انتظام کی جزئیات پر مصنف نے اپنے مشاہدات تحریر کیے ہیں۔ ساتھ ہی مصر وشام کے حالات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس سفرنامے کو اخبار وکیل میں مختلف قسطوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ۱۰ رمئی ۱۸۹۹ء کو مصنف سمرنا پہنچے تو یہاں کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں:

تیسرے دن ہمارا جہاز دوپہر کے قریب ازمیر پہنچا۔ جسے انگریزی میں سمرنا کہتے ہیں۔ سمرنا میں اب بھی بڑے شہروں کی شان نظر آتی ہے۔ اسلامی آثار بھی یہاں بکثرت ہیں۔ کئی سو مساجد ہیں جو شان وشوکت میں بہت بڑھ چڑھ کر ہیں[160]۔

استنبول میں مصنف نے ترکوں کے سالانہ جلوس سلاملق کا بھی مشاہدہ کیا۔ اور سلطان عبدالحمید کے نماز جمعہ کی ادائی کو جو وہ جامع مسجد حمیدیہ میں ادا کرتے تھے اسے بھی دیکھا۔ اس جلوس کے حوالے سے وہ اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں:

مسجد کے اردگرد عجیب منظر تھا۔ ایوان شاہی سے جامع مسجد حمیدیہ تک ہر قسم کی فوج بحری، بری پلٹنیں، رسالے، توپ خانے، سفرینا، عربوں ترکوں اور کردوں کے جداجدا دستے راستہ کے دونوں طرف زرق برق وردیاں زیب تن کیے ہوئے نہایت شان سے کھڑے تھے[161]۔

انیسویں صدی کے تہذیبی انحطاط میں اسلامی شان وشوکت کی تصویری جھلکیوں کے ساتھ یہ سفرنامہ مسلمانوں کے ان کیفیات کو بیان کرتا ہے جس میں زوال کے احساسات پنہاں ہوتے ہیں۔ گم شدہ تہذیبی کڑیوں کی باقیات اور علامات کے بیان نے اس سفرنامے میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

اس کے برعکس خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ روزنامچہ سیاحت جس میں عراق عرب کے مقدس مقامات، جنوبی روس، قسطنطنیہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے اختتام پر اسلامی ممالک کے سیاسی حالات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے سفر کیے جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانان

ہند کے مابین جو باہمی نفاق موجود ہے اسے کم کیا جائے۔ اپنے اس مؤقف کا اظہار کرتے ہو لکھتے ہیں کہ:

اگر اس سفرنامے کو پڑھ کر مسلمانانِ ہند عبرت حاصل کریں اور اپنی اخلاقی، مالی اور دینی حالت کو درست کرنے اور حبل اللہ کو مضبوط پکڑنے میں مصروف ہو جاویں اور یہ بھروسا چھوڑ دیں کہ اسلام کی تقویت یا تائید کے بغیر مسلمانانِ ہند کی اندرونی اصلاح و ترقی کسی بیرونی امداد سے ہو سکتی ہے تو میری محنت بے کار نہ جائے گی۔ کیوں کہ سیاسی اقتدار ہر جگہ چراغ سحری ہے[۱۶۲]۔

خواجہ غلام الثقلین کا یہ سفرنامہ اردو زبان میں ادبی لحاظ سے بھی اہم ہے۔ انھوں نے صرف مقاماتِ مقدسہ کی بابت حالات نہیں لکھے بلکہ جہاں جہاں گئے وہاں کے مقامی لوگوں سے ملے اور پھر وہاں کے خیالات کو اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ مشرقی روس میں ایک ترک نوجوان سے ملاقات کا حال یوں لکھتے ہیں:

آج ایک نوجوان ترک نے آ کر خواہش ظاہر کی کہ میں تمھاری کتاب میں کچھ عبارت لکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا بہ خوشی۔ مگر آپ کی عبارت کون سمجھے گا۔ اگر عربی میں لکھیے تو بہتر ہے۔ انھوں نے کہا میں عربی نہیں جانتا، خیر میری نوٹ بک میں ایک ترکی عبارت لکھی ہے جس کا خلاصہ جس قدر میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ روس سے اسلامبول جاتے وقت میری ملاقات خواجہ غلام الثقلین آفندی سے ہوئی جن کی معلومات بہت وسیع ہے اور وہ ہندوستان سے آئے ہیں لیکن مجھ کو افسوس ہے کہ میں ان کی زبان نہیں سمجھ سکتا اور ان سے باتیں نہیں کر سکتا[۱۶۳]۔

غلام الثقلین کا یہ سفرنامہ عین اس زمانے کا ہے جب جنگ طرابلس شروع ہوئی تھی۔ اٹلی اور ترکی افواج ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں اور اس جنگ کے دوران ہندوستانی مسلمانوں نے زبردست ملی اخوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس حوالے سے روزنامچہ سیاحت میں خاصی معلومات ملتی ہیں۔ مصنف نے جا بہ جا یورپ کی اقوام کی سیاسی حکمتِ عملی پر تنقید کی ہے لکھتے ہیں کہ:

یورپین اخبار عموماً اٹلی کی زیادتی پر معترض ہیں۔ مگر یہ ظاہری اور زبانی باتیں ہیں۔ دل میں سب چاہتے ہیں کہ ہماری بدنامی کے بغیر یہ ملک بھی ایک یورپین طاقت کے ہاتھ آ جائے تو بہتر ہے[۱۶۴]۔

اس طویل سفرنامے میں بلادِ اسلامیہ کے حالات ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ حجاز ریلوے کے منصوبے پر جو کام جاری تھا اس کا مشاہدہ بھی خواجہ غلام الثقلین نے کیا اور اس میں موجود نقائص کو بھی بیان کیا ہے۔ عبدالحمید کا بنایا گیا یہ منصوبہ عربوں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس سفرنامے میں ریلوے اسٹیشن کی تفصیلات اور درعہ سے حیفہ تک سفری روداد کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اردو زبان میں لکھے گئے سفرناموں میں حجاز ریلوے کے حوالے ملنے والی معلومات کو اس منصوبے کے اوّلین ماخذ کے طور پر دیکھا جا سکتا

ہے۔[۱۶۵]

محمد حمید اللہ خان سر بلند جنگ کا سفر نامہ قسطنطنیہ بھی اس ذیل میں اہمیت کا حامل ہے۔ گویا مصنف کو ہر جگہ اپنے عہدے اور مرتبے کا خیال رکھنا پڑا، اس لیے اس میں حالات نہایت دھندلے انداز میں سامنے آتے ہیں[۱۶۶]۔اس کے باوجود یہ سفر نامہ ترکی کی تاریخ کو سمجھنے میں کافی معاونت کرتا ہے۔

اردو زبان میں دو بڑے ادیبوں کے سفر ناموں کو اس ضمن میں کافی اہمیت حاصل ہے۔مولانا محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی کا سفر نامہ انیسویں صدی میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے میں کافی معاونت کرتا ہے ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا مرکزی محور کو تبدیل ہو گیا تھا۔محمد حسین آزاد کے سفر نے ان کی زندگی خصوصاً ادبی رجحانات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔روس کے قبضے کے بعد وسط ایشیا کی صورت حال جاننے کے لیے صرف برطانیہ ہی نہیں، مسلمانان ہند بھی بے چین تھے۔مولانا محمد حسین آزاد نے جب اس علاقے کا سفر کیا تو پورے وسط ایشیا پر روس کا قبضہ نہیں تھا بلکہ کئی علاقے ایسے بھی تھے جو اس وقت بھی مسلمانوں کی عمل داری میں تھے[۱۶۷]۔

پھر روس کے بڑھتے ہوئے قدم نے ہندوستانی سرحدوں پر بھی خطرات کی گھنٹیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ایران پر بڑھتا ہوا دباؤ عوامی ردعمل میں تبدیل ہو چکا تھا۔اسی عوامی ردعمل کے نتیجے میں ۱۸۲۶ء میں جب فتح علی قاچار نے روس سے زور آزمائی کی تو اسے سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا[۱۶۸]۔لہٰذا آزاد ایک برطانوی مشن کے تحت اس سفر پر گئے کیوں کہ ہندوستان کے برطانوی حکام پر یہ ذمہ داری عائد تھی کہ وہ افغانستان، ایران اور وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں میں روس کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے اقدامات کرے[۱۶۹] اس سلسلے میں برطانیہ نے افغانستان کو اپنے ماتحت کر کے روس کے راستوں میں خندق بنانے کی کوشش بھی کی[۱۷۰]۔بہر حال محمد حسین آزاد نے چند دیگر احباب کے ساتھ بخارا، سمرقند، تاشقند، خوقند، مجند، خیوا جو روس کے قبضہ میں تھا اس کے حالات لکھے ہیں۔اور اس زمانے میں وسط ایشیاء کا نقشہ بھی بنایا تھا[۱۷۱]۔

محمد حسین آزاد کی طرح شبلی نعمانی کے سفر نامہ روم و مصر و شام کو بھی اردو ادب میں نہایت اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔اس میں ترکوں کی تمدنی حالت اور حسن معاشرت کو عمدہ طریقے سے اور کسی حد تک جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شبلی نعمانی اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ:

اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب وشائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کرلیے تھے ایک مدت تک وہ اعلانیہ اس طریقے سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا[۱۷۲]۔

شبلی چوں کہ خود بھی اسلام اور اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے اور ترکوں کے ساتھ ایک خاص قرب محسوس کرتے تھے۔ اس لیے اس سفرنامے میں جا بہ جا عقیدت کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ شبلی نعمانی کی بین الاسلامیت ان کی تحریروں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے سفرنامے میں غازی عثمان پاشا اور تمغۂ مجیدی کے عطا ہونے کے باب میں لکھتے ہیں کہ ''غازی عثمان پاشا وہ نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسیوں کو مجروح کیا تھا اور آٹھ ہزار تہ تیغ کیے گئے تھے جن کے مقابلے میں زار روس نے اپنی کل فوجی طاقت صرف کردی تھی۔ وہ خود سپہ سالار بن کر گیا جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا''[۱۷۳]۔ ان کی بہادری کے چرچے پورے ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے۔

شبلی لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا اور نہ ملنا چاہا لیکن غازی عثمان پاشا جیسے نادر روزگار کو دیکھنے کا شوق بے چین کیے رکھا۔ ان تک رسائی کی صورت ممکن نہ تھی مگر شوق کی بے تابی سے مجبور ہو کر ایک مترجم کو ساتھ لے کر ان کے مکان پر گئے[۱۷۴]۔ بہر حال اس ملاقات نے شبلی کو بے حد متاثر کیا۔ غازی عثمان پاشا ہی نے سلطان عبدالحمید سے تمغۂ مجیدی کے لیے سفارش کی تھی۔ انھوں نے شبلی کو رخصت کرتے ہوئے یہ پیغام بھی دیا کہ ہندوستان جا کر تمام علماء فضلاء کی خدمت میں میرا اسلام کہیے گا کہ آل عثمان آپ لوگوں سے دل سے محبت کرتے ہیں[۱۷۵]۔

شبلی اپنے سفرنامے میں ترکوں کی تہذیب وشائستگی کی جو خوب صورت تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ اس زمانے کے عام ادبی مذاق سے بالکل مختلف ہے۔ یورپین مصنفین نے ترکوں کو جس حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے ادب میں وہ ترکوں کا جو نقشہ پیش کرتے رہے اس سے قارئین کے دل میں ترکوں سے نفرت پیدا ہوتی تھی[۱۷۶]۔ شبلی نے یورپین مصنّفین اور سیاحوں کی زہر افشانی کا اپنی تحریروں سے قلع قمع کیا اور کوشش یہ کی کہ ترکی کے مثبت پہلوؤں سے اردو دنیا کو روشناس کرایا جائے[۱۷۷]۔ ساتھ ہی شبلی نے اس سفرنامے میں اردو ادیبوں کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اسلامی ممالک کی سیاحت کی جائے۔ شبلی ہی نے

ہندوستانی سیاحوں کے دل میں اسلامی ممالک کی سیاحت کا جذبہ پیدا کیا اور جو سیاسی ماحول مسلمانوں میں پرورش پا رہا تھا اسے بین الاسلامیت کے دھارے میں تبدیل کر کے عوام وخواص کے رخ کو ترکی کی جانب موڑ دیا۔

انھیں کڑیوں میں منشی محبوب عالم کا سفرنامہ سفر نامہ بلاد روم و شام و مصر اردو کے طویل سفرناموں میں سے ایک ہے۔ یہ سفرنامہ پیسہ اخبار میں مختلف قسطوں میں شائع ہوتا رہا، اسے محسن الملک کے کہنے پر منشی محبوب عالم نے مرتب کیا اور ۱۹۰۸ء شائع کیا گیا[۱۷۸]۔ افسوس اسی سال محسن الملک کا انتقال بھی ہو گیا۔ منشی محبوب عالم نے اس سفرنامے میں ترکی معاشرے کے ان پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی کوشش کی جن کا تعلق عوام الناس سے ہوتا ہے۔ مساجد سے لے کر قبرستان تک کے حالات بیان کیے ہیں وہاں کے اخبارات، رسالے، مطابع اور کتب خانوں کے حالات کے علاوہ ترک مشاہیر سے ملاقاتوں کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ شیخ سید ابوالہدیٰ سے ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> چناں چہ ان کے مکان کی ایک سقف سے جہاں انھوں نے مجھ سے ملاقات کی باسفورس کے نیلگوں پانی اور اس میں اسٹیمروں کے چلنے کے دلفریب نظارہ کبھی بھولنے کے قابل نہیں [۱۷۹]۔

ان ملاقاتوں کے باب میں منشی محبوب عالم نے علما کرام کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے ہیں۔ اس کے اثرات ترکی معاشرے میں جس صورت ظاہر ہوئے انھیں وہ مصطفیٰ کمال اتاترک کے انقلاب کے بعد دیکھے جا سکتے ہیں۔ شیخ ظافر اور شیخ سید ابوالہدیٰ میں جو اختلافات تھے اسے بیان کیا[۱۸۰]۔ ساتھ ہی ان مشاہیر کے تصنیفی کاموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

محبوب عالم کا یہ سفرنامہ اسلامی ممالک کی سیاحت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اسلوب کی سادگی اور اظہار کی بے تکلفی نے اس سفرنامے کو اردو زبان وادب میں ایک مثالی اور نادر اضافے کی صورت میں ظاہر تو کیا ہی ہے مگر بعض مقامات ایسے ہیں جو قاری کو حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں[۱۸۱]۔ منشی محبوب عالم نے اپنے اس سفرنامے میں ماضی کے تاریخی واقعات کا سہارا بھی لیا ہے۔ مثلاً قسطنطنیہ کی سیر کو جاتے ہوئے سلطان محمد فاتح کے محاصرہ قسطنطنیہ سے لے کر کئی اہم واقعات بھی شامل کر لیے ہیں۔ غرض انیسویں صدی کے آخری عشروں میں پیش کیا گیا یہ سفرنامہ اردو زبان میں علمی وتہذیبی اعتبار سے ایک نادر اضافہ ہے۔ جو تاریخی اور تہذیبی حوالوں کے علاوہ اپنی ادبی شان بھی رکھتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم ہندوستان میں مسلم نشاۃ ثانیہ کو منزل کمال پر پہنچتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں جدید فکری رجحانات کو فروغ دے کر تخلیقی تجربات کیے ہیں[۱۸۲]۔ ترکوں کی تہذیب سے وہ متاثر تو تھے ہی مگر اسلامی روایات بھی ان کو عزیز تھیں۔ یلدرم نے ۱۹۰۴ء میں ایک رپورتاژ لکھا جسے اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ اس کا نام سفر بغداد رکھا گیا ہے۔ اردو میں یلدرم کے اس رپوتاژ سے پہلے اردوادب میں اس صنف کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس میں یلدرم نے کراچی سے بصرہ تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ یلدرم نے اس رپورتاژ میں مناظر قدرت کو اہم جانا ہے[۱۸۳]۔ سید معین الرحمٰن نے اپنی کتاب مطالعہ یلدرم میں زیارت قاہرہ وقسطنطنیہ کو سفر نامہ لکھا ہے[۱۸۴] مگر یہ سفر نامہ نہیں ہے بلکہ یہ بھی رپوتاژ ہی ہے۔ اس میں یلدرم نے لکھا ہے کہ:

> کوئی صاحب ان اوراق میں مصر اور استنبول کے متعلق معاشرتی، ادبی، سیاسی نمی دانم چہ و چہ حالات کے جویا نہ ہوں، نہ میں وہ غائر نظر رکھتا ہوں کہ ان حالات کی تدقیق کرسکوں۔۔۔ ان اوراق میں ایک وارفتہ محبت کے ہزیانات ہیں اور میں تو صرف یہ کہتا ہوں:

جو آج جائزہ لیتا ہے جاں نثاروں کا ہمارا نام بھی لے کر پکارے ہم بھی ہیں[۱۸۵]

یلدرم ترکی میں انقلاب پسند جماعتوں خاص طور پر نوجوان ترک سے کافی متاثر تھے ان کے بارے میں اپنے رپوتاژ میں لکھتے ہیں کہ ''اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری ملاقات ہوئی ان کی لیاقت، ان کی وسعت نظر، ان کی حب وطن اور حب ملت دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دشمن سمجھے جاتے ہیں[۱۸۶]''۔ سفر بغداد میں ترکی کے سیاسی حالات سے یلدرم کی اچھی خاصی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخی وسوانحی کتب ومقالات:

سفر ناموں سے قطع نظر انیسویں صدی میں اتحاد بین المسلمین اور خلافت عثمانیہ پر تاریخی اور سوانحی مطالعات کی کثرت نظر آتی ہے ان کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں کے مابین باہمی تعلقات پر وقیع علمی و ادبی سرمایہ موجود ہے۔ ساتھ ہی اردو مصنفین کی شعوری کوشش یہ تھی کہ عیسائیوں کے اعتراضات اور غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ اور مسلم شخصیات کے اوپر لگائے گئے الزامات کو رد کیا جائے، اسی لیے اردو زبان میں اس عہد میں لکھے گئے سوانحی کتب میں سلطان عبدالحمید ایک ایسی شخصیت کے طور پر نظر آتی ہے جس پر کئی سوانحی کتابیں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں مرزا حیرت دہلوی[۱۸۷] نے حیات حمیدیہ نامی سوانح عمری میں

عبدالحمید کی زندگی کے تمام واقعات پر بحث کی ہے مگر یہ کتاب عقیدت مندانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔
حیات حمیدیہ کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

> اب تک جو کچھ اس عالی جاہ سلطان کی نسبت لکھا گیا ہے وہ نا کامل ہی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر غلط ہے۔ زندگی کے واقعات قلم بند کرنے کا طریقہ کچھ ایسا کٹھن ہے کہ ہر شخص اس پر حاوی نہیں ہوسکتا[۱۸۸]۔

اس کتاب میں مصنف نے صرف سلطان عبدالحمید کی زندگی کے واقعات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ روس اور ترکی کے مابین ہونے والی جنگ کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ایڈریانوپل کی جنگ میں ترکی نے کس طرح دشمنوں کی سازش کا مقابلہ کیا، بعد میں ہونے والے معاہدوں کے کیا نتائج برآمد ہوئے، اس کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ حیرت دہلوی کا کہنا ہے کہ: ''سلطان عبدالحمید نے عثمانویوں میں قدیم قومیت کی روح پھونک دی اور اسلام کی مختلف قوموں پر اتحاد کی ضرورت کو ظاہر کر دیا۔ فی الحقیقت یہ بڑی کامیابی ہے''[۱۸۹]۔

یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی اور عبدالحمید کے ساتھ ساتھ ترکی کی سیاسی زندگی کا خلاصہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس کے تیسرے باب میں محاصرہ پلونا کے حوالے سے حیرت دہلوی لکھتے ہیں کہ ''ترکوں نے اپنے فنون جنگ کی قابلیت سے بعض موقعوں پر بڑی زبردست کامیابی حاصل کی''[۱۹۰]۔ اردو کی تاریخی سوانح عمریوں میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں ترکوں کی کوتاہیوں سے لے کر ان کی کاوشوں کو جو مسلمانوں کے مابین اتحاد پیدا کرنے کے لیے کی گئیں دیانت دارانہ تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی حواشی وتعلیقات کے ذریعے ان واقعات کے ضمن میں مزید معلومات کو بھی شامل کر کے اسے محققین کے لیے اہم بنا دیا گیا ہے۔ حیات حمیدیہ کے حصۂ دوم میں تاریخ آل عثمان ۱۲۰۰ء سے ۱۲۲۶ء تک کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس میں آغاز سلطنت عثمان، جنگیں اور فتوحات بھی شامل ہیں۔ عثمانوی تاریخ کو اردو میں مرتب کرنے کے لیے اس کتاب کو بطور اساسی ماخذ کے استعمال کیا جاسکتا ہے[۱۹۱]۔

مرزا حیرت دہلوی کی کتاب تزک امیری بھی پان اسلامزم کے فکری رجحانات کا عکاس ہے اس سوانح میں انھوں نے امیر کابل عبدالرحمٰن کے حالات لکھی ہیں۔ امیر عبدالرحمٰن کا عہد مسلمانوں کی سیاسی ابتلا کا وہ زمانہ ہے جب دو بڑی عالمی قوتیں روس اور برطانیہ افغانستان میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے میں کوشاں تھیں۔ مسلمانوں میں پائی جانے والی حربی وسیاسی قوت کی کمی نے زوال کے عمل کو تیز کر دیا تھا۔

یہ کتاب امیر عبدالرحمٰن کے سیاسی وسماجی حالات کے ساتھ ساتھ افغانستان میں جاری خانہ جنگی کے

حالات کا جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ ستمبر ۱۸۹۳ء کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کتاب میں روسی جارحیت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ: ''جب امیر کابل ہزارہ برادری سے جنگ میں مصروف تھے تو روسی افواج نے افغانی سرحدوں پر بڑھنا چاہا مگر قبائلیوں سے مڈبھیڑ ہونے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا''[۱۹۲]۔

اردو ادب کے نام ور محقق حافظ محمود شیرانی بھی تحریک اتحاد اسلامی سے متاثر تھے مگر ان کی زندگی کا یہ گوشہ تا حال گم نامی میں ہے۔ مقالات شیرانی میں مظہر محمود شیروانی نے حافظ شیرانی کے حالات زندگی پر جو مضمون لکھا ہے اس میں اس پہلو پر بھی اشارے ملتے ہیں۔ عبداللہ سہروردی جو لندن میں پان اسلامک سوسائٹی کے ممبر تھے ان کی کوششوں سے حافظ محمود شیرانی بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ لکھتے ہیں کہ:

> میں اس وقت پان اسلامک سوسائٹی کا جوائنٹ سیکریٹری ہوں لیکن کچھ ہی عرصے میں سیکریٹری بن جاؤں گا۔ اس وقت میرا اردہ ہے کہ اس کی اشاعت میں از سرِ نو کوشش کی جائے اور لیکچروں کا سلسلہ با قاعدہ جاری کیا جائے۔ اس میں بھی ذاتی طور پر عملاً حصہ لوں گا۔ اسی سوسائٹی کے مقاصد اگر معلوم نہ ہوں تو یہ ہیں[۱۹۳]۔

۱- ''عالم اسلام کی تمدنی اور اخلاقی اور عملی اصلاح۔ مسلمانوں کے لیے ایک مرکزی طاقت کا قیام۔ ان میں کل مومن اخوۃ کا عمل۔

۲- غیر مسلم اقوام سے اسلام کی بابت غلط فہمی کا رفع کرنا۔ در پردہ اس میں اشاعت اسلام بھی شامل ہے۔ الغرض اور بھی اسی قسم کی اغراض ہیں جن سے صرف مفاد اسلامی مقصود ہے''[۱۹۴]۔

اس سوسائٹی کے مقاصد کے حصول میں عبداللہ کوئیلم صاحب نے کافی مدد کی ہے۔ عبداللہ کوئیلم کے بارے میں شیرانی لکھتے ہیں کہ:

> شیخ الاسلام عبداللہ کوئیلم گزشتہ جمعے کو میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے عبداللہ کوئیلم بھی تھے۔۔۔۔ شیخ عبداللہ کوئیلم فاضل اجل ہیں۔ عربی بہت کم جانتے ہیں۔ ویسے نہایت لائق اور عمدہ تقریر کرنے والے آدمی ہیں۔ آئندہ ستمبر میں ہم ان کو اپنی سوسائٹی میں تقریر کرنے کے لیے بلاویں گے۔ انگریزوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے تبلیغ اسلام کا اپنا طریقہ اختیار کیا اور اب تک دو سو سے زیادہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ سلطان عبدالحمید غازی نے ان کو شیخ الاسلام آفندی اور بے وغیرہ کے خطابات دیے[۱۹۵]۔

حافظ محمود شیروانی نے ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) کی کتاب ***An Account of the Rise and Progress of Mahometanism, and***

Vindication of him and his Religion from the Calumnies of the Christians کو گم نامی کے پردے سے نکال کر مرتب کیا۔ اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کر کے Luzac and Company London سے شائع کی۔ اس میں جو ضمیمہ شائع کیا گیا ہے اس کا نام *Early Christian and Fables concerning Islam* ہے۔ اس ضمیمے کو مرتب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں ان صریح بہتانوں کو رد کیا جائے جو یورپین مصنفین کی تحریروں میں موجود ہے۔ شیرانی کا کہنا تھا کہ قسطنطنیہ کی پسپائی تک بھی یورپ نے مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے کبھی خاص توجہ نہیں دی۔ ترک کی اہم اصطلاح جب وضع ہوگئی تو اسے پورے یورپ میں ہر مسلمانوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا[۱۹۶]۔

شیرانی کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلامی مطالعات کو اب تنازعات سے نکل کر اوپر اٹھنا چاہیے۔ یورپ میں غیر جانب دار اسکالروں کی آواز جہالت، واویلا پن اور ریاکاری کے شور میں گم ہوگئی ہے۔ ان اسکالروں نے پان اسلامزم اور مسلمانوں کو متعصب اس لیے کہا تھا کہ عیسائیت کو مسلسل خوف کی حالت میں رکھا جائے۔ ان تمام ممالک میں انگلستان کا انداز سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ سلطنت برطانیہ میں سب سے زیادہ مسلمان ممالک تھے جس کے کتب خانے مسلمانوں کی ذہانت کے موتیوں سے بھرے پڑے تھے۔ شیرانی کا خیال ہے کہ اسلام اور اس کی روایات کے بارے میں انصاف ہونا ابھی باقی ہے[۱۹۷]۔

اس کتاب کی اشاعت میں بہت سے مسلمانوں اور اداروں نے مالی معاونت کی۔ ایسے اکتالیس ناموں کی فہرست کتاب کی ابتداء میں دی گئی ہے۔ ان میں نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی، مشیر حسین قدوائی، سید امیر علی اور پروفیسر آرنلڈ کے نام شامل ہیں۔ یہ کتاب ڈھائی سو سال تک مسودے کی شکل میں رہی، حافظ محمود شیرانی کی مساعی سے طبع ہوئی[۱۹۸]۔ اسلام سے متعلق عیسائی فضلاء کی کتابوں میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ دیباچے میں محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ:

> یہ کتاب ہمیں اسلام کے متعلق پرانے نظریات سے واقف ہونے کا بڑا نادر موقع مہیا کرتی ہے۔ گو ان تصورات کی دھجیاں اڑ چکی ہیں تاہم آج بھی مغربی تصانیف پر ان کا گہرا اثر موجود ہے اسی غرض سے کتاب میں ایک ضمیمے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس سے امید ہے موضوع پر مزید روشنی پڑے گی۔ اگر اس تصنیف کے منظر عام پر آنے سے انگریزی زبان میں مطالعہ اسلام کے فروغ کے لیے سرگرمی کی اشد ضرورت مسلمانوں کے ذہن نشین ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ اس موضوع سے لاپرواہی کے نتیجے میں مسلمان جس افسوس ناک رسوائی کا شکار ہوئے ہیں اس کے

بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔ ہمیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مغرب سے بہت سی چیزیں حاصل کرنے کیساتھ ساتھ ہمیں اسلام کا حقیقی منشا اوراس کے عقائد بھی اسے سکھانے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بیسویں صدی میں بھی کمی نہیں پائی جاتی جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان محمد نامی ایک شخص کے پرستار ہیں[۱۹۹]۔

یہ کتاب پان اسلامک سوسائٹی لندن کے مقاصد کی ایک کڑی تھی۔اس کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حافظ محمود شیرانی کا واحد کام ہے جو انگریزی میں ہے[۲۰۰]۔حافظ محمود شیرانی اردو کے ایک ایسے محقق ہیں جن کے کاموں کی نوعیت قاموسی ہے۔ان کی زندگی کا یہ پہلو اردو دنیا والوں کی نگاہ میں کم ہی رہا ہے۔

عالم اسلام کے موضوعات پر مبنی انگریز مصنفین کی ان کتابوں کو ہندوستانی دانش وروں نے ترجمہ کرنا شروع کیا جو جدید تحریکات اور صلیبی جنگوں کے واقعات اور خلافت عثمانیہ کی تاریخ پر مبنی تھیں۔ان کتابوں میں مسلمانوں کی جدید تحریکات اوران میں برپا تبدیلیوں کا ذکر خصوصی حوالوں سے ملتا ہے۔انھیں میں پروفیسر لوتھارپ اسٹاڈرڈ Prof. Lothrop Stoddard کی کتاب *The New World of Islam* عالم اسلام میں جدید تحریکات کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہے۔اس کتاب میں وہابی تحریک سے لے کر انیسویں صدی میں برپا ہونے والی بڑی تبدیلیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کا مستقبل کس نوع کا ہوگا اس پر اجمالی تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔اس کتاب کا ترجمہ مولوی عبدالقیوم جو بارایٹ لا سابق مدیر مسلم اسٹنڈرڈ لندن واعزازی سکریٹری اتخبارات اسلامیہ تھے انھوں نے کیا ہے۔

مصنف نے میں مسلمانوں میں پائی جانے والی تصورات ملی کو مدنظر رکھ کر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مراکش، ترکستان سے کانگو تک ۴۰ کروڑ مسلمانوں کے قلوب میں نئے جذبات وتحریکات موج زن ہیں[۲۰۱]۔اس کتاب میں مترجم نے مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> گو پروفیسر لوتھارپ کی وسیع علیت نے اہل مشرق کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے مگر افسوس انھوں نے قوائے مغرب کی چیرہ دستیوں کو کسی اخلاقی کسوٹی پر نہیں پرکھا۔بہر حال بیسویں صدی کے مستشرقین کا یہ اصول تھا کہ وہ مغرب کی پردہ پوشی سے کام لیتے تھے[۲۰۲]۔

پروفیسر لوتھارپ نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست پر تفصیلی نظر ڈالی ہے اوران مصنفین کے کام کا تجزیہ بھی کیا ہے جنھوں نے انگریزی میں لکھا جیسے مولوی چراغ علی، سید امیر علی وغیرہ[۲۰۳]۔کتاب کے باب دوم میں پان اسلامزم کے نظریے کو موضوع بناتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ اس تحریک کے ذریعے جوسب

سے اہم کام ہوا وہ یہ کہ ان کی مشنری اسپرٹ پھر سے عود کر آئی ہے۔ گو اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں کی تبلیغی کوششیں کبھی بھی کم نہیں ہوئی اور اس کے زمانہ اقتدار کی کامیابی تو خیر انحطاط میں بھی اس کا مبلغانہ اصول کمزور نہیں ہوا[204]۔

لوتھارپ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس تحریک کے اثرات نے اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ کر دیا ہے اور اس آگاہی کے باعث سیاح، تاجر، زائر اور نامہ نگار ہیں۔ میں نے قاہرہ کے اخبارات بغداد، تہران اور پشاور میں لوگوں کو پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ قسطنطنیہ کے اخبارات بصرہ، بمبئی اور کلکتے کے اخبارات کو کربلا اور پورٹ سعید میں دیکھے[205]۔ داعیان اتحاد بین المسلمین جو مزدوروں، طبیبوں، فقیروں اور واعظوں کے بھیس میں ہوتے ہیں ہر جگہ دعوت تحریک پہنچاتے رہتے ہیں[206]۔

پروفیسر لوتھارپ نے یورپین جارحیت کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلو بچا لیا ہے مگر اس میں مسلمانوں میں پائی جانے والی بے داری کو دیانت دارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر انھوں نے صرف ان کتابوں کو ماخذ بنایا ہے جو انگریزی زبان میں تھیں۔ جب کہ اور دیگر زبانوں میں جو کام ہوئے ہیں وہ ان کی کتاب میں ماخذ بننے سے رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ دیگر زبانوں سے عدم واقفیت بھی ہو سکتی ہے۔

آرمینس ویمبری (Arminius Vambery) کے سفرنامے کا ترجمہ منشی محبوب عالم نے کیا مگر ان کی ایک کتاب *Western Culture in Easter Land* کا ترجمہ ظفر عمر نیلی چھتری والے نے مستقبل اسلام-مغربی تمدن اور مشرقی ممالک کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ویمبری نے ۱۹۰۶ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں اتحاد بین المسلمین کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> حال میں یورپی طریقہ مجالس اختیار کرنے کی مدد سے اتحاد اسلامی یا پان اسلامزم میں زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ سب سے اوّل اشارہ استنبول کی جانب سے ہوا ہے[207]۔

اس کتاب میں انھوں نے یورپ کی ان غلطیوں کا بھی تجزیہ کیا ہے جو ترکی کے تعلق سے تھیں۔ ساتھ ہی سید امیر علی کی تصنیف روح اسلام کے حوالے بھی موجود ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر خواہ کتنا ہی ہمدردانہ کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں مذہبی عصبیت کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ خاص کر سلطان عبدالحمید کو سازشی[208] اور ان کے کاموں کو سخت ناپسند قرار دیا گیا۔ لکھتے ہیں کہ:

> سلطان عبدالحمید خطرناک مصائب کے زمانہ میں تخت نشین ہوئے اور انھوں نے ترکی کی دماغ اور مادی حالت کو سنبھالنے اور ترقی دینے میں انتہا درجے کی کوششیں کی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ اپنے

ملک اور رعایا کو نفع پہنچائیں۔ لیکن ان کا دشمن ان کا زمانہ تھا علاوہ بریں سلطان موصوف کی تعلیم اور عام شخصیت میں اہم نقائص موجود تھے[209]۔

حجاز ریلوے کے حوالے سے ویمبری نے لکھا ہے کہ:

سلطان عبدالحمید خان کی سرگرم طبیعت سازش پسند واقع ہوئی ہے۔ ایسی سازش کا اہتمام وہ بہ نفس نفیس کرتے ہیں۔ حجاز ریلوے کی تعمیر جس سے اسلامی مرکزوں کے باہمی تعلقات آسان تر ہوجائیں گے خاص سلطان کا کام ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ بین المسلمین کی تحریک میں ترقی ہو[210]۔

اس کتاب میں مسلمانوں کے سیاسی حالات میں مغربی تمدن نے کیا تبدیلیاں کیں اس کا بھی تجزیہ ملتا ہے اور آنے والے ادوار میں کیا کیا اہم پیش رفت مسلمان کر سکتے تھے اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ کئی حوالوں سے یہ کتاب کارآمد ہے۔ سب سے پہلا حوالہ تو یہی ہے کہ مسلمانوں کی غیرت اور اتحاد اسلامی کی تاریخ سے انحراف نے صلیبی قوتوں کو تقویت پہنچائی ہے اور باہمی نفاق نے اسے جتنے ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے اس نے اسے دوبارہ ایک عالم گیر اتحاد اسلامی کی ضرورت کو ترتیب دینے پر مجبور کیا ہے۔

پنجاب ریویو نومبر و دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں اسی کتاب کے ترجمے کرنے کے حوالے سے ظفر عمر نے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں ویمبری کا ایک خط بھی شائع ہوا ہے جو انھوں نے بداپسٹ یونی ورسٹی سے ترجمہ نگار کے نام لکھا۔ اس خط میں انھوں نے اس کتاب کے ترجمہ کیے جانے پر مصنف کا شکریہ ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ "بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی دنیا کے مختلف مما لک سے آپ جیسے روشن خیال اصحاب نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مصنف کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کی ناظرین ان سے اتفاق کریں"[211]۔

عالم اسلام کے سیاسی حالات نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے جذبات اسلامی کا اثر ادب پر بھی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ زیادہ تر مضامین ان شخصیات اور معاہدوں مبنی ہیں جو راست اسلامی جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کتابوں کے لکھے جانے کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمان عالم اسلام کے فکری، سیاسی رجحانات سے اچھی طرح روشناس ہو جائیں۔ لہٰذا اردو میں عالم اسلام کی مشہور کتابوں کا ترجمہ تواتر کے ساتھ اس عہد میں کیا گیا۔ ان میں زیادہ تر موضوعات ترک اور ترکوں کی مسائل سے ہوا کرتے تھے۔

آرمینیس ویمبری نے لندن میں ترکوں کے تمدن و ترقی پر ایک لیکچر بھی دیا جس کا اردو ترجمہ رسالہ حسن اگست جلد دوم نمبر ۸ میں شائع ہوا ہے۔رسالے میں ترجمہ نگار کا نام موجود نہیں۔ رسالہ میں اس کا عنوان لیکچر ترکی کی عام ترقی اور شائستگی لکھا گیا ہے۔

اس لیکچر میں جو لندن میں منعقد کیا گیا ایک ایسا مجمع تھا جس میں کثیر تعداد میں سول اور ملٹری افسروں، ممبر پارلیمنٹ کے علاوہ کئی ممالک کے سفراء بھی موجود تھے[۲۱۲]۔اس میں انھوں نے ترکوں کی ترقی کا احوال بیان کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تمدن و طرز معاشرت پر بھی اجمالی تجزیہ موجود ہے۔ترکوں کی عام تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''سلطنت ترکی کے تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے مجھ کو سب سے پہلے یہ ریمارک کرنا ہے کہ وہاں اب تک قدیم اسلامی طریقہ طرز خواندگی جاری تھا جو غالب درجہ مذہبی لباس میں ملبوس تھا''[۲۱۳]۔

اس لیکچر میں انھوں نے یورپ کے سیاسی رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس رویے کو برا کہا جو ترکوں کے ساتھ اہل یورپ نے روا رکھا تھا۔اس رویے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اس امر کے بیان کی بہت کم ضرورت ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ جدید لٹریچر کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ساتھ نفرت کم ہوگئی ہے اور آئندہ بھی کم ہو جائے گی۔اس تعصب اور اختلاف کی وجہ قرآن میں نہیں ہے جیسا کہ بالعموم سمجھا جاتا ہے بلکہ ہم لوگوں کا سیاسی برتاؤ ہے جو ہمیشہ جائز طور سے نہیں ہوتا[۲۱۴]۔

ویمبری کے خیالات اپنی جگہ مگر تاریخ کا مطالعہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترکوں کے ساتھ یورپ کی ریاستوں کا سیاسی کردار اچھا نہیں تھا انھوں نے ان کے مذہبی رجحانات پر بھی بے جا تنقید کی ہے اور نوآبادیات کے دور میں عیسائی مشنریوں کا کردار محمد ﷺ کی ذات کے حوالے سے ناشائستہ ہی نہیں گمراہ کن بھی رہا ہے۔ خاص کر ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو مسلمانوں سے نفرت پر اہل یورپ کو اکساتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ کا سیاسی کردار بھی مسلمانوں کے ساتھ متشددانہ ہو گیا تھا۔

۱۸۷۷ء جنگ پلونا میں غازی عثمان پاشا کی شخصیت کا کارنامہ ہے۔اس جنگ پر پوری دنیا میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں تو غازی عثمان پاشا کی شخصیت کو اساطیری انداز میں دیکھا گیا۔اس جنگ کے حوالے سے اخبارات کے شذرات اور مضامین کی کثرت نظر آتی ہے۔مگر عظم زادہ حقی نے عربی میں ایک کتاب دفاع پلفنا جس کا اردو ترجمہ پیسہ اخبار لاہور میں کیا گیا۔اس کتاب کا نام جنگ پلونا ہے[۲۱۵]۔

غازی عثمان پاشا نے جس بہادری اور جواں مردی سے روسیوں کا مقابلہ کیا اس نے دشمنوں کے بھی دل جیت لیے۔ روسی سپہ سالار جوزار روس کا چچا تھا اس نے اس کی بڑی عزت وتکریم کی[۲۱۶]۔ دوران جنگ جب کئی وقت فاقے کو ہو چکے تھے تو عثمان پاشا نے محصورین کو حکم دیا کہ چمڑے کے تمام ساز وسامان اور سپاہیوں کے توش دان اور بوٹ وغیرہ جمع کر کے انھیں آگ پر جوش دے لو اور جو کچھ چمڑے کا اثر نکلے اسے شوربا سمجھ کر پی لو[۲۱۷]۔ اس کتاب میں پلونا کی جنگ کی ابتدا سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور مصنف کے اسلوب نے اس میں جذباتی فضا کا تاثر قائم کر دیا ہے۔ جس سے قاری کو ناول پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔

محمد حلیم انصاری نے مصر کے نامور مؤرخ کرنل اسمٰعیل بک کی کتاب حقائق الاخبار دول البحار کا اردو ترجمہ تواریخ آل عثمان کے نام سے ۱۹۰۹ء میں کیا۔ اس کتاب میں عثمانوی تاریخ کی ابتدا سے لے کر محمد پاشا وزیر اعظم کے حالات تفصیلی انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔ مترجم کا کہنا ہے کہ ”اردو زبان میں کوئی ایسی مکمل تاریخ نہیں ملتی جس میں عثمانیوں کے بری اور بحری دونوں قسم کے حالات موجود ہوں۔ لہٰذا اس کتاب کو اسی لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ اردو زبان میں عثمانویوں کی ایک مربوط تاریخ مرتب ہو جائے۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے مصنف نے مستند ترک مؤرخین اور یورپ کے مستشرقین کی کتابوں سے مدد لی ہے“[۲۱۸]۔ اس کتاب کو اردو زبان میں عثمانی تاریخوں میں اس لیے ممتاز و ممیز قرار دیا جا سکتا ہے اس میں خصوصی طور پر مصنف نے عثمانوی سلطنت کی بحری کامیابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ یوں بھی عثمانیوں کی کامیابی کا راز ان کی بحری قوت میں پوشیدہ تھا۔

مولانا شوکت علی نے Ernest N. Bennett کی کتاب *With the Turks in Tripoli; Being Some Experiences in the Turco-Italian War of 1911* کا اردو ترجمہ محاربات طرابلس کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۹ مئی ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی۔ شوکت علی لکھتے ہیں کہ:

> صرف یہ تحریر کرنا ہے کہ اس کا ترجمہ انجمن ہلال احمر کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ انجمن لکھنؤ میں اس غرض سے بنائی گئی ہے کہ مجروحین اور یتیموں و دیگر پس ماندگان شہیدان طرابلس کی امداد کرے اور اس وقت تک کئی پونڈ اس انجمن کی طرف سے قسطنطنیہ روانہ کیے جا چکے ہیں۔ لیکن چندے کی کمی دیکھ کر انجمن نے یہ طے کیا کہ اس کتاب کا ترجمہ کر کے شائع کیا جائے[۲۱۹]۔

چناں چہ مولانا شوکت علی نے اس کتاب کے ترجمے کے لیے باقاعدہ طور پر مصنف کو خط لکھ کر اجازت

لی۔لہذا مصنف نے اجازت دی اور لکھا ہے کہ:

مجھے بڑی خوشی اس بات سے ہوئی کہ آپ نے میری کتاب پسند کی اور جو حالات میں نے طرابلس کے متعلق اپنے تجربے سے لکھے ہیں بہ نظر پسندیدگی دیکھے۔اگر میری کتاب کا ترجمہ اردو میں ہو جائے اور ہندوستانی مسلمانوں کو میری تحریر سے واقفیت کا موقع مل سکے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی[۲۲۰]۔

مصنف نے شوکت علی کو خط میں مزید لکھا ہے کہ:

جس زمانے میں، میں دربن جنوبی افریقہ میں تھا تو مجھے رائل سوسائٹی کی جانب سے لیکچر دینے کا اتفاق ہوا اس لیکچر میں تقریباً آٹھ سو ہندوستانی مسلمان شریک ہوئے اور جو روپیہ داخلہ کے ٹکٹ لگانے سے وصول ہوا تقریباً چھ سو یا ساڑھے سات سو ہوگا۔ میں نے انجمن مذکور کو نذر کردیا۔ یہ کل رقم مسٹر داؤد نے جو دربن کے سربرآوردہ ہندی سوداگر ہے استنبول بھیج دی[۲۲۱]۔

مولانا شوکت علی نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جہاں تک جنگ کا تعلق ہے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو بعض باتیں ایسی ملیں گی جو کسی اخبار میں آج تک شائع نہیں ہوئی ہیں اور جنگ کی بابت یہ اندازہ ہو جائے گا کہ غازیان عرب و ترک کس طریقے سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پاس کیا سامان ہے[۲۲۲]۔

ارنسٹ این بے نیٹ (Ernest Nathanial Bennett) نے اس کتاب کو خیمے کے اندر بیٹھ کر لکھا اس نے اس کا منظر نامہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

میں نے یہ کتاب کیمپ کے اندر خیمے میں بیٹھ کر لکھی جس کے چاروں طرف اونٹوں کے بلبلانے، آدمیوں کے باتیں کرنے اور قسم قسم کی آوازیں جو عربوں کے کیمپ میں پیدا ہونی چاہئیں آیا کرتی تھیں۔بعض مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ میلوں پیادہ سفر کرنے یا گھوڑے پر راہ طے کرنے کے بعد کچھ وقت مل گیا[۲۲۳]۔

کتاب میں طرابلس کے بارے میں نقشے بھی موجود ہیں جو علی گڑھ کے ایک طالب علم ریاض الرحمٰن نے تیار کیے ہیں[۲۲۴]۔مصنف کی اس کتاب کا ترجمہ منشی محمد عبداللہ خان جو مولانا مولوی عبدالعلیم کے نبیرہ تھے انھوں نے بھی مناظر کارزار طرابلس کے نام سے کیا ہے۔مولوی عبدالعلیم حیدرآباد دکن میں تعلقہ دار تھے[۲۲۵]۔

اسی طرز کے ایک اور انگریز مصنف سی۔سی بگہم مرسی(Charles Clive Bigham Mersey) کی کتاب ۱۸۹۸ء میں Macmilan and Co,Limited New York سے شائع

ہوئی جس کا نام *With the Turkish Army in Thessaly* ہے اس کا اردو ترجمہ جنگ ترکی و یونان ۱۸۹۷ء کے نام سے منشی محمد حسن خان نے کیا۔ منشی صاحب اسسٹنٹ ملٹری ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا تھے۔ کتاب کے ترجمے کی اجازت انھوں نے خود مصنف سے لی تھی۔

منشی محمد حسن خان نے مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ ابتداً وہ انگریزی فوج میں نوکر تھے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو اخبار لندن ٹائمز کے نامہ نگار ہو کر ترکی فوج کے ہمراہ ہوئے [۲۲۶]۔ مترجم کا کہنا ہے کہ ''مصنف کی کئی چیزوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس جنگ کے تعلق سے دونوں ملکوں کی بحری و بری طاقتوں کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ بگہم کی لکھی ہوئی یہ تفصیلات اردو زبان میں ترکوں کے بری و بحری جنگ کے طریق کار پر اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے سلطان عبدالحمید کے کچھ دل چسپ واقعات بطور ضمیمے کے شامل کیے ہیں۔ کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم عبدالحمید کی شخصیت سے متاثر تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

> عبدالحمید کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ نہایت ہی محنتی اور جفاکش شخص ہیں۔۔۔ جب روسیوں نے ترکی کے دارالخلافے تک اپنے قدم بڑھا لیے تھے تو عبدالحمید کی شخصیت نے ہمت و بہادری سے کام لے کر ترکوں کو بہت بھاری نقصان سے بچایا تھا [۲۲۷]۔

اس کتاب میں مختلف مقامات کے نقشے بھی موجود ہیں جیسے تھسلی [۲۲۸]، کا ڈوموکو کا [۲۲۹]، ڈوموکو میں جو معرکہ ہوا جسے جنگ ڈوموکو کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نقشے ان مقامات کے ہیں جہاں ترک اور یونانی افواج آمنے سامنے برسرِ پیکار تھیں۔ ترکی فوجوں کی رسدگاہ سے لے کر تھسلی کے جنوبی حصے پر ترکوں کے قبضے کی پوری داستان اس کتاب میں موجود ہے۔ اس دوران جہاں جہاں ترکی افواج اور یونانیوں میں مڈبھیڑ ہوئی اس کا بھی تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

انگریز نامہ نگاروں کی ان کتابوں کے ترجمے سے اردو ادب میں خلافت عثمانیہ اور اس کی حکمت عملی کے کئی پہلوؤں کو دیکھا جاسکتا ہے علاوہ ازیں جنگ عظیم اوّل پر لکھی جانے والی ادبی و تاریخی کتابوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اگر کوئی محقق اردو ادب میں جنگی معرکوں پر لکھی جانے والی کتابوں کا جائزہ لینا چاہے تو ان کی کتابوں کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔

اس دور کے کئی اہم لکھنے والے تحریک اتحاد اسلامی سے متاثر ہوئے۔ سید احمد خان، حالی، شبلی کے فکری دبستان کو پروان چڑھانے والے مولوی عبدالحق کے ابتدائی رجحانات پر اسلامی فکر کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔

انھوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی شخصیات کو موضوع بناتے ہوئے کئی اہم مضامین لکھے ہیں۔ظفر علی خان کے رسالہ دکن ریویو میں طویل مقالہ العالم الاسلامی کے نام سے تقریباً ۳۰۰ صفحات پر بالاقساط شائع ہوا پھر بھی نامکمل رہا[۲۳۰]۔اسی رسالے میں ان کے دو مضمون مصطفی کمال پاشا[۲۳۱] اور ترکی کا انقلاب[۲۳۲] بھی شائع ہوئے جوان کے علمی شغف اور اسلامی جذبے کی ترجمانی کرتا ہے[۲۳۳]۔

مولوی عبدالحق کا طویل مقالہ العالم الاسلامی جس میں انھوں نے ترکی، مصر، ایران، روس، وہابی تحریک، طرابلس اور تیونس وغیرہ کے ذیلی عنوانات قائم کر کے ان ممالک کے سیاسی اور معاشرتی تاریخ پر نظر ڈالی ہے۔ان مضامین کے حوالے سے الطاف حسین حالؔی نے مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا۔نہایت پرزور مضمون لکھا ہے یہ آپ ہی کا حصہ تھا۔مگر برٹش فارن پالیسی پر اس میں جابجا نوک جھونک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو للہ آپ اس سلسلے کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے گا[۲۳۴]۔

ان مضامین کا اگر مطالعہ کیا جائے تو مولوی عبدالحق نے اسلامی ممالک کی تاریخ کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ نوآبادیاتی نظام پر نہایت سخت تنقید کی ہے اور یورپ کی جارحانہ حکمت عملی کو غیر جواز قرار دیا ہے ان مضامین میں ان کی عالم اسلام سے جذباتی وابستگی دیکھی جا سکتی ہے۔مسئلہ زنجبار پر ایک مضمون لکھتے ہوئے اس صورت حال کو یوں واضح کرتے ہیں کہ:

> ۱۸۹۶ء میں حامد بن ثوینی کے انتقال پر خالد بن برغش تخت پر بیٹھ گیا۔انگریزوں کو یہ ناگوار ہوا کہ بغیر ان کی منظوری کے تخت نشینی کیسے عمل میں آئی۔ حالاں کہ رعایا اس سے راضی تھی اور یہ بڑا بہادر اور قابل شخص تھا لیکن انگریزوں نے گولہ باری کر کے محل سلطانی کو مسمار کر دیا۔خالد نے بھاگ کر جرمن قونصل خانے میں پناہ لی۔اور سید محمود تخت پر بٹھایا گیا۔۔۔یہ شخص انگریزوں کو بہت چاہتا تھا[۲۳۵]۔

اسی طرح افریقہ میں اشاعت اسلام کے موضوع پر لکھتے ہوئے محمد السنوسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> اصل حقیقت اس کی یہ ہے کہ جب الجیریا میں فرانسیسیوں سے جنگ چھڑی ہوئی تھی تو ایک شخص سید محمود السنوسی وہاں سے بھاگ کر مکے چلا گیا۔اور کچھ دنوں وہاں رہ کر طرابلس میں آ کر آباد ہوا۔

جہاں اس نے ایک جھونپڑا بنایا جو سفید تھا اور اس کا نام زاویہ بیضا رکھا۔ اسی شخص نے یہاں مذہب اسلام کی اشاعت واصلاح کا کام شروع کیا[۲۳۶]۔

عالم اسلام پر عبدالحق کے ان مقالوں کو دیکھ کر ان کے وسیع مطالعہ، اسلام اور مسلمانوں سے سچی محبت اور اسلاف کے کارناموں کی وقعت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان مقالوں میں اسلامی ممالک کے تاریخ، سیاسی، سماجی، ادبی وثقافتی کوائف پر وافر مواد فراہم کیا گیا ہے[۲۳۷]۔ مثلاً مسئلہ زنجبار کے مضمون میں اس علاقے کی زرعی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے یہ تک لکھا ہے کہ کون کون سی چیزیں یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

یہاں کی پیداوار لونگ ہے جسے سلطان سید سعید نے بہت کچھ ترقی دی اور اس کی وجہ سے عربوں کو اس کی کاشت کا شوق پیدا ہوا جس کی اب یہ کثرت ہے کہ دنیا کی کل لونگ کی پیداوار میں ۸/۷ حصہ یہاں کی لونگ کا ہے[۲۳۸]۔

اسلامی ممالک کی تاریخی چیزوں کے علاوہ ہندوستان میں ترکوں کے تعلق سے جو جذبہ پایا جاتا تھا اس سے بھی عبدالحق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کے اس مضمون میں اس تاثر کو اور بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ترکی کے دستوری انقلاب کے موقعے پر نمودار ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ان کا مضمون ترکی کا انقلاب نہایت جذبات سے پُر ہے۔ اس میں انھوں نے سلطان عبدالحمید کی شخصیت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور انقلابیوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اثرات ان ممالک اسلامیہ پر بھی ظاہر ہوں گے جو ابھی تک شخصی حکومت کے حصار میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں:

یہ انقلاب جو اس طرح چپ چاپ بغیر کشت وخون کہ اس طور واقع ہوا کہ رعایائے دولت عثمانیہ رات کو شخصی سلطنت کی تاریکی میں سوئی ہوئی تھی اور صبح کو جو اٹھی تو پارلیمنٹری دور کا نور سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا اس کا اثر صرف ترکی تک محدود نہ رہے گا بلکہ سارے عالم پر پڑے گا اور خصوصاً مصر کی امنگوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوگا[۲۳۹]۔

مولوی عبدالحق بھی عالم اسلام میں مصر سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے جب رسالہ افسر حیدر آباد دکن سے افسر الدولہ کی ایما پر جاری ہوا اور اس رسالے کا سارا کام محبّ حسین انجام دیتے تھے[۲۴۰]۔ محبّ حسین رسالہ معلم، معلم شفیق بھی نکالتے تھے جس میں جمال الدین افغانی کے مضامین بھی شائع ہوئے، اس رسالے میں بھی عبدالحق نے مصر اور اسلامی موضوعات پر مضامین لکھے۔ اسی طرح رسالہ حسن میں جو حیدر آباد دکن سے نکلتا تھا اس میں بھی مولوی عبدالحق نے ایک مضمون مصر پر قاہرہ کی

مسجد عمرو کے عنوان سے لکھا[۲۴۱]۔

مصر ہی کے نامور قوم پرست رہنما مصطفی کامل پاشا پر ان کا ایک مضمون دکن ریویو میں شائع ہو چکا ہے۔ اپنے مضمون ترکی کا انقلاب میں بھی مصر کے حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے مضامین کے علاوہ عبدالحق نے کئی اور مضامین اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے لکھے ہیں جو اس زمانے کا عمومی رجحان تھا۔ ایک مضمون سنہ ھجری جو رسالہ افسر میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا بعد ازاں کراچی کے رسالہ ہم قلم میں اسے دوبارہ شائع کیا گیا۔ اس مضمون میں انھوں نے تاریخی انداز میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ہجری سال کا آغاز ہجرت نبی ﷺ سے ہی ہوا ہے[۲۴۲]۔

مولوی صاحب کی اسلامی تحریروں میں مسلم قوم پرستی کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً وہ مسلم قوم پرستی کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے ڈرامے جنگ روس و جاپان (۱۹۰۵ء) کے مقدمے میں عبدالحق نے انگریزی ظلم و استبداد اور اہل یورپ کی ہوس ملک گیری پر بڑی سخت تنقید کی ہے[۲۴۳]۔ جنگ روس و جاپان میں مولوی عبدالحق نے یورپی طاقتوں کی تنقیص میں جذباتی حوالوں سے ایشیا کو بھی بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

> یہ وہ انقلاب ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے نہ ملے گی اب زمانے نے نیا جنم لیا ہے۔ بہت پرانے اصول مٹانے پڑیں گے اور بہت سے نئے اصول بنانے پڑیں گے۔ بہت سے پرانے سبق بھلانے پڑیں گے اور بہت سے نئے سیکھنے پڑیں گے۔ واقعات کو اب دوسری نظر سے دیکھنا ہوگا اور اصول تمدن و تاریخ میں دائرہ نظر کو اور وسیع کرنا ہوگا۔ یورپ کا غرور اور تکبر اب قائم نہیں رہ سکتا اور اگر رہا تو وہ خود مٹ کے رہے گا۔ مشرق میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی ہے جس نے کلمہ بہ کلمہ یورپ کے قوی ہیکل دیو سے مقابلہ کر کے اسے زیر کیا ہے[۲۴۴]۔

بہر حال اور دیگر اہل قلم کے رجحانات اور ہندوستان میں پان اسلامزم کی تحریک کے اثرات مولوی عبدالحق پر بھی نظر آتے ہیں عبدالحق کی ان تحریروں کا پس منظر اس تحریک کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عالم اسلام میں تحریک اتحاد اسلامی کی وجہ سے پروان چڑھتے ہوئے تاریخی شعور نے ہندوستان کے کئی اہم اور غیر اہم مصنفین کو راست متاثر کیا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں احمد حسین الہ آبادی مدیر رسالہ الاسلام الہ آباد نے امام ابن خلدون کی تاریخ کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے صلاح الدین ایوبی کی سوانح لکھی۔ جس کا

نام صلاح الدین ہے اس کتاب کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ ''مسلمانوں کو اپنی گزشتہ تاریخ کے یاد دلانے اور اس میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی کے خصائل و عادات اور فتح بیت المقدس کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت ہے''۔ اس کتاب کی ترتیب میں مشرق و مغرب کی تاریخی کتابوں سے بھی استنباط کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ:

> ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ سے عدم دل چسپی نے مشاہیر کے نام تک بھلا دیے ہیں یا پھر ہندوستانی مسلمانوں نے تاریخ کو ناول کے پیرائے میں پڑھا ہے اس لیے ضروری ہے کہ سنجیدہ باوقار سوانح عمریاں لکھی جائیں جو مستند حوالوں سے پُر ہوں جو مسلمانانِ ہند میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا کر سکیں[۲۴۵]۔

مولوی عظمت علی صاحب حسرت لکھنوی کی کتاب محاصرہ درہ دانیال گزشتہ محاصروں کی تاریخ پر مختصر بحث کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے ترکوں کی بحری تاریخ پر جہازوں اور سپاہ کی تعداد کے حوالے سے بھی تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے[۲۴۶]۔

بجنور سے اخبار نجات نکلتا تھا۔ یہ اخبار عالم گیر اتحاد اسلام کے حوالے سے ترکی، عربی، افغانی، ایرانی اخبارات کے تراجم شائع کرنے اور اسلامی ممالک کی خبریں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کرتا تھا۔ اسی اخبار نے غازی جمال پاشا کی کتاب ترک انقلاب اور جنگ بلقان کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ کتاب میں مترجم کا نام موجود نہیں ہے اور نہ ہی سن اشاعت درج ہے[۲۴۷]۔

مولوی ذکاء اللہ کی کتاب محاربات عظیم میں بھی روس اور ترکی کے مابین جو چپقلش تھی اس کا حال ملتا ہے اور پھر انگریزوں کی پالیسی ترکوں کے ساتھ کیا رہی ہے مولوی ذکاء اللہ نے اس کا مختصر تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں کریمیا کی جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> اہل روس عیسائی مذہب کے بڑے پابند تھے وہ اپنے شہنشاہ سے کبھی مانوس نہ ہوتے اگر وہ عیسائیوں کی نسبت جو ترکی حکومت میں رہتے تھے اپنا نہایت مستقل ارادہ ظاہر نہ کرتا کہ وہ ان کا محافظ و معاون ہوگا۔۔۔ روسیوں نے ترکی کے عیسائیوں کی حمایت کا ایک مذہبی بہانہ اس لیے بنایا ہے کہ ایک نئی سمت میں یورپ کے جنوب میں اپنی سلطنت کی سرحدیں بڑھائیں[۲۴۸]۔

مولوی ذکاء اللہ سر سید احمد کی تحریک کے سرگرم رکن تھے اور ان کی ملاقات علی گڑھ میں ولفرڈ بلنٹ سے بھی ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے مولوی عنایت اللہ دہلوی نے بھی آرنلڈ Prof . Arnold کی کتاب *The Preaching of Islam* کا ترجمہ دعوت اسلام[۲۴۹] کے نام سے کیا تھا۔ سید احمد خان کی فرمائش

پر یہ ترجمہ اس لیے کیا گیا کہ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ بلکہ صلح اور امن و آشتی اس کا شعار رہا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ چوں کہ خود بھی عیسائی تھے اس لیے انھوں نے محققانہ انداز میں تبلیغ اسلام کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بہ زور قوت نہیں بلکہ حسن اخلاق سے پھیلا ہے اس میں مصنف نے استدلالی انداز اختیار کیا ہے۔

مرزا رفیع الدین بیگ وحشی کی کتاب ملوك وسط ایشیاء میں ترکستانی ریاستوں کے حالات تفصیلی انداز میں پیش کیے ہیں۔ ترکستان کی یہ ریاستیں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سے باعث کشش رہی ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں روسی فتوحات کو خاص اہمیت دیتے ہوئے مصنف نے ان حالات پر بڑی باریک بینی سے نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے روس ان ریاستوں پر قابض ہو گیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

> ہندوستان کے حکمرانوں کا تعلق چوں کہ اکثر وسط ایشیاء ہی سے تھا اس لیے ضروری ہے کہ ان ممالک کی تاریخ اور ان غلطیوں کو ضرور دیکھا جائے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ سلطان روم کی قوت توڑ کر روس نے ان ممالک کو فتح کیا[۲۵۰]۔

مرزا رفیع الدین نے تاریخی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے وسط ایشیائی ریاستوں کے ماضی و حال اور مستقبل کو بیان کرنے کے علاوہ عربوں کی بہادری کا بھی جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے یہ ریاستیں عالم اسلام کا حصہ بنیں۔ یہاں کی ریاستوں میں علماء کرام کے حالات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں اور مصنف نے ان غلطیوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جو ان علمائے کرام سے ہوئیں اور مسلمانوں کی یہ ریاستیں کمزور سے کمزور تر ہوتی گئیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کا ترکوں کے ساتھ ربط صرف تحریک اتحاد اسلامی اور دور ابتلا ہی میں نہیں رہا بلکہ یہ تمام خطے تہذیب و ثقافت کے مشترک عناصر رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے قرب محسوس کرتے ہیں اور اس قربت میں اس وقت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ ممالک کسی دشمن کے حرص کا شکار ہو رہے ہوں۔ اس لیے اردو زبان میں ترکی تخیل تاریخ کے ان مٹ نقوش کا حامل ہے۔

جنگ روس و ترکی نے عالمی سطح پر اور پھر یورپی قوتوں کی دست درازی نے عالم اسلام کے مسلمانوں کو جس اضطراب میں مبتلا کیا ہوا تھا اس لیے کئی عام لکھنے والوں نے بھی تحریک اتحاد اسلامی کو عام کرنے کے لیے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جو مسلمانوں کی تاریخی و تہذیبی روایات کا حصہ رہی ہیں اور اپنی سوچ و فکر کے

ذریعے تجزیہ کر کے سارے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

حاجی بدرالدین احمد بی۔اے نے قسطنطنیہ پر فتح قسطنطنیہ نامی کتاب لکھی۔اس کتاب کے دیباچے میں مصنف کا کہنا ہے کہ "۱۹۰۴ء میں جب حج کے لیے ہندوستان سے باہر گیا تو قسطنطنیہ اور مصر کی بھی سیاحت کی اگر چہ اس وقت میری عمر ۱۴ سال تھی مگر اس کا اثر مجھ پر بہت گہرا تھا"[۲۵۱]۔لہٰذا طرابلس پر جب اٹلی نے حملہ کیا اور بلقان میں مسلمانوں پر تباہی آ گئی اور ہندوستان میں یہ خبر آئی کہ بلغاری، قسطنطنیہ کے قریب چتلجہ کے مقام پر پہنچ چکے ہیں تو میرے چشم تصور میں تاریخ اسلام کا وہ ورق آ گیا جس نے مسلمانوں کو اس عظیم فتح سے دوچار کیا تھا[۲۵۲]۔لہٰذا بدرالدین احمد نے اس کتاب میں اسی فتح کو موضوع بنایا ہے۔

مسلمانان ہند کو عثمانی ترکوں کی سیاست سے آگاہی اور انسلاک کے لیے جن اہم شخصیات کا نام آتا ہے ان میں مولوی انشاء اللہ خان کے کردار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے برطانوی عہد میں ہندی مسلمانوں کی تجدید نو میں اہم خدمات انجام دیں مگر ان کا ذکر حیرت انگیز طور پر کم کیا گیا ہے۔انھوں نے نامساعد حالات میں سلطنت عثمانیہ کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کے خلاف کی جانے والی افترا انگیزی کا مقابلہ استدلال اور علم کے زور پر کیا۔انھوں نے برطانوی نو آبادیت میں مسلمانوں پر کیے جانے والے تہذیبی اور تعلیمی تجربات کے خلاف آواز بلند کی اور مسلم تہذیب کی نہ صرف برتری ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ زندگی بھر اسلامی اقدار کی ترویج و اشاعت کرتے رہے۔

مولوی انشاء اللہ خان استاد اور صحافی ہونے کے علاوہ پیشہ ور مصنف بھی تھے۔انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے دفاع میں کئی کتابیں اردو میں تحریر کی ہیں۔پیش نظر مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے کئی رسائل بھی جاری کیے۔وہ اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے خیالات سے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہتے تھے[۲۵۳]۔

انشاء اللہ خان ہندوستان میں تحریک اتحاد اسلامی کے داعی تھے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے تحریر اور سیاست سے کام لیا۔چندہ یا امدادی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان کی زیادہ تر تصانیف ترکوں کی تاریخ اور ترک اقوام پر لکھی گئی انگریزی کتابوں کے تراجم پر مبنی ہیں۔وہ سلطان عبدالحمید سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔

اردو میں ان کی ایک اہم کتاب تاریخ خاندان عثمانیہ ہے جو دو جلدوں میں ہے۔اس میں عثمانی

سلطنت کی ابتداء سے سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب کے بارے میں مصنف کا کہنا تھا کہ:

> شہزادی لوسکنان نے ہمارے موجودہ امیر المومنین سلطان عبدالحمید خاں غازی کے عہد حکومت کی سوانح ۱۸۸۸ء تک اگرچہ نہایت ہی جامع طور حسب ضرورت موقع اختصار یا تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کر دیے ہیں اور میں نے اس کتاب میں جا بہ جا حواشی دینے اور کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے شامل کر کے اس مسعود و محمود عہد کے ۱۸۸۸ء سے بعد کے واقعات و حالات تا بہ سنِ رواں حضرت امیر المومنین کی نجی زندگی کے متعلقہ چند کوائف درج کر دینے کی کوشش کی ہے[۲۵۴]۔

انشاء اللہ خان کا سلطان عبدالحمید سے دلی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کے عہد حکومت کو مسعود و محمود قرار دیتے تھے[۲۵۵]۔ان کا خیال تھا کہ سلطنت عثمانیہ تاریخی تناظر میں یورپی قوتوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔سلطان عبدالحمید کی جدوجہد کو سمجھنے کے لیے یورپی عیسائی مصنفین کی تصانیف پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ عیسائی طاقتوں کی سیاسی پالیسیوں کو سمجھنے کے لیے اردو خواں طبقے کے لیے سلطنت عثمانیہ کی ایک ایسی تاریخ رقم کی جائے جس میں وہ اسباب و علل بیان کیے جائیں جنھوں نے اس سلطنت کو تاریخ ساز بنا دیا[۲۵۶]۔اس کتاب میں انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کا تجزیہ بھی کیا ہے اور خاص طور پر ان واقعات کا ذکر کیا جو سلطنت کے دفاع کے لیے کیے گئے تھے۔

اس کتاب میں ترکوں کی خارجہ پالیسی کو خاص اہمیت دی گئی عثمانیوں کی فتح قسطنطنیہ سے لے کر محمد چہارم کے دور تک کے حالات میں خارجہ پالیسی کی اہم بنیادوں کی وضاحت کی گئی۔ترکوں کے مختلف سلاطین کا یورپی اور مسلم ممالک کے ساتھ روابط کو اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔

مولوی انشاء اللہ خان نے ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کی کتاب *The Future of Islam* کا اردو ترجمہ اسلام کی حالت مستقبلہ کے نام سے کیا تھا۔یہ صحیح تھا کہ بلنٹ نے مسلمان فرقوں کی ذات اور نسلی عناصر کے کردار کو خصوصی توجہ دی تھی اور شہری و دیہی اسلام کے درمیان امتیاز رکھا تھا۔بلنٹ نے اسلامی ممالک سیاحت اور سیاسی حالات کے عمیق مطالعے کے بعد برطانوی نو آبادیات کی پالیسی پر تنقید کی اور انھیں درست کرنے کا مطالبہ کیا۔خصوصاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں بلنٹ اور اس جیسے مستشرقین نے اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور برطانوی پالیسی کے ردعمل پر مسلمانوں کے رویے پر خصوصی توجہ دی تھی[۲۵۷]۔ایسی سرگرمیوں کو مختلف ذریعوں سے انھوں نے نہ صرف توانائی بہم پہنچائی بلکہ اس معاملے میں بلنٹ کا کردار کئی

امور میں دل چسپ رہا ہے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں انھوں عرب قومیت سے سرشار لوگوں کی حوصلہ افزائی کی تا کہ وہ عرب ثقافتی ورثے کی بنیاد پر ترکوں سے چھٹکارا حاصل کریں اور عرب قومیت کی شناخت پر زور دیں۔

بلنٹ کی کتاب مستقبل اسلام کو عالم اسلام میں کافی سنجیدگی کے ساتھ لیا گیا۔ اکبرالہ آبادی، شبلی نعمانی، عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اس کے متعلق صائب رائے بھی دی تھی۔ اکبرالہ آبادی نے بلنٹ سے ملاقات میں اردو ترجمے کی بابت اُسے آگاہ بھی کیا۔

بلنٹ اپنی ڈائری لارڈ رپن کا عہدِ حکومت میں لکھتا ہے کہ:

جمال الدین افغانی کے پانچ مرید میری کتاب مستقبل اسلام کے متعلق اظہارِ ہم دردی کی غرض سے آئے یہ سب کے سب نوجوان طالب علم ہیں اور انگلستان سے نفرت رکھتے ہیں۔ جب انھیں جمال الدین کا عربی خط دکھایا تو انھوں نے اسے بوسہ دیا، مذہب کے متعلق ان سب کے خیالات آزادانہ ہیں۔ یہ سب کچھ افغانی کی تعلیمات کا اثر ہے۔ یہ نوجوان نہایت دلیری کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں جو مجھے پسند ہے[۲۵۸]۔

اکبر حسین سے ملاقات کے احوال میں بلنٹ کا کہنا ہے کہ:

اکبر حسین آئے اور مستقبل اسلام کے ترجمہ کے متعلق کچھ باتیں کیں، وہ نئے دیباچے سے بالکل مطمئن ہیں جسے کل میں نے ان کے حوالہ کر دیا تھا لیکن میں ان حصوں کو خارج کر دوں گا جو ذاتی طور پر سلطان عبدالحمید سے متعلق ہیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں نے یہ کتاب اپنے دوستوں کو دکھائی تھی ان پر بے حد اچھا اثر ہوا ہے۔ ان میں سے ایک مذہبی امور سے قطع تعلق کر چکے تھے مگر اسے پڑھتے ہی پھر نماز، روزے کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اردو ترجمے کو بہت مقبولیت حاصل ہو گی، میں نے ان سے کہا کہ میرا قسطنطنیہ جانے کا ارادہ ہے جہاں میں سلطان المعظم سے مل کر پین اسلامک سیناڈ (*Pan-Islamic Synod*) اسلامی اتحاد کو ترقی دینے والی جماعت قائم کرنے کا مشورہ دوں گا، ہم دونوں اس امر پر متفق تھے کہ مصر میں اسلام کی شکست کے بعد اب کسی کو زیادہ حقدار خلیفہ کے منتظر رہنے کی ضرورت نہیں ہے، جو بات دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ کا کام جن ہاتھوں میں ہے وہ جدید گروہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ قدیم خیال کے مسلمان ہیں[۲۵۹]۔

اس اقتباس میں بلنٹ کی اکبرالہ آبادی سے ہونے والی گفتگو سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بلنٹ کی شخصیت مسلم دانش وروں کس درجہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ *Pan-Islamic Synod* کے قیام کا منصوبہ اور برطانیہ کا ترکوں کے ساتھ رویہ اور عبدالحمید اس انجمن کے قیام کے حوالے سے راضی کرنا بلنٹ کی شخصیت

کوکئی رخ سے دیکھنے کا تقاضا کرتی ہیں۔

مولوی انشاء اللہ خان نے کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے حواشی میں بلنٹ کے اس رویے کی نشاندہی کی تھی۔ کیوں کہ اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کتاب کے مقدمے میں اس کے تحریر کیے جانے کا مقصد بیان کر دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کی وفات یا سلطنت سے اس کی علیحدگی سے خلافت قاہرہ میں قائم ہو جائے گی اور عرب پھر اپنی گم شدہ مذہبی صدارت حاصل کر لیں گے[۲۶۰]۔ اس لیے وہ عربوں کے یہاں قومیت کے تصور کو پھیلتے دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور ترکوں کے اقتدار کو کم زور کرنے کی مزید کوششیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا یہ خیال ہے کہ ترکوں کے کم زور ہو جانے سے عرب دنیا ایک نئی روحانی قوت حاصل کرے گی۔ کیوں کہ اس کے نزدیک اسلام عرب قوم کا تحفہ تھا[۲۶۱]۔

مولوی انشاء اللہ خان کے ترجمے کا مقصد دنیائے اسلام کو بلنٹ کے کردار سے آگاہ کرنا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کے ترکی کے خلیفہ سے روابط کا تذکرہ کیا۔ اس کا یہ خیال ہے کہ اگر برطانوی عمال حکومت اس تعلق کو سنجیدگی سے نہ لیں گے تو بہت جلد انھیں بڑے طوفان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

انشاء اللہ خان نے بلنٹ کے ایک اور مضمون جو اس نے ہندوستانی معاشرت[۲۶۲] کے متعلق لکھا تھا، اس کا بھی ترجمہ کیا۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انگریز حکام کو ہندوستان میں کی جانے والی غلطیوں سے آگاہ کیا جائے، جو ہندوستانی عوام کو ان سے متنفر کر رہی تھیں۔ انگریز معاصرین کے برخلاف اس کی رائے ہندوستان کے بارے میں نہ صرف اچھی تھی بلکہ اس نے کچھ ایسی آرا بھی پیش کیں جن سے ہندوستانیوں کے ذہنی رویے کا نیا زاویہ بھی سامنے آتا ہے اس نے لکھا:

> مجھ کو یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کی طبیعت مبالغوں سے بھری ہوئی ہے جو پر جوش جذبات ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستانی لوگ جذباتی اور غافل نہیں ہیں۔ وہ اپنے اقوال اور افعال میں احتیاط کرتے ہیں۔ غضب ناکی، پر جوش دھمکیاں اور تخویف ہندوستان میں، میں نے بہت کم پائی ہیں۔ غیر منطقی دلائل بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ایسی دلیلیں جو واقعات صحیحہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو عمدہ ترین دلائل ہیں اور جس کو سیاسی اصطلاح میں کامن سنس یعنی عام معقولیت کہتے ہیں[۲۶۳]۔

بلنٹ کا شمار ان سیاست دانوں میں ہوتا ہے جس نے ہندوستانیوں اور برطانویوں کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے لکھا کہ:

> جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ان تمام باتوں سے مجھے صاف یہ یقین پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستانیوں اور

انگریزوں میں کدورت پائی جاتی ہے۔ اگر انگریز عمال حکومت اپنے رویے کو درست نہیں کرتے تو دونوں ملکوں کے مابین کشاکش کی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور ان کی شدت اس قدر ہوگی کہ پچھلی تمام تر تاریخیں اس نزاجیت کے سامنے ہیچ نظر آئیں گی[۲۶۴]۔

مولوی انشاء اللہ خان کی کتاب ترکوں کی موجودہ ترقیات اور اسلامی دنیا کا فوٹو میں ان انگریز مصنفین کے مضامین کو جمع کیا گیا جو ترکی عہدے داروں کی قابلیت اور ان کی صلاحیت کا اعتراف کرتے تھے[۲۶۵]۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا حصہ ترکی کی ترقی، مفسدہٴ آرمینیا اور یورپی مصنف سڈنی وہٹ مین (Sydney Whitman) کے مضامین کے ترجمے ہیں۔ دوسرا حصہ مسلمان سیاحوں کے حالات اور وہ تجاویز ہیں جو انشاء اللہ خان نے عثمانی ترکوں دیے تھے یہ تجاویز ۱۹۰۷ء تک محیط ہے۔ اس کتاب میں حواشی و تعلیقات کے ذریعے ضروری اور اہم باتوں کی صراحت بھی کردی گئی ہے۔ کتاب میں اس وقت کے بعض اردو اخبارات میں شائع ہونے والی ذکی پاشا کی یادداشت کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ جس میں درہ دانیال کو ناقابل تسخیر بتایا گیا تھا[۲۶۶]۔ یہ کتاب ترکی میں اس وقت کی سیاسی اور انتظامی صورت حال کا جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔ چوں کہ انشاء اللہ خان کوئی معمولی ذہن اور فکر رکھنے والے شخص نہیں تھے[۲۶۷] اس لیے اس کتاب میں مستقبل کی ترقی کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کی گئی تھیں۔

مختلف شعبوں میں ترکی کی ترقی کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلم ممالک سے اس کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ ضمیموں اور تبصروں کو شامل کرنے سے بھی اس کتاب کی وقعت بڑھ گئی ہے[۲۶۸]۔ سلطان عبدالحمید سے گہرا لگاؤ اور عقیدت رکھنے کے باوجود انشاء اللہ خان نے لکھا تھا کہ:

ترکی اخبارات کو آزادی نہیں کہ وہ ملک کی حالت کے لیے کچھ لکھ سکیں۔ قسطنطنیہ کے اخبارات کا اس زور سے گلا دبایا گیا ہے کہ وہ کوئی آواز نہیں نکال سکتے[۲۶۹]۔

انشاء اللہ خان نے تعلیم کے شعبے کو وسعت دینے پر سلطان کی تعریف کی تھی، لیکن کہا تھا کہ سلطنت کے اس شعبے کو مستحکم کرنے سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان کے خیال میں ترکی کی ترقی میں حصہ لینا ہر مسلمان پر فرض ہے اور انگریزی یا یورپی نامہ نگاروں اور مصنفین کی غیر منصفانہ تنقید جو عثمانویوں پر تھی اسے ہذیانی کیفیت سے تعبیر کیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ استنبول کے اخبار وکیل میں اردو اخبار وکیل کا ایک مضمون کاٹ چھانٹ کے بعد شائع ہوا تھا۔ عموماً اردو اخبارات کے مضامین ترکی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے[۲۷۰]۔

مولوی انشاءَ اللہ خان کی ایک اور اہم کتاب ترکوں کے دارالخلافہ پر لکھی گئی جس کا عنوان حالات قسطنطنیہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قسطنطنیہ کی مختصر تاریخ کے بعد انگلستان کے پروفیسر میکس مولر Max Mollar اور ان کی بیگم جارجینا میکس مولر کی سیاحت قسطنطنیہ کا ترجمہ بھی شامل کیا۔ پروفیسر میکس مولر نے اپنی سیاحت کے دوران ترک معاشرے کا جائزہ کئی اہم امور کو مدنظر رکھ کر لیا تھا اس سیاحت کے دوران ان کی بیگم نے بھی ترکی معاشرے پر ان کی کتاب میں دیباچہ لکھا جس میں انھوں نے ترکی کی صورت حال پر اپنے خیالات پیش کیے۔ انھوں نے لکھا کہ:

> میں وہاں اپنے خاندان کے ساتھ جسے آب و ہوا کی تبدیلی اور آرام کی ضرورت تھی اپنے بیٹے کو جو انگریزی سفارت کا سیکریٹری تھا ملنے گئی تھی۔ ہمارے فرزند نے باسفورس کی بہار اور دل فریب خوب صورتی کے متعلق ہم کو اپنے خطوط میں مفصل لکھ کر بہت کچھ بتا دیا تھا مگر قرب و جوار کی پرانی یادگاروں کے عجائبات اور دلکشی کے مشاہدے سے ہم ششدر رہ گئے [۲۷۱]۔

کتاب میں حواشی و تعلیقات کے ذریعے ان اختلافی امور کی نشاندہی بھی کی گئی جو پروفیسر میکس مولر نے اپنے سفرنامے میں ترکوں کے حوالے سے کیے تھے۔ مثلاً ایک جگہ میکس مولر نے لکھا ہے کہ ''جامع مسجد صوفیا میں وعظ ہو رہا تھا وعظ کرنے والا تلوار کندھوں پر رکھ کر زور سے ہلاتے ہوئے خطبہ دے رہا تھا۔ یہ نظارہ قابل دید تھا۔ خواہ اس کے دیکھنے سے ہم عیسائیوں کے دلوں میں کچھ بھی خیالات پیدا ہو جائیں۔ یہ وعظ صرف مذہبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ سیاسی معاملات میں بھی ہوتے تھے اور لوگ اسے غور سے سنتے تھے۔ قرآن پر اعتراض کرتے ہوئے میکس مولر کا یہ کہنا تھا کہ:

> قرآن شریف میں بھی فقط مذہب کے بنیادی اصولوں کا ہی نہیں بلکہ معاشرت اور تمدن کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق احکامات ہیں۔۔۔ مگر وہ احکامات صحرا کے بدوؤں کے حسب حال ہیں [۲۷۲]۔

اس اعتراض پر انشاءاللہ خان نے جواب دیا کہ:

> میں اس جگہ پروفیسر میکس مولر کے ساتھ بحث کرنا پسند نہیں کرتا ایسے سطحی اعتراضات کے جوابات قبلہ سر سید مرحوم اور آنرایبل سید امیر علی صاحب جیسے جادو نگار مفصل اور واضح طور پر دے چکے ہیں۔ وہ وقت بعید نہیں کہ ان احکامات کی موزونیت ہر زمانے اور ہر ملک کے حسب حال ہونے کی پوری کیفیت واضح ہو جائے گی [۲۷۳]۔

آرمینیوں کے مفروضہ مظالم پر پوری دنیا میں جو شور برپا ہوا اس نے اردو خواں طبقے میں قسطنطنیہ کے حالات جاننے کے لیے ایک جوش پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے قسطنطنیہ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ نوازش

علی خان نے قسطنطنیہ یعنی دارالخلافت عثمانیہ کی دل چسپ کیفیت نامی کتاب لکھی۔اس کتاب میں عبدالحمید خاں غازی کے حالات کو بیان کرنے میں مولانا شبلی کے سفرنامے سے کافی مدد لی گئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ زیادہ حالات اسی کتاب سے نقل کیے گئے جن کا حوالہ مصنف نے دیا ہے[۲۷۴]۔

مفروضہ مظالم آرمینیا پر انشاء اللہ خان کی کتاب مفروضہ مظالم آرمینیا اور دول ثلاثہ اصل میں ان بہتان طرازیوں کے جواب میں لکھی گئی تھی جس میں آرمینیا کے باشندے ترکوں کے ظالم ہونے کی بابت اپنی مظلومیت کی من گھڑت داستانیں سناتے تھے۔انشاء اللہ خان کا کہنا ہے کہ ''آرمینیا میں ترکوں کے ظلم کی داستان اصل میں فرضی ہے۔ان داستان کو بیان کرنے میں یورپ کے چند نامی گرامی متعصب مدبرین کا ہاتھ ہے جنھوں نے مختلف عہدناموں کے ذریعے خاص کر عہدنامہ برلن، معاہدہ قبرص اور انسانی ہمدردی کو آڑ بنا کر برطانوی حکومت کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا جواز فراہم کیا تھا''[۲۷۵]۔

اس کتاب میں نپولین بوناپارٹ کے قید کیے جانے کی مختصر تاریخ اور اس کے ہم راہی کا خط بھی شامل ہے اور شورش آرمینیا کے متعلق ۲۵ ستمبر ۱۸۹۵ء تک کے واقعات مختصراً کتاب میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ متعدد ہم درد یورپین کی تقریریں بھی جمع کی گئیں جنھوں نے ترکی پر لگائے گئے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا۔جس کی وجہ سے یہ کتاب کافی حد تک اس مسئلے کے اہم پہلوؤں پر تجزیہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کتاب میں ۷رمئی ۱۸۹۵ء کو جیمس ہال لندن میں جو جلسہ ڈیوک آف آرگائل Duke of Argyll کی صدارت میں ہوا تھا اس کی روداد بھی موجود ہے۔ اس روداد میں لکھا گیا کہ ''سلطنت روم میں جو تکلیفیں عیسائیوں کو برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ صرف ان کی حرکات ناشائستہ کے طفیل ہیں اور وہ تکالیف یونانی پادریوں کی شرارت اور بے جا امنگوں اور خود عیسائیوں کے اپنے مختلف فرقوں کے باہمی جھگڑوں اور تنازعوں کے باعث پیدا ہوتی ہیں''۔سلطنت عثمانیہ نے اپنے کل قلم رو میں ان کو اپنے پادری اور مطابع اور کتب خانے قائم رکھنے اور دین عیسوی پھیلانے اور ترقی کرنے کے کل دیگر وسائل کو کام میں لانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی[۲۷۶]۔

اسی کتاب میں ۲۰رمئی ۱۸۹۵ء کو Liverpool میں عیسائیوں نے شورش آرمینیا کے متعلق جو جلسہ کیا

اس میں شیخ الاسلام عبداللہ کوئیلم (۱۸۵۶ء-۱۹۳۲ء) نے بھی تقریر کی۔ کوئیلم نے اس ظلم کی داستان کو جو سلطان عبدالحمید کی ذات سے وابستہ تھی اسے مفروضے پر مبنی قرار دیا تھا۔ اس جلسے کی تقریر میں عیسائیوں کا کہنا تھا کہ مفروضہ مظالم آرمینیا کا حکم سلطان نے اپنے خاص دستخطی فرمان کے ذریعہ دیا تھا۔ عبداللہ کوئیلم کا کہنا تھا کہ ابھی چند دن ہی گزرے ہیں کہ *Daily Telegraph* کے نامہ نگار نے کہا ہے کہ یہ فرمان محض جعلی کاغذات تھے[۲۷۷]۔

انشاء اللہ خان نے اپنی متعدد تصانیف میں اس امر کو ملحوظ رکھا کہ انگریزوں کی جانب سے ترکوں پر لگائے گئے الزامات کو انگریز مصنفین کی کتابوں سے رد کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اس عہد کے اہم انگریزی مصنفین کی کتابوں کے تراجم کیے اور سلطنت عثمانیہ کے بارے میں جاری منفی پروپگنڈے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اہم کتاب عہد حکومت السلطان عبد الحمید خان ثانی جو این ڈی لوسگنان Annie de Lusignan نے سلطنت عثمانیہ میں کئی برس رہنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں سلطان عبدالحمید کے بارہ سالہ عہد حکومت کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس کا مطالعہ یورپ اور ترکی کے پیچیدہ معاملات کی تفہیم کے لیے بنیادی ماخذ ہے۔ انشاء اللہ خان نے اس کتاب میں جابجا حواشی اور تعلیقات لکھ کر اسے معلومات افزا بنادیا ہے[۲۷۸]۔

سلطنت عثمانیہ میں جاری انجمن نوجوانان کی تحریک سے انشاء اللہ خان دوسرے ہم عصر ہندوستانی دانش وروں کے برعکس رائے رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "موجودہ سلطان کے بعد ہی ترکی کی آئندہ شکل کا تعین ہوگا۔ وہ بعض انتظامی خرابیوں کو مانتے تھے اور خطہ حجاز میں دوعملی کو بدانتظامی کا سبب قرار دیتے تھے۔ انھیں حالات نے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ انھوں نے یہ تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا کہ ترک آنے والے وقتوں میں یورپی بن جائیں گے"[۲۷۹]۔

ترک نوجوانوں سے مخالفت کے باوجود انشاء اللہ خان نے ترکی کے معاملات سے صرف نظر نہیں کیا نوجوان ترکوں کے قابل اور مستند انگریز دوست ای۔ ایف۔ نائٹ (E.F. Knight) کی کتاب The Awackening of Turkey کا ترجمہ کیا۔ البتہ دیباچے اور حسب سابق اپنی دیگر تصنیفات کی طرح اس میں بھی انھوں نے اپنی بات کہنے کی گنجائش بھی نکالی ہے[۲۸۰]۔ انشاء اللہ خان نے ای۔ ایف۔ نائٹ کو فری میسن بتایا تھا اور اسی کو بعض جوانان ترک سے دوستی کا سبب قرار دیا تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ:

سلطان عبدالحمید پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس کے مشیر اور وزرا جور و ستم کے ذریعے حکومت کرتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ اس کی فوجی قوت تھی۔ مگر موجودہ حکمران بھی جدید ترکی میں جو عدل و انصاف پھیلا رہے ہیں یہ بھی فوجی قوت کا نتیجہ ہے۔ اس عجیب تضادات کا فیصلہ تاریخ ضرور کرے گی[۲۸۱]۔

انشاء اللہ خان نے نوجوانان ترک کے ان بیانات کو جو انھوں نے سلطان عبدالحمید پر لگائے گئے تھے خالد خلیل بک کی کتاب *The Dairy of a Turk* کا ترجمہ کر کے انھیں غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب میں عبدالحمید کی شخصیت کو عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ خالد خلیل بک پہلی جنگ عظیم سے قبل ترکی کی حکومت کی طرف سے بمبئی میں قونصل کے عہدہ پر سرفراز تھے[۲۸۲]۔ ان کی یہ کتاب یورپ میں کافی مقبول ہوئی[۲۸۳]۔

سلطان عبدالحمید کی شخصیت سے انشاء اللہ خان بے حد متاثر تھے اس لیے انھوں نے ان کی نقرئی جوبلی کا حال بھی لکھا، وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ یہاں کے بعض بڑے شہروں میں کسی فرماں روائے ترکی کا جشن جوبلی اس شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس موقع پر حیدرآباد دکن میں ظفر علی خان نے قصیدۂ تہنیت پڑھا''[۲۸۴]۔

ان تصنیفی کاموں کے علاوہ تحریک اتحاد اسلامی کو فعال بنانے میں انشاء اللہ خان کا سب سے بڑا منصوبہ حجاز ریلوے کا تھا۔ انشاء اللہ خان پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھوں نے اس ریلوے کی تجویز اور اس تحریک کے لیے چندے کا آغاز کیا[۲۸۵]۔ سلطنت عثمانیہ میں عالم اسلام کے مسلمانوں کے ذریعے ریلوے کی تعمیر، تنظیم اور دیکھ بھال کا تصور ان کے ذہن میں تھا۔ چوں کہ یہ سلطنت مغربی طاقتوں کی مداخلت سے آزاد تھی اس لیے حجاز ریلوے کی تجویز کو انھوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا تاکہ عازمین حجاز کو سہولتیں فراہم کی جائیں[۲۸۶]۔ ڈاکٹر تنویر واسطی کے مضمون Muhammad Inshaullah Khan and tha Hijaz Railway میں کئی ایسے انکشافات کیے گئے ہیں جو حجاز ریلوے کے تعلق سے اہمیت کے حامل ہیں۔

تنویر واسطی کا خیال ہے کہ ''انشاء اللہ خان نے اپنی تجاویز ذاتی طور پر پیش کی تھیں لیکن اب یہ واضح ہے کہ اس نوع کے خیالات عثمانیوں کے ذہن میں بھی تھے۔ ان تجاویز کو ابتداء میں غیر عملی تصور کیا گیا تھا مگر بعد میں عثمانوی سلطنت کے مقتدر حلقوں میں ایک گونج کی طرح سامنے ابھری اور اس منصوبے کو نہ صرف عسکری،

حلقوں میں بلکہ سیاسی اور جنگی تعلق سے بھی اہم سمجھا گیا"[۲۸۷]۔

مولوی انشاء اللہ خان نے اخبار وکیل ہی میں حجاز ریلوے کے اجراء پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں پر اس ریلوے کے فوائد ظاہر کیے اور اس کی سیاسی اہمیت سے دنیا کو آگاہ کیا جو اس ریلوے کے ذریعے سلطنت عثمانیہ اور عالم اسلام کو حاصل ہونے والی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں حجاز ریلوے کو چندہ دینے کا مطالبہ بھی وکیل کے کالموں میں دیکھا جا سکتا ہے اور جب تک وہ اس اخبار سے وابستہ رہے کافی رقم جمع کر لی تھی[۲۸۸]۔

سلطان عبدالحمید کی خواہش حجاز ریلوے کے منصوبے اس لیے جڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنے اقتدار کو اور اپنی حیثیت کو تمام مسلمانوں میں بہ حیثیت خلیفہ منوانا چاہتے تھے اس خیال کو انھوں نے حجاز ریلوے منصوبے کے ذریعے اور تقویت دینی چاہی[۲۸۹]۔ انشاء اللہ خان کی کتابیں اور کتابچے حمیدیہ ایجنسی ترکی نے بھی شائع کی تھیں۔ جو اس سے قبل حمیدیہ سٹیم پریس لاہور سے شائع ہو چکی تھیں۔ انشاء اللہ خان کی ایک کوشش یہ بھی تھی کہ وہ اس منصوبے کے ذریعے سلطان عبدالحمید کی توجہ حاصل کریں۔ حجاز ریلوے کے تعلق سے چندہ جمع کرنے اور تشہیر کے عمل کو Ochsenwald اور Landua جیسے مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں مختصراً حوالہ بنایا ہے۔ ان دونوں مصنفین کا خیال ہے کہ حجاز ریلوے کی پہلی تجویز انشاء اللہ خان نے ہی پیش کی تھی[۲۹۰]۔

تنویر واسطی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ فلپ Philipp نے نشان دہی کی ہے کہ حجاز ریلوے کا خیال ۱۸۶۴ء میں عثمانوی اداروں کو Dr. Charles Zample نے پیش کیا تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں تنویر واسطی نے کئی اور بھی حوالے دیے ہیں مگر حجاز ریلوے پر مولوی انشاء اللہ خان کی کتاب نقشہ جات حجاز ریلوے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ تجویز حجاز ریلوے میں انھوں نے زیادہ تر خطوط کو اقتباس کے طور پر پیش کیا ہے۔ انگریزی کے حوالے بھی متن میں موجود ہیں[۲۹۱]۔

انشاء اللہ خان نے عثمانیوں کو مشورہ دیا تھا کہ اس دور کی مغربی صحافت نے سلطان عبدالحمید کے اس منصوبے پر جس انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے وہ توہین آمیز ہے[۲۹۲]۔ اس لیے مغربی ذرائع ابلاغ میں جاری منفی پروپگنڈے کو رد کیا جانا ضروری ہے۔ انشاء اللہ خان کے مضامین میں ریلوے لائن کی مدینہ تک تعمیر کے بارے میں وضاحت شامل تھی ان کی اس کتاب میں یہ بھی شامل ہے کہ ریلوے لائن کے ذریعے تحریک

اتحاد اسلامی کو تقویت ملے گی۔ ترک اور برطانوی تعلقات کی خرابی کے بعد جس میں برطانوی سیاست دانوں کے غلط اندازے بھی شامل تھے ایک منصوبہ بلقان میں ریلوے لائن کے تعلق سے بنایا گیا۔ انشاء اللہ خان نے ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے برطانیہ اور خلافت کے معاملات میں روحانی تصادم کو محسوس کیا[۲۹۳]۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ کے قریبی تعلقات اسلامی دنیا کو آگے بڑھنے میں معاونت فراہم کر سکتے ہیں[۲۹۴]۔

مولوی انشاء اللہ خان کی کتاب کے برعکس دلیل الحجاز والشام مولفہ حاجی غلام محمود طاہر حجاز ریلوے کی انتظام وانصرام کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تمام اسٹیشنوں کی تفصیلات فراہم کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''حسن اتفاق سے حجاز ریلوے اور قدس ریلوے کے سوائے حلب و بیروت کے ریلوے لینوں پر سفر کرنے کا موقع ملا لہذا خیال ہوا کہ حجاز ریلوے کے ساتھ دمشق سے بیروت اور حلب کی ریل۔ یافہ سے قدس کی ریل اور پورٹ سعید سے مصر کی ریل کے بھی حالات اردو زبان میں بطور ایک رسالے کے شائع کروں''[۲۹۵]۔

مصنف نے اس کتاب میں حاجیوں کی سہولتوں کو مدنظر رکھ کر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لیے اس ریلوے نظام کے ذریعے عالم اسلام میں جو تبدیلیاں آئیں اس کا تجزیہ نہیں ملتا۔ حجاز ریلوے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''ترکی اور شامی کاری گر سنگ تراش نجاری اور آہنگ گری کا کام کر رہے تھے۔ ریل کے ڈبوں میں خصوصاً درجہ اول کی گاڑی بہت عمدہ ہے۔ دو دو آدمی کے لیے ایک ایک کمپارٹمنٹ مراکو کے چمڑے سے مرتب اور ہر طرح سے آراستہ ہیں۔ ہر ایک کمپارٹمنٹ کے روبرو راستہ ہے''[۲۹۶]۔

ان کتابوں کے مقاصد یہ تھے کہ ہندوستانی مسلمان خلافت اور اس سے وابستہ نظام کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ انشاء اللہ خان انھیں مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے خلافت کی بقا کو عالم اسلام کی بقا سمجھا اور اس سے جڑے تمام منصوبوں سے جس میں حجاز ریلوے کا بھی منصوبہ شامل تھا، منسلک ہو گئے۔

انشاء اللہ نے ان سیاسی اور علمی کاموں کے علاوہ ترکی قواعد بہ زبان اردو بھی تین جلدں میں مرتب کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہندوستانی مسلمان میں ترکوں کی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے جسے وہ اردو زبان میں کوئی مستند کتاب نہ ہونے کی وجہ سے پورا نہیں کر سکتے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے اخبار

وطن نے ایک سلسلہ ترکی زبان کے سیکھنے کے۔ ۔ں کی اشاعت کا شروع کیا ہے۔اس کتاب میں حروف تہجی سے لے کر ترکی زبان کے قواعد کی پوری تفصیلات بیان کرنے کی کوشش کی گئی"[۲۹۷]۔اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ انشاءاللہ خان خود بھی ترکی زبان سے واقفیت رکھتے تھے۔اردو اور ترکی زبان کے روابط میں اس کتاب کو بنیادی حوالے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مولوی انشاء اللہ اصل میں ترکوں اور جنوبی ایشیا کی تاریخ میں کئی اہم حوالوں سے دیکھے جاتے ہیں۔جس طرح انھوں نے ترکوں پر کی جانے والی افترا انگیزیوں کا علمی بنیادوں پر جواب دیا ہے اس سے نہ صرف ترکوں کی تاریخ بلکہ مشنریوں کے کام اور ان کے رجحانات کا بھی پتا چلتا ہے۔ان کاموں میں سیدی علی رئیس (۱۴۹۸ء۔۱۵۶۳ء) کا سفرنامہ مراۃالمما لک بھی ہے جسے انگریزی میں آرمینیس ویمبری (Arminus Vambery،۱۸۳۲ء۔۱۹۱۳ء) نے اور اردو میں محمد انشاءاللہ خان نے ترجمہ کیا تھا۔

اس سفرنامے کے بارے میں ویمبری کا کہنا تھا کہ سیدی علی رئیس کے اس سفرنامے سے سولہویں صدی کے ایشیائی مسلمانوں کی شبیہہ کا خاکہ با آسانی کھینچا جا سکتا ہے کیوں کہ اس نے ہندوستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کے حالات خود دیکھ کر بیان کیے تھے سیدی علی رئیس خود بھی کئی علوم میں مہارت رکھتا تھا اس لیے اس کی تجزیے کی صلاحیت ایک عام آدمی سے کئی گنا زیادہ تھی[۲۹۸]۔

اس سفرنامے میں ایک باب "ہندوستان میں میرے تجربات" کے عنوان سے موجود ہے جو نہایت دل چسپ ہونے کے علاوہ اس وقت کے سیاسی حالات کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔کیوں کہ سیدی علی رئیس ہندوستان میں اس وقت آیا جب ہمایوں (۱۵۰۸ء۔۱۵۵۶ء) نے ہندوستان کو نیا نیا فتح کیا تھا۔اور دولت عثمانیہ عالم اسلام میں اس وقت مرکزی حیثیت رکھتی تھی اس لیے دولت عثمانیہ کے کسی بڑے فوجی افسر کی آمد کسی بھی ہندوستانی بادشاہ کے لیے کئی حوالوں سے کارآمد تھی اسی لیے ہمایوں نے اس امیرالبحر کا پرتپاک استقبال کیا اور اسے نہایت عزت واحترام سے نوازا گیا۔ہمایوں کے انتقال کے وقت سیدی علی رئیس اس کے ساتھ ہی تھا اس نے پورے واقعے کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

> جب میں ان کے تفرج گاہ سے رخصت ہونے کو تھا تو موذن نے اذان دی۔بادشاہ کی عادت تھی کہ جب یہ آواز ان کے کانوں میں پڑتی تھی تو تعظیماً زانو جھکا لیا کرتے تھے۔جب یہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اسی وقت موذن نے اذان دی حسب عادت انھوں نے زانو کو جھکا لیا مگر پاؤں پھسل گیا اور چند سیڑھیاں نیچے گرے۔جس سے ان کے سر اور بازو پر چوٹیں آئیں اور اسی میں ان کا

انتقال ہو گیا[299]۔

اس سفرنامے سے مغل بادشاہوں کے عثمانوی خلافت سے سفارتی تعلقات اور تہذیبی روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔عزیز احمد نے اپنی کتاب بر صغیر میں اسلامی جدیدیت میں بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ہمایوں اس امیر البحر سے کافی متاثر تھا۔سیدی علی رئیس نے نظم ونثر کا ذوق بھی پایا تھا اس لیے ہمایوں نے اسے شیر ثانی کا خطاب دیا جو ترکی زبان کا مشہور شاعر تھا[300]۔اس سفرنامے میں جا بہ جا ہندوستان میں وزرا کے ساتھ اس کی ملاقات اور سیدی علی رئیس کا اپنی شاعری کو ان کے دربار میں پیش کیے جانے کا تذکرہ کرتا ہے۔

ان تہذیبی اور علمی کتابوں کے تنوع کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انشاء اللہ خان ترکوں کی تہذیب سے کس طرح جڑے ہوئے تھے۔انھوں نے محاربات پلونا پر تین جلدوں میں لیفٹنٹ ولیم ڈی ہربرٹ کی کتاب کا ترجمہ محاربات پلیونا کے نام سے کیا۔اس کتاب کے ترجمے کیے جانے کا مقصد یہ تھا کہ پلیونا میں عیسائی مظالم کو ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔روس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مسلمانوں کا یہ خطہ عثمانیوں سے چھینا گیا۔ولیم ڈی ہربرٹ لکھتا ہے کہ:

> جب جون ۱۸۷۶ء میں بلگیریا میں بغاوت پھوٹ پڑی تو عیسائی بلغاریوں نے اس ریاست میں موجود مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔سلطنت عثمانیہ کے باشندے اچھی طرح جانتے تھے کہ اس شرارت کا بدنما داغ انیسویں صدی کی تاریخ پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ اس افترا انگیزی کا اصل محرک کون ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔انھوں نے عیسائیت کے نام پر ناگفتہ بہ مظالم ڈھائے۔اس صورت حال میں عثمانوی قوت نے باغیوں کی سرکوبی کی،اس پر جو شور اہل یورپ نے مچایا اور روس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر پلیونا پر حملہ کر دیا[301]۔

یہ کتاب بنیادی طور پر محاربات پلیونا کا روزنامچہ ہے۔جس میں جولائی ۱۸۷۶ء سے اپریل ۱۸۷۸ء تک کے حالات درج ہیں۔کتاب کے آخر میں ضمیمے میں غازی عثمان پاشا،مارشل طاہر پاشا اور پلیونا کے مختلف علاقوں کے جہاں ترکی افواج برسرپیکار تھی' نقشے بھی دیے گئے ہیں۔غازی عثمان پاشا کے باب میں مولوی انشاء اللہ خان نے دنیا بھر سے اس کی وفات پر جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے اسے بھی یہاں پر پیش کیا ہے۔اس ضمیمے میں ہندوستانی اخباروں کے تعزیتی نوٹ بھی شامل کیے گئے ہیں۔جس میں پنجاب آبزرور،اخبار حبل المتین،مشیر دکن،شمس الاخبار وغیرہ شامل ہیں۔شمس الاخبار مدراس ۲۸ رمئی ۱۹۰۰ء میں نہ صرف ان کی تعزیت کی بلکہ رشید بک عاکف پاشازادہ نے ان پر جو مرثیہ لکھا

اسے بھی پیش کیا تھا[302]۔ یہ مرثیہ ترکی زبان میں لکھا گیا تھا اس کا اردو ترجمہ انشاء اللہ خان نے کیا تھا[303]۔

انگلستان کے معروف دانش ور سر ایشمیلیڈ بارٹلٹ کی کتاب محاربات تھسلی یعنی کارزار روم و یونان کا ترجمہ بھی مولوی انشاء اللہ خان نے کیا ہے۔ یہ کتاب بھی تین جلدوں پر ہے اور اس میں جرمن اسٹاف کی سرگزشت بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے ترجمے کی غایت یہ تھی کہ محاربہ یونان وروم پر اردو میں جامع معلومات کی کمی کو دور کیا جائے۔ تاکہ جنگ کے اہم واقعات اور اس کے پیچھے موجود محرکات کا درست اندازہ لگایا جا سکے[304]۔

اس جنگ کی کوئی بنیادی وجہ نہ تھی۔ ترکوں کو مختلف محاذوں پر الجھا ہوا دیکھ کر یونان نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ سے ترکوں کو کئی فائدے حاصل ہوئے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ سلطنت عثمانیہ نے عیسائیوں کی ایک ریاست کو مسیحی اتحاد سے الگ کر دیا۔ اور اس کے اتحادیوں کو اس جنگ میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔ اس کتاب میں یونانی فوج کے نظام اور ترکی فوجی نظام پر بھی مواد ملتا ہے۔ اس جنگ کے اسباب و نتائج اور تھسلی کی جانب ترکوں کی پیش قدمی کی حکمت عملی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

مولوی انشاء اللہ کے ان علمی کاموں کو دیکھ کر دولت عثمانیہ کی صورت حال سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اندرونی کش مکش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ خان کی کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کے دلوں میں ترکوں کے حوالے سے پھیلائی جانے والی بدگمانی کو دور کرنا چاہتے تھے اور ان افترا انگیزیوں کا جواب دینا بھی مقصود تھا جو مستشرقین کے کاموں کی وجہ سے مسلمانوں کو اس عظیم سلطنت سے متنفر کر رہا تھا۔

مولوی انشاء اللہ خان کے برعکس جنوبی ایشیا میں اپنی شخصیت اور اپنے کاموں کے متنوع جہات کی وجہ کر مولانا ظفر علی خان تبلیغ اسلام اور تحفظ اقتدارِ اسلامی کے لیے اپنی زندگی کو صرف کر دیا اور مسلمانان ہند پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے جمال الدین افغانی کے اثرات کو جذب کیا[305] ساتھ ہی ممالک اسلامیہ میں جو بھی تجدد پسند لوگ آگے بڑھے ان کی جرأت آمیز کوششوں نے ظفر علی خان کی زندگی پر اپنے تاثر کو اور مضبوط کر دیا جس کی وجہ وہ ایک بے باک رہنما بن کر ابھرے[306]۔ انھوں نے جنوری ۱۹۱۱ء کے پنجاب ریویو میں جمال الدین افغانی پر ایک مختصر سا مضمون لکھا جو پروفیسر براؤن کی کتاب انقلاب ایران کے ایک باب کا ترجمہ ہے مگر اس میں ظفر علی خان نے متعدد اضافے کیے ہیں''[307]۔

ظفر علی خان کا کردار ہمیشہ سے اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے والا رہا ہے۔ سید جمال الدین افغانی کے علاوہ مشاہیر اسلام کے حالات لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور افغانی نے جس طرح پان اسلامزم کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ ظفر علی خان نے اس کی تعریف کی ہے[۳۰۸]۔ اتحاد اسلامی کے حوالے سے ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ ''اسلامی اخوت ایک سیدھا سادا جملہ ہے جس کے لیے ہمیں بہت زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یک جہتی اور باہمی ہم دردی و غم گساری جیسے جذبات رکھنا مذموم اور ناروا قرار نہیں دیے جاسکتے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ اہل یورپ اسے پان اسلامزم کا نام دیتے ہیں''[۳۰۹]۔

ایک نو جوان ترک جلال الدین نوری بے نے پان اسلامزم کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی اور ظفر علی خان سے فرمائش کی تھی کہ اس موضوع پر مسلمانان ہند کے نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ:

> پان اسلامزم کے تصور کو اگر اس لبادہ شر سے عاری کر دیا جائے جو مغربی خباثت نے اوڑھ رکھا ہے اور اتحاد بین المسلمین کے عام معنوں میں برتا جائے تو پان اسلامزم کوئی نئی قوت نہیں بلکہ قدامت میں اسلام کی ہم سر ہے[۳۱۰]۔

ظفر علی خان کا استدلال یہ ہے کہ اتحاد بین المسلمین کا تصور قرآن و حدیث میں پہلے ہی سے موجود ہے[۳۱۱]۔ ان کی نظر میں عرب، افغان اور ایران سب سلسلۂ اسلام کی کڑی تھے[۳۱۲]۔ اس لیے جلال الدین نوری بے کی کتاب پر انھوں نے لکھا ہے کہ ''مسلمانان ہند کا خیال ہے کہ وہ اوّل مسلمان ہیں اور اس کے بعد ہندوستانی، اسی طرح ہر طبقہ اور ہر جماعت کے ان بیسویں مسلمانوں نے، جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے یقین دلایا ہے کہ ان پر پہلا خون اسلام کا ہے اور اس کے بعد عثمانیت کا۔ اسلامی اخوت کی ہمہ گیری کے اس تصور میں پان اسلامزم کی تحریک کی سب سے بڑی قوت کا راز مضمر ہے اور مسلمانان ہند اس حقیقت کے اوّلین راز دار ہیں''[۳۱۳]۔

جنگ طرابلس کے موقع پر ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ انگریز اگر چہ بھس میں چنگاری ڈال کر بی جمالو کی طرح الگ کھڑے ہو گئے تھے اور انھوں نے طرابلس اور بلقان کی جنگ میں غیر جانب داری کا اعلان کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ بغض جوان کے دل میں دولت عثمانیہ کی طرف سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور جب انھوں نے مصر میں جس پر ترکی سیادت قائم تھی ترکی فوج کو طرابلس جانے کی اجازت نہ دی تو دنیا کو معلوم ہو گیا کہ ان کی نیت کیا ہے[۳۱۴]۔

ظفر علی خان نے اس پورے معاملے میں اخبار زمیندار کے ذریعے ترکوں کی مدد کی اور مسلمانوں کو بھی اس کے لیے ابھارا[۳۱۵]۔ مولانا ظفر علی خان اور دیگر مسلمان رہ نماؤں کی طرح سلطان عبد الحمید کو مسلمانان عالم کا خلیفہ تصور کرتے تھے۔ ان کی کتاب غلبۂ روم بنیادی طور پر خاندان آل عثمان کی خلافت کو دنیا میں درست قرار دینے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس معاملے میں ہمیں چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر اور ساتویں صدی عیسویں کے ربع اوّل پر غائر نظر ڈالنی ہوگی اور روس و ایران کے ساتھ عرب کے سیاسی تعلقات کی نوعیت دکھا کر اس معرکے کی تاریخ سپرد قلم کرنی ہوگی جو سورہ روم کا شان نزول ہے۔ اس کے بعد یہ ثابت کر کے سورہ مذکور کی تنزیل کے وقت تباہ حال رومیوں کے غلبہ کا قطعی حکم لگانا بظاہر اسباب طاقت بشری سے خارج اور حرف منصب نبوت سے مخصوص تھا[۳۱۶]۔

اس کتاب میں انھوں نے قرآن وحدیث کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلطنت روم کے حقیقی وارث ترکان آل عثمان ہیں موجودہ افتاد اصل میں علیٰ سبیل تفاؤل بلکہ علیٰ وجہ الایقان غلبہ روم کی بشارت کا اعادہ ہوتا ہوا دکھلائی دیتا ہے[۳۱۷]۔ ظفر علی خان کا یہ بھی کہنا تھا کہ نیابت جناب خاتم النبین کی اہلیت اس زمانے میں آل عثمان کا حصہ ہے اس لیے جہاد فی سبیل اللہ جو ایمان کی جان اور اعمال صالح کی روح ہے توفیق ایزدی مسلمانان عالم میں سب سے زیادہ مومنین مخلصین کے اسی گروہ کو عطا ہوئی ہے[۳۱۸]۔

اس کتاب کے لکھے جانے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ عثمانوی خلافت کو اسلامی قرار دیا جائے اور ان پر موجودہ ادبار کو قرآن کی سورہ روم سے استدلال کر کے یہ بتایا جائے کہ ایک بار پھر روم یعنی سلطنت عثمانیہ دنیا پر غلبہ حاصل کرے گا۔ اسی لیے اس کتاب کا نام بھی غلبہ روم رکھا گیا ہے۔

ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ ''باوجود صلیبی نعروں کے جو انگلستان کے چند مخبوط الحواس پادریوں کی طرف سے فضائے عالم میں گونج رہے ہیں اور باوصف ان مسلم آزاد مظاہروں کے جن میں انگریز قوم کا ایک بڑا طبقہ حصہ لے رہا ہے۔۔۔ تاکہ دنیا کو حقیقی امن وامان نصیب ہو اور بنی آدم کی ترقی کا وہ سلسلہ جسے گزشتہ جنگ یورپ نے منقطع کر دیا ہے ازسرنو جاری ہو جائے اس کی صرف ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان سے باہر ان ممالک میں جو جنگ سے پہلے دولت عثمانیہ کے زیر نگیں تھے، برطانوی ہوس کشور کشائی کو پاؤں نہ پھیلانے دیے جائیں کیوں کہ اسی میں برطانیہ کی خیر اور ہماری بھی نجات ہے''[۳۱۹]۔

ظفر علی خان کی تحریروں میں اتحاد اسلامی کی جھلک پوری آب وتاب سے کئی حوالوں سے موجود

ہے۔ خصوصاً ان کی شاعری میں ہمیں ایک بڑا حصہ اتحاد بین المسلمین کا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا وحید الدین مسلم پانی پتی کی تحریروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کئی مضامین پر اتحاد اسلامی کے اثرات موجود ہیں۔ حیات جاوید پر جب انھوں نے ریویو لکھنے کا آغاز کیا تو ترکی کے نام ور شاعر نامق کمال بے کے ان الفاظ سے کیا ہے:

> ایک انسان کی زندگی دوسرے انسان کے لیے روشنی کے مینار کی طرح ہے جو سمندر کے کنارے ڈولتے جہازوں کو اشارہ کرتا ہے کہ جلد بھنور سے نکل جائے۔ مبارک ہیں وہ جو اس اشارے کو سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے جہاز کو چٹانوں سے بچا کر نکل جاتے ہیں[۳۲۰]۔

اسی طرح انھوں نے ایک مضمون مسلمانوں میں زندہ دلی کیوں کر پھیل سکتی ہے لکھا اس میں انھوں نے مصری روشن خیال رہنما فرید بک کے الفاظ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کو اپنے منتہائے خیال کو بلند رکھنا چاہیے تا کہ وہ اس دنیا میں اپنی قومی ہستی کو قائم و دائم رکھ سکیں''[۳۲۱]۔

وحید الدین سلیم پانی پتی نے ۱۹ر فروری کے مسلم گزٹ میں اخبار الحقیقہ جو بیروت سے نکلتا تھا اس کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا جو جنگ طرابلس کی ایک دل چسپ کہانی کے نام سے چھپا۔ اس میں جنگ طرابلس میں شریک ایک نو جوان مصطفےٰ کی کہانی بیان کی گئی ہے جو طرابلس کی جنگ میں رضا کارانہ طور پر شریک جنگ ہوتا ہے[۳۲۲]۔

وحید الدین سلیم پانی پتی نے سانحہ کانپور پر بھی ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا اگر میں کانپور کا کلکٹر ہوتا۔ یہ سانحہ مسلمانوں کے ملی احساس کو سمجھنے کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وحید الدین کے قلم سے اس مضمون کا نکلنا تھا کہ لکھنؤ سے ۲۴ گھنٹے کے اندر انھیں نکل جانے کا حکم ہوا۔ انھوں نے اس شہر کو الوداع کہا اور لاہور جا کر اخبار زمیندار کی ادارت سنبھال لی لیکن اخبار میں چند مضامین ایسے لکھ دیے جس سے اس اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی[۳۲۳]۔

وحید الدین سلیم پانی پتی نے یکم جولائی میں علی گڑھ سے معارف نامی رسالہ جاری کیا اس رسالے کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ بلاد اسلامیہ کے نامور ترکی رسالوں کے نمونے پر اسے جاری کیا جائے اور اردو زبان کے علم و ادب کے دائرے کو وسیع کیا جائے تا کہ مسلمانوں میں روشن ضمیری اور علم اور اسلام سے ان کی وابستگی کو مضبوط بنایا جا سکے۔

وحید الدین سلیم پانی پتی کی تحریروں میں ہمیں اتحاد اسلامی کے رجحانات کا عکس دکھائی دیتا ہے اور انھوں نے بین الاسلامیت کو فروغ دینے کے لیے اپنے رسالے میں ترکی، عربی اور انگریزی کی اہم کتابوں کے تراجم پیش کیے۔ ان کے رسالوں میں کئی ایسے اصحاب تھے جنھوں نے ترکی کے اہم ادیبوں کی علمی کاوشوں کو اردو میں منتقل کیا جن میں سجاد حیدر یلدرم، مولانا عبدالعلی خان، مولانا حاجی محمد اسمٰعیل خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

ترکی اور عالم اسلام کے تاریخی اور تہذیبی رابطوں میں صرف تحریک اتحاد اسلامی کا مطالعہ کرنے سے بات نہیں بن سکتی۔ یہ تمام اسلامی ممالک صرف سیاسی سطح پر یکجا نہیں تھے بلکہ دل و دماغ بھی سے ایک دوسرے سے خود کو وابستہ محسوس کرتے تھے۔ اصل میں افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری توجہ صرف سیاسی رشتوں کے مطالعے پر صرف ہوتی ہے جب کہ ہم ان جذباتی اور ذہنی رشتوں کو ذرا برابر بھی توجہ نہیں دیتے جو روحانی طور پر مسلمانان عالم چودہ سو سال سے اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ اس پورے تانے بانے کو فراموش کر کے اتحاد بین المسلمین کے مطالعے کو مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اردو کے اس نثری سرمائے سے تاریخی، تہذیبی اور ادبی روایت کا پتا چلتا ہے جو عالم اسلام میں ہمیں ایک دوسرے سے مربوط کر دیتا ہے۔

اس نثری سرمائے میں کہیں کہیں دائرہ کار میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اختلاف سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ علم و دانش کی روایت اس سے نہ صرف مضبوط ہوتی ہے بلکہ فکر و عمل کے دائرے میں نت نئے تجربات بھی جنم لیتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱- محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ص ا
۲- ایضاً، ص ٦
۳- ایضاً، ص ٦، ۷
۴- ایضاً، ص ۷
۵- ایضاً، ص ۸
٦- کانپوری، عبدالرزاق، ۱۹۵۷ء، ص ١٦
۷- میر امن، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ۱۷
۸- طوق آر، خلیل، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴
۹- رئیس، قمر، ڈاکٹر، ۱۹۸۳ء، ص ٦۰-٦۱؛ حسن آرا سے آزاد نے اس شرط پر شادی کرنا منظور کی تھی کہ وہ جنگ کریمیا میں روس کے خلاف لڑیں گے اصل قصہ فسانہ آزاد اسی قدر ہے۔ مصنف کے زور قلم کا یہ عالم ہے کہ پچیس سو صفحات اس مختصر مطلب کو ادا کرنے میں صرف کر دیے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، ۱۹۲۸ء، مضامینِ چکبست، انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد
۱۰- سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ۱۹۸۴ء، جلد دوم، ص ۱۴٦، ۱۴۷
۱۱- ایضاً، ص ۱۴۹
۱۲- عارف، محمد، ڈاکٹر، ۲۰۰٦ء، ص ۳۳۹
۱۳- ایضاً، ص ۳۴۰
۱۴- ایضاً
۱۵- سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ۱۹۸۴ء، جلد اول، ص ۳۴۱
١٦- عارف، ص ۳۴۱
۱۷- سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ۱۹۸۴ء، جلد اول، ص ۵۸۷
۱۸- عارف، ص ۳۴۲
۱۹- سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ۱۹۸۴ء، جلد دوم، ص ۳۰۰
۲۰- عارف، ص ۳۴۸
۲۱- عبدالسلام، پروفیسر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۵
۲۲- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۹۳ء، ص ۲۹
۲۳- ایضاً، ص ۴۰

۲۴- فصیح، غلام قادر، ۱۸۹۸ء، ص ۱

۲۵- ______، ۱۸۹۸ء، دربار روس کے اسرار، ص ۱

۲۶- ایضاً، ص ۱۲۱

۲۷- فصیح، غلام قادر، ۱۸۹۸ء، ص ۲؛ جارج ڈبلیو رینالڈس کی تصنیف 'جوزف ولمٹ' کا اردو ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری نے 'گردش ایام' کے نام سے کیا تھا۔ تیرتھ رام فیروز پوری نے رینالڈس کی کتاب کے علاوہ دیگر یورپی مصنفوں کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا جس میں فسانہ لندن، 'نظارہ پرستان' اور 'انصاف' وغیرہ اہم ہیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری نے بیوٹی اینڈ پلیزر کا ترجمہ غرور حسن کے نام سے کیا تھا۔

۲۸- شہیدان کار تھہیج، ۱۸۹۹ء، اس کتاب کا ترجمہ ایم ایل آر نے کیا ہے۔ کافی تگ و دو کے بعد بھی مصنف کا پورا نام نہیں مل سکا، البتہ یہ کتاب مسز آر ڈیپ کے ناول کا ترجمہ ہے۔

۲۹- لال، منشی موہن، سن ندارد، ص ۱

۳۰- ایضاً، ص ۷

۳۱- نامعلوم، فروری ۱۹۲۴ء، ص ۱۶

۳۲- ایضاً، ص ۱۵

۳۳- ایضاً، ص ۱۶

۳۴- بشیر منڈیالوی، محمد، سن ندارد، ص ۱

۳۵- یلدرم، سجاد حیدر، جولائی ۱۹۰۰ء، ص ۵۶

۳۶- حیدر، قراۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۵۴

۳۷- ایضاً

۳۸- پانی پتی، وحید الدین سلیم، مولانا، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۰۱

۳۹- ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۲

۴۰- منگلوری، ممتاز، ڈاکٹر، ۱۹۷۸ء، ص ۴۱

۴۱- ہرگانوی، ص ۱۳۲، ۱۳۳

۴۲- منگلوری، ص ۳

۴۳- عقیل، معین الدین، جون ۲۰۰۸ء، ص ۴۱۰

۴۴- منگلوری، ص ۷۶

۴۵- ایضاً

۴۶- شرر، عبدالحلیم، ۱۸۸۹ء، ص ۱

۴۷- جعفری، سید مرتضی، ڈاکٹر، جون ۱۹۷۲ء، ص ۴۷

۴۸- منگلوری، ص ۸۶

۴۹- جعفری، ص ۴۷
۵۰- نعمانی، پروفیسر شرر، جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۵
۵۱- منگلوری، ص ۹۷
۵۲- نعمانی، پروفیسر شرر، جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۴
۵۳- منگلوری، ص ۱۲۹
۵۴- عقیل، معین الدین، ص ۴۱۰
۵۵- منگلوری، ص ۱۷۳
۵۶- ہالکمال، مارماڈیوک، ۱۹۲۵ء، ص ۱
۵۷- ایضاً، ص ۱۰۹
۵۸- حیدر، قرۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۵۱
۵۹- نامق کمال بے کی سوانح عمری کو مولوی عبدالعلی خان نے مرتب کی ہے۔ نامق کمال بے ایک شاعر کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے دادا احمد راتب پاشا بھی ترکی زبان کے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تصوف کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ نامق کمال بے شاعری اور نثر نگاری دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں۔ اردو کے کئی ادیبوں جن میں وحید الدین سلیم پانی پتی اور یلدرم نے ان سے بہت زیادہ اثرات قبول کیے ہیں، دیکھیے: رسالہ، معارف، اکتوبر ۱۹۰۰ء، علی گڑھ، ص ۱۲۶=۱۲۷
۶۰- حیدر، قرۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۵۱
۶۱- ایضاً
۶۲- ایضاً، ص ۴۹
۶۳- ایضاً
۶۴- یلدرم، سجاد حیدر، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۳
۶۵- قریشی، محمد نعیم، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۵
۶۶- ایضاً
۶۷- حیدر، قرۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹
۶۸- ندوی، سید رئیس علی جعفری، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۳
۶۹- ایضاً
۷۰- ایضاً، ص ۲۲۴
۷۱- ایضاً
۷۲- حیدر، قرۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۶۲
۷۳- ایضاً

۷۴- حسین، اقتدار، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء، ص ۵۵
۷۵- ایضاً، ص ۵۵، ۵۶
۷۶- حسین، اقتدار، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۴۳
۷۷- راشد الخیری، علامہ، جون ۱۹۳۴ء، ص ۵
۷۸- ایضاً، ص ۱۱
۷۹- ایضاً، ص ۲۶
۸۰- ایضاً، ص ۳۱
۸۱- ایضاً، ص ۳۵
۸۲- ایضاً، ص ۴۵
۸۳- راشد الخیری، علامہ، جنوری ۱۹۴۱ء، ص ۵۰
۸۴- ______، ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۲۹
۸۵- فوق، حنیف، ڈاکٹر، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۲۰
۸۶- شفیع، محمد، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۸
۸۷- ایضاً، ص ۱۹۹
۸۸- ایضاً
۸۹- ایضاً، ص ۲۰۰
۹۰- ایضاً، ص ۳۷۶
۹۱- ایضاً، ص ۳۷۶
۹۲- ملک، مسز شمیم، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۴۱۵
۹۳- شفیع، محمد، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۰، ۲۰۱
۹۴- ایضاً، ص ۲۴۷
۹۵- ملک، مسز شمیم، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۹
۹۶- شفیع، محمد، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۶، ۲۴۷
۹۷- ایضاً، ص ۲۴۷
۹۸- ایضاً، ص ۲۷۳
۹۹- ایضاً، ص ۳۸۸
۱۰۰- محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ص ۵۶
۱۰۱- حسین، ثریا، ڈاکٹر، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳
۱۰۲- نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، ص ۲۸۸
۱۰۳- حیدر، قراۃ العین، ۱۹۹۰ء، ص ۲۲۵

۱۰۴- نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، جلد اول، ص ۲۸۸
۱۰۵- ایضاً، ص ۲۸۸-۲۸۹
۱۰۶- ایضاً، ص ۲۸۹
۱۰۷- ایضاً، ص ۸۹
۱۰۸- نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، جلد سوم، ص ۲۰-۲۱
۱۰۹- ایضاً، ص ۲۱
۱۱۰- ایضاً، ص ۷۵
۱۱۱- ایضاً، ص ۵۴
۱۱۲- ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ۱۹۸۳ء، ص ۳۲
۱۱۳- ایضاً، ص ۵۶
۱۱۴- ایضاً، ص ۴۷
۱۱۵- ایضاً، ص ۷۵
۱۱۶- ایضاً، ص ۷۷
۱۱۷- ایضاً، ص ۱۰۵
۱۱۸- ایضاً، ص ۱۱
۱۱۹- ندوی، سید رئیس علی جعفری، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۱۴
۱۲۰- نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، ص ۵۲
۱۲۱- برنی، ضیاء الدین احمد، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۲۸ بلنٹ کی کتاب *India Under Rippon* کا اردو ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ رسالہ نگار میں ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔ بلنٹ پہلا برطانوی تھا جس نے البرٹ بل کی حمایت کی تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان کی سیاسی صورت حال اسے خودمختاری سے قریب کر دے گی۔
۱۲۲- نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، جلد سوم، ص ۵۷
۱۲۳- تمکین، منشی محمد آدم خان، مارچ ۱۹۰۷ء، ص ۳
۱۲۴- ایضاً، ص ۲
۱۲۵- ایضاً، ص ۸۹
۱۲۶- ایضاً
۱۲۷- قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۱
۱۲۸- خان، مہدی حسن، نواب، اگست ۱۸۸۹ء، گلگشت فرنگ، ترجمہ: مولوی عزیز مرزا، مطبع مفید عام آگرہ، ص ۴۳؛ نواب مہدی حسن خان پر انگریزی تہذیب کے اثرات غالب تھے۔ انھوں نے ایک آئرش

خاتون Ellen Gertrude Donnly سے شادی کی تھی۔ یہ شادی حیدر آباد دکن میں انھیں بہت مہنگی پڑی۔ ایک نامعلوم پمفلٹ *A Shocking Social Scandal* شائع ہوا جس میں ڈونلی پر الزامات کی بوچھاڑ کی گئی تھی۔ یہ پمفلٹ حیدر آباد دکن کے شرفاء میں تقسیم ہوا۔ پمفلٹ نگار نے ان پر سخت تنقید کی اور ان کی بیوی کے کردار کو مشکوک ثابت کیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب مہدی حسن خان لندن میں تھے۔ پمفلٹ نے اپنا بھر پور تاثر چھوڑا۔ مہدی حسن خان کو ۱۸۹۳ء میں حیدر آباد دکن میں ان کی ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ اپنے دفاع میں مہدی حسن خان نے ہتک کا دعویٰ دائر کیا' جو ایک صحافی ایس ایم مترا کے خلاف تھا۔ یہ صحافی *The Hyderabad Record* سے وابستہ تھا۔ یہ اخبار دکن کے ریزیڈنسی سے نکلتا تھا۔ مترا پر الزام لگایا گیا کہ وہ پمفلٹ کا مصنف اور ناشر ہے۔ اس سلسلے میں طویل سماعتیں ہوئیں' ریزیڈنسی بازار کے سپرینٹنڈنٹ اور جسٹس آف پیس V.Bosanquat نے مترا کو اپنے ایک فیصلہ میں باعزت بری کر دیا۔ ۱۸۹۳ء میں نظام کی نوکری سے نکالے جانے کے بعد مہدی حسن خان کی شہرت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ایک نامعلوم شاعر نے ان کی برخواستگی کو موضوع بناتے ہوئے ایک نظم لکھی۔

کیا عزت و جاہ مال کھو کر نکلا نامی تھا مگر نام ڈبو کر نکلا
اک میم کی الفت میں اسی سال افسوس کیا مہدی حسن ذلیل ہو کر نکلا

مزید تفصیلات کے لیے عمر خالدی کی کتاب *An Indian Passage to Europe*، مرتبہ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء۔

۱۲۹- قدسیہ، قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۱

۱۳۰- خان، مہدی حسن، نواب، اگست ۱۸۸۹ء، ص ۶۵

۱۳۱- ایضاً، ص ۱۶۲

۱۳۲- جہاں، نواب سلطان، ۱۹۱۱ء، ص ۱۱۳۔ یہ سفر نامہ ۱۹۱۱ء کے لندن پیرس اور قسطنطنیہ کی سیاحت پر مبنی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے سہ ماہی الزبیر، بہاول پور، شمارہ نمبر ۵، ۱۹۶۲ء۔

۱۳۳- ایضاً، ص ۱۱۳

۱۳۴- ایضاً، ص ۱۱۴

۱۳۵- ایضاً، ص ۱۱۶

۱۳۶- ایضاً، ص ۹۳

۱۳۷- ایضاً، ص ۱۲۲

۱۳۸- ایضاً، ص ۱۲۲

۱۳۹- عالم، محبوب، منشی، ۱۹۰۳ء، پروفیسر ویمبری کا سفر نامہ، کارخانہ پیسہ اخبار، ص ا؛ *Travels in Central Asia being the account of a journey from Tehran across the Turkoman Desert on the eastern shore of the Caspian to Khiva*

,*Bokhara* ,and Samarcand of the Hungarian academy of Pesth by whom he was Scientific mission. The investigator of the Anciant history of the East ,and yielding to none in knoweldge of the present condition of Central Asia. London, John Murry. Albe marless Street,1864.

ویمبری کے بارے میں سہ ماہی الزبیر ۱۹۶۲ء میں سر عبدالقادر کا ایک مختصر سا مضمون دو گھنٹے ویمبری کے ساتھ چھپا ہے۔ ویمبری کی شخصیت کو جاننے کے لیے نواب سلطان جہاں کے سفر نامے سیاحت سلطانی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں منشی محبوب عالم کے ترجمے کے بارے میں ویمبری نے جو کہا انھیں کے الفاظ میں پڑھیے۔

یہ کتاب تمھارے لاہور کی چھپی ہوئی ہے میری اس کتاب کا اردو میں خلاصہ چھپا ہے۔ اسے منشی محبوب عالم صاحب نے جو پیسہ اخبار کے اڈیٹر ہیں انھوں نے شائع کیا ہے اور سفر نامہ پروفیسر ویمبری اس کا نام رکھا ہے۔ کیا تم انھیں جانتے ہو۔ میں نے کہا جانتا کیا معنی وہ میرے بڑے دوست ہیں اور لاہور میں ہمارا وقت فرصت بیش تر اکٹھے صرف ہوتا تھا اس سے بہت خوش ہوئے' کہنے لگے انھیں بتا دینا کہ میں ان کے ترجمے کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ پیغام پہنچا دوں گا۔ یقیناً وہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔

۱۴۰- اشرف، آغا محمد، نومبر ۱۹۵۹ء، ص ۲۵

۱۴۱- ویمبری، ۱۹۱۰ء، ص ۲

۱۴۲- احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، ص ۴۷

۱۴۳- انشاء اللہ خان، مولوی، اپریل ۱۹۰۶ء، سیدی علی رئیس کا سفر نامہ، حمیدیہ سٹیم پریس لاہور، ص ۴۴۔ اس سفرنامے میں ترکی کا یہ امیر البحر جن ممالک میں گیا ان مقامات کی تفصیلات فراہم کرتا گیا ہے۔ چوں کہ وہ پرتگالیوں سے مقابلے کے لیے اپنے بحری بیڑے کے ساتھ نکلا تھا' مگر بحری بیڑے کی تباہی کی وجہ سے ہندوستان میں گجرات کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پڑا اور یوں ہمایوں کے دربار میں پہنچا۔ اس سفرنامے کو بھی ویمبری نے ترکی سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

۱۴۴- شوق، حافظ احمد علی خان، مارچ ۱۸۹۹ء، شہنشاہ جرمنی کا سفر نامہ سفر قسطنطنیہ، مطبوعہ مطبع احمدی ریاست رام پور، ص ۲،

۱۴۵- ایضاً

۱۴۶- ایضاً

۱۴۷- ایضاً، ص ۳

۱۴۸- بیگ، مرزا عرفان علی، ۱۸۹۵ء، ص ا

۱۴۹- برٹن، سر رچرڈ (Captain Sir Richard F. Burton)، سن ندارد، *Personal Narrative of a pilgrimage to Al-Madina and Mecca*، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، حمیدیہ سٹیم پریس

لاہور، ص ۳؛ برٹن ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں کیپٹن تھا۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے سات سال گزارے، پھر مہم جوئی کے شوق میں فوج سے چھٹی لی اور Royal Geographical Society کی طرف سے افریقا کے مشرقی ساحل کی تحقیقی مہم پر نکل گیا۔ وہ پہلا یورپین تھا جو جھیل ٹانگانیکا تک پہنچا۔ بعد میں دمشق اور آخر میں ٹریسٹ میں برطانیہ کی سفارت کاری کے فرائض انجام دیے۔ حکومت برطانیہ نے اسے سر کا خطاب دیا۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں وہ ٹریسٹ میں ہی انتقال کر گیا؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: رفیع الزماں زبیری، ۲۰۱۳ء، حرمین کے مسافر، فضلی سنز کراچی

۱۵۰- ایضاً، ص ۵

۱۵۱- ایضاً، ص ۶

۱۵۲- ایضاً، ص ۶، ۷

۱۵۳- حسن، حافظ احمد، ۱۸۷۱ء، *Pilgrimage to the Cabba and Charing Cross*، لندن؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: زبیری، رفیع الزماں، ۲۰۱۳ء، حرمین کے مسافر، فضلی سنز کراچی، ص ۱۱۳، ۱۱۴

۱۵۴- قریشی، عبدالمجید، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸

۱۵۵- قریشی، ایم نعیم، ۲۰۰۹ء، ص ۶۱

۱۵۶- نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۶۲ء، ص ۹۷

۱۵۷- سدید، انور، ڈاکٹر، اگست ۱۹۸۷ء، ص ۲۷، ۲۸

۱۵۸- امرتسری، حافظ عبدالرحمٰن، ۱۹۰۵ء، ص، ح

۱۵۹- ایضاً، ص ۶

۱۶۰- ایضاً، ص ۱۲۶

۱۶۱- ایضاً، ص ۱۴۹

۱۶۲- غلام الثقلین، خواجہ، اپریل ۱۹۱۲ء، ص ۳

۱۶۳- ایضاً، ص ۳۰۶

۱۶۴- ایضاً

۱۶۵- ایضاً، ص ۴۲۹؛ خواجہ غلام الثقلین نے یہ سفر ۱۹ مئی ۱۹۱۱ء میں شروع کیا اور ۲۸ نومبر ۱۹۱۲ء میں اختتام کو پہنچا۔ خواجہ صاحب مولانا الطاف حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۶۶- سدید، ص ۲۰۶

۱۶۷- اشرف، ص ۲۵

۱۶۸- ایضاً، ص ۳۹

۱۶۹- ایضاً، ص ۳۶

۱۷۰- ایضاً

۱۷۱- شبلی نعمانی، مولانا، ۱۹۲۸ء، ص ۲

۱۷۲- ایضاً، ص ۷۹

۱۷۳- ایضاً

۱۷۴- ایضاً، ص ۸۰

۱۷۵- ایضاً، ص ۸۱

۱۷۶- قدسیہ، ص ۳۱۷

۱۷۷- ایضاً، ص ۳۱۹ تا ۳۲۰

۱۷۸- عالم، منشی محبوب، باردوم ۱۹۹۷ء، ص ۷

۱۷۹- ایضاً، ص ۵۷۵، ۵۷۶

۱۸۰- ایضاً، ص ۵۷۶

۱۸۱- سدید، ص ۱۸۸

۱۸۲- بخاری، پطرس، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۴۲

۱۸۳- حیدر، ص ۹۵

۱۸۴- معین الرحمٰن، سید، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۸؛ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: ماہ نامہ رسالہ ۱۹۶۲ء پگڈنڈی امرتسر سجاد حیدر یلدرم نمبر شمارہ نمبر ۵ جلد ۹۔

۱۸۵- حیدر، ص ۱۹۴

۱۸۶- ایضاً، ص ۱۱۳

۱۸۷- مرزا حیرت دہلوی کو مذاہب کی چھان بین کا بہت شوق تھا۔ سیاحت کے گرویدہ تھے چناں چہ ایشیائے کوچک اور عرب کے علاقوں میں گھومتے رہے۔ عدن میں تھے کہ انگریزوں نے روس کا جاسوس سمجھ کر گرفتار کرلیا اور بمبئی کی ایک رجمنٹ میں نظر بند کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ شاعری بھی کرتے تھے مگر اپنی شاعری کو خود ہی تلف کردیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، اردو ادب، باب چہارم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۲۳۳

۱۸۸- دہلوی، مرزا حیرت، س ن، ص ۲

۱۸۹- ایضاً، ص ۴

۱۹۰- دہلوی، مرزا حیرت، ۱۹۰۶ء، ص ۶۵

۱۹۱- ______، ۱۹۰۱ء، ص ۲

۱۹۲- ______، ۱۹۰۴ء، ص ۲۲۲

۱۹۳- شیرانی، مظہر محمود، جنوری ۱۹۶۶ء، ص ۴۹

۱۹۴- ایضاً

۱۹۵- ایضاً،ص۴۹،۵۰
۱۹۶- شیرانی،حافظ محمود،۱۹۱۱ء،ص۵
۱۹۷- ایضاً،ص۶تا۷
۱۹۸- شیرانی،مظہر محمود،جنوری ۱۹۶۶ء،ص۵۴،۵۵
۱۹۹- ایضاً،ص۵۵
۲۰۰- ایضاً
۲۰۱- اسٹاڈرڈ،لوتھارپ،پروفیسر (Prof Lothroop Stoddard)،س ن،ص۱
۲۰۲- ایضاً،ص۳
۲۰۳- ایضاً،ص۳۲
۲۰۴- ایضاً،ص۵۰
۲۰۵- ایضاً،ص۶۷
۲۰۶- ایضاً
۲۰۷- ویمبری،آرمینیس،۱۹۱۰ء،ص۱۳۵
۲۰۸- ایضاً،ص۱۳۵
۲۰۹- ایضاً،ص۵۳
۲۱۰- ایضاً،ص۱۳۵
۲۱۱- ویمبری،آرمینیس،پروفیسر،نومبر و دسمبر ۱۹۱۰ء،ص۳۰
۲۱۲- ویمبری،آرمینیس،س ن،ص۱
۲۱۳- ایضاً،ص۴
۲۱۴- ایضاً،ص۱۲
۲۱۵- حقی،عظم زادہ،۱۹۰۷ء،ص۱
۲۱۶- ایضاً،ص۱
۲۱۷- ایضاً
۲۱۸- انصاری،محمد حلیم،۱۹۰۹ء،ص۳
۲۱۹- بینٹ،ارنسٹ این (Ernest N.Bennet)،مئی ۱۹۱۲ء،ص۱؛یہ انگریزی کتاب *With the Turkish in Tripoli* انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔
۲۲۰- ایضاً،ص۲
۲۲۱- ایضاً
۲۲۲- ایضاً،ص۳

۲۲۳- ایضاً، ص۵
۲۲۴- ایضاً
۲۲۵- عبد اللہ، محمد، منشی، ۱۹۱۲ء؛ یہ کتاب بھی Ernest N.Bennet کی کتاب *With the Turks in Tripoli* کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا مصنف انگلستان کا ممبر پارلیمنٹ تھا۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں دینیات کے پروفیسر ہونے کے علاوہ اخبار *Manchester* کے نامہ نگار کی حیثیت سے طرابلس کی جنگ میں نامہ نگاری کے فرائض بھی انجام دیے۔
۲۲۶- سی سی بگہم (C.C.Bigham)، ۱۸۹۸ء، ص۱۱؛ یہ کتاب انٹرنیٹ پر موجود ہے۔
۲۲۷- ایضاً، ص۱۴۲، ۱۴۳
۲۲۸- ایضاً، ص۷۵
۲۲۹- ایضاً، ص۱۰۶
۲۳۰- ثاقب، شہاب الدین، ۱۹۸۵ء، ص۱۱۲
۲۳۱- عبد الحق، مولوی، اپریل ۱۹۰۸ء، ص۳
۲۳۲- ______، ستمبر ۱۹۰۸ء، ص۳۱
۲۳۳- ثاقب، ص۱۱۰
۲۳۴- عبد الحق، مولوی، ۱۹۷۶ء، ص۱۲۷
۲۳۵- ______، اکتوبر ۱۹۰۷ء، ص۱۵۷
۲۳۶- ______، اکتوبر ۱۹۰۷ء، ص۱۶۷
۲۳۷- ثاقب، ص۱۱۳
۲۳۸- عبد الحق، مولوی، اکتوبر ۱۹۰۷ء، ص۱۶۰
۲۳۹- ______، ستمبر ۱۹۰۸ء، ص۳۴
۲۴۰- صدیقی، محمد اکبر الدین، اگست ۱۹۶۲ء، ص۴۸
۲۴۱- عبد الحق، مولوی، جون ۱۸۹۴ء، ص۳
۲۴۲- ______، اگست ۱۹۶۲ء، ص۷۸
۲۴۳- ثاقب، ص۱۱۳
۲۴۴- عبد الحق، مولوی، ۱۹۱۴ء، ص۸
۲۴۵- الہ آبادی، احمد حسین، ۱۸۹۸ء، ص۳
۲۴۶- لکھنوی، عظمت علی حسرت، مولوی، ۱۹۲۱ء، ص۲
۲۴۷- پاشا، غازی جمال، س ن، ص۳
۲۴۸- ذکاء اللہ، مولوی، ۱۹۰۴ء، ص۴

۲۴۹- آرنلڈ، پروفیسر(Thomas Walker Arnold)،۱۸۹۸ء،ص ا
۲۵۰- وحشی، مرزا رفیع الدین بیگ،۱۹۱۴،ص ۴
۲۵۱- بدرالدین، حاجی،۱۹۱۴ء،ص ۴
۲۵۲- ایضاً،ص ٦
۲۵۳- واسطی، سید تنویر، اپریل ۱۹۹۸،ص ٦۰
۲۵۴- انشاءاللہ خان، مولوی، س ن، ص ا
۲۵۵- ایضاً
۲۵٦- ایضاً
۵۲۷- مشیرالحسن،۲۰۰٦ء،ص ۱۴۸
۲۵۸- برنی، ضیاءالدین،۱۹۲٦ء، مشمولہ: 'نگار' اکتوبر ۱۹۲٦ء،ص ۲۹
۲۵۹- ایضاً
۲٦۰- بلنٹ، ولفرڈ اسکاؤن، فروری ۱۹۰۳ء،ص ۳
۲٦۱- ایضاً
۲٦۲- بلنٹ نے یہ مضمون ستمبر اکتوبر ۱۸۸۴ء میں رسالہ ہائے فورٹ نائٹلی ریویو (*Fortnightly Review*) میں تحریر کیا تھا۔ اس مضمون کے دو حصے تھے۔ حصہ اوّل میں اس نے ہندوستان میں زراعت پیشہ لوگوں کی حالت کا سیاسی لحاظ سے جائزہ پیش کیا تھا اور ملک کی آمدنی اور اس کے انتظام پر نکتہ چینی کی ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ انگریزوں کے قومی تکبر اور ہندوستانیوں سے ان کے تنفر پر مبنی ہے۔ مولوی انشاءاللہ خان نے بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کے ساتھ ساتھ ضمیمے کے طور پر اس مضمون کے دوسرے حصے کا ترجمہ بھی کیا ہے۔
۲٦۳- بلنٹ، فروری ۱۹۰۳ء، قومی تکبر اور ہندوستان سے تنفر، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، مطبع حمیدیہ لاہور، ص ۱۰
۲٦۴- ایضاً، ص ۱۱؛ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بلنٹ ان برطانوی حکام میں سے ایک تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کی پیشن گوئی کی تھی۔ اس نے جس کم عمری میں خارجہ امور میں نوکری کی اس سے بھی اس کے ذہنی استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر عربوں اور ترکوں کے مابین کئی اہم مواقع پر جب برطانوی حکومت مشکلات کا شکار تھی تو عالم اسلام میں اس نے اپنے وسیع تعلقات کو استعمال کر کے برطانویوں کی مشکلات کو آسان کیا۔ خصوصاً مہدی سوڈانی کے معاملے میں جنرل گارڈن کی ناکامی کو بچانے کے لیے جمال الدین افغانی اور بلنٹ کے خطوط کا مطالعہ کئی اہم پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ بلنٹ نے اپنی کتاب میں خلافت کو اہل قریش کے سپرد کیے جانے پر زور دیا تھا۔ یہ نظریہ برطانیہ کی ایک ایسی حکمت عملی تھی جس نے عربوں کو ترکوں سے بدگمان کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں عالم اسلام میں عثمانوی خلافت کی مرکزیت نہایت کم زور پڑ گئی تھی۔ Elizabeth Longford (۱۹۰٦ء-۲۰۰۲ء) نے بلنٹ کی سوانح عمری *A pilgimage of passion: The life of Willfrid Scawen Blunt* میں بلنٹ کے کردار کا عالم اسلام میں جائزہ لیا، جس میں اس نے بلنٹ ذاتی

ڈائری سے بھی مدد لی تھی۔

۲۶۵- انشاء اللہ خان، مولوی، س ن، ص ۱۰

۲۶۶- فوق، حنیف، ڈاکٹر، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۲۱؛ سڈنی وہٹ مین کا ابتدا سے جھکاؤ قوم پرست طلبہ تنظیم سے رہا ہے۔ پھر جب وہ صحافت سے وابستہ ہوا تو اس نے کئی ممالک کا سفر کیا۔ جس میں جرمنی، آسٹریا، ناروے، ترکی، روس اور ایشیا کے کئی علاقے شامل تھے۔ اس سفر کے دوران اس نے کئی مشکل حالات کا بھی سامنا کیا۔ اس نے یہ سفر دو اخباروں کے خصوصی نمائندوں کی حیثیت سے کیے ان میں ایک نیویارک اور دوسرا ہیرالڈ (Herald) ہے۔ ترکی کے بارے میں اس کی ایک اہم کتاب *Turkish Memories* کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کتاب میں اس نے مسئلہ آرمینیا کے بارے میں *The Armenian outbreak in Constantinople* کے نام سے ایک پورا باب تحریر کیا ہے جس کے اہم حصوں کا ترجمہ مولوی انشاء اللہ نے کیا ہے۔ اسی کتاب میں اس نے یونان اور ترکی کی جنگ ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اس کے بھی حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی دل چسپ ہے جس میں اس نے سلطان عبدالحمید، قصر یلدیز اور دیگر اہم ترک سرگرمیوں پر مضامین لکھے ہیں۔ اس کی یہ کتاب نیٹ پر دستیاب ہے۔ مگر اس کے ذاتی حالات نہیں ملتے۔

۲۶۷- واسطی، ص ۶۱

۲۶۸- فوق، ص ۲۱

۲۶۹- ایضاً

۲۷۰- ایضاً ص ۲۱، ۲۲

۲۷۱- انشاء اللہ خان، مولوی، ۱۸۹۸ء، ص ۱۵

۲۷۲- ایضاً ص ۶۲، ۶۳

۲۷۳- ایضاً ص ۶۳

۲۷۴- علی خان، نوازش، ۱۸۹۷ء، ص ۱۰

۲۷۵- انشاء اللہ خان، مولوی، بار سوم ۱۹۰۵ء، ص ۱

۲۷۶- ایضاً ص ۱۱، ۱۲

۲۷۷- ایضاً ص ۷۱؛ عبداللہ کوئیلم (۱۸۵۶ء۔۱۹۳۲ء) کا پرانا نام William Henry Quilliam تھا۔ وہ انگلستان میں لیور پول میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ مالی مشکلات کا شکار تھا۔ ان کے والد Robert Quilliam گھڑی ساز تھے۔ اسلام لانے سے قبل انھوں نے مراکش کا دورہ کیا اور ۱۷ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ وہ جب مراکش سے لوٹے تو اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ انھوں نے برطانیہ میں لیور پول میں Muslim Institute قائم کیا۔ وہ ہر ہفتے غیر مسلموں سے اس ادارے میں مناظرہ کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں ان کی ماں، ان کے بچے اور کئی سائنس داں و غیر مسلم دانش وروں نے اسلام قبول کیا۔

۲۷۸- فوق، ص ۲۲

۲۷۹- ایضاً،ص۲۳

۲۸۰- ایضاً؛ Edward Frederick Knight برطانیہ میں پیدا ہوا،اوراپنے خاندان کے ساتھ برطانوی ہندوستان میں ابتدائی عمر میں سفر کیا۔اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا ہے۔اس نے لداخ،نگراور گلگت کا دورہ کیا اور ۱۸۹۱ء میں گلگت میں رہتے ہوئے اس نے ہنزہ اور نگر کو ایک چھوٹی سی ریاست بنانے کے خلاف مہم چلائی۔اس کی کتاب *The Awakening of Turkey :A History of the Turkish Revolution* ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔جب ۱۸۷۸ء میں روسی اور ترکی جنگ جاری تھی تو اس نے البانیہ (Albania) اور مانٹی نیگرو (Montinegro) کے بارے میں وہ معلومات فراہم کیں کہ وہ بلقان سے کیوں واپس ہوئے۔

۲۸۱- ایضاً

۲۸۲- برنی،ضیاءالدین احمد،۱۹۶۱ء،ص۱۴۴

۲۸۳- ایضاً،ص۱۴۵

۲۸۴- فوق،ص۲۲

۲۸۵- مرتضیٰ،محمد،ستمبر۱۹۰۸ء،ص۲۳

۲۸۶- واسطی،ص۶۱

۲۸۷- ایضاً

۲۸۸- فوق،محمدالدین،اکتوبر۱۹۱۲ء،ص۲۵

۲۸۹- واسطی،ص۶۱

۲۹۰- ایضاً،ص۶۱،۶۲

۲۹۱- ایضاً،ص۶۲

۲۹۲- ایضاً،ص۶۵

۲۹۳- ایضاً،ص۶۶

۲۹۴- ایضاً

۲۹۵- طاہر،حاجی غلام محمود،۱۹۰۹ء،ص۳،۴

۲۹۶- ایضاً

۲۹۷- انشاءاللہ خان،مولوی،۱۹۰۳ء،ص۱

۲۹۸- ویمبری،اپریل ۱۹۰۶ء،ص۸؛اس سفرنامے میں ترکی کا یہ امیرالبحر جن ممالک میں گیا ان مقامات کی تفصیلات فراہم کرتا گیا ہے۔چوں کہ وہ پرتگالیوں سے مقابلے کے لیے اپنے بحری بیڑے کے ساتھ نکلا تھا مگر بحری بیڑے کی تباہی کی وجہ سے ہندوستان میں گجرات کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پڑا اور یوں ہمایوں کے دربار میں پہنچا۔اس سفرنامے کو بھی ویمبری نے قدیم ترکی سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

۲۹۹- ایضاً،ص۴۷

۳۰۰- ایضاً،ص۴۴؛میرعلی شیر وسط ایشیا کا ایک نامور ترکی شاعر گزرا ہے۔یہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۰۰ء میں اس کا

انتقال ہوگیا-اس کا تخلص نوائی تھا-اس کی نظمیں آج بھی بہت شوق پڑھی جاتی ہیں-

۳۰۱- ہربرٹ، ولیم ڈی، ۱۹۰۰ء، ص۵

۳۰۲- انشاء اللہ خان، ۱۹۰۰ء، ص۱۱۴

۳۰۳- ایضاً، ص۱۱۴؛ مولوی انشاء اللہ خان نے رشید بک عاکف کے مرثیہ کا ترجمہ اس انداز میں کیا ہے۔

مومنوں روؤ کرو اے ترکیوں آہ و فغاں — کھو دیا تم نے آج اپنا وہ مقدس پہلواں
جس نے رکھا تھا جنگ سابق میں پلونا کو بچا — جو تھا اپنے وقت کا عثمان اور شیر خدا
جو دلیری میں جہاں میں قابل تعظیم تھا — دولت عالی کا جو تھا یک وزیر باوفا
قوم کی آئندہ امیدوں کا تھا جس پر مدار — مصحف قومی کی جو تھا ایک آیت نور بار
عصمت و اخلاق پاکیزہ کی جو تصویر تھا — زبدہ اسلامیاں اس کو کہیں تو ہے بجا
نور نصرت جس کی پیشانی سے تھا لمعہ فگن — جس کا سینہ غیرت قومی کا گویا تھا چمن

۳۰۴- انشاء اللہ خان، مولوی، ۱۸۹۹ء، پیش لفظ، محاربات تھسلی، ص ا

۳۰۵- زیدی، نظیر حسنین، ڈاکٹر، جون ۱۹۸۶ء، ص۲۳۰

۳۰۶- ایضاً، ص۲۳۱

۳۰۷- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۹۳ء، ص۸۸

۳۰۸- ظفر علی خان، مولانا، س ن، جمال الدین افغانی، ص۱۷

۳۰۹- ذوالفقار، ص۸۹

۳۱۰- طارق، رابعہ، اگست ۱۹۹۹ء، ص۱۹۶

۳۱۱- ایضاً

۳۱۲- زیدی، ص۲۳۲

۳۱۳- طارق، ص۱۹۶

۳۱۴- ایضاً، ص۱۴۹

۳۱۵- ایضاً

۳۱۶- ظفر علی خان، مولانا، س ن، ص۶

۳۱۷- ایضاً، ص۶، ۷

۳۱۸- ایضاً، ص۷

۳۱۹- ظفر علی خان، مولانا، ۱۳۳۹ھ، ص۷۸

۳۲۰- پانی پتی، وحید الدین سلیم، مولانا، جون ۱۹۰۱ء، ص۱۶۱

۳۱۲- ______، ۱۹۶۱ء، ص۱۸۶

۳۲۲- ایضاً، ص۱۹۹

۳۲۳- پانی پتی، روشن، جنوری ۱۹۵۵ء، ص۶۴

باب ششم

تحریک اتحاد اسلامی اور اُردو شاعری

تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری

تحریک اتحاد اسلامی (Pan Islamism) انیسویں صدی میں مسلمان ممالک کو انحطاط سے نکالنے کے لیے جمال الدین افغانی اور سلطنت عثمانیہ نے شروع کی۔ چوں کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت عثمانیہ کی خلافت کو روحانی، سیاسی اور تہذیبی طور پر اپنا رہ نما تسلیم کرتے تھے اس لیے ہندوستان کے مسلم دانش وروں کا بڑا طبقہ تمام تر مسلکی اور علاقائی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس میں شامل ہو گیا۔

ان دانش وروں میں علما، سیاست دان اور ادیب شامل تھے۔ اس لیے اس تحریک کے اثرات ادب پر نہایت وسیع انداز میں موجود ہیں۔ اسی لیے انیسویں صدی کے اردو ادب پر عالم گیر سیاسی اثرات کئی حوالوں سے موجود ہیں۔ اس مقالے میں اس تحریک کو مد نظر رکھتے ہوئے چند اہم اور منتخب شاعروں کی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔

تحریک اتحادِ اسلامی کے اثرات اپنی جگہ مگر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے کئی حوالوں سے ہندوستانی معاشرے پر ہمہ گیر اثرات مرتب کیے ہیں اور اردو شاعری بھی اس انقلاب کا خاص موضوع رہی ہے[۱]۔ پھر ہندوستانی مسلمان جن سیاسی اور سماجی حالات سے دوچار تھے اس نے ان کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے، ان میں وطنیت کا تصور سیاسی محکومی کا شدید احساس اور اتحاد بین المسلمین کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے[۲]۔ ملکی زندگی کے یہ چند خد و خال بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں ہنگامے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس دور میں ہر شخص زندگی کے مسائل و مصائب کا ہمت سے مقابلہ کرنا سیکھ چکا تھا اور اپنی ذات کا عرفان اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ کسی فرضی معشوق کے آستانے پر مسلسل ناصیہ فرسائی ممکن نہ رہی تھی۔ وطن کی سربلندی، قوم کی اصلاح، ملت کی تعمیر، مشاہیر اور اکابر کی تعریف، سیاسی مسائل کا ذکر، مناظر قدرت کو بیان کر کے شعرا ادبی عظمت محسوس کرنے لگے تھے[۳]۔ اگر مزید صراحت پیش کی جائے تو اس دور میں غزل گوئی کے قدیم رجحانات پر زوال آ گیا تھا[۴]۔

تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات شاعروں کے یہاں شہر آشوب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان

نظموں میں جہاں ملت کے برباد ہو جانے کا غم موجود ہے وہاں اس بات کا بھی ملال ہے کہ اگر یہ ملت ایک کڑی میں پیوستہ ہوتی تو شاید یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی جسے مجاہد شاعر بھی کہتے ہیں [۵]، انھوں نے اپنی شاعری میں مغربی اثرات جو ہندوستانی معاشرے میں پڑ رہے تھے اس کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری کے لیے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔ اس جنگ آزادی میں چوں کہ وہ خود بھی شریک تھے اس لیے اس کی ناکامی کا انھیں بے حد قلق تھا۔ انھوں نے اپنی حبسیہ شاعری میں اس کا ذکر نہایت دردمندانہ انداز میں کیا ہے ان کی ایک غزل میں ملت میں نااتفاقی اور انگریزوں کی دیدہ دلیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

سر کاٹنے کی تیغ ادا کو خبر نہ ہو
یوں جان لیجیے کہ قضا کو خبر نہ ہو
دل سے سوا بلند رہے حوصلہ مرا
پہنچوں وہاں کہ بخت رسا کو خبر نہ ہو [۶]

میر اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے تصور ملت کی اور نکھری ہوئی صورت تحریک جہاد کے متعلق مومن خان مومن کی مثنوی جہادیہ میں نہ صرف آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی بلکہ بے دین نصاریٰ سے بھی نجات حاصل کرنے کو مذہبی فریضہ کہا گیا ہے [۷]۔ وہ کہتے ہیں:

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور — کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
برنگ مئے ایماں کو آجائے جوش — نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
پئے تشنہ کامی سبو در سبو — پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھادوں بس انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا [۸]

اس مثنوی میں مومن خان مومن نے جہاں ملی احساس کو نمایاں کیا ہے وہاں انھوں نے اتحاد بین المسلمین کا بھی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ تحریک جہاد صرف انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے

ہی نہیں چلائی گئی تھی بلکہ اس کے پس منظر میں اسلامی شریعت کا بھی نفاذ تھا اس تحریک کی ناکامی نے اس پورے عمل کو کافی نقصان پہنچایا۔ مثلاً ان کے ان اشعار میں اتحاد اسلام کا منظر یوں بیان ہوا ہے:

خبردار ہو جاؤ اے اہل دل — کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
جو داخل سپاہ خدا میں ہوا — فدا جی سے راہ خدا میں ہوا
حبیب حبیب خداوند ہے — خداوند اسی سے رضامند ہے[9]

ان نظموں اور مثنویوں میں عیسائی پادریوں کی چیرہ دستیوں اور عوام کے معاشی استیصال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے مولوی لیاقت اللہ کی ایک مثنوی قابل ذکر ہے۔ یہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے پر جوش مبلغ تھے۔ کنہیا لال کپور کا کہنا ہے کہ ''موصوف الٰہ آباد میں جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے اور انھوں نے وہاں کے باشندوں میں نصاریٰ کی حکومت کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا یہ نظم صرف سنائی ہی نہیں جاتی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اسے کھڑے ہو کر پڑھتے اور نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس جہادیہ مثنوی میں قرآن وحدیث کی روشنی میں جہاد کی تلقین کی گئی ہے''[10]۔

جو مسلماں رہ حق میں لڑا گر لحظہ بھر — روضۂ خلد بریں ہوگیا واجب اس پر
اے برادر تو حدیث نبوی بھی سن لے — باغ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے
دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر — سات سو اس کو خدا دیوے گا روز محشر
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں — مثل دیوار جو سر باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو! سنو تم نے جو خوبی جہاد — چلو اب ان کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد[11]

الطاف حسین حالی: (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

قومی وملی شاعری کا آغاز حالی کی جدت پسند طبیعت سے اردو میں ہوتا ہے۔ انھوں نے روایتی غزل گوئی میں مضامین کے حوالے سے بھی بڑی اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ حالی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ شاعری کے ذریعے اصلاح کا کام لیں[12]۔ حالی کی مسدس کا جائزہ تو بعد میں لیا جائے گا پہلے ان کی غزل میں اتحاد اسلام یا ملت کے موجود عناصر کا جائزہ لیتے ہیں۔

حالی کی غزل گوناگوں کیفیات، رجحانات اور مختلف حالات سے متاثر ہوتی رہی ہے[13]۔ انھوں نے صداقت اور حقیقت نگاری اور نفس انسانی کا مطالعہ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے[14]۔ اسی لیے ان کی غزل اس رویے کی وجہ سے زندگی کے وسیع تجربات ومشاہدات پر محیط ہے[15]۔ اس کی وجہ سے غزل میں شعور واحساس کی ایک نئی فضا، خیالات کی ایک نئی دنیا نظر آئے گی۔ سیاسی حالات، اخلاق، عمرانی تصورات، قوم کی بربادی پر نوحہ، تعمیر نو کا جذبہ، غرض ہر مضمون ان کی غزل میں کا موجود ہے[16]۔

درمندی حالی کی سیرت اور کلام دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں کا لب ولہجہ ناصحانہ ہے[17]۔ نصیحت کا یہ عمل ملی عناصر کو لیے ہوئے ایک عجیب طرز احساس کا حامل ہے جس سے اردو شاعری پہلے واقف نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر   آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت
رہ نماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا   راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت
یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار   راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت[18]

ناصحانہ رویوں کے علاوہ ان کی غزلوں میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا ادراک بھی موجود ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر غزل میں نیم سیاسی خیالات کو داخل کیا ہے۔ یوں بھی اگر اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی حالات پر نظر ڈالی جائے تو شاید کسی بھی شاعر کے لیے ان خیالات سے مفر ممکن نہیں تھا۔ حالی کا کہنا ہے کہ:

دو بے نواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو!   بس جام جم ہمارا اور ملک جم تمھارا
روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا   دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا[19]

پھر اسی غزل میں درپردہ طور پر ہم مسلمانوں کو یہ سبق دیا جارہا ہے کہ حادثات، امیدوں اور حوصلوں کو جلا بخشتے ہیں لہٰذا سانحات سے سبق حاصل کرتے ہوئے امید وحوصلہ کی جانب قدم بڑھانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی غزل نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر جہاں اپنے مزاج میں تبدیلی کا عندیہ دیتی ہے[20]۔ وہیں ملک وقوم میں جذبہ تعمیر ان کا مستقل موضوع بن جاتا ہے[21]۔

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو! ہماری   احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمھارا
پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم   گم ہے تمھی میں یارو باغ ارم تمھارا[22]

مسلمانوں میں موجود نااتفاقی کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم　　اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا[۲۳]

حالی کی غزل میں لفظیات پر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کا انداز بھی نظمیہ ہے کیوں کہ غزل جب بھی اپنے روایتی انداز سے جدا ہوتی ہے فوراً اس کا انداز نظمیہ ہو جاتا ہے۔ مگر حالی کی غزل روایت سے انحراف نہیں ہے بلکہ ایک نئی روایت کی بناڈالتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اصل میں معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ان کی شاعری سے کہیں عظیم تھا اور اسی کام نے ان کی غزلوں میں جدت کا احساس نمایاں کیا ہے۔ کئی مثالیں ایسی ملتی ہیں جس میں مسلمانوں کو متحد ہو کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ　　یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر　　کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی　　حالی نکل سکے گا نہ دل کے بخار بس[۲۴]

حالی کی شاعری اپنی وسعتوں کی وجہ سے زندگی اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور نئی ادبی روایات کو بھی قائم کر دیتی ہے جو یقیناً ایک قوم اور ملک کا مقدس ورثہ ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے ہم باآسانی مسلمان قوم کی ثقافت و تہذیب کا جائزہ لے سکتے ہیں[۲۵]۔ حالی اپنے عہد اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اس انداز سے نوحہ کناں ہیں کہ بعض اوقات گریہ کا سا انداز محسوس ہوتا ہے انھوں نے غیروں کے تسلط کو طنز کا بھی نشانہ بنایا ہے:

ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں[۲۶]

اپنی ایک غزل میں عالم اسلام کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن کی　　ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے　　ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن

قبر اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو　　زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں

اسی غزل کا یہ شعر مسلمانوں کی پوری عظمت رفتہ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی　　تم نے سنا بھی اس پر کیا گذری انجمن میں[۲۸]

حالی کی غزل میں قوم و ملت کی صورت حال کا دکھڑا جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ کسی اور غزل گو شاعر کے یہاں کم ہی دکھائی دیتا ہے[۲۹]۔ مسلمانوں پر چھائی ادبار کو دیکھ کر انھوں نے یوں شکوہ کیا ہے:

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشت امید آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ[۳۰]

غرض یہ کہ حالی کی اور دیگر نظموں کے علاوہ غزل میں ملی نشاۃ الثانیہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے انھوں نے مسلمانوں کی اجتماعی صورت حال کا شاید اس سے بہتر اظہار اور نہیں کیا ہوگا:

خندہ زن ہے اس مسلمانی پہ کفر جیسی ہے حالی مسلمانی مری[۳۱]

مولانا حالی کی غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں اور مسدس مدوجزر اسلام میں بھی پان اسلامزم کے خیالات ملتے ہیں۔ حالی کی مسدس اور شکوۂ ہند ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ حالی کا ان دونوں نظموں میں اسلامیان ہند کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی زبوں حالی اور پستی و پامالی کی جو داستان بیان کی گئی ہے اس میں یکسانیت اور مماثلت تو ہے مگر دونوں نظموں میں مسلمانوں کے اوصاف کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا کسی اور شاعر کے یہاں محال ہے[۳۲]۔ مسدس مدوجزر اسلام میں اتحاد اسلامی کے جذبات کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

وہ گھر جس میں دل ہوں ملے سب کے باہم خوشی ناخوشی میں ہوں سب یارو ہم دم
اگر ایک خوش دل تو گھر سارا خرم اگر ایک غمگیں تو دل سب کے پر غم[۳۳]

حالی نے اس نظم میں عالم اسلامی کے ان خصائص کا تذکرہ کیا ہے جو مسلمانوں کا کبھی طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ تحقیقی انداز میں مسلمانوں کے اہم اوصاف کو جس انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اس سے ان کے ملت کے تصور کو باآسانی سمجھا جاسکتا ہے[۳۴]۔ اس نظم میں موجود ملت اسلامیہ کے عروج کے یہ مرقعے عظمت رفتہ کے دل پذیر نقوش اجاگر کر دیتے ہیں[۳۵]۔ انھوں نے مسدس میں ترکمانی صولت، اعرابی نطق، یثربی مہمان نوازی اور اخوت اسلامی کی ترکیبوں کو استعمال کر کے اپنے ملی شعور سے دوبارہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی تلقین کی ہے۔ اگر اس نظم میں ان اوصاف کی فہرست کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ملت اسلامیہ کی دیرینہ عظمت و وقار کا احساس اور اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے[۳۶]۔

عراقین و شامی و خوارزم و توراں — جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں
رہیں پے سپر کر کے کو ہ وبیاں — پہنچتے تھے طلاب افتاں و خیزاں
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا تانتا بندھا تھا[۳۷]

عظمت رفتہ کے ان مرقعوں کو پیش کرنے کے بعد حالی دفعتاً زوال ملت کے دل خراش مناظر بیان کرنے لگتے ہیں جو پڑھنے والوں کے دلوں میں تڑپ جانے والی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ عروج وزوال کی اس داستان کا تجزیہ کرتے ہوئے حالی یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا عروج دین اسلام سے متابعت کا نتیجہ تھا اور ان کے موجودہ زوال کا سبب انھیں اصولوں اور اتحاد سے روگردانی و انحراف ہے[۳۸]۔ مسدس کے ایک حصے میں کہتے ہیں کہ:

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک — کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
مَلایا میں ہیں ان کے آثار اب تک — انھیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر
نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر[۳۹]

نہیں اس طبق پر کوئی برّ اعظم — نہ ہو جس میں ان کی عماراتِ محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام دیلم — بناؤں سے ہیں ان کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا[۴۰]

حالی کا کہنا ہے کہ دیلم یعنی بحرۂ کیسپین کے جنوب پہاڑی علاقہ جو پہلے ایران میں تھا اب روس میں ہے[۴۱]۔ وہاں سے لے کر کوہ بیضا اندلس میں ایک برف پوش چوٹی تک مسلمانوں کے یادگار نقوش، تاریخ کا حصہ ہیں[۴۲]۔ حالی نے اس مسدس میں جا بہ جا استعارات کے ذریعے مسلمانوں کی عظیم قوتوں، جن میں سلطنت عثمانیہ بھی شامل ہے کی بھی تصویر کشی کی ہے ساتھ ہی دیگر قوموں اور ملکوں کی زبوں حالی کی صورت حال بیان کی ہے۔

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا — نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا

پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا　　پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا[۴۳]

یہاں پر لفظ جہاز بہ طور استعارہ ہے۔ بحر روم پر تسلط اور زبردست جہازی بیڑے کی مناسبت سے حالی نے مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کی جانب اشارہ کیا ہے جب کہ چراغ سلطنتِ ایران کی جانب اشارہ کررہا ہے[۴۴]۔ حالی نے مسدس میں مسلمانوں کی ان جگہوں کا خاص ذکر کیا ہے جو کبھی سلطنت اسلامیہ کا حصہ تھیں مگر روس اور دوسری یورپی جارحیتوں نے اسے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اپنے مسدس میں مسلمانوں کی مشہور علمی طور پر درسگاہوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اسی طرز پر دوبارہ اپنی نئی زندگی کی بنیاد ڈالیں۔

حالی کی شاعری مسلمانوں کے احیا کی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ہاتھوں سے آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں مسلمان قوم اپنی صورت حال ملاحظہ کر سکتی ہے کہ وہ کون تھے اور کیا ہوگئے[۴۵]۔ حالی کی شاعری مسلمانوں کے احیا کی تحریک کا آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ہاتھوں سے آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں مسلمان قوم اپنی صورت حال ملاحظہ کر سکتی ہے کہ وہ کون تھے اور کیا ہوگئے۔

حالی نے یہ نظم اسی لیے لکھی تھی کہ مسلمانوں پر جو بلا خیز طوفان آئے تھے، اب ضرورت ہے دوبارہ اپنے آپ کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے، جدوجہد کرنے کی تاکہ دوبارہ مسلمان علم وفن کی دنیا میں اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرلیں جو ان کا شاندار امتیاز رہا ہے۔ اسی لیے اس نظم میں خودشناسی وخودنگری کی مثال کئی جگہ موجود ہے۔

الپ ارسلان سے یہ طغرل نے پوچھا　　کہ قومیں جو دنیا میں ہیں جلوہ فرما
نشاں ان کے اقبال مندی کے ہیں کیا　　کب اقبال مند ان کو کہنا ہے زیبا
کہا ملک ودولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک
جہاں جائیں وہ سرخرو ہو کے آئیں　　ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں　　نہ اکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں

کریں مس کو گر مس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو[46]

آخر میں انھوں نے مسدس میں دعا مانگی ہے اور یہ دعا ملت اسلامیہ کے نشاۃ الثانیہ کی خواہش لیے رقت انگیز انداز میں ڈھل کر دل سوزی و درد مندی کی تفسیر بن جاتی ہے:

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جس دیں کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے[47]

مولانا ظفر علی خان نے جنگ بلقان کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی مدد کے لیے جس طرح تیار کیا حالی اس سے متاثر تھے۔ انھوں نے ایک نظم شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان اگست ۱۹۱۳ء میں زمیندار اخبار کے لیے بھیجی تھی[48]۔ اس نظم میں حالی کہتے ہیں کہ:

بلقان و طرابلس میں ناگاہ — اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردی اہل دیں نے آخر — جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر — دامن ہوا چاک تا گریباں[49]

حالی نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگ بلقان کے واقعات پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا مگر اس واقعے سے قبل انھوں نے ایک قطعہ ترکی کے سلطان عبدالعزیز کے قتل کے بعد سرویا مانٹی نیگرو اور روس کے مقابلے میں ترکی نے جو جنگ کی اس پر بھی لکھا تھا[50]۔

خبر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ نا ساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگر گوں زمانے کے انداز
ٹڈیوں کا ہے کھیتوں پہ ہجوم — بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز
ہو گا انجام دیکھیے کیا کچھ — ہے پر آشوب جب کہ یہ آغاز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر　　موج حائل ہے اور ہوا ناساز[۵۱]

شبلی نعمانی: (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)

شبلی علی گڑھ تحریک میں وہ واحد شخص تھے جنھوں نے مفتی عبدہٗ اور رشید رضا کے نظریہ بین الاسلامیت سے خود کو نظریاتی طور پر وابستہ کیا۔ اسی لیے ان کے فکری کارناموں میں اس نظریے کی کارفرمائی نظر آتی ہے یہاں صرف ان کی شاعری میں موجود اتحاد اسلامی کے رجحانات کو پیش کرنا مقصود ہے۔ شبلی کی شاعری میں تاریخی اور اخلاقی نظموں کے نمونے ملتے ہیں ہر ایک نظم خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر ان کے حسن کو دوبالا کیا تو دوسری جانب اردو زبان میں کسی حادثے اور سانحے کو نظم کرنے کے بہترین نمونے فراہم کیے[۵۲]۔ شبلی کی شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے واقعات کو جس انداز میں جذبات سے ملایا ہے اس نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت کو آگے بڑھنے کے اچھے نمونے فراہم کیے ہیں۔ ان کی نظموں میں اسلامی روایتوں کے پرتاثیر واقعات اور اسلامی تاریخ کو فخریہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

شہر آشوب اسلام کے نام سے انھوں نے جو نظم لکھی اس کے بارے میں خواجہ کمال الدین صاحب لاہور نے مولانا کو لکھا تھا کہ اس نظم نے مجھ کو لندن میں تڑپا دیا اور اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں یہ نظم بھی اس کا محرک تھی۔ اس نظم کا اتنا چرچا ہوا کہ کئی لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی[۵۳]۔

شبلی کی نظر میں دنیا کے تمام مسلم ممالک میں اگر کسی کا وقار مسلم تھا تو ترکی کا۔ جس کا گہوارہ تیرہ سو برس پہلے یثرب و بطحا میں رہ چکا ہے۔ ۱۸۹۶ء کی جنگ میں آرمینیا کا مسئلہ اٹھا تو اس وقت انگریزوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شبلی نے اتحاد اسلامی کی عکاسی کی۔ علی گڑھ چھوڑنے میں جہاں اور بہت سے محرکات کارفرما تھے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ علی گڑھ کے ارباب اختیار ترکی کے معاملے میں انگریزی نقطہ نظر کے حامی تھے۔ شبلی اس گھٹی ہوئی فضا کو برداشت نہیں کر پائے کیوں کہ وہ خلیفہ سلطان عبدالحمید اور ان کے رفقا کی کھل کر مدح کرنا چاہتے تھے[۵۴]۔ ۱۹۰۸ء میں جب ترکی نے دستوریت کا اعلان کر کے اپنی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی تدبیریں کیں تو اس وقت کئی مخالفتوں کے باوجود شبلی نے کہا کہ:

نالوں کو عندلیب کے میں نے دبالیا
بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر[۵۵]

سلطان عبدالحمید سے انھیں گہری عقیدت تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے تمہید قصیدہ مدح سلطا ن عبد الحمید میں کیا ہے:

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت وچمن   بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتش گل   پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگادی ہے کسی نے شاید   حسن میں عکس گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن[۵۶]

شبلی نے اپنی نظموں میں اسی تسلسل کو برقرار رکھا ہے جو ان کی علمی وادبی کاموں میں دکھائی دیتا ہے انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں جب قوم مغرب سے مرعوب ہوکر شدید ذہنی غلامی میں مبتلا ہوچکی تھی ایک ایسا لائحہ عمل اپنے علمی وادبی کاموں میں پیش کیا جس میں قدیم وجدید رجحانات کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر شبلی نے اپنی فکر کو صحیح معنوں میں واضح نہیں کیا۔ اس لیے ان کے اثرات بھی صرف علوم اسلامیہ کے احیا کی صورت میں ایک علمی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور یہی عمل ان کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے[۵۷]۔ مثلاً ان کی ایک نظم اسلام کے تنزل کا اصلی سبب میں اسی نقطے کو بیان کیا ہے:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے اب امر صریح   کہ زمانہ میں کہیں عزت اسلام نہیں
آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل   اس میں تخصیص عراق وعرب وشام نہیں[۵۸]

اسی نظم میں مسلمانوں میں موجود اتحاد کی کمی کو یوں بیان کیا ہے۔

نصِ قرآں سے مسلمان ہیں بھائی بھائی   اس اخوت میں خصوصیتِ اعمام نہیں
یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن   کون سا گھر ہے جہاں یہ روش عام نہیں[۵۹]

۱۹۱۲ء میں جب بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور انگریزوں کی مدد انھیں حاصل ہوئی تو اس وقت شبلی نے شہر آشوب اسلام ہنگامہ طرابلس وبلقان کے موضوع پر یہ نظم لکھی اس نظم نے اردو شاعری میں اسلامی روایت کو بیان کرنے کے حوالے سے ایک نئی زندگی فراہم کی ہے[۶۰]۔ اس نظم کے متعلق اردو ادب میں کافی باتیں ہوچکی ہیں اس لیے یہاں پر صرف چند مثالیں پیش ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک | چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیے پرزے | فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے | کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک [٦١]

شبلی نے یہ نظم لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں، جو ترکی کے لیے چندہ فراہمی کے لیے ہوا تھا، پڑھی تھی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی لکھنؤ کی ماتمی مجلس ہے [٦٢]۔ ادھر جنگ بلقان جاری تھی کہ مسجد کان پور کا دردناک واقعہ پیش آیا۔ کان پور میں ایک مسجد سے لگتی ہوئی ایک سڑک نکالی گئی اور مسجد کا وضوخانہ جو سڑک کے بیچ میں تھا، مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ڈھا دیا گیا۔ مسلمانوں نے دوبارہ اس کی تعمیر شروع کردی، حکومت نے گولی چلانے کا حکم دیا اور کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ لوگوں کا شہید ہونا تھا کہ مسلمانوں میں پہلے سے موجود بے چینی دو آتشہ ہو گئی۔ ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، محمد علی جوہر اور دوسرے اکابر قوم نے انگریزی حکومت کے اس قہر وجبر پر سخت احتجاج کیا اور شبلی کی نظموں نے مسلمانوں کے دل میں جذبہ حریت کی آگ کو مزید تیز کردیا [٦٣]۔ شبلی نے نظم ہم کشتگان معرکہ کان پور میں جس طرح مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے ان کے اس رجزیہ نالوں نے مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔

کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے | دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر | بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا | ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں [٦٤]

شبلی نعمانی نے جب اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت ترکی اور برطانیہ کے حالات کافی کشیدہ تھے اس کے باوجود مولانا نے یہ سفرنامہ اس انداز میں لکھا کہ یہاں کے لوگوں کو ترکوں سے محبت ہو جائے اور مسلمانوں کی سیاست مقامی اثرات سے نکل کر بین الاقوامی رخ اختیار کرلے [٦٥]۔ ان کی نظموں میں بھی اسی رخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جب ترکی سے واپس آیا تو یہ نظم کہی اس سے بھی ترکی کی محبت کا اظہار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے | کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی | تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں [٦٦]

ہندوستانی مسلمانوں نے بار بار حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے اساس کا لحاظ کرے اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے مگر اس کا جواب یاس انگیز ملا[۶۷]۔ مولانا ظفر علی خان کو جنگ بلقان کے موقعے پر جب ہندوستان میں عید الاضحیٰ کی خوشی کا موقع تھا تو شبلی نے کہا کہ اپنی خوشیوں کو ترک کر دیں اور ترکی کی مدد کریں۔ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> میں نے جو فتویٰ لکھا ہے اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ بھائی! ترکوں کی امداد اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے[۶۸]۔

اسی طرح جرائد اسلامیہ کے نام سے لکھے ہوئے خط میں بھی اس فتوے کے حوالے سے دلیل دیتے ہوئے شبلی نے لکھا تھا کہ:

> ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے اس خاص موقعے اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لے کیا حجت ہو سکتی ہے۔ قربانی شعائر اسلام ہے مسلمان اس کو چھوڑ نہیں سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی قوم کی پرواہ کر سکتے ہیں[۶۹]۔

ان خطوط کے اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی تحریک اتحاد اسلامی کے کس حد تک قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بلقان کے دوران آغا خان نے ایک مضمون میں ترکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سرزمین یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تا کہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں تو شبلی کو بھی اس مضمون سے کافی رنج ہوا اور انھوں نے ایک نظم میں اس کا بھرپور جواب بھی دیا ہے[۷۰]:

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتار الم
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چہ غم
نظر آجائے گی بے کاری آلات جدید — جب کہ تم وادی تاتار میں رکھو گے قدم[۷۱]

شبلی کی ان نظموں میں پرسوزی اور واقعات کی حقیقت نگاری نے مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد میں ایک ایسا تموج پیدا کیا جس سے مسلمانوں کی زندگی کے منہاج تبدیل ہو گئے۔ یہ شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں تھی بلکہ اس میں ملی شعور کا بیان بھی تھا۔ دعوت عمل تھی اور ناموس اسلام کی خاطر قربانی دینے کے

لیے کوشش و عمل کا جذبہ تھا۔شبلی نے فرنگی جالوں سے نکلنے کی تلقین کی اور ہمت و بہادری کے جذبات کو مہمیز دی [۷۲]۔

اکبرالٰہ آبادی: (۱۹۴۲ء۔۱۹۲۱ء)

حالؔی اور شبلی نے جس بنیاد پر اپنی شاعری کی اسے تکمیل کے درجے پر اکبرالٰہ آبادی نے پہنچایا ہے۔اکبر نے اپنی غزلوں، نظموں میں انگریزی تہذیب، ان کی سیاست، ان کی چالوں کا خوب مذاق اڑایا ہے [۷۳]۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنی شاعری میں ہندوستانی ماحول سے الگ تھلگ رہ کر بھی دیکھا اور مدغم کر کے بھی۔ ان کی شاعری حقیقتاً اس دور کے سیاسی، تہذیبی اور تحریکی مزاج کی آئینہ دار ہے۔

اکبر کے اس قسم کے اشعار کے خلاف حکومتی ادارے تادیبی کارروائی بھی کرتے اور دھمکیاں بھی دی جاتیں اور انھیں اس بات کا پابند کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے اشعار کہنا بند کر دیں ورنہ ان کی پنشن بند کر دی جائے گی [۷۴]۔اکبر کے سیاسی عقیدے میں ترقی کا اصل مدار حصول قوت تھا۔ان کا بنیادی مسلک یہ تھا کہ سیاسیات نام ہے توازن قوت کا، جو قوم جس قدر قوی ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلے میں ممتاز ہوگی [۷۵]۔

اکبر نے اپنی غزلوں میں کم جب کہ نظموں اور قطعات میں زیادہ انگریزوں پر تنقید کی ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ گوری قوم کو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں چاہیں قابض ہو جائیں اور یورپی طاقتیں ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔مثلاً بلغاریہ، سرویا، رومانیہ اور یونان اگر ترقی کی راہ پر چلیں تو یہ ان کا حق ہے لیکن اگر ترک، عرب، ایرانی و افغانی محض اپنی کمر کسنا چاہیں تو یورپ کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھتا ہے اور پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کر کے مسیحی سلطنتیں مسلمانوں کو مٹانے کے درپے نظر آتی ہیں [۷۶]۔ یہ نقطۂ نظر اکبر کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے:

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیل موسم کی — کھلیں ہیں اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے — کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہوں گے [۷۷]

اکبر کی غزلوں میں چوں کہ اتحاد اسلامی کے جذبات کم ہی ملتے ہیں۔مگر ان کی نظموں اور قطعات میں اتحاد اسلامی کے رجحانات نہایت گہرے ہیں۔اکبر کی شاعری ہندوستانی معاشرے میں عیسائی مشنریوں کے کردار پر بھی طنز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس طنز میں ایک پیغام پوشیدہ ہے۔انھوں نے مسلمانوں کو سختی سے

اتحاد کا درس دیا ہے تاکہ صلیب وہلال کی کش مکش میں مسلمانوں کی کوششیں آپس کے افتراق سے بے کار نہ ہو جائیں:

گنتی میں زیادہ نہیں ہے قول مرا ایک ‏ ‏ بے خوف میں کہتا ہوں اسے یعنی خدا ایک
تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک ‏ ‏ تھی تین پہ سوئی مری ہیبت سے بجا ایک
یارب رہے جمعیت مسلم یونہی قائم ‏ ‏ رخ ایک رسول ایک کتاب ایک خدا ایک [۷۸]

عیسائی دنیا کی یلغار مسلمانوں پر صرف حربی نہیں تھی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے شعائر کا بھی مذاق اڑایا اور کچھ ایسے ابہام بھی جنم دیے جو بے بنیاد تھے مگر سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اس سے شکوک پیدا ہو گئے۔

شیخ مائل ہوئے ہیں ساغر و مینا کی طرف
برکتیں نشہ میں لائیں گی کلیسا کی طرف [۷۹]

شاعری کے علاوہ اکبر کے نثر پارے بھی اتحاد اسلامی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پانیر میں جو خبریں ترکی کے حوالے سے شائع ہوتی تھیں ان خبروں پر انھوں نے ہلکا پھلکا طنز بھی کیا ہے۔ ان کا ایک نثر پارہ تھسلی کی دست برداری پر ہے۔ اس میں انھوں نے پانیر کے رپورٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> رپورٹر کے تار، تار عنکبوت سے کم نہیں ان سے اخذ نتائج کرنا نادانی ہے۔ کل خبر لکھی کہ سلطان نے شرائط صلح منظور کر لی ہیں آج فرماتے ہیں کہ شرائط صلح کی نسبت بحث کے لیے آئندہ تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر شرائط صلح منظور ہو گئیں تو پھر بحث کیسی۔۔۔

آگے چل کر اکبر نے اسی شذرے میں لکھا ہے کہ:

> خدا جانے یہ بیان کہاں تک صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یونان ایسے ٹٹ پونجیے سے کچھ چھیننا سلطان خلاف شان سمجھتے ہوں گے، بقائے عظمت کے لیے اس کو نیچا دکھا دینا کافی تھا سو یہ بات ہو گئی [۸۰]۔

کہاں کا ایپرس کیسی تھسلی
تمھیں ٹھونکا، ہوئی دل کو تسلی [۸۱]

اسی طرح ایک اور شذرے میں پانیر پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ترکی سلطنت سلاطین یورپ کے عدم اتفاق سے بچی جاتی ہے میں کہتا ہوں کہ کرہ ارض کو اکب کے کشش باہمی سے بچا جاتا ہے ورنہ اس کا پتا بھی نہ لگتا [۸۲]۔

اسی اخبار کے ایک رپورٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پانیر اخبار کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ ترکی سلطنت کو ضرور زائل کر دینا چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہو گا مسلمانوں کی بے چینی نہ جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی کوشش ۱۴۵۳ء سے ہو رہی ہے آپ دعا کیے جایئے، رہی مسلمانوں کی بے چینی وہ کبھی کبھی آپ کی حماقت سے ہو جاتی ہے [۸۳]۔

اکبر ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی کی جنگ جسے جنگ پلونا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کے بارے میں ایک جنگ نامہ لکھا تھا اس جنگ نامے میں کئی مقامات اور تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی روسی افواج کو ترکوں کے مقابلے میں بزدل قرار دیا ہے۔ اس جنگ نامے میں اکبر کا کہنا ہے کہ بہادری وہی ہے جو خود غرضی سے پاک ہو، جو بے کسوں پر زبردستی نہ کرے جیسا کہ روسیوں کا قائدہ تھا کہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی انتقام کی آگ میں جلا کر خاک کر دیتے تھے [۸۴]۔ اس جنگ نامے میں ترک و روس کا موازنہ کیا ہے کہ حالت جنگ میں ان دونوں ممالک کے کردار و اخلاق کس نوع کے ہوا کرتے تھے ایسا لگتا ہے کہ اکبر نے باکمال مصور کی طرح اس جنگ نامے میں وہ اثر و جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ غازی عثمان پاشا کی بہادری و عظمت کو ان اشعار میں عقیدت و محبت کے ساتھ بیان کیا ہے:

سنو جنگ دو شنبہ کی اب خبر مقام پلونا پہ رکھو نظر
وہ عثمان بادشاہ جوان و دلیر جو ہے اس نیستاں میں مانند شیر
عدو اس پہ جب حملہ آور ہوئے تباہ و پریشاں سراسر ہوئے
سپاہ ان کی بس ہو گئی منتشر کہ باضابطہ روس بھی ہے مصر [۸۵]

اس جنگ نامے میں رزم، بزم، دعا، موازنہ، جنگ، شکست سب اپنی جگہ بے نظیر ہیں [۸۶]۔ ان خصوصیات کے ساتھ تحریک اتحاد اسلامی کے نظریے اور سوچ کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ اس جنگ نامے میں وہ ٹکڑا جہاں بروج اور ستاروں سے معرکہ رزم فضائے آسماں میں دکھایا گیا ہے وہ 'اسد' 'ثور' کا مقابلہ ہے [۸۷]۔ اس مقابلے کا منظر نامہ یوں پیش کرتے ہیں۔

سنو حالت جنگ ارمیبا جو ہے داخل کشور ایشیا

وہ میکاف وہ جنرلِ نامدار
کہ جو سارے یورپ کا تھا افتخار

وہ جس پر بہت روسیوں کو تھا ناز
جو مشہور تھا حیلہ جو فتنہ ساز

جو مختار پاشا سے کھا کہ شکست
پریشان تھا صورت فاقہ مست

معین اس کی پھر آئی تھیں پلٹنیں
کہ چودہ جو ہوتی تھیں تعداد میں

ملے توپ خانے بھی سن اس کو تین
کسی پھر بھی ظالم نے گھوڑے پہ زین

جو ہے دل میں بے عزتی کی امنگ
پھر آیا ہے وہ سوئے میدانِ جنگ

خدا جانے کیا موقعۂ جنگ تھا
لڑائی کا کیا رنگ کیا ڈھنگ تھا

ابھی تک نہیں آئی اس کی خبر
کہ کس کو عطا کی خدائے ظفر[۸۸]

اس پورے جنگ نامے میں ترکی سلطنت جن جن یورپی قوتوں سے نبرد آزما رہی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان ہی یورپی قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر ترکوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

مددگارِ ترکاں ہو پروردگار
کہ دوچار ہیں دوست دشمن ہزار

ادھر سرویا مائل سر کشی
ادھر مونٹی نگرو میں یہ بر ہمی

بغاوت میں مصروف رومینیا
شرارت پہ آمادہ بلگیریا

غرض صوبہ ہائے مسیحی تمام
ہیں اعدائے ترکان عالی مقام

ادھر خانگی مفسدوں کا یہ رنگ
ادھر حضرت روس سر گرم جنگ

محض ہے یہ تائید فضل اللہ
کہ خوش حال اب تک ہے ترکی سپاہ[۸۹]

یہ جنگ نامہ کلیات اکبر الٰہ آبادی کے نسخے میں موجود نہیں ہے۔ طالب الٰہ آبادی نے اپنی کتاب اکبر الٰہ آبادی میں اسے شائع کیا ہے۔ اس نظم کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کی کتاب کا جو ترجمہ اکبر نے کیا تھا اس کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباسات زیادہ تر ان کے مقدمے سے لیے گئے ہیں۔ ترجمے کے مقدمے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر نے اس وقت کی عالمی صورت حال پر نہ صرف نظر رکھی ہوئی تھی بلکہ یورپ کے جارحانہ رویے کو مسلمانوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ:

مصنف نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا نہ ہوں، ان کی صحت تمام تر لائق

تسلیم ہو یا نہ ہو، ایسے نہ تھے کہ مجھے مسلمانوں کی اطلاع کے لیے اس کے ترجمہ کا شوق پیدا نہ ہوتا۔ مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرہ خیال کو وسیع کرنے کے لیے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی پالیٹیکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی مرتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے ان کو مطلع کیا، تو برا نہیں کیا[90]۔

ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے اپنی کتاب کے آغاز میں ایک عربی شعر لکھا ہے جس کا ترجمہ اکبر نے کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

نہ ہو تو مایوس و دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی
زیادہ تر حسن عمدگی سے گوندھیں گے بار دگر یہ موتی[91]

بلنٹ کی کتاب تاریخی اور سیاسی نوعیت کی ہے ساتھ ہی اتحاد اسلامی اور ترکوں کے حوالے سے کئی اہم چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اکبر کا کہنا تھا کہ:

اب بھی مجھ کو اسلام کی آئندہ حالت پر ویسا ہی اعلیٰ درجہ کا تیقن اور بھروسا ہے جیسا کہ ۱۸۸۲ء کی فصل بہار میں تھا اور اگر چہ لوگوں کو نخل امید سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہو گئی لیکن میں بد دل نہیں ہوں گو سر دست ناکامی ہوئی ہے لیکن ہم کو خدا پر بھروسہ اور یقین رکھنا چاہیے[92]۔

یہی وہ پہلو ہے جو ان کے اس جنگ نامے میں بھی سامنے آیا ہے۔ جنگ نامہ اودھ پنچ میں ۱۸۷۷ء میں چھپا تھا اس میں ترکوں سے جو لگاؤ ظاہر ہوا ہے اور ان کی بہادری کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے اکبر کی محبت و عقیدت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ترکوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ:

یہ سب کچھ ہے حاصل تجھے میں گواہ ۔۔۔ مگر جنگ ترکاں خدا کی پناہ
یہ زیر فلک ہے وہ قوم دلیر ۔۔۔ کہ غصہ سے دیکھیں تو ڈر جائے شیر
اگر کوہ سے ہوں یہ سرگرم جنگ ۔۔۔ اڑیں ہوش کی طرح ذرات سنگ
بہادر ہیں منصف ہیں دیں دار ہیں ۔۔۔ دلاور ہیں مرنے پہ تیار ہیں[93]

اکبر الہ آبادی کی ایک نظم جنگ ترکی اور اٹلی کے متعلق رائیں ہے۔ اس نظم میں اس جنگ کے حوالے سے ہندوستان میں برپا مختلف آرا کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اکبر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ملت کو غیرت ایمانی کے ذریعے سے بچایا جا سکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں نفس کی غلامی نے ہماری دلیری کو بزدلی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کا ہو کر باطل قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ ترکی

میں بر پا انقلاب کو اکبر اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کا تجزیہ یہ تھا کہ اس انقلاب کے ذریعے ترکی کی معاشرت تیزی سے مغرب زدہ ہو جائے گی۔اس بارے میں انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو علی گڑھ تحریک کے حوالے سے تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ بعد کے حالات نے ان کے اس زاویے کو درست کر دکھایا۔

دکھائے نیا اب رنگ ترکی نہ ہوگی مبتلائے جنگ ترکی
وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں ہوئی اب ہم کنار گنگ ترکی
بہت خود رائے تھے سلطان سابق رہا کرتی تھی ان سے تنگ ترکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن ترقی اب کرے گی ینگ ترکی[۹۴]

یہاں پر نوجوان ترک کے انقلابیوں پر اکبر الٰہ آبادی نے طنز کیا ہے اکبر چوں کہ خلافت کو اور مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو بہتر سمجھتے تھے اس لیے ان پر طنز کیا جانا فطری ہے اس نظم میں اکبر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

کیا بحث ایران سے یا ترک و عرب سے اس وقت تجھے قطع نظر چاہیے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے[۹۵]

مسلمانوں میں اتحاد بین المسلمین کے جذبے کی کمی کا شکوہ اس انداز سے کرتے ہیں۔

غضب ہے حب اسلامی سے خالی سب کا سینا ہے کہ حد سے ناتواں بینی ہے بے مہری ہے کینا ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینا ہے؟[۹۶]

اکبر کی شاعری ملی احساس کا آئینہ دار ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات میں کرب اور طنز کا جو پہلو س ملتا ہے وہ مسلمانوں کی ملی شکست کو نمایاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کے ایک قطعے میں مغرب اور مسلمانوں کے مابین جاری کش مکش کو یوں نمایاں کیا جا رہا ہے:

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

اس شعر کے بعد جو حال یورپ کی تہذیب پر عمل کرنے والوں کا ہوتا ہے اسی قطعہ میں اس کی منظر کشی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مغرب کا نظام مسلمانوں کے ایمان اور یقین کو ڈگمگا دیتا ہے اور جب ایمان پر

ایمان اٹھ جاتا ہے تو پھر گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے:

بادہ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خُم کے خُم — ایشیا کے شیشہ تقویٰ کو کردو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایا ہو گیا — جس سے ہے دل کی حرارت کو سراسر انتعاش [97]

اکبرالٰہ آبادی نے ایک قطعہ سلطنت نہ سہی رہو تو مل جل کر میں مسلمانوں کو متحد رہنے کی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے — کبھی خزاں ہے جو اس پر کبھی بہار بھی ہے
نگاہِ غور کرو سوئے ترکی و ایراں — نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویراں [98]

یعنی ترکی و ایران کبھی مسلمانوں کی دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ جب سے ان قوموں میں نئی تہذیب کی روح پھونکنے کی کوشش شروع ہوئی ان کی حالتیں اسلامی نقطۂ نظر سے روز بروز بدتر ہوتی جارہی ہیں اور ان کا وجود ہر طرح سے تباہ ہوتا جارہا ہے۔ نئی قوتوں کے پنپنے کی صلاحیت ان میں ختم ہوگئی ہے [99]۔ اکبر نے اس قطعے کے آخر میں مسلمانوں کو متحد رہنے کا مشورہ دیا ہے:

جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر — کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو مل جل کر [100]

مشرق و مغرب کا یارانہ کے عنوان سے قطعہ میں اکبر نے ان دونوں خطوں کی آویزش کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ دونوں خطے روش کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ ان کا ملنا ناممکن ہے:

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ — ادھر صورت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ
یہ یونی ورسٹی کا مسئلہ کیا کم تھا اے گردوں — کہ چھیڑا تو نے ہم دم ترکی و اٹلی کا افسانہ [101]

اس آخری شعر میں اس بات کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ علی گڑھ میں مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے حوالے سے ہندوستان میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس کے ساتھ جنگ طرابلس نے ہندوستانی مسلمانوں کو اور زیادہ برانگیختہ کر دیا اور پورے ملک میں اس حوالے سے احتجاج شروع ہوگیا [102]۔ اس میں اکبر نے اپنے نظریاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر علی گڑھ کو یونی ورسٹی کا درجہ دیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مسلمانوں کے ملی معاملات سے کبھی لاتعلق نہیں رہے یہی وجہ ہے ان کے کلام میں اہم ترین واقعات جو ہندوستان اور ترکی میں برپا ہوئے اس حوالے سے شعری مثالیں با آسانی مل جاتی ہیں۔

اکبرالٰہ آبادی نوجوان ترکوں کو پسند نہیں کرتے تھے سلطان عبدالحمید کی معزولی پر انھوں نے نہایت رنج

کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی سلطنت نے اب عیسائی چولا پہن لیا ہے[۱۰۳]۔ اکبر نے سلطان عبدالحمید اور زار روس کی معزولی کا ایک جگہ موازنہ کیا ہے:

جو زار روس اترے تخت سے ان کا یہ شکوا تھا　　　انھیں نے دی دغا ہم کو ہمیں جن پر بھروسا تھا
انھیں قولوں نے کھینچا عبرت و حسرت کا نقشا بھی　　　انھیں سے ہے عیاں طرز خیال دین و دنیا بھی[۱۰۴]

زار روس کو ۱۹۱۷ء میں ایک بغاوت کے نتیجے میں مع خاندان قید کر لیا گیا تھا اور پھر انھیں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ سلطان عبدالحمید نے اپنی معزولی کے وقت کہا تھا کہ مشیت الٰہی یہی ہے جب کہ زار روس نے جن پر بھروسہ کیا تھا وہی غدار نکلے۔ عبدالحمید کو اپنی معزولی سے عبرت حاصل ہوئی جب کہ زار روس کو حیرت و پشیمانی۔ عبدالحمید کا رویہ دین دارانہ تھا[۱۰۵]۔

محمد علی جوہر: (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی جوہر کا شعری سرمایہ مقدار میں زیادہ نہیں ہے۔ اس میں بیش تر غزلیات ایسی ہیں جنھیں ملی شاعری میں شمار کرنا درست نہیں ہوگا مگر ان کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن میں جوہر کا کرب نہ صرف برعظیم پاک و ہند بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے واضح طور پر سامنے آتا ہے[۱۰۶]۔

جوہر چوں کہ خود بھی ملی احساس اور اتحاد بین المسلمین کے پیغامبر تھے اس لیے ان کی شاعری میں وہ تمام رجحانات جو اس وقت امت مسلمہ کو درپیش تھے آشکار ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو حزن و ملال سے منع کیا ہے اور امید کا پیغام دیا ہے کہ اگر محنت و عمل کو شعار بنایا جائے تو مسلمان دوبارہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو محفوظ بنا سکتے ہیں۔

جوہر نے جب ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ جاری کیا تو ہندوستان کی فضا سیاسی اعتبار سے انقلاب کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ ایک جانب اسلامی ممالک کی تباہی ہندوستانی مسلمانوں کو بے کل کر رہی تھی تو دوسری جانب یورپ کے جارحانہ اقدام نے مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کی جانب راغب کر دیا تھا۔ جب ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو عالم اسلام کی خوشی دیدنی تھی۔

جب یہ خبر دہلی پہنچی تو رات کافی ہو چکی تھی۔ مولانا کی ترکوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اپنے چند رفقا کو لے کر سیدھے جامع مسجد دہلی پہنچے اور راستے میں چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ خوش خبری دیتے رہے آخر مسجد میں ایک مجمع جمع ہو گیا اور پھر جوہر نے

ایک دردانگیز تقریر کی جس میں یورپ کی شاطرانہ چالوں کو بے نقاب کیا گیا[107]۔ اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی شکست کی خبر نے مولانا محمد علی جوہر کو بے چین کر دیا تھا۔ انھوں نے اس اضمحلال میں خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ:

طرابلس کی اس تباہ کن جنگ کے دوران میرے جذبات اتنے شدید تھے کہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایک دن میں نے اس سے مغلوب ہو کر خودکشی کا اردواہ کر لیا تھا۔ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی اس رات مجھے اپنی ہمت اور بزدلی کی آزمائش سے میرے ایک مسلمان دوست کی آمد نے بچالیا[108]۔

۱۹۱۴ء میں London Times میں The Choice of the Turks کے عنوان سے ایک مضمون لکھا[109]۔ اس مضمون میں ترکوں کو سخت لہجے میں تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ جنگ میں جرمنی کا ساتھ نہ دیں اسی مضمون کی پاداش میں انھیں چھنڈ وارہ جیل میں پانچ سال کے عرصے کے لیے قید کر دیا گیا[110]۔ جوہر کے اخبار کامریڈ نے ترکی کی مدد کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی اور جوہر کی مستعدی سے اس رقم کو زخمی سپاہیوں اور مجروحین جنگ میں تقسیم کرنے کے لیے آٹھ رکنی وفد روانہ کیا گیا[111]۔

جوہر کی شاعری زبان و بیان کی نزاکت کے ساتھ شاعرانہ پیوندکاری سے لبریز ہے اسی لیے ان کی شاعری میں افسوس کے اظہار کے بجائے سرمستیِ عمل اور لذت کردار نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں مجاہدانہ ولولے کو خصوصی جگہ دی ہے[112]۔ جوہر نے اپنی شاعرانہ طبیعت کے بارے میں اظہار کیا ہے کہ:

لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اس سے خود مجھے کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے مگر میری شاعری کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہے[113]۔

۱۸۹۸ء میں ان کی ایک غزل جس میں بادہ وساغر کے ساتھ ساتھ حق و باطل کا معرکہ یوں بپا ہے:

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم　　حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ　　بال و پر نکلے قفس کے در کھلے[114]

جوہر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے[115]۔ جوہر کے دل میں عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے بے کراں محبت کا جذبہ تھا۔ ان علاقوں کے مسلمانوں سے انھیں سے خاص لگاؤ تھا جو مغربی اقوام کی ہوس ملک گیری کی زد پر تھے۔ ترکوں کی کھل کر جس طرح جوہر نے حمایت کی تھی اس کے اثرات ہندوستان میں ظاہر ہوئے[116]۔ جوہر کے اس جرأت مندانہ کردار نے انھیں ترکوں کے حلقے میں

خاص کر نوجوان ترک میں متعارف کرایا۔ جوہر نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ عالم اسلامی میں ہم آہنگی موجود ہے۔ یہ مسلمان اخوت کے عالم گیر رشتے میں بندھے ہوئے ہیں لیکن ترکوں نے جب سلطنت اور خلافت ختم کر دی تو انھیں یہ سمجھ نہیں آیا کہ وہ اپنی مایوسی اور اذیت کو کیسے چھپائیں[117]۔ فتح سمرنا کے موقعے پر جوہر چوں کہ جیل میں تھے مگر اس زمانے میں انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ترکوں نے یونانی غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اس پر انھوں نے جو غزل کہی اس کا انداز کچھ یوں ہے:

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی — سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی
ہیں سب عرب میں شام فلسطین اور عراق — ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک حسین کی[118]

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری اس لیے بھی اہم ہے کہ انھوں نے سیاسی شاعری کے امکانات کو وسعت بخشی، چوں کہ ان کے یہاں مذہب اور سیاست ایک چیز نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری میں مذہب کے جذبے سے صداقت حاصل کی ہے اور اس کی وسیع تاریخ سے بھی استفادہ کیا ہے[119]۔ مذہب اور مذہبی تاریخ سے اخذ کردہ علامتوں نے جوہر کی غزل کو وسعت بخشی ہے۔ ایک ایسی وسعت جو خالص سیاسی عناصر کے بس کی بات نہیں ہے[120]یہی وجہ ہے کہ جوہر کی غزل میں موجود سیاسی عناصر نے شاعری کی روایت میں سیاسی رجحان کو اعتبار بخشا[121]۔ ترکوں کے ساتھ جو جذبہ ہندوستانی مسلمانوں میں موجود تھا جوہر کی شاعری بھی اس سے مبرا نہیں ہے:

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی — مظلوم کی دعا بھی کبھی بے اثر گئی
اگلی سی اب وہ زعم کی طغیانیاں کہاں — شب بھر میں کیا چڑھی ہوئی ندی اتر گئی
عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا — ہم بے کسوں کی آہ عجب کام کر گئی[122]

جوہر نے اپنی ایک غزل میں جو لب و لہجہ اختیار کیا اس کے اشعار آج بھی حق و باطل کے معرکے میں ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں اس غزل کو ان کی شاعری کا حاصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا:

دورِ حیات آئے گا دورِ قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد[123]

ایک اور غزل میں مسلمانوں کی بے توقیری کا اظہار کیا گیا ہے:

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی — اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

کشور کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو   سیر ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی[۱۲۴]

سامراجی قوتوں کے سامنے جو ہر مزاحم کار رہے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں اس مزاحمت کے واضح اشارے موجود ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے   پر غیب سے ساماں بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو   خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ زمانے سے خفا میرے لیے ہے[۱۲۵]

مولانا محمد علی جوہر کا کلام زیادہ تر محبوسیات کے تحت آتا ہے جو انھوں نے چھنڈواڑہ جیل میں قیدی کی حیثیت سے لکھا ہے۔ ان کے کلام میں اتحاد بین المسلمین، صبر و رضا اور تائید حق کے جذبات ملتے ہیں اور جبر واستبداد کی قوتوں کے مقابلے میں کلمہ حق کو جس طرح انھوں نے اپنی زندگی میں بلند کیا وہی ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے[۱۲۶]۔ ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی سامراج اور جبروتی قوتوں کے خلاف جن رہ نماؤں نے مساعی و تلقین کی ہے جوہر کا نام ان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک جگہ اپنی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> میری غزلوں کی تعریف اکبر الٰہ آبادی فرمائیں یا کوئی اور، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل نہیں ہیں۔ محض میرے درد کی آواز ہیں دیکھیے کب تک رہے[۱۲۷]۔

اسمٰعیل میرٹھی:

اسمٰعیل میرٹھی بچوں کی نفسیات کے ماہر تھے اس لیے ان کی نظمیں نصابی کتب میں مقبول ہوئیں[۱۲۸]۔ مگر انھوں نے مسلمانوں کی پستی کا نقشہ اپنی نظموں میں نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی نئی تہذیب اور نئے علوم کو پسند کرتے تھے اور سائنسی علوم کی قدروں کا انھوں نے خیر مقدم بھی کیا۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے مگر زوال امت کا احساس ان کی نظموں میں جا بہ جا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نظم جریدہ عبرت میں مسلمانوں میں موجود خرابیوں کا ذکر کیا ہے، رسوم بد کا تذکرہ اور کردار کی خرابیوں کو پیش کیا ہے۔ اسلام کی عظمت اور خوبیوں کو گنایا ہے[۱۲۹]۔ اسمٰعیل میرٹھی کی ایک اور نظم قلعہ اکبر آباد بہ آثار سلف ۱۸۸۹ء میں کہی گئی ہے جس میں مغلیہ سلطنت کا جاہ وجلال، زمانۂ حال میں مسلمانوں کی پستی اور انحطاط کی طرف اشارہ ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو پیش کرتے ہوئے نئی نسل کے نوجوانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ

وہ عزم واستقلال کا ایندھن انھیں کارناموں سے حاصل کریں[۱۳۰]۔اس پوری نظم میں ملت اسلامیہ کی ابتری کا کرب نمایاں ہے:

یارب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دور گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچم جاہِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیِ اکبر[۱۳۱]

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے جنگ روم وروس کے موقعے پر۱۸۷۸ء میں ترک مجروحین کی مالی امداد کے لیے مسلمانان میرٹھ کے جلسے میں تقریر کی۔ یہ تقریر نجم الاخبار میں شائع ہوئی تھی۔اس کی فصاحت کا ذکر تہذیب الاخلاق میں بھی کیا گیا ہے[۱۳۲]۔اس سے قبل انھوں نے ایک پوری نظم جنگ روم وروس کے حوالے سے ۱۸۷۷ء میں لکھی۔اس نظم میں انھوں نے ملت اسلامیہ کے تصور کو نمایاں کرتے ہوئے ترکوں کی بہادری اور شجاعانہ کردار کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ مثنوی روم وروس کی جنگ کے حوالے سے اسمٰعیل میرٹھی کے جذبات کی عکاس ہے:

حالاتِ روم و روس سے دن رات کام ہے — اخبار کا ورق نہیں خوان طعام ہے
کیسے خیال جنگ میں روزے گزر گئے — معلوم بھی نہیں کدھر آئے کدھر گئے
سوجھا نہ اور کچھ ہمیں اس بھوک پیاس میں — دن کاٹتے رہے انہی خبروں کی آس میں
روزہ خبر بغیر ہمیں بار ہوگیا — آیا جو تار فتح تو افطار ہوگیا[۱۳۳]

ترکوں کی بہادری تعریف یوں بیان کی ہے۔

کیا اب بھی ترکتاز میں ترکی سوار ہیں — جن غازیوں کی تیغ سے روسی فگار ہیں
کیا کر رہی ہے احمد مختار کی سپاہ — فیروز مند غازیِ جرار کی سپاہ
اے ماہِ نور بارِ سفر میں ہے تو مدام — حالات جنگ کے تجھے معلوم ہیں تمام[۱۳۴]

ترکوں کی بہادری اوران کے کردار کو ہندوستانی تاریخ میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کا کردار دراصل ترک کردار تھا اور ترکوں کی تمدنی وتہذیبی جھلک ہندوستانی معاشرے کی

زندگی میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اسی لیے اسمٰعیل میرٹھی نے اس جنگ نامے میں ان کی شان وشوکت کو یوں بیان کیا ہے۔

ترکوں کو ایسی شوکت وجاہ و جلال دے　　جو زلزلہ غنیم کے لشکر میں ڈال دے
مشرق کی سمت سے ہو سلیمان گرم کار　　افواجِ زار و وچ کو دکھا دے رہِ فرار
بلگیریا میں ختم ہو ہنگامہ جنگ کا　　رومانیا نشانہ ہو ترکی تفنگ کا
دم بند روسیوں کا ہو صمصام ترک سے　　بھاگے سپاہ روس فقط نام ترک سے

ترکی سپاہ میں علم فتح ہو بلند
پہنچے سپاہ زار کو آزار اور گزند[۱۳۵]

اپنی ایک اور نظم ترکی کی یونانیوں پر فتح میں کہتے ہیں کہ:

ہاں کیوں نہ ہو دو چند ہمیں عید کی خوشی　　فتح عظیم پائی ہے سلطان روم نے
سچ کہہ رہا ہوں شک ہو تو پا نیر میں پڑھو　　کیسی شکست کھائی ہے یونانِ شوم نے

شکر خدا ہر ایک مسلمان خوش ہے آج
عیدی کے شعر پڑھ کے لگے ہم بھی جھومنے[۱۳۶]

نظم جریدہ عبرت میں انھوں نے انگریزی تہذیب وتمدن سے وابستہ لوگوں کا مذاق اڑایا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس تہذیب کو اپنایا ہے اس کے نتیجے میں وہ نہ انڈین رہے اور نہ مکمل انگریز بن سکے ان کا مذہبی حال ایسا ہے کہ چرچ اور مسجد دونوں انھیں قبول نہیں کرتے۔ ان لوگوں نے اغیار کی صورت اختیار کر کے اپنی عزت کے گوہر درخشاں کو تار تار کر دیا ہے۔ اس نظم کے آخر میں اسمٰعیل میرٹھی نے دعا مانگی ہے کہ خدا مسلمانوں میں دوبارہ شوق جنوں پیدا کر دے کہ وہ علم کے حصول کے لیے راہ مستقیم اور عقل سلیم کو اختیار کر کے جمال صورت و معنی میں دوبارہ کمال حاصل کریں۔ انگریزی تہذیب کو اپنانے والوں کو کہتے ہیں کہ:

رہا وہ جرگہ جسے چڑ گئی ہے انگریزی　　سو واں خدا کی ضرورت! نہ انبیاء درکار!!
وہ آنکھ میچ کے بر خود غلط بنے ایسے　　کہ ایشیا کی ہر ایک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش تو پس در یہ کوٹ　　سواریوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید　　بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جینٹل مین   اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نے خدا ترسی   گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار[۱۳۷]

قوم کی سیاسی اور علمی زبوں حالی کا احساس ان کی نظموں میں عام طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ان کے تمام علمی کارناموں کی غایت اصلاح قوم تھی۔ان کی نظمیں چاہے وہ سیاسی رجحان کی حامل ہی کیوں نہ ہوں گہرے قومی درد کی آئینہ دار ہیں۔وہ ان مختلف طبقات کی بے راہ روی اور لاپرواہی پر نکتہ چیں ہیں جو قومی احساس اور اجتماعی شعور سے عاری ہو کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں[۱۳۸]۔

حسرت موہانی: (۱۸۷۵ء-۱۹۵۱ء)

حسرت موہانی کا شمار ہندوستان کے ان باغی انقلابیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے انگریزوں سے مصالحت کرنے کے بجائے آزادی کی خاطر جنگ لڑنے کا ارادہ کیا اور اس ارادے پر پورے اترے[۱۳۹]۔ ۱۹۰۸ء میں انگریزوں کی مصر کے حوالے سے تنقیدی مضمون کو اپنے رسالے اردوئے معلّٰی میں شائع کر کے بغاوت کا الزام اپنے سر لینے والے حسرت موہانی نے ساری زندگی حق گوئی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

حسرت موہانی بچپن میں ہی مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے والد تھے کے مرید ہو چکے تھے۔ بزرگان فرنگی محلی سے خاص تعلق کی وجہ سے حسرت نشیب و فراز کے باوجود اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں غیر متزلزل رہے[۱۴۰]۔علمائے فرنگی محل کا نظریہ اتحاد بین المسلمین ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے عیاں تھا۔حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر اس کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔انھوں نے اپنے ایک مضمون کی اشاعت اپنے رسالے میں کی تھی اس میں لکھا گیا تھا کہ:

> انگریز ہی ترکی کی بربادی کی وجہ ہیں۔مقدونیہ اور کریٹ کے متعلق انگریز ثالث رہے ہیں۔وہ ملک کے وجود کو ختم کر دینے کا عزم رکھتے ہیں۔۔۔کیا اعرابی پاشا جو مصر کی آزادی چاہتا تھا اور نئی روشنی کا خواہاں تھا جو نئے خیالات کا علم بردار تھا، کو جلاوطن کرنا جائز تھا؟[۱۴۱]

اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو ترکوں اور عربوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ کیا۔گھمسان کی جنگ ہوئی۔یورپی ممالک نے اٹلی کو شہ دینا شروع کر دی۔جس سے سارے عالم اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت اور بے زاری کی لہر دوڑ گئی۔حسرت نے اس پر یوں اظہار کیا ہے۔

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے   اب تو انصاف اس ستم کا دست پیغمبر میں ہے

جورِ یورپ ہے بنا بیداری اسلام کی — خیر ہے دراصل یہ حالاں کہ شکل شر میں ہے
خاطرِ افسردہ میں باقی ہے اب تک یادِ عشق — گرمیِ آتش ہنوز اس مشت خاکستر میں ہے
قلتِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر — ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند — رایتِ حریت وحق جو کفِ انور میں ہے[۱۴۲]

حسرت موہانی اپنے رفقا کے ساتھ شہر شہر ترکوں کی ہم دردی اور سودیشی تحریک کی حمایت میں تقریریں کرتے تھے اور آزادی کے نعرے بلند کرتے ہوئے انجمن خدام کعبہ اور ہلال احمر کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے[۱۴۳]۔ عالمِ اسلام کے حوالے سے جنوری ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۳ء کے مابین کئی اہم مضامین شائع کیے۔ جن میں پان اسلامزم اور مصر، مسلمانوں پر جنگ اٹلی و ترکی کے اثرات اور جنگ بلقان خاص طور پر قابل ذکر ہیں[۱۴۴]۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو بلقان کے خلاف ترکی کی ہم دردی میں لکھنؤ شہر میں والیِ رام پور حامد علی خان کی صدارت میں ایک اہم جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں حسرت نے برطانوی حکومت کے کردار پر اپنی تقریر میں سخت موقف اختیار کیا، والئی رام پور دم بہ خود جلسے کی صدارت پہ مجبور تھے[۱۴۵]۔ ترکی کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا انھیں علم تھا اور اس حوالے سے ان کی شاعری میں اشارے موجود ہیں:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہوکر
اٹھے ہیں جفاپیشگانِ مہذب — ہمارے مٹانے پہ تیار ہوکر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بے زار ہوکر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگِ دشوار ہوکر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر[۱۴۶]

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس دور کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد جو حقائق سامنے آتے ہیں ان میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی بھی شامل ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہمہ گیر مایوسی سے دوچار کر دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی اصلاحی تحریکوں اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں نے مسلمانوں کے فکر واحساس میں کئی اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہماری اردو شاعری قومی وملی احساس کے ساتھ سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انگریزوں سے نفرت اور اس کی پالیسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا صرف عام مسلمانوں

کا ہی رویہ نہیں تھا بلکہ اس سلسلے میں خواص نے بھی اپنی شاعری اور مضامین کے ذریعے عام مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں حسرت موہانی پہلے مسلمان تھے جنھوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔ اس پورے عرصے میں حسرت موہانی کا بیش تر کلام سیاسی حالات و واقعات سے بھی متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چوں کہ حسرت کے یہ اشعار عاشقانہ مضامین پر مشتمل شعروں کے ساتھ پیوستہ ہیں[۱۴۷] اس لیے یہ مسئلہ ہمیشہ قاری کے سامنے ہوتا ہے کہ اس شعر کا اصل مخاطب کون ہے۔

اصل میں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو شاعری کا اتنا اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بنا کر کچھ کہتے۔ تاہم اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کو شاعری میں جابہ جا بیان کیا ہے[۱۴۸]۔ کئی شاعرانہ پہلوان کے یہاں ایسے ہیں جو راست انگریزوں سے مخاطب ہو کر ان کے کردار کا مضحکہ اڑاتے نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں سادہ وشگفتہ الفاظ، رواں مصرعے سیاسی موضوع کا اظہار اور بصیرت آمیز خیالات ان میں موجود ہیں[۱۴۹]:

چلنے لگی ہے سارے جہاں میں ہوائے حرص — یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص
جاپاں بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص — ہے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد[۱۵۰]

حسرت ہمیشہ جس جذبۂ حریت کے شیدائی رہے وہ انگریزی حکومت کی نظر میں خطرناک ہی رہا۔ انھیں مسلسل قید کیے جانے کا عمل انگریزی حکومت کی وہ بزدلی تھی جو ان کی شورش پسند طبیعت سے حکومت پر ظاہر ہوتی تھی۔ مگر قید فرنگ نے اس حریت کامل کے جذبہ کو کبھی سرد نہیں ہونے دیا[۱۵۱]۔

پھیلے گی یوں ہی شورش حبِ وطن تمام — اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ وزغن تمام — سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ[۱۵۲]

مولانا حسرت موہانی کی ایک غزل جو رسالہ الہلال کلکتہ میں چھپی۔ اس میں بھی انھوں نے یورپی قوتوں کے فریب کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اسلام سے ان کی شیفتگی ہر قسم کے شک وشبہے سے بالا تھی۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور عالم اسلام پر دشمنوں کی غارت گری اور تاراجی پر انھوں نے ہمیشہ اپنی آواز بلند کی ہے[۱۵۳]۔ اس غزل میں بھی یورپ کی باطنی طبیعت کو مزید نمایاں کیا ہے:

ابھی تم کو سمجھے نہیں اہل مغرب	بتادو انھیں گرم پیکار ہوکر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی	نکل آؤ بے رحم و خوں خوار ہوکر
یہ ترک و عرب ٹھان لیں اپنے دل میں	رہیں گے نہ محروم کفار ہوکر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت	وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر[۱۵۴]

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا نتیجہ ترکوں کی توقعات کے خلاف سامنے آیا تو اس وقت انور پاشا ۱۹۲۱ء میں بخارا پہنچے۔ مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا کے ترکوں کو روسیوں کی غلامی سے نجات دلا کر ایک اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جائے۔ یہ وہی انور پاشا ہیں جنھوں نے ترکی فوج کے سپہ سالار ناظم پاشا کو گولی سے اڑا دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے کان پور کی مسجد کے فیصلے سے متاثر ہوکر یہ شعر کہے[۱۵۵]:

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں بودے دل کے ہیں	مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں
مظہر و انصار مظہر نے یہ ثابت کر دیا	ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم وکامل کے ہیں
کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا	راہ زن ہوں جب وہی جو راہ بر منزل کے ہیں[۱۵۶]

انور پاشا اتحاد اسلامی کے زبردست حامی تھے اور مذہب اسلام کے فدائی بھی۔ مصطفیٰ کمال، لینن اور اسٹالن کی لامذہبیت کی وجہ سے ان کے سخت مخالف تھے۔ جب وہ وسط ایشیا میں جنگ کر رہے تھے تو اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی نظریں انور پاشا پر لگی ہوئی تھیں اور خیال تھا کہ انور پاشا فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوں گے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی یہ شعر کہے جو جذبات وعقیدت سے مملو ہیں[۱۵۷]:

میں کس خوشی سے دل و دیدہ فرشِ راہ کروں	اگر وہ ترک ادھر بھی کہیں گزار کرے
خدا سے اب یہ دعا ہے کہ جلد بادِ مراد	کہیں تلافیِ مافاتِ روزگار کرے[۱۵۸]

اسی غزل میں ایک قطعے میں حسرت نے پیغام یوں پہنچایا ہے:

ہے ایک پیام ہمارا بھی اے نسیم دکن	خدا تجھے طرف افروز و غم شکار کرے
ملے جو اس سے تو کہنا کہ ترے شوق کا راز	کہاں تلک دل حسرت نہ آشکار کرے

مولانا ظفر علی خان: (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خان کا شمار بیسویں صدی کی ناقابل فراموش شخصیات میں ہوتا ہے جن کی نثر نگاری اور شاعری نے ہندوستانی مسلم معاشرے پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد اور

ادبی کارناموں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں حریت وانقلاب کی روح پھونکی اور ادبی دنیا میں ایسے معیارات قائم کیے جو سیاسی حالات کو بدلنے میں بھی معاون ہوئے۔

ظفر علی خان، جمال الدین افغانی کی پر اثر شخصیت سے بھی متاثر تھے اور انھوں نے اتحاد اسلامی کے تصور کو اپنی عملی جدوجہد میں کبھی فراموش نہیں کیا، ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمان ممالک بے دار ہوں، متحد ہوں اور اپنی عزت و وقار کا تحفظ کریں[۱۶۰]۔

ظفر علی خان کی شاعری نے عوامی اذہان پر اچھے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے روزمرہ سیاسی حالات پر جدوجہد کرنے کے لیے لوگوں کو ابھارا۔ اس لحاظ سے وہ عوامی شاعری میں اپنا مقام دیگر شعرا سے بلند رکھتے ہیں[۱۶۱]۔

ظفر علی خان کے زور قلم سے اس دور کی رودادِ سیاست تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی، طرابلس اور بلقان کی جنگ سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے جو کچھ لکھا۔ اس میں ان کے جذبہ ایمانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ یورپ کی استعماری قوتوں نے اسلامی ممالک کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ایک ایک نقشہ ظفر علی خان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے[۱۶۲]۔ اپنی ایک نظم نئی صلیبی جنگ میں یورپ کے سامراجی ذہن کو یوں نمایاں کرتے ہیں۔

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے
بدن کو دیتی ہے روح دھمکی کہ آ گیا وقتِ جاں کنی ہے
سمجھ رہے ہیں یہ اہل یورپ کہ ہم مسلماں کو لوٹ لیں گے
جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی جو یورپ کی روشنی ہے[۱۶۳]

اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو فرانسیسی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ ''طرابلس اب خانہ زنبور بن گیا ہے اور اٹلی نے ایسی حالت پیدا کر دی جس کا نتیجہ اس کے لیے اور خود ہمارے لیے برا ہے[۱۶۴]۔'' ہندوستانی مسلمان اور ظفر علی خان ان حالات سے بے حد متاثر تھے۔ ظفر علی خان نے جنگ طرابلس کے حوالے سے کئی نظمیں لکھی تھیں جن میں ترک اور اطالوی، کارزار طرابلس، جنگ طرابلس، بادل میں بھی، سمندر انور مشہور ہیں۔ ان میں کارزار طرابلس ایک ایسی نظم ہے جس میں تاریخ اور حالات حاضرہ کو مدغم کر کے ظفر علی خان نے رجزیہ انداز پیدا کر دیا ہے۔ اس نظم میں روما کی چیرہ دستیوں کا

حال بیان کیا گیا ہے[165]۔

اس نظم میں پاپائیت پر بھی طنز کیا گیا ہے جو عیسائی مذہب کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں رہا جو خود کو انسانیت کا پیغامبر ظاہر کرتے ہیں مگر ان کے حوارییین جن میں اٹلی کے لشکر بھی شامل ہیں وہ مسلمانوں پر طرابلس میں کیا کررہے ہیں۔ وہ اس نظم میں برطانوی سامراج سے سوال کرتے ہیں کہ تم اس ستم کو کیوں نہیں روکتے[166]۔ مگر اس سوال کے ساتھ اس عزم کا اعادہ بھی کیا گیا ہے خواہ مسلمان کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں مگر محمد ﷺ کے نام پر سر کٹانے کو اپنے لیے فخر وانبساط سمجھتے ہیں اور یہی جذبہ ان کی شکست کو کامیابی سے ہم کنار کردے گا[167]:

چمک اے تیغ روما کا نشان ہے تو مٹانے کو　　گرج اے توپ اٹلی کے دھوئیں ہے تو اڑانے کو
مسلمان لاکھ بودے ہوں مگر نام محمدؐ پر　　خوشی سے اب بھی حاضر ہیں وہ اپنے سر کٹانے کو
یہ چوتھے آسماں پر جاکے عیسیٰؑ سے کوئی کہہ دے　　کہ نکلی آپ کی امت ہے قصر امن ڈھانے کو[168]

اسی طرح جنگ طرابلس میں انھوں نے اٹلی کی بزدلی اور ترکوں کی بہادری کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا اس نظم میں کہنا ہے کہ پاپائے روم جن ارمانوں کو سجائے ہوئے طرابلس پر حملہ آور ہوئے تھے مسلمانوں کی جفاکشی اور بہادری نے ان کی ساری امنگوں کو خاک میں ملادیا:

کھیل بچوں کا جسے سمجھا تھا اٹلی نے، وہ جنگ　　کررہی ہے قافیہ اس کے جواں مردوں کا تنگ
خاک بن کر اڑ گئی روما کے دل کی آرزو　　خون ہو کر بہ گئی پاپا کے پہلو کی امنگ
اینٹ وکٹر کی گری پتھر محمدؐ کا چلا　　قول سعدی ہے کلوخ انداز را پاداش سنگ
پھونک دی اٹلی نے چشمِ روشنِ ایمان میں خاک　　چڑھ گیا آئینہ انصاف پر یورپ میں زنگ[169]

ظفر علی خان نے مسلمانوں کو اپنی شاعری میں قرآن کے حوالے دے کر یہ باور کرایا ہے کہ اگر مسلمان پنی حالت کو بدلنے پر تیار نہیں ہوں گے تو پھر ان کی حالت کوئی نہیں بدلے گا۔ اسی لیے ظفر علی خان نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی تگ ودو کی۔ ویسے بھی ان کا اصل میدان رزم ہی ہے اور وہ تنہا اس میدان میں مبارزطلبی کے لیے نظر آتے ہیں[170]:

تجھے تہذیب مغرب سبز باغ اپنا دکھاتی ہے　　یہ ساماں ہو رہا ہے تری نیت کے پھسلنے کا
سول اللہؐ خود گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں　　تجھے اے بے خبر ہر وقت موقع ہے سنبھلنے کا

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا[171]

مولانا محمد علی نے طبی وفد کی تشکیل میں جو کام کیا اس میں ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے قومی رہنماؤں نے حصہ لیا۔ ظفر علی خان نے اس موقعے پر مسلمانانِ ہند کے سیاسی زاویہ نگاہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

تجھ سے اے ترکی ہمارا برقرار اعزاز ہے   تو ہمارے واسطے سرمایۂ صد ناز ہے
گونجتی تھی محفل عالم کبھی جس ساز سے   تو اسی ساز بلند آہنگ کی آواز ہے
آئی ہے اٹلی کی شامت موت ہے سر پر سوار   اس لیے کھولے ہوئے اپنا دہان آز ہے[172]

ظفر علی خان نے انجمن ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور ترکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں وہ روپیہ پیش کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب ظفر علی خان نے ترکی کا دورہ کیا تو وہاں شتلجہ کے محاذ کا بھی دورہ کیا جہاں غازی انور پاشا کی معیت میں اس حصے کا معائنہ کیا تھا جو اٹلی سے برسرِ پیکار تھا[173]۔ جب سلطان عبدالحمید سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے ایک فارسی قصیدہ بھی ان کے لیے لکھا[174]۔

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مصر میں وہاں کے علما سے ملاقاتیں کیں جن میں سید رشید رضا کا نام قابل ذکر ہے اسی دوران یہ اطلاع ملی کہ حمیدیہ جہاز کے شہرۂ آفاق کپتان غازی رؤف پاشا اسکندریہ میں موجود ہیں۔ آپ نے غازی رؤف پاشا کو خط لکھا اور ملاقات کی آرزو کا اظہار کیا۔ رؤف پاشا نے نہ صرف ملاقات کی بلکہ وہ توپ بھی دکھائی جس کے ذریعے حمیدیہ جہاز اطالوی فوجوں پر گولہ باری کر کے واپس آرہا تھا۔ ظفر علی خان نے انتہائی جوش میں اس توپ کو بوسہ دیا[175]۔

ظفر علی خان کی ان سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عالم اسلام میں اتحاد باہم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مشہد مقدس پر روسی گولہ باری پر سر ایڈورڈ گرے (Edward Grey) جو برطانیہ کے خارجہ امور سے تعلق رکھتے تھے گلا کیا ہے۔ یہی وہ تاریخی نظم ہے جس کے لکھنے پر زمیندار اخبار عمر بھر مصائب و انوائب کی تمہید بن گیا[176]:

ہوا جس کی ثنا میں تر زباں اس طرح قاآنی   وہ تھا اپنے زمانے میں بلا شک شان یزدانی
ابھی تک یادگار ان کی ہے باقی مشہد سر میں   مسلمانوں کو پہنچے اس سے جو فیضانِ روحانی
سر ایڈورڈ! آج آتش زیرِ پا سارے مسلماں ہیں   پریشاں کیوں نہیں کرتی تمھیں ان کی پریشانی
لگایا روس نے پہلوئے مسلم میں وہاں چرکا   یہاں لائی ہے رنگ اس زخم کی خوں نابہ افشانی[177]

اتحاد اسلامی کے حوالے سے مولانا ظفر علی خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے مارچ ۱۹۲۰ء کو برہان پور میں خلافت کے حوالے سے تقریر میں کہا ہے کہ:

> ہم آئینی طور پر جدوجہد کرتے رہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حکومت برطانیہ تنگ آکر خلافت اسلامیہ کے متعلق نامبارک کوششوں سے خوددست کش نہ ہو جائے۔ یہ وقت خاموشی کا نہیں بلکہ افلاک میں غلغلہ ڈالنے کا ہے خواہ اس غلغلہ افگنی کے لیے صور اسرافیل سے صور ہی کیوں نہ مستعار لینا پڑے[۱۷۸]۔

حالی کی چند ابیات کی تخمیس کے عنوان سے، نوآبادیات نے جس طرح مسلمان کے ممالک کے ٹکڑے کیے اس کی صورت حال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مشرق میں ٹھیکہ ایک نے تبریز کا لیا ۔۔۔ مغرب میں دوسرے نے مراقش کو کھا لیا
جو ہم نے گم کیا تھا وہ یورپ نے پالیا ۔۔۔ یارانِ تیز گام نے محفل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے[۱۷۹]

مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں تاریخی واقعات اس طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں جن سے جدید حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی نظموں میں ستیزہ کاری اور میدان کارزار کا نقشہ ہمہ وقت اس لیے موجود ہے کہ خود ان میں بھی جذبہ ایثار پایا جاتا ہے۔ عہد حاضر کی ان برگزیدہ ہستیوں سے انھیں خاص عقیدت تھی جو اسلام کے ستونوں کو مضبوط کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا تھا جن میں اکابر اسلام کا ذکر موجود ہے۔ مولانا نے شاعری میں امت مسلمہ کے درد کو اپنا درد سمجھ کر پیش کیا ہے اور وہ مخالف طاقتوں کو پھیلتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے[۱۸۰]۔ اسی لیے بلقانیوں کو نہایت موثر انداز میں طنز کا نشانہ بنایا ہے:

بلقانیوں کا شور ہے کوؤں کی کائیں کائیں ۔۔۔ خبریں ہیں ان کی فتح کی سب آئیں بائیں شائیں
ہوتا ہے کوئی دم میں جلال حق کا آشکار ۔۔۔ یہ کشتگانِ غمزۂ ابلیس رہ تو جائیں
ڈالا زمیں میں ظلم سے یورپ نے زلزلہ ۔۔۔ مسلم دعا سے پایۂ عرشِ بریں ہلائیں[۱۸۱]

ترکوں کو عالم اسلام میں مرکزیت حاصل تھی۔ اسی لیے عالم اسلام کے مسلمان یہ چاہتے تھے کہ وہ یورپ کی ریشہ دوانیوں سے بچ جائیں تا کہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طرابلس اور بلقان کی جنگ میں اخوت اسلامی کا جذبہ پوری دنیا میں بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص موجود

تھا۔ظفر علی خان نے اپنی آپ بیتی ازالتہ الخفا میں لکھا ہے کہ:

> ترکوں کی نوزائیدہ طاقت کو فنا کرنے کے لیے دول مغرب نے بلقان میں ایک اور شرارہ چھوڑ دیا تو پھر بھی کوئی ایسی جماعت اس ملک میں موجود نہ تھی جو اسلام کے ان سرفروشوں کی مدد کے لیے فراہمیِ سرمایہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔ظفر علی خان کا یہ بھی کہنا ہے کہ زمیندار اخبار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا[۱۸۲]۔

خیر یہاں پر ظفر علی خان خود پسندی کا شکار ہو گئے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے جس تن دہی سے چندہ مہم کا آغاز پنجاب میں کیا اس کی مثال دو چار اصحاب کو چھوڑ کر کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔اس اخبار کے توسط سے پانچ لاکھ کی خطیر رقم مولانا نے ترکی کو فراہم کی اور پھر کامریڈ اخبار نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا۔یہ اقدامات بھی اخوت اسلامی کی سمت میں ایک زندہ و جاوید مثال ہے[۱۸۳] جسے ہر مشکل وقت میں عالم اسلام کے مسلمانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ظفر علی خان بنیادی طور پان اسلامسٹ تھے۔انھوں نے اس حوالے سے لکھا کہ ''پان اسلامزم مسلمانوں میں ازل سے موجود ہے ان کا سفر یورپ بھی اس لیے تھا کہ وہ ترکی میں ان مجاہدین کی حوصلہ افزائی کریں جو بلقان کی وادیوں میں برسر پیکار ہیں۔وہ انھیں اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ دور افتادہ بے کسوں کی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں[۱۸۴] اسی لیے انھوں نے نہایت خاموشی سے یہ سفر کیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔اس سفر کے دوران ظفر علی خان نے ایک نظم سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی لکھی۔اس میں مسلمانوں پر یورپی جارحیت کے خلاف درد و غم اور آہ و بکا کی کیفیات موجود ہیں:

مسلم بے چارہ کے حق میں اسی کے فیض سے
صرف رجعت ہو رہی ہے گردش لیل و نہار

ساحل اٹلی کا ادھر سسلی کے مینارے ادھر
وہ فضا سے ہم کلام اور وہ صبا سے ہم کلام

مسلم بے کس کے خوں میں پرورش پائے ہوئے
اس کی دل کش گھاٹیاں اس کے دل آرا مرغزار

آہ وہ سسلی بسایا تھا جسے ہم نے کبھی
اندلس کی طرح مغرب میں ہماری یادگار

پرچم توحید اڑا تھا جس کے ساحل پر کبھی
اور اذانوں سے کبھی گونجے تھے جس کے کوہسار[۱۸۵]

ان کی شاعری میں اسلامی اقدار و روایات کی ہمہ گیر صورت اس طور سے سامنے آئی ہے کہ اس دور کے سیاسی واقعات سے متعلق ہونے کے باوجود شعر و ادب کی دنیا میں آج بھی زندہ ہیں۔ان کے لکھے ہوئے

پر تاثیر اشعار خواہ کسی بھی واقعے سے اثر انداز ہوئے ہوں، ان میں فکر واحساس کی جھلک ضرور نمایاں ہے جو اردو شاعری میں بیش قیمت اضافے کے طور پر کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔

علامہ اقبال: (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

اقبالؔ قومیت اور وطنیت کے مغربی تصور کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ وہ اتحاد اسلامی کے خواہاں تھے ان کی نظم ونثر میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد ہو کر سیاسی جدوجہد کرنے کی خواہش کا اظہار عام طور پر ملتا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن Dr (Nicolson) کو ۲۴ جنوری ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسانی سے محبت کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں[۱۸۶]۔

اقبال نے اپنے فکر وفن کے ذریعے ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا بلکہ ان میں خودشناسی اور خودآگاہی کا ولولہ بھی پیدا کیا ہے۔ اقبال کی غایت یہی تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان توحید باری اور رسول اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اخوت اسلامی کا مظاہرہ کریں[۱۸۷]۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھرپور طریقے سے اتحاد اسلامی کا جذبہ ایک تحریک کی میں صورت دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جاوید نامہ میں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی معیت میں نماز کے ادا کرنے کو جنت کے حصول کے لیے درست مزدوری قرار دیا ہے[۱۸۸]۔ اس نظم میں اقبال، افغانی سے کہتے ہیں کہ:

> میں اس دنیا کے موجودہ حالات سناؤں جہاں سے میں آیا ہوں۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اپنے حقیقی ورثے کو بھول کر مغربی تصورات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ عالم گیر ملت اسلامیہ کی ایک وحدت کے بجائے اپنی قومی شناخت سے وفاداریاں نبھا رہے ہیں[۱۸۹]۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے[۱۹۰]

اقبال کا یہ بھی کہنا ہے کہ وطنیت کا مغربی تصور ایسا ہے جس سے پوری دنیا رشک، حسد میں مبتلا ہو جائے گی اور کمزور پس کر رہ جائیں گے۔ اس سے ایسی معیشت اور معاشرت تشکیل پائے گی جس میں دوسرے کو حق

دینے کا جذبہ مٹ جائے گا:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصور تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے[191]

اقبال نے ملت اسلامیہ کو ایسے نظام کا پابند رہنے کی تلقین کی جس میں مکر کی چالیں نہ ہوں۔ انھوں نے یہ کہا کہ مغربی تہذیب نے گرمی بازار اور تجارت کے نئے نئے طریقوں کے ذریعے بنی آدم کے دل سے حق کی روشنی چرا لی ہے موجودہ عہد میں مذہب کی بالا دستی محض خواب ہے[192]۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زائران حریم مغرب کی رہبری کو ترک کر کے نئے سرے سے ملت اسلامیہ کو تشکیل دیں:

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبی میں رو رو کے کہہ رہا تھا کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں[193]

اقبال کے پیغام کا مرکز و محور یہ ہے کہ مسلمان ہر طرح کے قومی اور نسلی تعصبات سے کنارہ کش ہو کر ایک واحد، منظم اور مستحکم ملت اسلامیہ کا جزو بن جائیں، دین کو وطن پر ترجیح دیں[194]۔ انھوں نے رنگ و قومیت سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ یہی اسلام کی بنیادی تعلیم بھی ہے۔ ان کی کئی ایسی نظمیں ہیں جس میں مسلمانوں کو مرکزیت قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی قومی زندگی اسلام کے بغیر ادھوری ہے۔ انھوں نے مثال دے کر کہا کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنوں کو جرمنی سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں ورنہ ہمارا شیرازہ بکھر جائے گا[195]۔

اقبال نے اسی تصور کے تحت ۱۹۱۱ء کے انجمن اسلام کے جلسے میں اپنی نظم شکوہ پیش کی[196]۔ اس نظم کا پس منظر بھی اتحاد بین المسلمین کے جذبے کو فروغ دینے پر مشتمل دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۱۱ء کے اوائل ہی میں سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقے برطانوی اور یورپی سامراج کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ ایران پر عملاً روسی، برطانوی اور کسی حد تک جرمنی اثرات کی حکمرانی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ہی تقسیم بنگال کی تنسیخ نے ہندوستانی مسلمانوں کو مزید صدمے میں مبتلا کر دیا تھا، اسی لیے علامہ اقبال نے خدا کے حضور مسلمانوں کی جانب سے

شکوہ کیا ہے۔اس بند میں انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے اس دور کی نشاندہی کی ہے جب مسلمانوں کی سلطنت یونان، البانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور آسٹریا تک پھیلی ہوئی تھی [۱۹۷]۔ اپنی اس نظم میں کہتے ہیں کہ:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی [۱۹۸]

اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کو بھی ملی انداز سے ہی دیکھا ہے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بارے میں انھوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم فیضی کے نام خط میں لکھا ہے کہ:

> ہندوؤں نے بنگال کی دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک کاری ضرب سے تعبیر کیا ہے لیکن حکومت کی طرف سے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔اس سلسلے کے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں [۱۹۹]۔

مندمل زخم دل بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آگیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی [۲۰۰]

اقبال کی پوری شاعری حق و باطل کے معرکے سے لبریز ہے انھوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو تمام چیزوں پر فوقیت دی ہے۔اسی لیے تقسیمِ تنسیخ بنگال اور یورپی جارحیت کو انھوں نے ملت اسلامیہ پر جاری یلغار کے نکتہ نظر سے دیکھا ہے۔ جب شمالی ایران پر روس نے مظالم ڈھائے تو انھوں نے اپنی نظم جواب شکوہ میں مسلمانوں کو یوں مخاطب کیا ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے [۲۰۱]

اس زمانے کے اہم واقعات کی بازگشت اقبال کی نظموں میں سنائی دیتی ہے [۲۰۲]۔ جنگ طرابلس کے موقعے پر اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ بھی اس جنگ کے حوالے سے لکھی گئی اور تمام نظموں میں انفرادیت کی حامل ہے۔

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے ذرۂ ذرۂ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حور صحرائی تری قسمت میں تھی غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی[۲۰۳]

اپنی ایک نظم حضور رسالت مآب میں انھوں نے دعائیہ انداز میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے حضور سرور کائناتؐ کے سامنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور کے اس جلسے میں سنائی تھی۔ جو ظفر علی خان نے جنگ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کی مالی امداد کے لیے منعقد کیا تھا[۲۰۴]۔

اس نظم میں اقبال نے حضور سے کہا ہے کہ ہم مسلمان اس دنیا میں اگر آسودگی تلاش کریں تو وہ ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ لاکھوں کی تعداد میں اسلام کو ماننے والے موجود ہیں مگر تیرے ﷺ نام پر قربان ہونے والوں کی تعداد بالکل نہیں۔ مگر میرے پاس ایک ایسا جام ہے جس میں تیری ﷺ امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ آپ ﷺ اسے قبول کریں تاکہ اس دہر میں ہم مسلمانوں کو آسودگی مل سکے[۲۰۵]۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں[۲۰۶]

اقبال کی نظم شمع و شاعر بھی اتحاد اسلامی کے قوی رجحان کا پتا دیتی ہے۔ اس نظم میں جہاں خودی کا نظریہ ملتا ہے وہیں مسلمانوں کو عظمت رفتہ کی یاد دلا کر ان کے دلوں میں جدوجہد کے عمل کو تیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے[۲۰۷]۔ اقبال کو عمر بھر یہ احساس ستاتا رہا کہ وہ اپنی ملت کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے اقبال کہا کرتے تھے ”میں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ میری خدمت اسلامی تو بس اتنی ہے جیسے کوئی شخص فرط محبت میں سوئے ہوئے بچے کو بوسہ دے“[۲۰۸]۔ اس پوری نظم میں اقبال نے ملت اسلامیہ کو جرأتِ رندانہ پر آمادہ کرنے کی اور نیند کی گراں باری سے جھنجھوڑ کر جادۂ عمل پر گام زن ہونے کی ترغیب دی ہے[۲۰۹]۔

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا[۲۱۰]

اقبال نے اپنی ایک نظم محاصرہ ادر نہ میں ترکوں کی سیرت کا ایک روشن پہلو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکوں کے دل میں شریعت کی پاس داری کس قدر تھی۔ ایڈریا نوپل جسے ترکی میں ادرنہ کہتے ہیں، فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن غازی انور پاشا نے جولائی ۱۹۱۳ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا تھا[۲۱۱]۔ غازی انور پاشا نے مجبور ہو کر شہر کے باشندوں کے سامان پر قبضہ کر لیا لیکن فقیہہ شہر نے فتویٰ دیا کہ ذمی کا مال مسلمانوں کے لشکر کے لیے حرام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کی لیکن عوام کے مال کو واپس کر دیا[۲۱۲]۔ نظم بلاد اسلامیہ میں بھی ترکوں کے دارالخلافے قسطنطنیہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ کا دل قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدی امت کی سطوت کا نشان پائدار

صورت خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستان مسند آرائے شہ لولاک ہے

نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربت ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلماں! ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر[۲۱۳]

اقبال کی کئی اور نظمیں بھی ہیں جس میں اتحاد اسلامی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ خضر راہ، طلوع اسلام جیسی نظموں میں دنیائے اسلام اور اس میں انتشار و اضمحلال کو تصویر کی صورت دکھایا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ مغربی استعماریت کی پوری عمارت معاشی استیصال اور سیاسی توسیع کے نظریات کی بنیاد پر قائم ہے[۲۱۴]۔ ترکی میں خلافت کے تصور کو پامال کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان دوبارہ عزت و جاہ و جلال چاہتے ہیں تو انھیں اتحاد بین المسلمین کے بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا[۲۱۵]۔

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) (۱۸۹۴ء۔۱۹۲۲ء):

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) بھی اتحاد اسلامی کی تحریک سے متاثر تھیں۔ ان کی دور اوّل کی نظموں اور غزلوں میں مسلمانوں کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نکلنے کی جدوجہد کرنے کی تلقین کی گئی

ہے۔ان کی ایک نظم ظہور امام میں موجودہ حالات کو بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ امام مہدی کے آنے کا وقت آچکا ہے، دنیا اب اس شخصیت کی منتظر ہے۔ وہ ظالم حاکم جنھوں نے ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں، ان سے تیری سیادت میں ہی انتقام لیا جائے گا۔ چوں کہ ترکی اس دنیا میں مسلمانوں کی سیادت کر رہا ہے اس لیے اس کی فوجیں امام مہدی کی رہبری میں قدم آگے بڑھائیں گی۔ یہ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

قائد فوج شہِ ترکی و ایراں ہوں گے　　اٹلی و روس یہ سب تابعِ فرماں ہوں گے
طیب خاطر سے کل انگریز مسلماں ہوں گے　　جارج سلطاں تیرے نائبِ سلطاں ہوں گے
تری تصدیق کرے گا شہ جاپاں آجا

ضعف اسلام ترقی پہ ہے شاہا! دن رات　　ہے یہ تجویز اطبائے فلاطوں اوقات
یک دلی، یک جہتی کا یہ پیے آب حیات　　آپ ہیں خضرِ زماں آپ ہیں شمعِ ظلمات
آہ درد دل اسلام کے درماں آجا[216]

ز۔خ۔ش کی نظموں میں روحانی عنصر بہت کم اور سیاسی شعور بہت زیادہ تھا۔ وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتی تھیں، جنھیں اس وقت کسی شاعرہ سے نسبت دینا لوگوں کے تخیل سے بعید تھا۔ ان کی نظموں میں سیاسی شعور اور وسعت عملی کی ایک شان تھی۔ جس نے ان کی شاعری کو مردانہ وجاہت بخش دی تھی[217]۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جس غیرت ملی کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور خاتون شاعر میں ملنا مشکل ہے۔

انھوں نے اپنی نظموں میں عظمت ماضی کے نقوش کو دوبارہ زندہ کیا ہے اور شعوری کوشش یہ کی ہے کہ ان نظموں کے ذریعے لوگوں میں مذہب سے دلی وابستگی اور قومی غیرت زندہ کی جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلام ہی اصل طاقت ہے جو ہمارے دلوں کو آپس میں جوڑ سکتا ہے۔ اتحاد بین المسلمین کا درس انھوں نے یوں دیا ہے:

کس لیے ہم سے تنفر ہے تجھے؟ استقلال　　یک دلی! کیوں نظر آتی نہیں صورت تیری
مذہبی جوش! پھر اک بار دکھا دے جلوہ　　درد اسلام! پھر اٹھ آ کہ ہے حاجت تیری[218]

جنگ طرابلس کے حوالے سے ایک نظم میں مسلمانوں کی سلطنت پر غیروں کا تسلط ہو جانے پر یوں شکوہ کیا ہے:

ارض اسلام پر غیروں کی حکومت کیسی　　قبل از وقت یہ آئی ہے قیامت کیسی
نور انصاف ہوا دہر سے یک دم کافور　　چار سو پھیل گئی ظلم کی ظلمت کیسی

اٹلی غیر مہذب ہمیں تہذیب سکھائے　　راہِ گم کردہ سے امیدِ ہدایت کیسی[۲۱۹]

نظم بصائر سیاسیہ میں بھی انھوں نے برطانیہ کے کردار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ:

ہم ہیں سرکار پہ قربان وہ ہم سے بدظن　　ہائے قسمت سے ملی ہے ہمیں قسمت کیسی
جارج پنجم شہ برطانیۂ عظمٰی کی　　کیا بتائیں کہ دلوں میں ہے محبت کیسی[۲۲۰]

اپنی مثنوی عالم خواب میں طرابلس میں جاری جنگ کو پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رزمیہ مثنوی بے حد رواں اور پُر جوش ہے۔ اس میں انھوں نے پردہ دار خواتین کی عزت لٹ جانے پر افسوس کا اظہار کیا ہے:

بپا تھا سر بہ فلک کیمپ اٹلی والوں کا　　تمام شہر پہ قبضہ تھا بد خصالوں کا
یہ بحر روم پہ لاشوں کا پل بنائیں ابھی　　زمین خشک میں دریائے خوں بہائیں ابھی
اسی گروہ میں تھیں پردہ دار خاتونیں　　فدائے ملت و غیرت شعار خاتونیں[۲۲۱]

یہ مثنوی طویل ہے اور اس میں غم و غصے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر انھوں نے اطالویوں کے کردار کی بھرپور مذمت کی ہے۔

اطالوی بھی عدوئے شہہ بشر نکلے　　خدا کی شان ہے لو چیونٹی کے پر نکلے
خبیث! اسم شہ پاک اور تیرا منہ　　صحابہ شہ لولاک اور تیرا منہ[۲۲۲]

ز۔خ۔ش نے انجمن ہلال احمر میں چندہ دینے کے لیے ہندوستانی مسلمان خواتین کو بھی ابھارا۔ اس نظم کا نام انھوں نے اپیل رکھا۔ اس نظم میں جہاں مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کی امداد و اعانت کریں وہاں انھیں اس نظم میں باخبر بھی کیا گیا ہے کہ ترکوں کی بہادری اور جاں فشانی کو دیکھ کر یورپی قوتوں نے بلقانی ریاستوں کو اس پر چڑھ جانے کی درپردہ طور پر سازش کی ہے۔

جب دشمنوں نے دیکھا یہ جاں گسل تماشا　　ہوتے نہیں ہیں زچ یہ آفندی اور یہ پاشا
بلقان کو ابھارا یہ کہہ کے بے تحاشا　　یورپ سے آج نکلے دین عرب کا لاشا
اس طرح سے چھڑی ہے یہ کارزار بہنو

بلقانیوں نے اکثر قصبے جلا دیے ہیں　　پھانسی پہ امن پرور شہری چڑھا دیے ہیں
اسباب سب کے لوٹے گھر سب کے ڈھا دیے ہیں　　اربابِ گنج و زر کو فاقے کرا دیے ہیں

باور نہ ہو تو پڑھ لو رپوٹر کے تار بہنو[۲۲۳]

اس نظم میں زبان و بیان کی روانی اپنی جگہ مگر جوش و جذبے کی فراوانی متاثر کن ہے۔ برصغیر کی خواتین جو روایتاً خاموش تماشائی تھیں انھیں بے دار کرنے کے لیے ایسی نظم نے متاثر کن کردار ادا کیا[۲۲۴]۔ مخمس کے انداز میں لکھی گئی یہ نظم اس وقت کے حالات کا نقشہ کھینچتی ہے جن سے ترک گزر رہے تھے اس نظم میں تاریخی حقائق کے علاوہ ہندوستان میں انگریز حکومت کے منافقانہ کردار کو بھی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ طرابلس کی خواتین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

پھرتی ہیں ماری ماری عزت شعار بہنیں وہ پاک باز بہنیں وہ پردہ دار بہنیں
ہیں وارثوں کے غم میں خوں نا بہ بار بہنیں اللہ سے اجل کی ہیں خواست گار بہنیں
فانی ہے عیشِ دارِ ناپائے دار بہنو

ترکاں پاک دیں کے دیکھے جو یہ مصائب بھائی ہوئے ہمارے بے غیرتی سے تائب
پایا خوشامدی کو اس حلقہ سے جو غائب حاتم بنا خدیو ہندوستان کا نائب
ہیں اک ادب پہ فائق یہ اک ہزار بہنو[۲۲۵]

مولانا شبلی ہی کے انداز میں انھوں نے نظم شہر آشوب اسلام لکھی اس نظم میں بھی ممالک اسلامیہ پر چھائی ہوئی زوال کی کیفیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک پورا حصہ ترکوں کے عادات و خصائل کا عکاس ہے۔

نہ پوچھ ہم نفسو! بار بار کیا ہیں ترک وجود حسنِ خلائق کا مدعا ہیں ترک
خروش فتح کی ہیں گونج زیر گنبد چرخ جیوشِ جاہ و حشم کے نشان پا ہیں ترک
نہیں ہے بحرِ عمیقِ جہاں میں ہول فنا جہاز ملت بیضا کے ناخدا ہیں ترک
یہ قول شبلی علامہ حرف قسمت ہے زوال دولت عثمان زوال ملت ہے[۲۲۶]

انھوں نے ایک نظم انور پاشا پر لکھی ہے جس میں ان کی بہادری اور جفاکشی کو سراہا گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

کیسی دل سوزی سے کہتی شمع گریاں تجھ سے ہے
اے مرے انور ضیائے بزم امکاں تجھ سے ہے[۲۲۷]

انور پاشا چوں کہ انجمن اتحاد نو جوانان ترک کے سرگرم رکن تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا

طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ اس انجمن نے جو دستوری انقلاب برپا کیا ہے اس سے ترکی دوبارہ عظمت وشوکت حاصل کر لے گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔ جنگ بلقان کی ناکامی نے اس انقلاب کو بھی ناکامی سے دوچار کر دیا۔ بہرحال اس نظم میں انور پاشا کی شخصیت کو انھوں نے عظیم انقلابی کے طور پر پیش کیا ہے۔

دیکھ او غازی ابھی تک میان میں خنجر نہ ہو
یا ہو تاج فتح سر پر ورنہ تن پر سر نہ ہو
پائیں خنجر کی زباں سے پانچ دنداں شکن
صلح جُو ہوں تجھ سے گر بلقانیِ پیاں شکن
عالمِ اسلام میں انور کئی پیدا ہوں کاش
تیری صورت کل مسلماں قوم کے شیدا ہوں کاش[228]

ہندوستانی مسلمان ابھی ان معاملات کو دیکھ کر رنجیدہ تھے کہ مسجد کان پور کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے نے ہندوستانی مسلمانوں پر یہ عیاں کر دیا کہ انگریزی حکومت سے کسی بھی قسم کی اچھی توقع رکھنا خام خیالی ہے۔ ز۔ خ۔ ش نے بھی اس سے متاثر ہو کر نظمیں کہیں:

پھٹ گیا محکوم و حاکم کا لباس اتحاد
انفراق اے ہم نشیں چولی سے دامن نے کیا[229]

جنگ عظیم اوّل کے حوالے سے انھوں نے اپنی نظم جنگ فرنگ میں اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور عالمی سیاسی حالات پر اظہار خیال کیا ہے۔

اندھا جنون ولولہ انتقام نے
جوزف فرانس کی حکومت کو کر دیا
جنگی ترانا گایا فرنچ اژدہام نے
اسٹیم رولر اور نشان اجل بڑھے[230]

ابراہیم بیگ چغتائی:

ابراہیم بیگ چغتائی نے جنگ یونان و روم کے عنوان سے ایک مثنوی ۱۸۹۷ء میں لکھی۔ اس مثنوی کے ابتداء میں شاعر کا کہنا ہے کہ ''میں نے اس جنگ کے واقعات کو جناب قاضی محمد جلال الدین مراد آبادی کی تاریخ یونان و روم اور دیگر تاریخ کی کتابوں سے اخذ کر کے منظوم کیا ہے[231]۔'' ان کا خیال تھا کہ اس لڑائی میں ترکوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی گونج عالم اسلام میں تادیر قائم رہے گی۔ لہذا انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس پورے واقعے کو مثنوی کی صورت میں بیان کیا جائے[232]۔ ابراہیم بیگ چغتائی کو اس منظوم تاریخ لکھنے کے عوض جو رقم کتابوں کی فروخت کی صورت میں حاصل ہونا تھی اسے حجاز ریلوے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ موصوف انجمن اسلام گوالیار کے سیکریٹری تھے[233]۔ مثنوی میں ترکی فوج

کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

دوسرے دن وہ فوج میں ملتے ————— دور جو فوج کے ڈویژن تھے
ہوگیا جنگ میں شریک آکر ————— ایک نے پائی جنگ کی جو خبر
شام ہونے سے پہلے آپہنچا[۲۳۴] ————— مار کر تیس کوس کا دھاوا

اس مثنوی میں جابہ جا ترکوں کی تعریف اور جنگی واقعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ کس طرح یونانیوں نے ترکوں سے جنگ کی، کون سے سیاسی عوامل تھے۔ کہاں کہاں ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور کن کن مقامات پر ترکوں نے اپنی بہادری کا سکہ منوایا۔ ترکی افواج نے دولو کے مقام پر جب حقی پاشا کے ہم راہ پیش قدمی کی تو اس کا نقشہ مثنوی میں یوں بیان کیا گیا ہے:

حقی پاشا کے ماتحت جو بڑھے ————— فوج ترکی کے دو بڑے دستے
دوسرا آیا جانب دولو ————— ایک نے لے لیا ویلسٹینو
زک سپاہِ گریس نے کھائی[۲۳۵] ————— راہ میں ایک سخت جنگ ہوئی

جب ترکوں نے دولو کو فتح کرلیا تو اس وقت ترکی افواج نے وہاں کے شہریوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، ان حالات کو اس مثنوی میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

حقی پاشا کے سر رہا سہرا ————— فتح ویلسٹینو دولو کا
باادب اپنے سر کیے ننگے ————— مجتمع شہر کے ہیں باشندے
خلق مشہور سب جہاں میں رہا ————— سچے دیں دار اور شجاعوں کا
ظلم کرتے نہیں کسی پہ کبھی[۲۳۶] ————— جانتے سب ہیں کہ یہ عثمانی

جب نجیب پاشا نے حقی پاشا کے کہنے پر تقریر کی اور وہاں کے تمام باشندوں کو امان بخشی تو تاریخی حقیقت کو اس مثنوی یوں پیش کیا گیا ہے:

میر عسکر ہیں تم سے فرماتے ————— یہ کہا نجیب پھر پاشا نے
تم میں ہر شخص کان دے کے سنے ————— ہے یہ اعلان ان کی جانب سے
اور آزادی تم کو ہے حاصل ————— تم کو دی جاتی ہے اماں کامل
سمجھیں محفوظ تم میں خاص و عام[۲۳۷] ————— اپنے ناموس و جان و مال تمام

یہ مثنوی اردو رزمیہ شاعری میں ایک انوکھی مثال پیش کرتی ہے۔ شاعر نے جنگ کے جدید طریقے کو شاعری کا لباس پہنا کر بالکل ایک نئے طرز کی ابتدا کی ہے۔ یونانی مورچوں پر ترکوں کے حملے جس انداز میں ہوئے، اس کی پیش کش کا انداز بھی وہی ہے:

بولتے مورچوں پہ ہیں دھاوا جس پہ غرۃ تھا دشمنوں کو بڑا
جنگ کی لہر میں جو ترکی تھے بحر مواج کی طرح وہ بڑھے
مورچوں کی طرف یہ فوج بڑھی جس طرح موج ہو سمندر کی
نغمۂ جنگ ان کا ہوش ربا جنگ کے بینڈ سے بھی دل دہلا[۲۳۸]

اس مثنوی کے آخر میں سلطان عبدالحمید کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا گیا ہے۔ جس میں ان سے بے حد عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترکی خلیفہ سے عقیدت رکھنا ہندوستانی مسلمانوں میں عام رویہ تھا۔ صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالحمید سے انسیت رکھتے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ:

ترک کیسے ہی ہوں شکستہ حال ساتھ ان کے ہے جنگ امر محال
روس پر منکشف ہوا پیہم رکھ سکے گا نہ جنگ وہ قائم[۲۳۹]

حجاز ریلوے پر انھوں نے ایک شذرہ بھی لکھا ہے جس میں اس ریلوے کو مقدس ریلوے کہا گیا ہے۔ اس کے استحکام کے لیے ایک دعائیہ نظم بھی موجود ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے:

ذریعۂ خیر و سعادت ہے حجازی ریلوے
مومنوں پہ حق کی رحمت ہے حجازی ریلوے[۲۴۰]

اس مثنوی کے ضمن میں شیخ نورالدین کی مثنوی قصۂ شاہ روم کا ذکر کرنا ازحد ضروری ہے۔ انھوں نے اس میں سلطنت عثمانیہ کے سیاسی اور عمرانی حالات و واقعات بیان کیے ہیں اسے بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ان کے پیش نظر رہا کہ مسلمانوں کا چاہے شاہ ہو یا گدا اگر وہ دین سے غافل ہوتا ہے تو تباہی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ مثنوی میں مسلمانوں کو اس بات کی تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ وہ ان ممالک سے سبق سیکھیں جو کبھی تاج و تخت کے مالک تھے مگر آج غیروں کے ہاتھوں ذلت و رسوائی اٹھا رہے ہیں۔ مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

خودی کے کام سے بندو ڈرو تم   یہ شاہ روم کا قصہ سنو تم
عجب اس شاہ کا یہ تذکرہ ہے   خودی سے اپنی کیا کیا دکھ سہا ہے
اسے سن کر جو ہووے مرد عاقل   خدا کے خوف سے ہووے نہ غافل[۲۴۱]

چوں کہ قصہ صرف ترکی شاہ کا ہے جو دین سے غافل ہے مگر شاہ روم کے تعلق سے قصہ لکھا گیا ہے اس لیے اسے بھی پیش کرنا میں نے مناسب سمجھا۔

آغا غلام حسین ارشد:

آغا غلام حسین ارشد کی نظمیں رسالہ تمدن دہلی میں ملتی ہیں ان کے حالات کا علم نہیں ہو سکا، مگر ان کی نظموں کا ذخیرہ دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اتحاد اسلامی کا جذبہ پیدا کرنے والے اہم لوگوں میں شمار کیے جاتے ہوں گے۔ رسالہ تمدن اپریل ۱۹۱۳ء میں ان کی ایک نظم نالہ جگر سوز چھپی، اس نظم کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

> ہلال احمر کے شفا خانے سے یہ نالہ جگر سوز بلند ہو کر جب سے میرے کان تک پہنچا ہے تب سے میرے دل کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے لیکن نہیں معلوم کہ اس کے سننے سے مسلمانان ہند کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی۔ جس مظلومہ کے حال نے مجھے اس نظم کے کہنے پر مجبور کیا اس کی نہایت مختصری روداداک دردناک نظارہ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار ۱۵مارچ ۱۹۱۲ء کو چھپ چکی ہے۔ میں اپنی اس ستم رسیدہ بہن کی طرف سے جملہ اہل اسلام کی خدمت میں متذکرہ بالا نظم پیش کرتے ہوئے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس غریب کے لیے جو ہلال احمر کے شفا خانہ میں زیر علاج تھی اور طرابلس کے دوسرے زخمی بھائی بہنوں کی امداد کے لیے جس قدر چندہ ممکن ہو سکے فراہم کریں[۲۴۲]۔

اس نظم میں انھوں نے مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو اب اپنے دین وملت کا پاس رکھتے ہوئے اپنی حمیت اور آئین وفاداری کے بھولے ہوئے سبق پر عمل کرنا ہوگا۔ خواب غفلت سے بیدار ہو کر شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ ملت اسلامیہ کے احیا کی جدوجہد کرنی ہوگی۔ انھوں نے اس نظم میں اطالویوں کے ظلم وستم کی بھی منظر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کی جمعیت کی پریشانی کا نقشہ نہایت دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بند میں کہتے ہیں کہ:

مسلمانو! تمھیں کچھ پاس بھی ہے دین ملت کا   خیال آتا بھی ہے تم کو کبھی اپنی حمیت کا

کیا ہے آج کل کیوں ترک آئین وفاداری　　سبق دینا نہیں اسلام کا تم کو اخوت کا
زمانہ جاگتا ہے اور تم ہو خواب غفلت میں　　نہیں ہے کچھ تمھیں احساس ہی اپنی مصیبت کا[۲۴۳]

ہندی مسلمانوں کو اس جنگ میں مالی امداد پر آمادہ کرنے کے لیے جذباتی لہجے میں اکساتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمیں کیا حق نہیں حاصل ہے مسلم کی کمائی میں　　دوا کے ہی لیے کچھ بھیج دو اپنے خزانے سے
نہ کی جب وقت پر امداد پھر کس کام آؤ گے　　کفن بنواؤ گے جب ہم گذر جائیں زمانے سے
تمھارے دل میں گر اسلام کی کچھ بھی محبت ہو
مسلماں ہو! مسلمانو! شریک رنج وراحت ہو[۲۴۴]

آغا غلام حسین ارشد نے یورپ کے جارحانہ رویے پر ایک نظم تازہ ستم کے نام سے لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے یورپی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی ہے اور مسلمانوں کی درخشاں روایات کو بیان کرتے ہوئے دوبارہ اس مؤقف کی تائید کی ہے کہ ہمیں اخوت کا سہارا لے کر دنیا میں اپنے وقار کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مشہور تھے جہاں میں ہم آن بان والے　　جھکتے تھے آستاں پر عرش آستان والے
زیرِ نگیں تھے سارے نام و نشان والے　　دب کر رہے ہمیشہ تاب و توان والے
رفعت نشاں رہا ہے ہر جا علم ہمارا
خورشیدِ تمکنت تھا دستِ کرم ہمارا[۲۴۵]

پھر اسی نظم میں مسلمانوں پر تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کوئی ہمیں بتا دے دنیا میں بن کے عادل　　کیا ہم ہی رہ گئے تھے ایسی جفا کے قابل
اس وقت وہ نہیں ہیں روز جزا کے قائل　　جا کر کہاں چھپیں گے ہنگام حشر قاتل
چہرہ ہے سرخ خوں سے خورشید خاوری کا
نزدیک آگیا ہے دوران داوری کا[۲۴۶]

ان کی شاعری میں پان اسلامزم کے جذبات کے علاوہ ملت اسلامیہ کے زوال کی نمایاں تصویریں جو حادثات اور سانحات سے عبارت ہیں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔ مگر انھوں نے امید کے دامن کو ہاتھ سے

نہیں چھوڑا ہے۔اس پُر الم ماحول میں بھی انھوں نے مسلمانوں کو مجتمع کر کے زمانے کے ساتھ چلنے کا درس دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ:

چال چلتا ہے زمانہ کیسی یہ رفتار دیکھ ہو کے بیدار انقلاب چرخ کج رفتار دیکھ
دیکھ مشرق کا ذرا اجڑا ہوا گل زار دیکھ سمت مغرب سے طلوع شمس کے آثار دیکھ
نالہ قمری، فغانِ عندلیب زار سن ہم صفیرانِ چمن کی غور سے گفتار سن[۲۴۷]

آغا غلام حسین ارشد چوں کہ اضطراری کیفیت میں شاعری کررہے تھے۔اس لیے ان کی نظمیں ایک خاص نظریہ اور فکر سے مربوط دکھائی دیتی ہیں۔جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اگر وہ اس پر خصوصی توجہ دیتے تو ان میں ایک اچھے شاعر کے جوہر پنپ سکتے تھے۔ان تمام باتوں سے قطع نظر ان کی شاعری میں اقبالؔ کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔

شمع کے شعلے نے پروانے کو خاکستر کیا انقلاب دہر سے ہے شورش محشر بپا
دم بہ دم ارشد یہی آتی ہے ہاتف کی صدا تیر جلادِ فلک نے ہاتھ میں خنجر لیا

ہے تیری ہستی کا دنیا سے سفر ہشیار ہو
سر پہ آپہنچی قیامت بے خبر ہشیار ہو[۲۴۸]

تحریک اتحاد اسلامی کے مطالعے کے دوران یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو نظم ونثر دونوں میں اس تحریک اور ان واقعات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ شعرا نے کثرت کے ساتھ ان جنگی معرکوں پر نظمیں لکھیں جن سے اس وقت مسلم ممالک دوچار تھے۔ان واقعات کی منظر کشی، اصل صورت حال کا ادراک، سیاسی چال بازیوں سے پردہ اٹھانے کا عمل، بیداری اور شعور کے لیے جدوجہد اس دور کے موضوعات رہے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ ان حالات کا بھی جائزہ نظموں اور دیگر نثری کتابوں میں پیش کیا گیا کہ مسلمان آخر ان حالات سے دوچار کیوں ہوئے۔کیا مسلمانوں میں فہم وفراست کی کمی تھی جس نے ان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا[۲۴۹]۔

ان نظموں میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے تابندہ ماضی کو موضوع بناتے ہوئے موجودہ صورت حال سے موازنہ کیا جاتا رہا ہے تا کہ مستقبل کے امکانات میں مسلمان اپنے ماضی کو کسی صورت فراموش نہ کریں۔

آغا غلام حسین ارشد نے اسی سوچ وفکر کے ساتھ اپنی ایک نظم مکالمہ رندوشیخ میں ملت کے

مسائل کو مکالماتی انداز میں نمایاں کیا ہے۔انھوں نے واضح طور پر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اب زمانہ نہایت تیزی سے کروٹ بدل رہا ہے اس بدلتی ہوئی صورت حال میں اگر ہم نے اپنے حالات کو تبدیل نہیں کیا تو دنیا میں دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔چوں کہ مغرب سے راست مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم و ہنر سے لیس ہو کر فنی، حربی اور تحقیقی میدان میں انھیں شکست سے دوچار کیا جائے۔اس نظم میں ایک جگہ انھوں نے خوش خلقی کے بارے میں یوں کہا ہے کہ:

مہربان بہلا کے من کو کیوں نہ ہو دل کو قلق　　کردیا سینے کو سنگ بد زبانی سے جو شق
یوں تو حضرت کو بہت کچھ دعویٰ اسلام ہے　　بیٹھ کر کعبہ میں سیکھا کافروں کا سا سبق
دور ہے یہ امر تو اسلام کی تہذیب سے　　خلق سکھلاتا ہے ہر انسان کو قانون حق ۲۵۰

آغا غلام حسین ارشد کی نظم اسلا م ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش واضح طور پر موجود ہیں۔انھوں نے اس نظم میں حرمت اسلام اور شوکت اسلام کو ماضی کے پردے میں دیکھا ہے۔حال میں نبی اکرمؐ سے دعا مانگی ہے کہ اس دین کا پاس رکھنے والے صلیبی طاقتوں کے نشانے پر ہیں اگر آپ نے مسلمانوں پر کرم نہیں کیا تو اس دین کا نام ونشاں بہت تیزی سے مٹ جائے گا۔اس نظم میں مستقبل کی صورت گری کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ مسلمانوں کو علم و ہنر سے آراستہ ہو کر دوبارہ اسلام کی سربلندی کے لیے ایک میدان میں جمع ہونا ہوگا۔انھوں نے کہا ہے ایک دور وہ بھی تھا جب کہ اسلام کا سکہ زمانے بھر میں چلتا تھا مگر اب ان کی ساری حکومتیں اغیار کے قبضے میں چلی جا رہی ہے:

تھی ایک زمانے میں مشہور طاقت اسلام　　ہر ایک ملک تھا زیر حکومت اسلام
یہ اوج پر تھا ستارہ بلند بختی کا　　کہ پہنچی عرش معلیٰ پہ شوکت اسلام
مگر زمانے کی گردش نے کھو دیا سب کچھ　　کہاں ہے زور کدھر ہے وہ دولت اسلام
کہوں میں کیا کہ کوئی حد نہیں غریبی کی　　یہ مفلسی تو علامت ہے بد نصیبی کی ۲۵۱

اس نظم میں شاعر نے یورپی طاقتوں کے جارحانہ رویوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کے حضور شکوہ کیا ہے اس میں ان کا کہنا ہے کہ اسلام اور اس کی قوت غیر مسلموں کو کسی صورت گوارا نہیں ہے۔اگر آپ نے نظر کرم نہ کی تو مسلمانوں کی قوت جلد از جلد تباہ و برباد ہو جائے گی

تجھے بھی کیا نہیں یارب نبی کی دین کا پاس　　ہماری خواری و زاری کا کچھ تو کر احساس

سنائیں حال دل بے قرار ہم کس کو ہمیں تو تیرے سوا اور نہیں کسی کی آس
مٹانا گر تجھے منظور ہے جہاں سے ہمیں دے گھول کے ہمیں پانی میں زہرۂ الماس
نشانِ دینِ ہدٰی مٹ کے خاک ہو جائے
عدو ہوں خوش جو یہ قصہ ہی پاک ہو جائے[۲۵۲]

آگے چل کر انھوں نے اللہ سے کہا ہے کہ یارب ارشد نے جو باتیں کی ہیں کیا وہ بجا نہیں ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کے حال پر رحم کر اور انھیں دین و دنیا کی دولت سے سرفراز کر کے دوبارہ وہی مقام عطا کر جوان کا طرۂ امتیاز تھا۔

یہ کہہ رہا تھا کہ ہاتف نے دی ندا ارشد کہی جو تو نے ابھی بات تھی بجا ارشد
سن اس کو ہوش سے کہنا ہے یہ خدا ارشد میں سن رہا ہوں ترا نالۂ رسا ارشد
نہ میرے عرش کو فریاد سے ہلا ارشد قبول ہی کرے اس وقت جو دعا ارشد
پسند آیا نہایت ہمیں سخن تیرا
کہے تو لعل و گہر سے بھریں دہن تیرا[۲۵۳]

آغا غلام حسین ارشد نے ساقی نامہ میں اپنے دل پہ چھائی ہوئی غم واندوہ کی کیفیت کو پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ زوال امت کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے مقدر میں تہی دست ہونا ہی لکھا تھا۔مسلمانوں میں انحطاط کے موضوع پر ان کا دردناک بیان اس ساقی نامہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ان کی نظموں میں جس انداز میں مسلمانوں کی حالت زار کی کیفیت بیا کی گئی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے قلب اور روح کو تڑپا دینا چاہتے ہیں۔ساقی نامے کی روایت کے مطابق، اس میں شاعر نے ساقی کو مخاطب کر کے مسلمانوں میں ایمان ویقین کو جلا بخشی ہے ان کے دل میں جو ملی درد واحساس موجود ہے وہ ایسی کش مکش کا نتیجہ ہے جس سے عالم اسلام اس وقت دو چار تھا۔وہ کہتے ہیں کہ:

تجھ کو کیوں کر یہ گوارا ہے کہ مضطر ہو کر پھینک دوں چیر کے پہلو کو امانت تیری
آبرو دین نبی کی جو ہے منظور تجھے کس لیے جوش میں آتی نہیں غیرت تیری
گردش ساغر صہبائے حجازی دکھلا
بھیج اب ساقی کو اور بندہ نوازی دکھلا[۲۵۴]

شاعر کی ان نظموں سے یہ اضطراب نمایاں ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کو متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کی سوچ و فکر کا بنیادی اور مرکزی نقطہ یہی رہا کہ ہم اس دور غلامی سے کسی صورت نکل جائیں۔ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر دنیا میں شریعت محمدی کو نافذ کر دیں تا کہ نوع انسانی یورپ کی انسانیت سوز منصوبوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالے۔

ہر طرف چلنے لگے پھر مئے توحید کا جام — صنعت مہر بلندی پہ ہو اسلام کا نام
نکل آجلد مدینے سے خدارا ساقی — ہاتھ میں جام ہو شانے پہ نشان اسلام
دل ہو مسرور مرا سن کے حجازی نغمہ — رنج و غم میں ہوئی جاتی ہے میری عمر تمام
یارسول عربی وقت مدد ہے اب تو — شاد امت ہو تیری اور ہوں دشمن ناکام
پھر دل امت مرحوم کو زندہ کردے — پھر سے ہشیار ہوں دنیا میں ترے مئے آشام[۲۵۵]

آغا غلام حسین ارشد کی نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی ملی احساس نمایاں ہے۔ ان کی ایک غزل جولائی ۱۹۱۴ء کے تمدن، دہلی میں فارسی زبان میں شائع ہوئی۔ اس غزل کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دل جمعی کے ساتھ شاعری کی ہے۔ وہ اپنے زمانے میں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے مگر افسوس ان کا مجموعہ کلام موجود نہیں ہے جس سے ان کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہو سکتا۔ ان رسائل میں جو کچھ بھی موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور ملی تناظر کو اپنی شاعری میں خصوصی جگہ دی تھی۔

شاہ قسیم الدین:

شاہ قسیم الدین کا مجموعہ کلام درد جگر جو مطبع اخبار الپنچ بانکی پور سے شائع ہوا تھا اس میں جتنی نظمیں بھی شامل ہیں ان پر پان اسلامزم کا احساس غالب ہے۔ شاعر نے قومی جوش و جذبے کے تحت یہ نظمیں ان جلسوں میں پڑھیں جو جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے مجروحین کے فنڈ کے لیے منعقد کیے جاتے تھے۔ ان نظموں میں یورپ کی ستم رسانی اور ان کی پالیسیوں پر تنقید بھی ہے اور مسلمانوں کی غیرت دینی کو زندہ کرنے کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان نظموں کے بارے میں ان کے دوست نے یہ رائے دی ہے کہ:

میں تمھارے قومی جوش و جذبے کی داد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اپنی نظموں کو شائع کر کے قوم

کو ممنون کرو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تمھاری جھجک تمھاری ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہے[۲۵۶]۔

ان نظموں کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی ایسا شہر اور قصبہ نہیں چھوڑا جس میں ترکوں سے محبت اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی ترجمانی نہ کی گئی ہو۔ بانکی پور کی جامع مسجد میں ۲۶ مئی ۱۹۱۳ء کو جو اجلاس ہوا اس میں قسیم الدین صاحب نے یہ نظم پڑھی جس میں ترکوں کی بہادری اور انور بے کی جرأت کو بھی سلام پیش کیا گیا تھا:

تظلم کی لگی ہیں اپنے دل میں برچھیاں لاکھوں   ستم گارو سمجھ رکھو مزا اس کا چکھا دیں گے
رہے سایہ فگن انور اگر چندے جو ترکی میں   توکل ہم صوفیہ میں فتح کے جھنڈے اڑا دیں گے[۲۵۷]

ایک نظم ترک مجروحین کی امداد کے لیے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء میں بانکی پور ہی میں پڑھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک تھے اس نظم میں بھی انھوں نے یورپ کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ اپنے آباء کی جرأت کو دوبارہ زندہ کر دیں تاکہ بلقان کو شکست سے دوچار کیا جائے:

خدا سب کو بچائے مکر سے ابلیس یورپ کی   یہ وہ فتنے ہیں جو ہشیار کو غافل بناتے ہیں
کہیں گے کچھ کریں گے کچھ یہی گر ہے حکومت کا   اسی کو ڈپلومیسی اپنی وہ حضرت بتاتے ہیں
ستم گاران یورپ ہوش میں آئیں سنبھل جائیں   انھیں اب جرأت آبائی کے جوہر دکھانے ہیں[۲۵۸]

انیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے خاصے متاثر تھے۔ اسی لیے مسلمان شعراء کے یہاں ہمیں خصوصی طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے ترکی اور دیگر ملکوں کے مسلمانوں کے حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ خیالات تقریباً ایک جیسے ہی تھے بس لفظوں کے فرق اور جذبوں کی حدت میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔

کسی بھی شاعری کو اگر مخصوص واقعاتی پس منظر میں دیکھا جائے تو پھر اس کا دائرہ اثر محدود ہوتا جاتا ہے قسیم الدین صاحب کی شاعری بھی اسی کا مظہر ہے انھوں نے پان اسلامزم کے تصور کے تحت جو شاعری کی اس میں تنوع نہیں ہے بلکہ وہ صرف واقعاتی بیان کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی نظم شہر آشوب اسلام سے متاثر ہو کر شاہ قسیم الدین نے جنگ بلقان کے پر نظم لکھی۔ اس نظم میں خیالات تک شبلی سے مستعار لیے ہیں:

غبار کفر کی سر پر رہیں گی بدلیاں کب تک   چلیں گی ظلم و ذلت کی ہمیں پر آندھیاں کب تک

گریں گی قہر و آفت کی خدایا بجلیاں کب تک
مراکش مصر و چیں فارس گئے اپنے حکومت سے

شہید ظلم کے خوں سے بہیں گی ندیاں کب تک
یہ شور جنگ بلقان کا ہماری آفت جاں ہے [۲۵۹]

قسیم الدین صاحب کی شاعری میں قومی اور ملی احساس نمایاں ہے۔ان کی بیش تر نظموں میں معروف شعرا کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کی مٹتی ہوئی شوکت وعظمت سے بے چین ہو کر اپنی شاعری میں ان احساسات کو پیش کیا ہے۔بلغاریوں کے ظلم وستم کے حوالے سے ایک نظم میں کہتے ہیں کہ:

اہل ایمان کے نعرۂ توحید
جن وانساں کے دل ہلائیں گے

نقش توحید کیا مٹائیں گے
یہ عدو آپ منہ کی کھائیں گے [۲۶۰]

بہر حال ان کی شاعری کے مجموعے میں بیشتر نظمیں جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور ترکوں کے حوالے سے موجود ہیں اس سے ہندوستان کے ادبی ماحول پر پان اسلامزم کی تحریک کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آغا حشر کاشمیری: (۱۸۷۹ء۔۱۹۳۵ء)

مسلمانان ہند میں بلاد اسلامی کے حوالے سے جو جذبات پائے جاتے ہیں اس کا اندازہ شاعری کی صورت میں بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔مسیحی قوتوں نے ترکی کو پامال کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔اقبال کی نظم شکوہ اور جواب شکوہ انھیں اسباب کا اظہار ہے۔

اسی دور میں ایک تخلیقی شاہ کار کا تذکرہ کیے بغیر بات نامکمل رہتی ہے۔یہ شاہ کار آغا حشر کاشمیری کی مشہور نظم شکریہ یورپ ہے۔حشر بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے مگر انھوں نے اپنے ڈراموں کے ذریعے بھی یاس و ناامیدی کے ماحول میں قوم کے حوصلے میں رمق پیدا کی۔

شکریہ یورپ کا لہجہ خطیبانہ شاعری کا بے مثال نمونہ ہے اس نظم کے جارحانہ انداز میں حرکت، روانی اور جوش و خروش کا تیز دھارا بہہ رہا ہے جو یاس و قنوطیت کے عام جذبات کو خس و خاشاک کی طرح اپنے بہاؤ میں بہا کر لے جا رہا ہے۔اپنے حیات بخش لہجے کے اعتبار سے یہ نظم گزشتہ نصف صدی کے قومی نوحوں اور مرثیوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں مشرق و مغرب آپس میں متصادم ہیں۔اسے بیان کرنے میں شاعر نے ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے جو اس کی ہمہ گیر کامیابی کی کلید ہے[۲۶۱]۔

شکریہ یورپ جیسی نظمیں کہنا انگریزی حکومت کے دور میں بڑی جرأت کا کام تھا۔انھوں نے اس نظم میں یورپ کے خلاف طنز کے تیر چلائے ،اسی وجہ سے اس نظم کو ضبط کر لیا گیا تھا[۲۶۲]۔اس نظم کے بارے

میں خواجہ حسن نظامی کا کہنا ہے کہ ''یوں تو نظم شکریہ یورپ کا ہر مصرع کوہ آتش فشاں ہے مگر آخری دعا نہایت مؤثر اور خاکستانی پیکر میں ہل چل ڈالنے والی ہے''[۲۶۳]۔

اس نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء میں پڑھی گئی جہاں سامعین کا انہاک قابل دید تھا۔ نظم کے آخری بند پر پہنچتے پہنچتے حشر صاحب کا گلا بھر آیا اور آواز بھاری ہوگئی حشر نے اس نظم میں انگریزی حکومت کے خلاف جو بات کہنی تھی وہ ایک دل نشین پیرائے میں کہہ دی۔ حشر کی آواز جادو بن کر قوم کے متوالوں کو حرارت پہنچاتی رہی۔ اس نظم کے بارے میں حشر کا کہنا ہے کہ ''اس میں جو کچھ ہے وہ مسلمانان عالم کے اضطراب درونی کا اظہار ہے[۲۶۴]۔''

اس نظم میں ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو نغمہ توحید مدتوں سے محو خواب تھا۔ یورپ کے حملوں نے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ مسلمان جو ماضی میں تماشائی تھے اب یورپ کی پالیسیوں نے انھیں موجودہ حالات پر غور کرنے کا اور نئی راہوں کو تلاش کرنے کا حوصلہ دیا۔

مدتوں سے نغمہ توحید محو خواب تھا ساز ہستی مسلماں تشنہ مضراب تھا
پیکر احساس میں خوابیدہ روح درد تھی شعلہ ریزیِ نواہائے اخوت سرد تھی[۲۶۵]

اس کے بعد ماضی کے روشن پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس نے مسلمانوں کو سروری اور دنیا پر حکمرانی سکھائی۔ اسلام کی تعلیمات کا اور ان اصولوں کو اس نظم میں خاص کر سراہا گیا جس کی بدولت انسانیت گمراہی اور اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف آئی:

روشنی دنیا کو دی جس مہر عالم تاب نے زنگ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقت انساں کو مینا کر دیا سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کردیا
شعلے پیدا کر دیے خاکسترِ افسردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں[۲۶۶]

ماضی کے اوراق کا مشاہدہ کرانے کے بعد دور حاضر کے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ابتلا کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج مقام افسوس ہے کہ وہ قومیں جنھیں ہم نے ٹھکرا دیا تھا وہی آج ہم پر حکمراں بن گئی ہیں:

تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
پھر بھی ننگ زندگی آسودۂ خواری رہا سونے والے پر وہی خواب گراں طاری رہا[۲۶۷]

اس نظم میں ایک حصہ یورپ کی کارستانیوں کا بھی ہے انھوں نے یورپ کے مظالم کے خلاف سخت مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ صرف لفظوں کے ذریعے امن اور تہذیب کا نعرہ لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، یورپ کا ستم اس کی تہذیب و شرافت کے دعوے کا مذاق اڑا رہا ہے:

صرف تصنیف ستم ہے فلسفہ دانی تری — آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری
اٹھ رہا ہے شور غم خاکستر پامال سے — کہہ رہا ہے ایشیا رو کے زبان حال سے ۲۶۸

اس نظم کے آخری حصے میں انھوں نے جو دعا مانگی ہے وہ اصل میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا وہ احساس ہے جو ہر دردمند دل کے لب سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے:

رحم کر بس اپنے آئین کرم کو بھول جا — ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے — آئے ہیں اب تیرے در پہ ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں — کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کے مسلم کا خدا کوئی نہیں ۲۶۹

حشر کی ڈراما نگاری میں بھی شاعری کا عنصر غالب ہے۔ان کے اکثر ڈرامے شاعری سے پُر دکھائی دیتے ہیں اور مکالمے بھی بڑی حد تک منظوم ہیں[۲۷۰]۔ان کی ایک اور نظم موج زم زم بھی ملت اسلامیہ کے کرب ناک حالات ک کو پیش کرتی ہے۔اس نظم کا بھی لب لباب یہی ہے کہ خدائی تائید اور مدد کے ذریعے دنیا کے بت کدے میں رحمت انسانیت ﷺ کے بھولے ہوئے پیغام کو پہنچایا جائے گا۔اس نظم کے آخر میں انھوں نے بارگاہ خدا سے دوبارہ رحمت کی طلب کی ہے۔

المدد اے نعرۂ اللہ اکبر المدد — بت کدے کو پھر بنانا ہے خدا کا گھر ہمیں
ڈگمگاتے ہیں گرتے جاتے ہیں تیرے ناتواں — اے تیری رحمت کے صدقے تھام لے بڑھ کر ہمیں
تیرے در کو چھوڑ کر ہم بے نوا جائیں کہاں — یا بتا دے اور کوئی اپنا جیسا گھر ہمیں

دوسروں کو زور و زر سے عیش دے آرام دے
اور ہمیں اس دولتِ دنیا سے صرف اسلام دے ۲۷۱

مولانا تمنا عمادی: (۱۸۸۸ء۔۱۹۷۲ء)

مولانا تمنا عمادی کی شاعری ان کی علمی خدمات کے سامنے دب کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے بھی مسلمانوں کے حالات اور پان اسلامزم کے جذبات کو مدنظر رکھ کر کئی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ ان کی شاعری رسالہ تمدن اور الناظر کے صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔ اتحاد اسلامی کے جذبات کے علاوہ ان کی نظموں میں ان الزامات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو ہندوؤں اور انگریزوں نے اسلام پر لگائے تھے۔

ان کی ایک نظم کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا میں ان کا استدلال یہ تھا کہ دنیا کے دیگر مذاہب کے افراد بالخصوص آریاؤں اور عیسائیوں کا خیال ہے کہ اسلام کی قوت پوری دنیا میں طاقت کے ذریعے پھیلی ہے۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ تمنا عمادی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس خنجر آہن نہیں بلکہ خنجر اخلاق تھا جس نے پوری دنیا کے لوگوں کو اپنے دامن میں سمولیا:

جس کی جانب اٹھ گئیں نظریں سراس کا اٹھ گیا　　بن گئی تھی دھاک ایسی بانی اسلام کی
خنجر اسلام ہر گز خنجر آہن نہ تھا　　ہاں مگر تھی تیغ، تیغ آہنی ہر گز نہ تھی
خنجر آہن نہ تھا وہ خنجر اخلاق تھا[۲۷۲]　　راستی کی تیغ تھی جو تھی مسلمانوں کے پاس

اسی نظم میں موجود قطعے میں انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا ہے:

اب تو ہے یہ عیاں کہ یہی سب کے جی میں ہے　　کیوں کر مٹا دیں امت خیر الوریٰ کا نام
احباب کو ملال ہے دشمن خوشی میں ہے　　اس قوم پر ہجوم بلا دیکھ دیکھ کر
محشر بپا تو آج ہی دین نبی میں ہے[۲۷۳]　　کیا جانیں روز حشر کب آنے کو ہے مگر

مولانا تمنا عمادی نے اپنی نظم دنیاے اسلام میں عالمی حالات کی منظر کشی بھی کی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے کہا ہے کہ میں جب عالم اسلام کی حالت دیکھتا ہوں تو غم کی ایک پوری گھٹا سی چھا جاتی ہے۔ جہاں کہیں مسلمانوں کی حالت دکھائی دیتی ہے تو ان کا نخل تباہ و برباد نظر آتا ہے۔ پورے عالم پر اٹلی اور یورپ کی وجہ سے پیہم مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں:

کہ بے تقصیر لاکھوں کٹ گئی اولا د آدم کی[۲۷۴]　　بہت کچھ سن رہے تھے غلغلہ تہذیب یورپ کا

اسی نظم میں ایران کی حالت پر نہایت دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔

کہاں تک روئیے ابتر ہے حالت چشم پرنم کی　　کلیجا منہ کو آتا ہے خیال حال ایران سے

ادھر گلیوں میں بہتے ہیں لہو اعیان دولت کے ادھر سڑکوں پہ لاشیں ہیں بزرگان مکرم کی
دہائی ہے دہائی ہے ! خبر لو یا رسول اللہ
کمائی لٹ رہی ہے حضرت فاروق اعظم کی[۲۷۵]

مولانا تمنا عمادی صرف شاعر ہی نہیں عالم دین بھی تھے۔اسی لیے ان کی نظموں میں دنیائے اسلام پر جاری مصیبتوں اور کشت وخوں کے بارے میں گہرے تاسف کے ساتھ مسلمانوں کی حالت زار پہ نہایت تکلیف دہ انداز میں شکوہ بھی ملتا ہے۔ان کی ایک نظم اسلام اب کہاں رہتا ہے میں مسلمانوں کے اخلاقی زوال اور انحطاط کے ان پہلوؤں کی جانب اشارہ ملتا ہے جن کی وجہ سے آئین ملت ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔اس نظم میں مسلمانوں کی مساجد، دولت کدوں کا اور گھروں کے بارے میں ان رویوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جس سے امت مسلمہ کا وقار مجروح ہوا ہے۔

کھینچ کر ایک آہ اس نے تھام کر ہاتھوں سے دل کیا کہوں کیوں کر سنایا یہ جواب جاں گسل
میں فرشتہ ہوں نہ جن و انس اک ناکام ہوں میں زمانے کا ستایا مذہب اسلام ہوں
اب جگہ ملتی نہیں لوگوں کے دولت خانوں میں
اس لیے رہتا ہوں چھپ کر میں انھیں ویرانوں میں[۲۷۶]

انجمن ہلال احمر کا کردار اتحاد اسلام کے حوالے سے ہندوستان میں نمایاں رہا ہے اس نے نہ صرف ترکی کے مسلمانوں کی مدد کی بلکہ اس کے کاموں سے مسلمانوں میں پائی جانے والی اخوت کو بھی مہمیز ملی۔اسی لیے ہندوستان کے تمام عالم دین نے اس کے کاموں میں اپنا حصہ لیا ہے۔تمنا عمادی نے بھی ایک نظم ہلال احمر لکھی ہے جس میں اتحاد اسلامی کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی عظمت رفتہ بیان کی ہے۔ اس نظم میں ان مقامات کے نام بھی لیے ہیں جو کسی زمانے میں عظمت کے مینار رہے۔ان کی نظموں میں مسلمانوں کو درپیش تکالیف کا اظہار ہوتا ہے اور ایک دردمند دل کس طرح ان حالات کو دیکھ رہا ہے اس کی صورت حال ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

سر مسلمانوں کے تھے اور خنجر اخگر فشاں جس جگہ دیکھا لہو کا ایک دریا تھا رواں
گھٹتے گھٹتے تو ہوا تھا ماہ کامل ہے ہلال اور بھی ان آفتوں نے کر دیا اس کو نڈھال
یہ دکھانے کو کہ کیسی حالت اسلام ہے
اب ہلالِ سرخ نقشِ رایت اسلام ہے[۲۷۷]

اردو ادب میں جنگ طرابلس کے حوالے سے کئی پہلوؤں پر شاعری ملتی ہے۔ تمنا عمادی نے بھی طرابلس کی ایک بے کس ستم رسیدہ عورت کی مناجات میں ملت اسلامیہ کی بے یقینی کی صورت حال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں میں جاں نثاری کا جوش ابتدا ہی سے موجود ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا جب ہم ان یورپی قوتوں کو شکست فاش سے دوچار کریں گے۔ اس نظم میں عورت کی مناجات کی صورت میں ملت کے زخم رسیدہ وجود کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

آپ کی ملت پہ جب وقت آپڑا   بے تامل سب کو قربان کردیا
سب کو وارا مذہب اسلام پر   جانیں دے دیں آپ ہی کے نام پر
یا نبی ! صرف ان کی حالت پر ہو رحم   نو اسیرانِ مصیبت پر ہو رحم
آپ اگر چاہیں تو ساماں ہیں بہت
اور ابھی بھائی مسلمان ہیں بہت[۲۷۸]

رسالہ تمدن کی دسمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں ایک قطعہ میں مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کیا ہے۔

مگر یہ قوم مسلماں کچھ ایسی ہے قلاش   نہ اس کے پاس حکومت نہ رتبہ ہائے بلند
نہ اس کے پاس ہے تیغ و سنان دشمن کش   نہ اس کے پاس کمان وکمندِ دشمن بند
پھر ایسی زیست ہے کیوں کر نہیں وبال اس پر
یہ بے حیائی کا جینا ہے کیسے اس کو پسند[۲۷۹]

تمنا عمادی کی ایک نظم اپنا ترانا ملی احساس اور شکست وریخت میں حوصلہ افزا پیغام لیے ہوئے ہے انھوں نے اس نظم میں لکھا ہے کہ ہمارا نام ونشان صفحۂ ہستی سے کبھی نہیں مٹے گا۔ یہ تو نور کے حرفوں سے رقم ہونے والی چیز ہے۔ ہم یورپی لوگوں کی طرح ظلم وستم کرنے والے نہیں ہیں۔ جب تک ہم حاکم رہے محکوم پر ہمارا دست کرم رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی گردش کی وجہ سے دنیا میں ہم پر تباہی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ہم عرب وعجم میں دوبارہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کردیں گے:

یہ ہوسکتا ہے اب بھی پھر ہمیں اقبال دولت ہو   یہ ممکن ہے کہ واپس پائیں پھر جاہ حشم اپنا
اگر اللہ نے چاہا تو کل افراد عالم کو   دکھادے گی اثر پھر سطوت خیرالامم اپنا
جہاں چاہیں گے جھنڈا گاڑ دیں گے اپنی سطوت کا   کوئی کیوں ہم کو روکے گا عرب اپنا عجم اپنا

فلک تک گونج اٹھے گا نعرہ اللہ اکبر سے　　　تمنا جوش میں جس دن اٹھالیں گے علم اپنا۲۸۰

مولانا تمنا عمادی نے ان نظموں کے علاوہ غزلیں اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ان کی غزلوں میں بھی ملی احساس نمایاں ہے:

آج اللہ میرے ضبط کی عزت رکھ لے　　　ہو نہ فریاد حریف لب خاموش کہیں
پھر کہیں دفتر عصیاں کا پتا بھی نہ ملے　　　تیری رحمت کے جو دریا میں اٹھے جوش کہیں۲۸۱

انھوں نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں اس میں رسول اکرمؐ سے محبت و عقیدت کا تاثر نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک نعت جس میں سراپا نبی کریم صلعم کو بیان کیا گیا ہے:

چہرہ کی آب و تاب سے ہے چاند بھی خجل　　　خورشید الگ ہے سر بہ گریبان و منفعل
گل زار میں ہے رشک سے ہر پھول مضمحل　　　شمشاد ہے جدا غمِ قامت سے پابہ گل
کیا پہنچے کوئی عارض پر نورِ شاہ کو
خورشید کو تو ہے یرقاں، برص ماہ کو۲۸۲

اسی طرح ان کی ایک نظم ھل جزاء الاحسان الاالاحسان ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ عمدہ سلوک کا مظاہرہ کریں اس کے نتیجے میں علم و عمل اور معاشرہ میں اخوت کو پروان چڑھنے کے بہتر امکانات پیدا ہوں گے۔اس نظم کا ایک بند یہ ہے۔

تو میں نے کہا اس سے اے خوش خصال　　　سراپا غلط ہے ترا یہ خیال
ہے قرآن میں صاف لکھا ہوا　　　کہ احساں ہی احسان کی ہے جزا۲۸۳

عبدالحلیم شرر لکھنوی: (۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶ء)

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کی نظم زمانہ اور اسلام پچاس بندوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے حالی کے تتبع میں یہ نظم لکھی اور اس کا لہجہ بھی حالی سے ملتا جلتا ہے۔لیکن معنوی اعتبار سے اس میں فرق پایا جاتا ہے۔ شرر نے تمثیلی اسلوب اختیار کیا ہے اس میں قصہ پن بھی ہے اور اس کا انداز ناولوں جیسا ہے۔اس میں رومانی فضا اور تخیلی دنیا آباد ہے۔

اس نظم میں زمانہ مشخص ہو کر ترقی اسلام کی راہ میں نکلتا ہے۔جس سے اس کو گیارہ سو سال پہلے عشق

ہو گیا تھا اور ایک مدت تک اس کی خدمت میں باریاب رہنے کے بعد یورپ کی سیر کو چلا گیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کو اپنی محبوبہ کا خیال آتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ لیکن اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں ملتا۔ ایک طوفانی رات میں خوفناک جنگل میں ہمت ہار دیتا ہے۔ اس وقت ایک درویش صفت بزرگ نمودار ہوتے ہیں۔ زمانے کو ایک کھنڈر میں لے جاتے ہیں۔ زمانہ ان سے حال بیان کرتا ہے۔ درویش اسے بتاتے ہیں کہ وہ جس محبوب کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں ہے وہ ادبار امتداد کا شکار ہو چکا ہے۔ دولت وحشمت نے اس سے آنکھیں پھیر لیں ہیں۔ اس کا قصر تباہ ہو گیا۔ اب یہی کھنڈرات اس کی نشانی ہیں۔ یہ سن کر زمانہ اور درویش دونوں رونے لگتے ہیں۔ اس منزل پر شاعر برآمد ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ رونا دھونا بہت ہو چکا اب وقت کا تقاضہ پورا کرو۔ سب مل کر اسلام کی گزشتہ عظمت واپس لانے کی جدوجہد کرتے ہیں[۲۸۴]۔

غضب حسن تھا اس بت دل ربا کا　　　تھا اس روئے تاباں سے اک رعب پیدا
کھڑا آگے اقبال تھا دست بستا　　　جبیں پر تھا اک خوش نما تاج رکھتا
چمکتے تھے حرف اس میں ہیرے سے بڑھ کر
ترقیِ اسلام لکھا تھا اس پر[۲۸۵]

شرر ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں بھی قوم کو بے دار کرنے کا منظر نامہ موجود ہے۔ زمانہ اور اسلام میں انھوں نے جذبات و کیفیات کو ہی آئینہ نہیں بنایا بلکہ ایک قوم کی مکمل داستان عروج وزوال بیان کر دی ہے۔ مسلم قوم کی تباہ شدہ حالت کا ادراک شرر کے سامنے موجود تھا اس نظم میں انھوں نے عروج کی داستان سنائی ہے تا کہ مسلمانوں کی خودداری اور عزت نفس کو ابھارا جائے۔ انھیں ان بھولے ہوئے اسباق کی یاد دلاتے ہوئے فکر و عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ یہ نظم دل درد آشنا کے لیے ایک مرثیے کا حکم رکھتی ہے اور عقل سلیم کے لیے دعوت فکر اور سر چشمہ ہدایت ہے[۲۸۶]:

مسلمانو! افسوس و عبرت کی جا ہے　　　زمانہ غم قوم میں مبتلا ہے
تمھیں ڈھونڈتا دربدر وہ پھرا ہے　　　بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے
بہت رو چکے رونے والے، اٹھو اب
زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب[۲۸۷]

شرر کی یہ نظم فرسودہ نظام معاشرت کی مدلل ہجو ہے۔ اس میں انھوں نے عروج وزوال کی تصویر کھینچی ہے۔

اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے فکر و عمل میں وسعت لانے کے خواہاں تھے۔ اس نظم کا ذکر اتحاد اسلامی اور ملی احساس کے تناظر میں کہیں نہیں کیا جاتا ہے، جب کہ اس وقت کے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی انتشار کے حل کے لیے یہ نظم اہمیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کو یوں بیان کیا ہے:

ممالک تھے سب زیرِ فرمان اس کے ‏ ‏ ‏ دہلتے شہنشاہ تھے اس کے ڈر سے
جھکائے تھیں قومیں سر اس کے آگے ‏ ‏ ‏ مذاہب تھے جو دست بستہ کھڑے تھے
ہوا بن گئی تھی زمین و زماں میں
تھی اک دھاک سی بیٹھی سارے جہاں میں [۲۸۸]

شرر کی تحریروں اور ان کی نظموں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام قوموں اور جماعتوں کے اختلافات اور تعصبات کو مٹا کر ان میں عالم گیر اخوت قائم کرنا چاہتا ہے، تا کہ علم و ادب کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جائے۔ شرر نے اردو نظم نگاری میں ہیئت کے کچھ نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ انھوں نے اردو میں سب سے پہلے نظم معریٰ اور آزاد نظم کا تجربہ کیا۔ انھوں نے شاعری کی جانب خصوصی توجہ نہیں دی مگر چند نظمیں ان کی عمدہ ہیں۔ جن میں شب وصل، شب غم، زمانہ اور اسلام، فلورنڈا، مظلوم ورجینا اور اسیری بابل قابل ذکر ہیں۔ نظم شب غم میں بھی انھوں نے ملت اسلامیہ کی غفلت کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عالم اسلام کی حالت دیکھ کر کہتے ہیں کہ اب رونے اور رلانے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مسجد والوں کو اور منبر والوں کو اٹھانے کی ضرورت ہے:

لاکھ طرح سے دل بہلایا ‏ ‏ ‏ چین کسی عنوان نہ آیا
سب کو اٹھایا سب کو جگایا ‏ ‏ ‏ کوئی بھی ہم دم ہائے نہ پایا
تھی اک شمع جو حال شرر پر
آٹھ آٹھ آنسو روئی شب بھر [۲۸۹]

شرر کی تاریخی نظم نگاری کا اصل محرک وہ خوں چکاں حالات تھے جن سے ملت اسلامیہ دوچار تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اتحاد اسلام کا درس دیا اور کہا کہ اس کی برکت سے ہم مسلمان فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

صفی لکھنوی: (۱۸۶۲ء۔۱۹۵۰ء)

صفی لکھنوی اساتذہ غزل میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔غزل گوئی کے باوجود اپنی ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے ملت کے خوابیدہ شعور کو بے دار کرنے میں کوشاں رہے۔ان کی قومی نظموں کا مجموعہ لخت جگر اسلامی ذہن وفکر کا احساس لیے ہوئے ہے۔ان کی نظمیں قوم کی ترجمان بن کر احساس وفکر کو جلا بخشنے کا کام دیتی ہیں۔

صفی لکھنوی نے ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس، جو لکھنو میں منعقد ہوا تھا میں جو نظم پڑھی وہ آج بھی تازگی لیے ہوئے ہے اس نظم سے انگریز حکام بھی کافی نالاں ہوئے اور ان پر دباؤ بھی ڈالا گیا۔مغرب کی استعماری قوتوں نے بلاد اسلامی کی بیخ کنی جس انداز میں شروع کی تھی اس سے ہر خاص وعام متاثر تھا اس لیے شاعروں کے یہاں دول یورپ کے جارحانہ رویوں پر شدید ردعمل دیکھا گیا ہے۔صفی لکھنوی کی یہ نظم اسی شدید ردعمل کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے۔صفی نے اس نظم کے ذریعے استعماری قوتوں کو یہ بتا دیا تھا کہ اسلام کے محافظ تمھارے اس ظلم وستم سے دبنے والے نہیں ہیں:

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے ۔ مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دیں گے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اٹھا دیں گے
ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں کیا صفحہ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے [۲۹۰]

صفی لکھنوی کی اس نظم کے علاوہ شیعہ کانفرنسوں میں پڑھی گئی نظمیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو صفی لکھنوی کی نظموں میں پائے جانے والے خیالات عمرانی اور سیاسی نوع کے ہیں اسی کے تحت انھوں نے اپنی نظموں میں شیعہ اسکول وکالج کھولنے کی تلقین کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی شاعری کے ایک حصے کو وقف کر دیا[۲۹۱]۔

اشتیاق سلونوی: (۱۸۷۸پ)

اشتیاق سلونوی نے مسلمانان عالم کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے، جوش اسلامی اور غیرت قومی سے بھر پور نظمیں لکھی تھیں۔ اشتیاق سلونوی ۱۸۷۸ء میں قصبہ سلون شریف ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی عمر میں ہی شاعری شروع کر دی۔ تقریباً تمام اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سیاسی، قومی اور ملی مضامین کی تعداد نمایاں ہے۔

ان کی شاعری کا ایک مجموعہ درد دل کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں عالم اسلامی کے حالات پر مبنی نظمیں شامل تھیں۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں چار طویل نظمیں ہیں۔ حالت الاخوان، انقلاب زمانہ، گریہ دل اور نوحہ اسلام کے عنوانات سے مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی اور علمی حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے حصے میں چھوٹی چھوٹی قومی اور ملکی نظمیں ہیں۔ مگر پہلا حصہ اہم ہے اس میں حالی کی مسدس اور اقبال کی نظم شکوہ کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان نظموں میں سوز و گداز اور دلی جذبات پائے جاتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر مسلمانوں کی اس وقت کی موجودہ معاشرتی بے چینی کا نقشہ ذہن میں ابھر آتا ہے۔ ان کی نظم حالت الاخوان مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر شعبہ زندگی کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے علاوہ موثر انداز میں شاعر کی بے کلی کو بھی پیش کرتی ہے۔ اس نظم میں زبان کی دل کشی اور سلاست نمایاں ہے۔

غفلت سے تجھے کام بس اب صبح و مسا ہے　　نمبر ترا افسوس ہر اک شے میں گھٹا ہے
اب بھی تو ذرا دیکھ کہ حالت تری کیا ہے　　اے قوم ترے سر پہ عجب وقت پڑا ہے
ادبار کی چھائی ہوئی اب تجھ پہ گھٹا ہے

اس کے بعد شاعر اسی نظم میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان عوامل کی جانب اشارہ کرتا ہے جنھوں نے اسے اس نہج پر پہنچا دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام سے اور علم و ہنر کی راہوں کو جس طرح ترک کیا ہے اس نے ان کا اقبال گہنا دیا ہے۔

اسلام کا گلشن کبھی پامال نہ ہوتا　　اس طرح سیہ نامۂ اعمال نہ ہوتا
برگشتہ و دشمن کبھی اقبال نہ ہوتا　　غافل جو نہ ہم ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا
تقصیر کسی کی نہیں یہ اپنی خطا ہے[۲۹۲]

نظم انقلاب زمانہ کے اکثر بند ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی نشانیاں پیش کی گئی

ہیں۔شاعرایک ناصح مشفق کی طرح نصیحت کرتا ہے کہ مسلمانوں نے اگر اپنے سنہری اصولوں کو دوبارہ زندگی بخشنے کی کوشش نہیں کی تو دنیا میں ذلیل ورسوا ہوتے رہنا ان کا مقدر بن جائے گا۔ دین اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کوفراموش کرتے رہنا ہی انقلاب زمانہ ہونے کی بنیادی وجہ ہے۔

ہماری شوکت وعظمت سے اک عالم لرزتا تھا　　ہمارے دبدبہ سے خائف ولرزاں نصاریٰ تھا[۲۹۳]

شاعرموجودہ حالت دیکھ کر ملول ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کرتا ہے:

ہمارا اعتبار اب کوئی دنیا میں نہیں کرتا　　عبث بدنام دین حق اس امت کی بدولت ہے
ترقی پر ہماری جس طرح دنیا کو حیرت تھی　　یوں ہی اب اس تنزل پر زمانے بھر کو حیرت ہے

ہماری ہر طرح اب قابل افسوس حالت ہے
مگراس پر بھی ساری قوم مست خواب غفلت ہے[۲۹۴]

نظم نوحہ اسلام میں مسلمانوں کے زوال اور خلافت عثمانیہ کے تاروپود بکھرنے پر رنجیدہ ہیں۔وہ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ اوراس کی شان وشوکت کے خاتمے پر دل گرفتہ ہوکراپنے جذبات کا اظہار اس نظم میں کرتے ہیں:

اک جنازے کو لیے جاتے تھے کل جانب گور　　آگے وہ پیچھے رواں خلق مچاتی ہوئی شور
ساتھ ساتھ اس کے مسلمان نحیف و کمزور　　غالباً ہوں گے وہ تعداد میں چالیس کروڑ
ان کی آہوں سے جگر غیر کا شق ہوتا تھا　　تھام لیتے تھے کلیجہ یہ قلق ہو تا تھا
پہلے پایہ کو تو اقبال دیے تھے کاندھا　　دوسرا دولت و عزت کو بدلتے دیکھا
علم وفن دونوں کو مصروف اسی میں پایا　　ساتھ سر پیٹتی جاتی تھی سیاست اپنا
پوچھا اک شخص سے کیا مجمع ناکام ہے یہ　　مجھ سے لوگوں نے کہا مجمع اسلام ہے یہ[۲۹۵]

ہاشمی فریدآبادی:

تحریک اتحاد اسلامی کا ثمر یہ بھی ہے کہ اردو شاعری میں بین الاقوامی حالات کو موثر انداز میں بیان کرنا آسان ہوگیا۔پہلی بار ایک منظم انداز فکر کے ساتھ شاعروں نے مذہب کے حوالے سے مسلمانوں کو مجتمع ہونے کی دعوت دی۔ مسلمان بھائیوں کی تکالیف کو محسوس کر کے شاعرانہ اظہار اور مسلمانوں سے جذبہ ہمدردی کا آغاز ہوا۔ پھر حکومت وقت کے خلاف جس سیاسی شعور کا مظاہرہ شاعری میں اس تحریک کے اثر

سے پیدا ہوا اس نے کئی ایسی نظموں کو بھی تخلیق کیا جو فی زمانہ اپنے انداز اور آہنگ کے اعتبار سے اردو شاعری میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ہاشمی فریدآبادی کی نظم چل بلقان چل کو پان اسلامزم کے مطالعے میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم علی گڑھ میں انھوں نے اس وقت کہی جب ڈاکٹر انصاری طبی وفد لے کر ترکی روانہ ہونے والے تھے۔ اس کے لیے ہندوستان کے نوجوانوں میں عمومی جوش پایا جاتا تھا۔ اس نظم میں موجود اپیل ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں حرارت پیدا کر رہی تھی۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں الناظر لکھنو کے ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن میں لکھنو کے لوگ بھی شریک ہیں اور ترکی مجاہدین کی مرہم پٹی کرنے قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ یہ جمعیت یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے لائڈ نامی جہاز پر روانہ ہو جائے گی۔ ہم ان گوناگوں جذبات کے اعادہ سے قاصر ہیں جو برادرِ عزیز کو رخصت کرتے وقت ہمارے دلوں میں موج زن تھے مگر پھر بھی ان کی حالت پر اظہار رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتے [۲۹۶]۔

اس مشن کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کی اٹلی کے جہاز ایس ایس سر دینیا S.S Sardinia کو بمبئی کی وکٹوریہ گھاٹ پر مشاہیر کی موجودگی میں الوداع کہا گیا۔ ان مشاہیر میں محمد علی، ظفر علی خان، میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی، فضلی بھائی ایم چنائے، کرم بھائی ایم چنائے، اور ترکش قونصل جنرل موجود تھے۔ مشن کے اراکین خاکی وردی میں ملبوس تھے اس وردی کا اسٹائل ترکی فوجی طبی وفد سے مماثل تھا۔

اسی رسالے میں ہاشمی فریدآبادی کی یہ نظم شائع ہوئی جو ایک تاریخی واقعے کا منظوم بیان ہے۔ یہ نظمیں حادثاتی ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کا کامل بیان ہیں فریدآبادی نے اس نظم میں جذباتی انداز اختیار کیا ہے:

تابہ کے رخ زرد آنکھیں خوں چکاں دل مضمحل
تابہ کے ساز جنوں مشتاق آہنگ بر عمل
دعویٔ ایماں رکھتا ہے تو اے مومن نکل
شمعِ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
جان سے لاکھوں گنی مہنگی ہے تیری آبرو
ہو فنا گر ہے بقائے جاوداں کی آرزو
سوگواری ہائے ظاہر کی نہ کر تلقین تو
شمعِ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
چھوڑ دے بے روح لوگوں کے لیے یہ اعتدال
موت حاصل کر کہ جو اس زندگی کا ہے کمال
مشکلیں کس کی؟ کہاں کی روک؟ اور کیسا مآل
لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل
تا کجا یکساں روی اب سن پیام انقلاب
چھوڑ بے رنگی سکوں کی ہو رہینِ اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دے دے جواب
لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل [۲۹۷]

ہاشمی فرید آبادی کی شاعری کو تا حال سنجیدگی سے موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ ان کی ایک کتاب سہ نظم ہاشمی ہے جس میں متعدد تاریخی واقعات و شخصیات پر نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں اور قطعات الناظر رسالے میں چھپتی رہی ہیں۔ جذبات ہاشمی نامی نظم الناظر جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے حسن و عشق کے پرانے خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان کی نظم ناگن کو کافی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح مارچ اپریل ۱۹۳۶ء میں بھی ایک قطعہ شائع ہوا تھا جس میں ملّی احساس نمایاں صورت میں دکھائی دیتا ہے:

دقیقِ فکر، نگہ تہ نگر، زباں بے باک — چمن کے روپ کو کہتا ہوں صنعتِ خاشاک

کسی کے رتبہ عالی کا رعب کیا مانوں — جب اک فریب تخیل ہے رفعتِ افلاک

نہ خوفِ جور سے مردہ ہوا ہے جذبہ حق — نہ حرصِ جاہ سے غیرت ابھی ہوئی ہے ہلاک[۲۹۸]

علی گڑھ تحریک کے بعض حامیوں کے نزدیک تحریک اتحاد اسلامی ایک فضول نعرہ تھا اس کے باوجود اسی یونی ورسٹی کے طلبہ نے اسے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی آواز بنا دیا۔ خود ہاشمی فرید آبادی نے طالب علمی ہی کے دوران نظم ٹریپولی لکھی۔ جس میں طرابلس الغرب کے مسلمانوں کی دردناک صورت حال بیان کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ اس جنگ کے نتیجے میں امت خیر البشر گرفتار بلا ہوگئی اور اس کا کارواں دوبارہ شیرازہ بندی کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔:

دیدہ بیم و رجا کس بات کا ہے منتظر — ڈالتا کیا ہے تریپولی پہ حسرت کی نظر

یاں بنایا جائے گا مرقد تری ناموس کا

یاں نشاں ہو گا تری ذلت ترے افسوس کا

پھر انھوں نے اسی نظم میں دین احمدی کی اس طرح ذلت و رسوائی پر افسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کی بے حسی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

کیا یہ سچ ہے دین احمد کا نچا دل اور جگر — کیا دعائیں کلمہ گویوں کی گئیں سب بے اثر

کیا ابھی تک قبر سے باہر نہیں نکلا عمر — تا کہ دیکھے مومنوں کے خاک و خوں آشفتہ سر

انہدام کوشکِ توحید اٹھ کر دیکھ لے

اور دریدہ روضہ اطہر کی چادر دیکھ لے[۲۹۹]

ہاشمی فرید آبادی کی نظم بہ عنوان بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی ہے اس نظم میں انھوں نے انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم مسلمان بہت دنوں سے اس ظلم وستم اور ناانصافی کو سہتے رہے ہیں مگر اب ہمارے صبر کا پیانہ لبریز ہو چکا ہے۔ہم نے اپنے وجود پر سیاسی اور تہذیبی غلامی کا جو طوق پہن رکھا تھا اسے اب اتار دیں گے۔اس نظم میں ان کا لہجہ کافی حد تک حاکمانہ ہے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب اس سرزمین کے ہم ہی سلطانِ مطلق ہیں۔

بہت کہتا رہامیں کچھ نہ کرنے کو شکیبائی　　بہت سمجھا کیا میں صبر و خاموشی کو دانائی
بس اے ہم نشیں میری طبیعت جوش پر آئی　　بہت دن ذلتوں کو مصلحت جا کیا لیکن
نفس میں سانپ کی پھنکار ہے بھوبل کی گرمائی　　بھڑک ہے نبض میں پیدا تڑپ ہے قلب میں ظاہر ۳۰۰

اس نظم کے آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم دنیا میں دوبارہ سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں:

مجھے خود اعتمادی نے پنھایا تاج دارائی　　بیک ہیجان خوں پارا ہوا ملبوس نامردی
بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی　　بس اب میں آج اپنے ملک کا سلطان مطلق ہوں ۳۰۱

عزیز لکھنوی:

عزیز لکھنوی کی غزلوں اور نظموں میں اتحاد اسلامی کے تصورات اور نظریات ملتے ہیں۔انھوں نے بھی مسلمانوں کی جاں بلب حالت کو دیکھ کر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔اپنے وقت کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس خراب حالت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خدا اور رسول کے احکام سے روگردانی کر چکے ہیں۔انھوں نے اپنی نظم آہ رسا میں اس پہلو پر یوں اظہار کیا ہے:

کہاں جاتے ہو قومِ جاں بلب کو چھوڑ کر تنہا　　بھرے آتے ہیں آنسو اور دم بھر دیکھتے جاؤ
ہماری شکوہ سنجی پر یہ کہنا کیا قیامت ہے　　دکھاتا ہے ابھی کیا کیا مقدر دیکھتے جاؤ ۳۰۲

بنارس میں مسلمانوں کی ایک انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے اغراض ومقاصد کے نمایاں پہلو یہ تھے کہ اسلام کے اہم واقعات پر فلسفیانہ نظر ڈالنا اور ان خیالات کی تردید کرنا جو اسلام پر اعتراض کی صورت میں وارد ہوتے ہیں۔اپریل ۱۹۱۱ء کو اس انجمن نے بنارس میں ایک عظیم جلسہ منعقد کیا جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے علما شریک ہوئے۔اس جلسہ کے آخر میں عزیز لکھنوی نے ایک

عمدہ نظم اشاعت اسلام کے نام سے پڑھی۔ نظم نے جلسے میں جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

کب ہوا اسلام رائج قوتِ شمشیر سے　　بلکہ اخلاقِ حسن سے صلح جو تدبیر سے
باطنی تھی اک کشش ان کے دل پر جوش میں
جذب روحانی تھا ان کی کوشش خاموش میں ۳۰۳

عزیز لکھنوی نے اپنی ایک نظم نالہ دل میں مسلمانوں کی مذہب سے دوری اور لہو ولعب میں پڑے ہونے کی تصویر کھینچی ہے۔ انھیں اس بات پہ شدید دکھ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے اسلاف کی یادگاروں کو سنبھالنے کے بجائے اس متاع کو لٹا دیا ہے جسے تہذیب وتمدن اور دولت وثروت سے بجا طور پر تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اب ہر طرف ممالک اسلامیہ میں ویرانی اور بربادی چھائی ہوئی ہے:

مہیا ہے تمہارے واسطے آسانیاں کیا کیا　　مگر اس پر بھی تم کرتے ہو نا فرمانیاں کیا کیا
بزرگوں نے ہماری جو زمیں جنت بنائی تھی　　نظر آتی ہیں کوسوں دور تک ویرانیاں کیا کیا ۳۰۴

رضا علی وحشت: (۱۸۸۱ء۔۱۹۵۶ء)

رضا علی وحشت کا تعلق بنگال سے تھا۔ ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور انگریزی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ وحشت ہی کی شخصیت نے شبلی اور حالی کو انگریز داں طبقے سے روشناس کرایا۔ اقبال نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اقبال وحشت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی قابل داد ہے ۳۰۵ ۔

ان کی ایک نظم مسلمانوں کی ملی حالت کا بھرپور نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس نظم میں شاعر فریادی بن کر مسلمانوں کی زبان سے فغاں کر رہا ہے۔ اور خدا کے حضور اپنی بے قدری کا رونا رو رہا ہے:

درد سے تنگ آ کے مصروف فغان ہوتے ہیں ہم　　کب شکایت سنج جور آسماں ہوتے ہیں ہم
اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہورِ جہاں　　محفل دشمن میں زیبِ داستاں ہوتے ہیں ہم
کھائے ہیں دھوکے بہت اے آسمانِ نیلگوں　　دل کبھی ہوتا ہے خوش تو بدگماں ہوتے ہیں ہم ۳۰۶

حوالہ جات وحواشی

۱۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۲
۲۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، ص ۴۲۶
۳۔ محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۲۷۵، ۲۷۶
۴۔ ایضاً، ص ۲۷۵
۵۔ تبسم، توصیف، ڈاکٹر، ص ۹
۶۔ ایضاً، ص ۵۱
۷۔ بانو، سعیدہ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۰
۸۔ مومن، ص ۴۳۳
۹۔ ایضاً، ص ۴۳۴-۴۳۵
۱۰۔ بانو، سعیدہ، ص ۱۳۴
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۵
۱۲۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۷
۱۳۔ مصطفٰے خان، غلام، ڈاکٹر، ۲۰۰۳، ص ۱۹۵
۱۴۔ عبدالحق، مولوی، ۱۹۷۶ء، ص ۷۸
۱۵۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۴۲
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۳
۱۷۔ عبدالحق، ص ۵۸
۱۸۔ حالی، ص ۱۰۶، ۱۰۷
۱۹۔ ایضاً، ص ۹۴
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴
۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ ایضاً، ص ۹۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵
۲۵۔ مصطفٰے خان، ص ۱۹۵
۲۶۔ حالی، ص ۱۳۹

۲۷- ایضا،ص۱۴۵؛اس مثال میں حالی نے ایک حدیث بھی بیان کی ہے۔یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ''یعنی ایمان ہے تو یمن کا'اور حکمت ہے تو یمن کی ہے۔

۲۸- ایضا،ص۱۴۴

۲۹- جالبی،جمیل،ڈاکٹر،فروری۲۰۱۲،ص۹۳۵

۳۰- حالی،ص۱۴۷

۳۱- ایضا،ص۱۶۰

۳۲- عظیم،وقار،پروفیسر،جنوری۱۹۷۲،ص۱۰۴

۳۳- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص115

۳۴- عظیم،ص۱۰۶

۳۵- ذوالفقار،غلام حسین،ڈاکٹر،جنوری۱۹۷۲،ص۶۰

۳۶- عظیم،ص۱۰۶

۳۷- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص۱۶۵،۱۶۶

۳۸- ذوالفقار،غلام حسین،ڈاکٹر،جنوری۱۹۷۲،ص۶۱

۳۹- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص۸۰

۴۰- ایضا

۴۱- صدیقی،افتخار احمد،جنوری۱۹۷۰،ص۸۰

۴۲- ایضا

۴۳- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص۷۶

۴۴- صدیقی،۷۶

۴۵- ذوالفقار،جنوری۱۹۷۲،ص۶۰

۴۶- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص۱۴۶

۴۷- ایضا،ص۱۷۷

۴۸- حالی،الطاف حسین،جنوری۱۹۲۴،ص۵۴

۴۹- ایضا،ص۵۵

۵۰- صدیقی،ص۱۲۲

۵۱- حالی،جنوری۱۹۷۰،ص۱۲۲،۱۲۳

۵۲- ندوی،سید سلیمان،۱۹۸۹،ص ق

۵۳- ایضا،ص ع

۵۴- صدیقی،احمد صدیق،ستمبر۱۹۶۰،ص۱۷۱

۵۵- ایضاً،ص۱۷۱
۵۶- شبلی،علامہ،۱۹۸۹ء،ص۲۹
۵۷- عبداللہ،سید،۱۹۹۸ء،ص۲۲۳
۵۸- شبلی،ص۴۴
۵۹- ایضاً
۶۰- سندیلوی،سلام،ڈاکٹر،ستمبر۱۹۶۰ء،ص۱۶۱
۶۱- شبلی،ص۴۹
۶۲- نارنگ،گوپی چند،ڈاکٹر،۲۰۰۳ء،ص۳۳۵
۶۳- ایضاً،ص۳۳۶
۶۴- ندوی،سید سلیمان،۱۹۸۹ء،ص۶۸
۶۵- شبلی،ص۶۹
۶۶- نعمانی،احمد اسحاق،ستمبر۱۹۶۰ء،ص۱۲۷
۶۷- شبلی،ص۵۱
۶۸- ندوی،سید سلیمان،۱۹۴۳ء،ص۵۹۳
۶۹- شبلی،نعمانی،علامہ،۱۹۸۹ء،ص۳۲۱
۷۰- ایضاً،ص۳۲۲،۳۲۳
۷۱- شبلی،ص۵۳
۷۲- جعفری،سید رئیس،۱۹۷۱ء،ص۳۰۶
۷۳- مہدی،صغرا،۱۹۸۳ء،ص۳۰
۷۴- ایضاً،ص۳۱
۷۵- دریابادی،عبدالماجد،۱۹۶۹ء،ص۱۴
۷۶- ایضاً،ص۱۵
۷۷- اکبر،الٰہ آبادی،س ن،ص۵۷
۷۸- اکبر،الٰہ آبادی،اپریل۱۹۳۲ء،ص۲۹
۷۹- ایضاً
۸۰- نونہروی،سید شبیہ الحسن،۱۹۵۰ء،ص۱۹
۸۱- ایضاً
۸۲- ایضاً،ص۲۰
۸۳- ایضاً

۸۴- الہ آبادی، طالب، س ن، ص ۸۱
۸۵- ایضاً، ص ۷۹
۸۶- ایضاً، ص ۷۸
۸۷- ایضاً
۸۸- ایضاً، ص ۸۰، ۸۱
۸۹- ایضاً، ص ۸۱
۹۰- ایضاً، ص ۱۱۵
۹۱- ایضاً
۹۲- ایضاً، ص ۱۱۷
۹۳- ایضاً، ص ۹۰، ۹۱
۹۴- اکبر، الہ آبادی، اپریل ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۹
۹۵- ایضاً
۹۶- ایضاً، ص ۱۹۲
۹۷- ایضاً، ص ۱۰۲
۹۸- احسان الحق، مرزا، ص ۱۲۷
۹۹- ایضاً
۱۰۰- ایضاً، ص ۱۲۸
۱۰۱- ایضاً، ص ۱۴۳، ۱۴۴
۱۰۲- ایضاً، ص ۱۴۴
۱۰۳- ایضاً، ص ۱۴۵
۱۰۴- ایضاً، ص ۱۰۸
۱۰۵- ایضاً
۱۰۶- قریشی، محمد طاہر، ڈاکٹر، جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۳
۱۰۷- برنی، ضیاءالدین احمد، ۱۹۶۱ء، ص ۵۳
۱۰۸- جوہر، محمد علی، ۱۹۶۶ء، ص ۵۹؛ جوہر کو خودکشی سے بچانے والے سر راس مسعود تھے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے 'مولانا محمد علی کا ارادہ خودکشی'، ڈاکٹر سید حامد حسین، مشمولہ: 'جامعہ'، جوہر نمبر، اپریل ۱۹۷۹ء، دہلی ۳۸، ۳۹
۱۰۹- ایضاً
۱۱۰- برنی، ص ۵۳
۱۱۱- عنایت، افشاں، ۲۰۰۶ء، ص ۵۱

۱۱۲- عروج، عبدالرؤف، جنوری،۱۹۶۳ء، ص ۱۴
۱۱۳- ایضاً، ص ۲۹
۱۱۴- جوہر، محمد علی، جنوری، ۱۹۶۳ء، ص ۵۰
۱۱۵- ندوی، سید ابوالحسن، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۳۶
۱۱۶- محمد مجیب، پروفیسر، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۹۲
۱۱۷- ایضاً، ص ۹۴
۱۱۸- جوہر، ص ۱۱۶
۱۱۹- صدیقی، انور، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۷
۱۲۰- ایضاً
۱۲۱- ایضاً، ص ۱۶۹
۱۲۲- جوہر، ص ۱۱۴
۱۲۳- ایضاً، ص ۳۸
۱۲۴- ایضاً، ص ۳۷
۱۲۵- ایضاً، ص ۵۳
۱۲۶- برنی، انعام عظیم، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء، ص ۴۳
۱۲۷- ایضاً، ص ۵۰
۱۲۸- سیفی، محمد اسلم، ۱۹۳۹ء، ص ۱۲
۱۲۹- رضوی، وقار احمد، ڈاکٹر، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۴، ۲۱۶
۱۳۰- ایضاً، ص ۲۱۶
۱۳۱- میرٹھی، اسمٰعیل، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۴
۱۳۲- سیفی، ص ۵۲
۱۳۳- میرٹھی، ص ۷۸، ۷۹
۱۳۴- ایضاً، ص ۷۹
۱۳۵- ایضاً، ص ۸۰
۱۳۶- ایضاً، ص ۲۴۴
۱۳۷- ایضاً، ص ۱۷۶، ۱۷۷
۱۳۸- عقیل، معین الدین، جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۸
۱۳۹- شریف الجاہد، پروفیسر، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
۱۴۰- ندوی، سید سلیمان، اپریل جون ۱۹۷۶ء، ص ۴۸

۱۴۱- صدیقی، نفیس احمد، ڈاکٹر، حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص۱۱۱
۱۴۲- حسرت، سید فضل الحسن، ۱۹۵۹ء، ص۴۳
۱۴۳- صدیقی، ص۱۴۰
۱۴۴- سلیم، احمد، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۹۰
۱۴۵- صدیقی، ص۱۴۰، ۱۴۱
۱۴۶- حسرت، ص۱۷
۱۴۷- محمود الرحمٰن، ص۲۵۰
۱۴۸- ایضاً، ص۱۵۱
۱۴۹- ایضاً، ص۲۵۲
۱۵۰- حسرت، ص۱۸
۱۵۱- محمود الرحمٰن، ص۲۵۲
۱۵۲- حسرت، ص۲۳
۱۵۳- جعفری، ص۴۰۰
۱۵۴- الہلال، جنوری ۱۹۱۳ء، کلکتہ، ص۱۰
۱۵۵- بسمل، عبدالغفور، ڈاکٹر، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۵۴ء، ص۱۰
۱۵۶- حسرت، ص۱۰۹
۱۵۷- بسمل، ص۱۱
۱۵۸- حسرت، ص۱۴۴
۱۵۹- ایضاً
۱۶۰- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۶۷ء، ص۳۸
۱۶۱- کاشمیری، شورش، جون ۱۹۶۷ء، ص۱۳
۱۶۲- محمود الرحمٰن، ص۲۳۹
۱۶۳- ظفر علی، مولانا، دسمبر ۲۰۱۰ء، ص۱۶۲
۱۶۴- زیدی، نظیر حسنین، ڈاکٹر، جون ۱۹۸۶ء، ص۹۲
۱۶۵- عنایت، ص۸۳
۱۶۶- ظفر علی، خان، ص۱۶۶
۱۶۷- ایضاً، ص۱۷۰
۱۶۸- قریشی، طاہر، ڈاکٹر، ۲۰۱۴ء، ص۱۲، ۱۳
۱۶۹- ظفر علی، ص۱۸۲

۱۷۰- ایضاً،ص ۲٦۷

۱۷۱- ایضاً،ص ۹۹

۱۷۲- زیدی،ص ۱۰۲

۱۷۳- ایضاً،ص ۱۰۴

۱۷۴- ایضاً،ص ۱۵۹

۱۷۵- ایضاً،ص

۱۷٦- ایضاً،ص ۱٦۰،۱٦۱

۱۷۷- ظفرعلی،خان،ص ۱٦۰

۱۷۸- ______، ۱۹۹۳ء،ص ٦۹۳

۱۷۹- ______،ص ۴۴۰

۱۸۰- راشد،ن،م،۱۵ اگست ۱۹۴۳ء،ص ۱۱،۱۳

۱۸۱- ظفرعلی،ص ۳۷۰

۱۸۲- ______،اگست ۱۹۹۹ء،ص ۱۴۸،۱۴۹

۱۸۳- ایضاً،ص ۱۴۹

۱۸۴- ایضاً،ص ۱٦۹

۱۸۵- ایضاً،ص ۱۷۴،۱۷۵

۱۸٦- اقبال،علامہ،۲۰۰۵ء،ص ۳۴۷

۱۸۷- ذوالفقار،غلام حسین،ڈاکٹر،جنوری ۱۹۹۹ء،ص ۵۹

۱۸۸- اقبال،علامہ،۲۰۰۷ء،ص ۱۹

۱۸۹- ایضاً

۱۹۰- اقبال،علامہ،۲۰۰۴ء،ص ۱۸۷

۱۹۱- ایضاً،ص ۱۸۸

۱۹۲- ندوی،سیدابوالحسن،۱۹۸۸ء،ص ۷۳

۱۹۳- اقبال،۲۰۰۴ء،ص ۱۸۹

۱۹۴- انصاری،اسلوب احمد،پروفیسر،جنوری ۱۹۷۷ء،ص ۸٦

۱۹۵- اکرام،سیدمحمداکرم،ڈاکٹر،اکتوبر ۱۹۹۸ء،ص ۲۲

۱۹٦- ہاشمی،رفیع الدین،ڈاکٹر،۲۰۰۴ء،ص ۳۳

۱۹۷- ایضاً،ص ۳۸

۱۹۸- اقبال،۲۰۰۴ء،ص ۱۹۱

۱۹۹- ـــــــ، ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۹

۲۰۰- ایضاً؛ یہ اشعار اقبال کے کسی بھی مجموعہ کلام میں موجود نہیں ہے۔

۲۰۱- اقبال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۳

۲۰۲- خان، محمد احمد، ۱۹۵۲ء، ص ۶۱

۲۰۳- اقبال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۳

۲۰۴- چشتی، یوسف سلیم، س ن، ص ۳۷۹

۲۰۵- ایضاً

۲۰۶- اقبال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۵

۲۰۷- خان، غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵

۲۰۸- ہاشمی، ص ۷۳

۲۰۹- انصاری، ص ۳۶

۲۱۰- اقبال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۴

۲۱۱- چشتی، ص ۴۱۲

۲۱۲- ایضاً

۲۱۳- اقبال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۲

۲۱۴- انصاری، ص ۸۵

۲۱۵- خان، ص ۲۷

۲۱۶- ز، خ، ش، ۱۹۴۱ء، ص ۳۸، ۳۹

۲۱۷- حقی، شان الحق، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۲۸۹

۲۱۸- ز، خ، ش، ص ۴۰

۲۱۹- ایضاً، ص ۴۶

۲۲۰- ایضاً، ص ۴۲

۲۲۱- ایضاً، ص ۴۴، ۴۵

۲۲۲- ایضاً، ص ۴۶

۲۲۳- ایضاً، ص ۵۴

۲۲۴- حسن، فاطمہ، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۰

۲۲۵- ز، خ، ش، ص ۵۵، ۵۶

۲۲۶- ایضاً، ص ۵۹

۲۲۷- ایضاً، ص ۶۶

۲۲۸- ایضاً،ص ۶۶، ۶۷
۲۲۹- ایضاً،ص ۶۹
۲۳۰- ایضاً،ص ۷۶
۲۳۱- چغتائی، ابراہیم بیگ، ۱۹۰۹ء، ص ۱
۲۳۲- ایضاً
۲۳۳- ایضاً،ص ۲
۲۳۴- ایضاً،ص ۱۱۲
۲۳۵- ایضاً،ص ۱۲۹
۲۳۶- ایضاً،ص ۱۳۰، ۱۳۱
۲۳۷- ایضاً،ص ۱۳۱
۲۳۸- ایضاً،ص ۱۱۵
۲۳۹- ایضاً،ص ۱۹۴
۲۴۰- ایضاً،ص ۲۰۳
۲۴۱- جیوا خان، شیخ نورالدین، ۱۳۰۲ھ، ص ۳
۲۴۲- ارشد، آغا غلام حسین، اپریل ۱۹۱۲ء، ص ۵۳
۲۴۳- ایضاً،ص ۵۴
۲۴۴- ایضاً،ص ۵۵
۲۴۵- ارشد، آغا غلام حسین، فروری ۱۹۱۲ء، ص ۵۷
۲۴۶- ایضاً،ص ۵۸
۲۴۷- ارشد، آغا غلام حسین، جون ۱۹۱۲ء، ص ۲۰
۲۴۸- ایضاً،ص ۲۱
۲۴۹- عنایت، ص ۱۳۵
۲۵۰- ارشد، آغا غلام حسین، جولائی ۱۹۱۲ء، ص ۱۹
۲۵۱- ______، اگست ۱۹۱۲ء، ص ۲۸
۲۵۲- ایضاً،ص ۲۹
۲۵۳- ایضاً،ص ۳۰
۲۵۴- ارشد، آغا غلام حسین، اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص ۶۰
۲۵۵- ایضاً،ص ۶۳
۲۵۶- حسین، حفاظت، س ن، ص ۲

۲۵۷- قسیم الدین، شاہ، س ن، ص ۳
۲۵۸- ایضاً
۲۵۹- ایضاً، ص ۱۱
۲۶۰- ایضاً، ص ۲۱
۲۶۱- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴۳
۲۶۲- شفیع محمد، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۶
۲۶۳- ایضاً، ص ۳۷۹
۲۶۴- ایضاً، ص ۳۸۰
۲۶۵- ایضاً، ص ۳۷۶
۲۶۶- ایضاً، ص ۳۷۷
۲۶۷- ایضاً، ص ۳۷۸
۲۶۸- ایضاً
۲۶۹- ایضاً، ص ۳۷۹
۲۷۰- ایضاً، ص ۷۹
۲۷۱- ایضاً، ص ۳۸۱
۲۷۲- عمادی، تمنا، مولانا، دسمبر ۱۹۱۲ء، کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، دہلی، ص ۱۶
۲۷۳- ایضاً
۲۷۴- عمادی، تمنا، مولانا، جون ۱۹۱۲ء، ص ۵۴؛ یہاں پر لفظ 'دودم' جو مولانا تمنا عمادی نے استعمال کیا ہے اس سے مراد روم یعنی ترکی اور ایران ہے۔
۲۷۵- ــــــ، جون ۱۹۱۴ء، ص ۵۴
۲۷۶- ــــــ، اگست ۱۹۱۲ء، ص ۱۰
۲۷۷- ــــــ، جون ۱۹۱۳ء، ص ۷۶
۲۷۸- ــــــ، ۱۳۲۷ھ، ص ۴۹، ۵۰
۲۷۹- ــــــ، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۲۲
۲۸۰- ــــــ، مئی ۱۹۱۲ء، ص ۱۰
۲۸۱- ــــــ، جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۳۹
۲۸۲- ــــــ، ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۳۳
۲۸۳- ــــــ، جون ۱۹۲۳ء، ص ۵۵؛ مولانا تمنا عمادی کی غزلیں اور نظمیں 'الناظر' کے شمارے میں بھی موجود

ہیں۔اپریل ۱۹۱۱ء میں ان کی نعت اور نعتیہ غزل ص ۳۵ پر ہے۔نومبر ۱۹۱۰ء 'الناظر' میں ہی ایک اور غزل ص ۵۶ پر موجود ہے۔اسی رسالے میں دسمبر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ایک شاندار نظم موت کے حوالے سے لکھی جس کا عنوان یہ ہے 'نہ کچھ کہتا، نہ کچھ سنتا کوئی شہر خموشاں میں'، اس میں بھی انھوں نے پوری مسلمان امت کو بے دار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

۲۸۴۔ رضا، جعفر، پروفیسر، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۹، ۱۲۰
۲۸۵۔ شرر، عبدالحلیم، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۰
۲۸۶۔ ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۲
۲۸۷۔ شرر، ص ۱۳۱، ۱۳۲
۲۸۸۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۲۸۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷
۲۹۰۔ لکھنوی، صفی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳
۲۹۱۔ جون پوری، ممتاز حسین، فروری ۱۹۳۴ء، ص ۲۷
۲۹۲۔ سلونوی، اشتیاق، س ن، ص ۱۵
۲۹۳۔ ایضاً، ص ۲۶
۲۹۴۔ ایضاً، ص ۲۷
۲۹۵۔ ایضاً، ص ۴۸
۲۹۶۔ علوی، ظفر الملک، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۸۴
۲۹۷۔ فرید آبادی، ہاشمی، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۵۸
۲۹۸۔ ______، مارچ اپریل، ۱۹۳۶ء، ص ۱۴
۲۹۹۔ ______، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۲۹
۳۰۰۔ ______، ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۲
۳۰۱۔ ایضاً
۳۰۲۔ لکھنوی، عزیز، مئی ۱۹۱۱ء، ص ۶۲
۳۰۳۔ ______، جولائی ۱۹۱۱ء، ص ۳۸
۳۰۴۔ ______، نومبر ۱۹۱۱ء، ص ۴۵
۳۰۵۔ اقبال، علامہ، جون، جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۸۲
۳۰۶۔ وحشت، رضا علی، مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۲۷

باب ہفتم

تحریک اتحاد اسلامی کا تناظر: اردو کی علمی وادبی صحافت

تحریک اتحاد اسلامی کا تناظر: اردو کی علمی و ادبی صحافت

اردو اخبارات نے اردو زبان و بیان کی ترویج و اشاعت میں جو کردار ادا کیا ہے اس کی تاریخی، تہذیبی اور فکری مطالعے کے بغیر جنوبی ایشیا کی تاریخ کے کسی باب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان اخبارات و رسائل نے ہندوستانی معاشرے میں جدید تحریکی و فکری رجحان کو نہ صرف جلا بخشی، بلکہ اہل ہند کی تربیت کا کام بھی انجام دیا ہے[1]۔

ہماری ملی زندگی میں اردو صحافت نے جن خیالات کو پروان چڑھایا ہے اور جن تحریکوں کو کامیاب بنانے میں اس نے اپنا کردار ادا کیا ہے اگر اس سے بے اعتنائی برتیں گے تو صحیح صورت حال کا اندازہ لگانا ممکن نہیں رہے گا۔ ان اخبارات کے ذریعے شعوری طور پر مسلمانان ہند کی ذہنی آبیاری جس انداز میں کی گئی اس کی داستان نہایت طویل ہے۔ اگر تحریک اتحاد اسلامی کے ضمن میں ان اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں بڑے پیمانے پر اس وقت کے عالم اسلام کی صورت حال سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

مولانا امداد صابری کی کتاب فن صحافت میں کئی ایسے اخبارات و رسائل کا تذکرہ موجود ہے جن کا ذکر تاریخ صحافت میں گم ہو چکا ہے، ان میں بعض اخبارات اپنی ابتدا ہی سے پان اسلامزم کے تصور کو نمایاں کرتے رہے ہیں۔[2] اس کے علاوہ اردو اخبارات و رسائل نے اپنے صفحات میں وہ معلومات پیش کی ہیں جس سے اس زمانے کے ماحول و حالات کا پتا چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ابتدائی ترقی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور اس زمانے کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے[3]۔

دنیائے اسلام کی سیاست سے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی وابستگی کا اندازہ پچھلے تمام ابواب سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس زمانے میں اس تحریک نے شہرت حاصل کی اس وقت برعظیم کے اخباروں میں دیگر اسلامی ممالک کی خبریں چھپتی رہی ہیں۔ خصوصی طور پر ترکی کی خبریں شائع ہوتی تھیں جس سے ترکوں کے ساتھ دلی لگاؤ کا اندازہ واضح طور پر ہوتا ہے۔ ان اخبارات میں نہ صرف اداریے لکھے گئے بلکہ انگلستان سے

مطالبہ کیا گیا کہ وہ ترکوں کی حمایت میں روس سے برسر جنگ ہو جائے۔اس سلسلے میں ایک رضا کار فوج بھیجنے کا چرچا بھی ہوا[4]۔

اردو صحافت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پان اسلامزم کی تحریک کو ہندوستانی مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے کئی اخبارات نے مشن سمجھ کر دانستہ طور پر اس تحریک کے رجحان سے خود کو وابستہ کرلیا تھا اور یہ عمل شعوری تھا ان ہی اخبارات میں قیصر الاخبار ہند پیش پیش تھا۔

قیصر الاخبار ہند جنوری ۱۸۷۷ء میں الہ آباد سے جاری ہوا۔اس میں چند عنوانات عالمی حالات پر ضرور ہوا کرتے تھے۔اخبارات تار برقی، ترکی عیسائی اور ترکی اور روس جیسے عنوانات کے تحت اداریے بھی لکھے جاتے تھے۔مثلاً یکم ستمبر ۱۸۷۷ء کو صفحہ۴ پر لندن ٹائمس نے روس اور ترکی کی جنگ کے مقام پر ترکوں کی جیت پر اس انداز سے تبصرہ کیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جیت کی اہمیت گھٹائی جارہی ہے۔اس پر اس اخبار نے یوں تبصرہ کیا:

> کیا ٹائمز اور ڈیلی نیوز کے متعصب کارسپانڈنٹ کی تحریر ترکوں کی فتح یابیوں کو چھپا سکتی ہے کہ ذرہ آفتاب کی چمک کو کوئی متعصب شخص خاک سے چھپادے۔ہرگز نہیں[5]۔

اسی اخبار میں ۲۱/اکتوبر ۱۸۷۷ء میں لارنس گزٹ سے ایک شذرہ نقل کیا گیا۔اس میں بتایا گیا کہ ابھی ہندوستان میں ترک مجروحین اور یتامٰی کے لیے مختلف مقامات پر چندہ جمع ہو رہا ہے۔اخبار لکھتا ہے کہ:

> جناب حسین آفندی کانسل بمبئی۔منجانب دولت باسعادت عثمانیہ۔دوسرے سید احمد خان بہادر سی ایس آئی سیکریڑی کمیٹی چندہ۔یہ صاحب کمیٹی اسٹفورڈ ہاؤس لندن کی معرفت چندہ روانہ کرتے ہیں۔جناب مولوی عبداللطیف خاں صاحب بہادر مجسٹریٹ کلکتہ۔سیکریڑی چندہ۔یہ حضرت خاص وزیر اعظم حضرت سلطان المعظم چندہ روانہ کرتے ہیں[6]۔

اسی طرح احسن الاخبار الہ آباد اپنی ۱۳ جنوری ۱۸۷۸ کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ:

> جب روسیوں نے پلونا فتح کیا۔تو ترکوں کے پاس ان کو جو روپے ملے وہ مسلمانان ہندوستان نے ترکی افواج کی امداد کے لیے روانہ کیا تھا[7]۔

اسی اخبار نے غازی عثمان پاشا کی بہادری کا ذکر کیا ہے۔اس اخبار کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چندہ تحریک کا آغاز ۵/اکتوبر ۱۸۷۶ء کو ہوا۔اس دن مولوی عبداللطیف نے ٹاؤن ہال کلکتہ میں مسلمانوں کا اجتماع منعقد کیا اور چندہ جمع کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی[8]۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو اخبارات میں غیر ممالک عمومی طور پر اور اسلامی ممالک خصوصی طور پر اداریوں کا

موضوع بنے اور عوام وخواص اسلامی ممالک کی خبریں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اردو گائیڈ کے شمارے ۱۰ ر دسمبر ۱۸۷۷ میں خبر ہے کہ:

> اخبار اسپیکٹیٹر لکھتا ہے کہ جو صاحبان انگریز یقین کرتے ہیں کہ جب روس ترکوں سے مقابلہ کریں گے تو بھاگ جاویں گے ان کو مناسب ہے کہ اس کتاب کو دیکھیں جو مسٹر مکنزی نے لکھی ہے اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جوزک روسیوں نے جنگ کریمیا میں پائی تھی اس کا کیا اثر روس میں ہوا[9]۔

ان اخبارات کی خبروں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پورے ہندوستان میں تحریک اتحاد اسلامی سے عوام الناس کس حد تک متاثر تھے۔ کچھ اخبارات نے اس تحریک پر خصوصی توجہ دی۔ مشیر قیصر لکھنو سے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ مولوی غلام محمد تپش دہلوی اس کے مدیر تھے۔ اس اخبار میں ملکی و غیر ملکی خبروں کے علاوہ تاریخی وادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے[10]۔ تپش دہلوی اودھ اخبار میں کام کر چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس اخبار کے معیار پر خصوصی توجہ دی۔ امداد اللہ مہاجر مکی اور رحمت اللہ کیرانوی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ گئے تو ان کے بیانات اخبار میں خصوصی طور پر شائع ہوتے تھے۔ جب خطہ عرب میں قحط پڑا تو اس اخبار نے اس کی اعانت کے لیے خصوصی مہم کا آغاز کیا[11]۔

اودھ پنچ لکھنو ہندوستان کا وہ اخبار ہے جس کا مزاج مکمل طور پر سیاسی تھا۔ منشی سجاد حسین اس کے مدیر تھے اور اس اخبار نے سیاسی اور سماجی معرکے سر کرنے کے لیے کئی بڑے لوگوں سے محاذ آرائی بھی کی۔ اس کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر اودھ پنچ میں مضامین نہ نکلے ہوں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے۔ اسی اخبار میں فسانہ آزاد جس وقت قسط وار چھپنا شروع ہوا جب اودھ پنچ کا اشتراک اودھ اخبار سے ہوگیا تھا۔

ہندوستان میں اردو اخبارات کے دفاتر میں ترکی اخبارات الجوائب، اختر روم اور دارالخلافت پابندی سے آتے تھے اور ان سے خبریں اخذ کر کے اردو اخبارات باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔ چناں چہ ہندوستانی مسلمانوں کی دل چسپی کے پیش نظر فارسی اخبار دارالخلافت کبھی کبھی اردو میں بھی خبریں اور مضامین درج کر دیتا تھا۔ قسطنطنیہ سے ۲۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو اردو عربی زبان کا ایک پندرہ روزہ اخبار بھی منظر عام پر آیا۔ اسے اسکندر آفندی نے جاری کیا اور اس کا سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔ اس

کے اجراء کا مقصد قیصر الاخبار ہندالہ آباد کے الفاظ میں یہ تھا۔

اس اخبار میں تازہ حوادث ممالک اسلامیہ، سلطنت عثمانیہ اور نیز یورپ کے جو صحیح اور سچے ہوں گے وہ خبریں شائع کی جائیں گی۔ اس مطبع کے مالک و منصرم مہربان آفندی ہوں گے۔ اہل ہند کو ممالک اسلامیہ کے صحیح واقعات سے جن کو اور اخبارات خلط ملط کر کے شائع کرتے ہیں مطلع کریں[۱۲]۔

ترکی سے ان اخبارات کے علاوہ اردو زبان میں بھی کئی اخبارات نکلے جو ہندوستانی مسلمانوں سے رابطے کو مضبوط کرنے کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں استنبول سے مختلف اوقات میں نکلنے والے اخبارات میں پیک اسلام، الدستور اور جہان اسلام قابل ذکر ہیں۔ پیک اسلام ۱۸۸۰ء میں اردو اور ترکی زبان میں شائع ہوتا تھا جب کہ الدستور اردو اور عربی میں، جہان اسلام اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں شائع ہوئے[۱۳]۔

اسی طرح ترکی سے سلطان الاخبار یکم جنوری ۱۸۸۰ء کو سلطان عبدالحمید کے نام پر جاری ہوا۔ آٹھ صفحات پر یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم سید قادر بخش تھے[۱۴]۔ اس اخبار میں بھی مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی جاتی تھی۔

اخبار جہان اسلام کے اردو حصے کے ایڈیٹر عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ انور پاشا سے اور دوسرے مدبروں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ قسطنطنیہ ہی میں تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ انھوں نے انور پاشا سے منتیں کی کہ مجھے بھی ترک فوج میں شامل کر لیا جائے مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ مایوس ہو کر مصر گئے تو وہاں مارشل لا میں پھنس گئے۔ قسطنطنیہ میں امیر شکیب ارسلان، عبد العزیز شادیش، عبد الحمید زہراوی، عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری جیسے انقلابیوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں[۱۵]۔

پان اسلامزم کو فروغ دینے میں ہندوستانی اخبارات نے جو کردار ادا کیا اس کی تاریخ طویل ہے۔ یہاں پر صرف ان چنیدہ اخبارات و رسائل کا ذکر کیا جائے گا جنھوں نے خصوصی طور پر اس تحریک کے حوالے سے عوام الناس میں شعور بیدار کیا اور جذبہ اتحاد اسلامی کے حوالے سے رائے عامہ ہموار کی۔ یہ اخبارات صرف ترکی کی خبریں ہی نہیں شائع کرتے تھے بلکہ تمام اسلامی ممالک کی ان تحریکوں کو بھی خصوصی موضوع بناتے تھے جو سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے حربی اور معاشرتی سطح پر کوششیں کر رہی تھیں۔

انھیں میں نسیم آگرہ آگرہ سے جنوری ۱۸۷۸ء میں سوہن لال دہلوی کی کوششوں سے جاری

ہوا، مگر جلد ہی بابو جمنا داس بسواس نے اس کے مالک و مدیر کی حیثیت سے ذمے داریاں سنبھال لیں۔ ان کی ادارت میں اس اخبار نے جلد ہی شہرت حاصل کر لی۔ اس اخبار میں دیگر اخباروں کی طرح اسلامی ممالک کی خبروں کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ ۱۸۸۵ء کے شماروں میں مہدی سوڈانی اور عثمان زقنہ کی خبریں بہ کثرت ملتی ہیں۔ یہ دونوں مجاہدین بہادری اور جواں مردی سے انگریزی استعمار سے نبرد آزما تھے اور ساتھ ہی ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف بھی فضا ہموار کر رہے تھے[۱۶]۔

مہدی سوڈانی کی ولولہ انگیز شخصیت کا سحر ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹاوہ کے نجم الاخبار میں مہدی سوڈانی کے جہاد کے بارے میں کئی اہم مضامین شائع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد سوڈان پر بھی تسلط حاصل کرنا چاہتا تھا اور مہدی سوڈانی نے برطانیہ کے جنرل گارڈن کو اس مہم میں شکست سے دوچار کیا تھا جس کی گونج عالم اسلام میں سنی گئی اور اردو اخبارات نے اس حوالے سے کئی تبصرے بھی شائع کیے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے میں اخبارات کا معیار اور خبروں کی اشاعت میں نمایاں سرگرمی دیکھی جا سکتی ہے۔ ۱۸۹۵ء میں وکیل امرتسر سے شائع ہوا۔ اس کے مدیر شیخ غلام محمد تھے۔ اس اخبار میں پانچ صفحات میں واقعات و حالات پر تبصرہ ہوتا تھا اس کے بعد تاریخی مضامین اور پھر اسلامی خبروں کا خاص عنوان ہوا کرتا تھا۔ جس کے تحت مصر، ترکی، ایران وغیرہ کی خبریں شائع ہوتی تھیں[۱۷]۔

اس اخبار نے مصر کے حالات پر کئی اہم مضامین شائع کیے مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اس عرصے میں مصر میں آزادی کی کافی تحریکیں چلیں۔ ۱۸۹۶ء میں آزادی کے ایک جاں باز ہیرو مصطفٰے کامل پاشا نے تحریک آزادی کے سلسلے میں یورپ کے ممالک کا دورہ کیا۔ چناں چہ یہ برلن بھی پہنچے۔ وہاں کے دی پوسٹ اخبار کے نمائندے نے ان سے انٹرویو کیا اور مصر پر انگریزوں کے مسلط ہونے کے بعد کی صورت حال اور مصری عوام کے انگریزوں کے بارے میں جذبات و خیالات معلوم کرنے کے لیے سوالات کیے گئے تھے۔ جوابات سے مصطفٰے کامل کے خیالات و افکار کا پتا چلتا ہے۔ یہ انٹرویو دی پوسٹ برلن میں ۱۴۔۱۶/اکتوبر ۱۸۹۶ء کو چھپا اور اس کا ترجمہ وکیل میں ۲۱۔۲۲/ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا[۱۸]۔ اس کے علاوہ جمال الدین افغانی کی سرگرمیوں کا جائزہ بھی اس اخبار میں خصوصی طور پر لیا گیا ہے۔ اسی اخبار نے جمال الدین افغانی کو پہلی بار انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا۔ جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ یہ اخبار

صحیح معنوں میں پان اسلامزم تحریک کا ترجمان تھا۔ اس نے ترکی کے لیے کئی مرتبہ چندہ جمع کرنے کی کامیاب مہم چلائی۔ جنگ ترکی و یونان میں مجروح ہونے والے اور کریٹ (اقریطش) کے مظلوم باشندوں کے لیے خطیر رقم مہیا کی[19]۔ اسی طرح مدرسۂ آصفی اور مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ کے لیے بھی امداد فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مولوی انشاء اللہ خان نے سب سے پہلے اسی اخبار کے ذریعے حجاز ریلوے کے لیے چندہ مہم کا آغاز کیا تھا[20]۔

وکیل شائستہ اور معیاری صحافت کا نمونہ تھا۔ معاصر اخبارات سے تنازعے میں بھی اس کا رویہ باوقار رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کرزن گزٹ کے ایڈیٹر مرزا حیرت دہلوی کی تصنیف حیات حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی زبان و بیان کی غلطیوں پر اعتراضات کیے جس پر کرزن گزٹ نے سخت ردعمل ظاہر کیا۔ جب یہ علمی بحث ذاتیات پر اتر آئی تو صادق الاخبار نے صلح صفائی کرائی[21]۔

البنچ پٹنہ سے ۵ر فروری ۱۸۸۵ء کو جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اس کے مدیر منشی محمد اعظم، مولوی شرف الدین اور سید الطاف حسین تھے۔ اس اخبار کا مزاج مزاحیہ تھا۔ خبروں میں بھی مزاح کا رنگ غالب تھا جس سے خبر کی ماہیت بدل جاتی تھی۔ ادبی حصہ اس میں کم ہوتا تھا۔ غیر ملکی خبریں بھی مختصر ہوتی تھیں۔ اس اخبار میں تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے کافی سرمایہ موجود ہے۔ چناں چہ البنچ مورخہ ۱۸ر نومبر ۱۸۹۸ء میں ریاض الاخبار پر تنقید کرتے ہوئے کریٹ کے مسئلے پر یوں اظہار خیال کرتا ہے[22]۔

> ریاض الاخبار کو اس کی خبر نہیں کہ سلطانی فوج کے اٹھ جانے سے کریٹ کا کیا حشر ہوگا۔ وہ زمانے کا رنگ دیکھ کر صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا، محض رپورٹر کی لغو تار برقیوں پر اپنے فیصلے کی بنیاد ڈالنا درست نہیں[23]۔

البنچ کے کچھ شمارے راقم کی نگاہ سے گزرے ہیں ان شماروں میں ایک حصہ عالم اسلام کے حوالے سے ضرور ہوتا تھا۔ ۲۵ر مئی ۱۹۰۵ء کو عالم اسلام کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے البنچ لکھتا ہے کہ:

> اٹلی بھی یاروں کی دیکھا دیکھی پیٹ سے پاؤں نکالنے لگا ہے۔ آج کل یہ طرابلس الغرب پر ڈورے ڈال رہا ہے۔۔۔ کیا وہ ترکی کی بحری کمزوری کی وجہ سے طرابلس الغرب کو بالکل نرم نوالہ سمجھتا ہے۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو وہ سخت دھوکے میں پڑا ہے۔ کیا دنیا کی مسلمان سلطنتیں، افغانستان، ایران، مراکو، مصر، ترکی دم سادھے یہ دیکھتی رہیں گی کہ اغیار ایک ایک مسلمان اسلامی سلطنت کو زہر مار کرتا چلا جائے گا اور یہ دم نہ ماریں گے۔ نہیں اب اسلامی سلطنتوں میں اتحاد اور اتفاق کی تحریک ہو رہی ہے وہ دن جلد آنے والا ہے کہ ساری اسلامی سلطنتیں متحد ہو کر دنیا کو اپنے اتفاق کا

نمونہ اور نتیجہ دکھلا دیں گی[۲۴]۔

۱۱رجنوری ۱۹۰۶ء کو الپنچ نے اسلامی دنیا کے صفحے پر اخبار مظفری میں جو مضمون نکلا تھا اس کی خبر شائع کرتے ہوئے اتحاد اسلامی کے نظریے کو تقویت بہم پہنچائی۔ یہ اخبار فارسی زبان میں بوشہر ایران سے شائع ہوتا تھا اس نے سلطان ترکی کے حادثے سے محفوظ رہنے پر ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المعظم کا حادثہ جامع حمیدیہ میں سلامت رہنے پر جس طرح تمام سنی مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے اس طرح ایران میں بھی اس کی خبر پہنچی تو عام طور پر خوشی منائی گئی۔ اس سے اتحاد بین المسلمین کا پتا چلتا ہے[۲۵]۔

اس اخبار نے خصوصی طور پر مسلمانوں کو متحد کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اخبار کے ایک شمارے میں ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ اگر مسلمان متحد نہ ہوں گے تو دنیا میں ان کا چراغ گل ہو جائے گا۔ مراسلہ نگار لکھتا ہے کہ:

> آپ جانتے ہیں مسلمانوں پر شامت کیوں ہے، یہ ادبار کیوں آیا۔ یہ گلی کوچوں سڑکوں پر منہ بنائے کیوں پھرتے ہیں، چیں بہ چیں کیوں ہیں۔ ہائے! مجھے اس کے جواب دینے سے قبل ان حالات کو دیکھ کر خوب دل پھاڑ کر رو لینا چاہیے۔ ہائے! انھوں نے وہ کوہ گراں مایہ کھو دیا۔ وہ یاقوت رمانی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے جس کی روشنی نے آج ہم لوگوں کو عرب و عجم، کابل، قندھار، خراسانی، ہندوستان کہاں کہاں نہ پہنچایا۔۔۔ یاد رکھو وہ گراں مایہ ہیرا اتحاد ہے[۲۶]۔

یہ اخبار عالمی معاملات میں اتنا مستغرق تھا کہ ۵راپریل ۱۹۰۵ء کے شمارے میں جاپانی اور روسی لڑائی کے حوالے سے خبریں موجود ہیں۔ صرف یہی اخبار نہیں بلکہ اردو کے تمام اخبارات نے اس جنگ کے حوالے سے کئی اہم مضامین لکھے ہیں۔

اگرچہ الپنچ کا اجرا علمی و ادبی چپقلش کا نتیجہ تھا لیکن اس اخبار نے اپنے طنزیہ و ظریفانہ مضامین کے ذریعے سیاسی اور سماجی برائیوں کی اصلاح کی کوششیں جاری رکھیں[۲۷]۔ اس اخبار میں کارٹونوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ان کارٹونوں سے اخبار کی پالیسی کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ۳۱رجنوری ۱۸۸۷ء کے ایک کارٹون میں کانگریس کا مذاق اڑایا گیا ہے اکثر کارٹونوں میں مسلم ممالک میں برطانوی پالیسی پر طنز کیا جاتا تھا[۲۸]۔

ان ہی اخبارات میں ایک اہم اخبار ایسا بھی تھا جس نے اپنی صحافتی زندگی میں انوکھا مقام حاصل

کیا بلکہ پہلی بار اخبار کو تجارتی مقاصد کے لیے بھی استعمال کا آغاز بھی اخبار پیسہ سے ہوا۔ یہ اخبار گوجرانوالہ مقام فیروز والا سے ۱۸۸۷ء میں ہفتہ وار جاری ہوا۔ اس اخبار کے مالک منشی محبوب عالم تحریک اتحاد اسلامی کے نظریاتی حامیوں میں تھے۔ یہ اخبار ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں باعزت سمجھتا تھا۔ ہندوستان کے مفاد کا ترجمان تھا۔ حتیٰ کہ بدیسی اشیا کے استعمال کا سخت مخالف اور دیسی چیزوں کے استعمال کی تلقین کرتا تھا[۲۹]۔

پیسہ اخبار نے بین الاقوامی سیاسی مسائل میں گہری دل چسپی لی اور اس سے متعلق ضروری حقائق سے وہ عوام الناس کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کرتا رہا۔ عالمی سیاست میں خاص طور پر عالم اسلام کے مابین کشیدگی پر اخبار میں کئی اداریے، مضامین اور کارٹون وغیرہ شائع کیے جاتے تھے[۳۰]۔ خلافت عثمانیہ سے چوں کہ منشی محبوب عالم بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ اس لیے اس اخبار کو اس سے خاص لگاؤ تھا۔ چناں چہ ترکی کے یورپی ممالک کے ساتھ جھگڑوں اور اندرونی مشکلات پر اس کا ردعمل ایک ہمدرد مسلمان جیسا تھا۔ اس اخبار نے جہاں کہیں انگریزوں اور مسلمانوں کے مفاد کا ٹکراؤ دیکھا وہاں برطانیہ پر تنقید کرنے کے بجائے اسے مشورے دیا کرتا تھا مگر اس اخبار نے سلطنت عثمانیہ کے موقف کی حمایت سے کبھی منہ نہیں موڑا[۳۱]۔

جنگ عظیم اول میں اور دیگر ہندوستانی مسلمانوں کی طرح پیسہ اخبار کا بھی یہی خیال تھا کہ ترکی کسی جنگ میں شریک نہ ہو[۳۲]۔ مگر جب ۱۹۱۹ء میں ترکی کے خلاف خفیہ معاہدے منظر عام پر آئے تو اس اخبار کا رویہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ حکومت کی حمایت کی پالیسی ترک کر دی اور احتجاج کا راستہ اختیار کیا[۳۳]۔ اس اخبار نے پان اسلامزم کی تحریک کی بڑی خدمت یہ کی کہ اینگلو انڈین اخبارات اور یورپی اخبارات جب ترکی کے سلطان پر تنقید کرتے تھے تو یہ اس تنقید کا جواب دیا کرتا تھا۔ لندن ٹائمز نے ایک موقعے پر اپنے طویل مضمون میں اہل انگلستان کو اکسایا کہ وہ سلطان ترکی کی مخالفت کریں اور انھیں برا بھلا کہہ کر ہندوستانی مسلمانوں میں بے چینی پیدا کریں۔ اس مضمون میں لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ نے لکھا تھا کہ ٹائمز کا یہ تجزیہ مبالغہ آمیز اور غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف ایک طبقے میں ترکی سلطان کا احترام پایا جاتا ہے اور صرف وہی فرقہ انھیں جائز خلیفہ سمجھتا ہے اور اس فرقے کی ہندوستان میں زیادہ تعداد ہے اور نہ اس کی کوئی خاص اہمیت ہے[۳۴]۔ پیسہ اخبار نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس رائے پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> اگر اخبار کسی قوم کے خیالات کا نمونہ ہو سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے اخبارات انگلستان کی اس حرکت کو جس کی نظیر پہلے موجود نہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ اینگلو انڈین اخبارات ایسی غلط بیانیوں سے اہل انگلستان کی نظروں میں خاک ڈال سکیں مگر ہندوستان میں ایسی خفیف حرکتوں سے یہ اپنے آپ کو اور سبک بنا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے اخبارات میں لاکھوں مضامین پچھلے دو سال میں انگلستان اور ترکی کے تعلقات کے بارے میں لکھے گئے۔ کیا کوئی شخص ایسا مضمون دکھلا سکتا ہے جس میں انگریزوں کی نئی پالیسی کی تعریف کی گئی ہو۔ لندن ٹائمز نے مسلمانوں کی دل شکنی کا صحیح اندازہ کیا مگر اس کی تلافی کی کیا تدبیر بتائی جائے[35]۔

جہاں تک سول اینڈ ملٹری گزٹ کا یہ کہنا ہے کہ صرف ایک فرقہ ہی سلطان ترکی سے عقیدت رکھتا ہے اور اس کی تعداد بھی کم ہے دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ ہندوستان کے شیعہ علما بھی ترکی سلطان کو خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ جسٹس امیر علی، مولوی چراغ علی اور سید عبداللطیف شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ترکی کے خلیفہ کو تقویت پہنچانے کی اپنی سعی کرر ہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پیسہ اخبار نے سوال اٹھایا کہ وہ کون سا مسلمان ہے جو سلطان ترکی کو دین اور دنیا کی اعلیٰ وقعت و عظمت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ پیسہ اخبار نے بلاد اسلامیہ کے حوالے سے کتابوں کی اشاعت کا بھی سلسلہ شروع کیا، اس کے کارکنان عربی اور انگریزی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے جنھوں نے تاریخ بلاد الجزائر اور تاریخ مراکش جو کرنل اسمٰعیل بیگ کی کتابیں تھیں اس کا ترجمہ کیا۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۱۰ء میں خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ادیب اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت کے شعبے سے بھی وابستہ تھے۔ ماہ نامہ دلگداز نے تحریک اتحاد اسلامی کی حمایت کی جو کوششیں کیں اس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا، مگر شرر کا ایک اور صحافتی کارنامہ روزنامہ مہذب اخبار بھی ہے[36]۔ جس کا ذکر کم ہی کیا جاتا ہے۔ مہذب کی خبروں کا اندار تبصروں جیسا ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار میں بھی ترکوں اور عالم اسلام کے حوالے سے کئی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ یہ اخبار اپنے مدیر کی وجہ سے مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی مسائل سے گہری دل چسپی رکھتا تھا، اسلامی شعار کی حفاظت کرنا اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستانی مسلمانوں نے مغربی ثقافت کو اپنانا شروع کیا تو اس اخبار نے کڑی تنقید کی[37]۔

ترکی میں تعلیم نسواں کے فروغ کے نام پر جو آزاد خیالی پیدا ہوئی اس پر بھی مہذب نے کڑی تنقید کی

اور لکھا کہ "تعلیم نسواں کے ذریعے وہاں جو انداز عورتوں میں پیدا ہوا ہے، اس کے قطعی قائل نہیں ہیں [۳۸]۔ یہ اخبار اسلامی حمیت وغیرت کا ترجمان تھا اس اخبار میں انگریز نومسلم عبداللہ کوئیلم جو مبلغ اسلام بھی تھے ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور ان کی سرگرمیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کیا جاتا تھا [۳۹]۔

اردو صحافت میں جس اخبار نے اپنا نام اور مقام بنایا وہ زمیندار تھا۔ مگر پان اسلامزم کی تحریک کو زمیندار سے پہلے مولوی انشاء اللہ خان کے اخبار وطن نے کافی جلا بخشی۔ اس اخبار نے حجاز ریلوے اور جنگ طرابلس و بلقان کے حوالے سے چندہ بھی جمع کیا۔ وطن اخبار خالصتاً سیاسی نوعیت کا تھا اور اس میں چھپنے والے مضامین اور تبصرے بھی سیاسی ہوتے تھے۔

جون ۱۹۰۳ء میں زمیندار اخبار جاری ہوا۔ یہ مولوی سراج الدین احمد، جو ظفر علی خان کے والد تھے کسانوں، کاشت کاروں کی تعلیم و تربیت کے لیے نکالا کرتے تھے۔ مگر جب یہ ظفر علی خان کی ادارت میں آیا تو اس اخبار نے پرانی پالیسی کو تبدیل کر دیا اور اب اس میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔

یہ اخبار مولانا ظفر علی خان کی شخصیت اور اسلام سے گہری وابستگی کی وجہ سے پان اسلامزم کی تحریک کی ترجمانی میں فعال ہو گیا۔ اس کے اداریے بھی اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ اس اخبار کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اور اس سے باہر تمام مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یکم مئی ۱۹۱۱ء کے اداریے میں اخبار لکھتا ہے کہ:

> آج کل کے زمانے میں جب کہ دنیائے اسلام کو مخالف قوتوں کی مزاحمت اور مداخلت کے لیے اپنی پوری قوت سے کام لینے کی ضرورت درپیش ہے۔ حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ پوری قوت بلا قوم کے نظام ترکیبی کی کامل صحت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور نظام ترکیبی کا قوام کچھ ایسا بگڑا ہوا کہ کروڑوں مسلمان منہ سے تو خدا کو ایک کہتے ہیں اور محمدؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں لیکن ماتھے پر کفر کا قشقہ لگائے ہوئے ہیں [۴۰]۔

اس اخبار نے مجروحین طرابلس و بلقان کی جو خدمت کی اس کا ذکر کئی بار کیا جا چکا ہے۔ اس اخبار میں سیاسی حوالوں سے نظمیں بھی شائع ہوئی تھیں جو زیادہ تر اس وقت کے سیاسی حالات کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ سب سے اہم کام جس نے زمیندار کو مجاہدانہ صحافت کا نقیب بنا دیا وہ برطانیہ کی پالیسی پر کھل کر کی جانے والی تنقید تھی۔ زمیندار کے اداریوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے کس طرح عالم

اسلام کے درد کو بانٹنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ مثلاً انھوں نے اپنے اداریے میں پورے عالم اسلام کا احاطہ اس طرح کیا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء کے اداریے کے عنوانات یہ ہیں: دنیائے اسلام کے تین مرکز، مکہ قلب اسلام، قسطنطنیہ ید اسلام، قاہرہ دماغ اسلام وغیرہ۔ ان اداریوں سے اس اخبار کی عالم اسلام سے وابستگی عیاں ہے۔

زمیندار اخبار ہفت روزہ تھا مگر جنگ طرابلس میں اس اخبار نے روزانہ کی بنیاد پر اشاعت شروع کردی۔ یہ اردو کا پہلا اخبار ہے جس نے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام بھی کیا[۴۱]۔ اس کی بے باک پالیسی کی بابت برطانوی حکومت سے تعدیبی کارروائیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ متعدد بار اس کو عوام سے چندہ لے کر بحال کیا گیا مگر جس روش کو اس اخبار نے اپنایا وہ اس کے آخری پرچے میں بھی نظر آتی ہے۔

ان اخبارات کے علاوہ اردو کے متعدد اخبارات نے پان اسلامزم کے نظریے اور سوچ کی آبیاری کی۔ ان میں آفتاب ہند، کشف الاخبار، بمبئی اور نوع کے دوسرے اخبارات شامل ہیں۔ کشف الاخبار بمبئی تو اپنے مشتملات کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> یہ شہر بمبئی ملک یورپ اور چین ترکستان و مصر اور ایران کی تازہ خبروں کا مخزن ہے۔ ان سب ملکوں کی خبریں اور خصوصاً دولت علیہ سلطان روم دام ملکہ کے خاص اخبارات دفتر کشف الاخبار میں آتے ہیں[۴۲]۔

ترکی کا اخبار جہان اسلام حقیقتاً ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کو ترکوں تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ عثمانیوں کے حق میں ہندوستانی مسلمانوں کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے اس نے شعوری کوششیں کیں۔ اس اخبار سے مولانا ظفر علی خان اور ابوالکلام آزاد جیسے لوگ بھی وابستہ رہے[۴۳]۔

ڈاکٹر خلیل طوق آر نے جہان اسلام کے تمام شماروں کی اشاعت دوبارہ کردی ہے۔ ان شماروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخبار سلطنت عثمانیہ کے موقف کی ترجمانی کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام میں باہمی مفاہمت کی فضا کو سازگار بنایا جائے۔ اتحاد اسلامی سے متعلق خبروں کے

علاوہ اس میں ہندوستان کی انگریزی سرکار اور عیسائی مشنریوں کی بھی خبریں ہوا کرتی تھیں [۴۴]۔ اسی لیے ۱۹۱۴ء میں اسے ہندوستان میں آنے سے روک دیا گیا [۴۵]۔

جہان اسلام کے شماروں میں صرف ترکی کے حوالوں سے ہی خبریں شائع نہیں ہوتی تھیں بلکہ کئی اسلامی ممالک جو استعمار کے قبضے میں تھے ان کے بھی حالات اس اخبار میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ ان خصوصی دستوں کا احوال خطوط کی صورت میں شائع ہو چکا ہے جو مختلف محاذ پر یورپی قوتوں سے نبرد آزما تھے۔ جہان اسلام کے شمارہ نمبر ۴ میں ایک ترک مجاہد کا خط شائع ہوا جس میں اس نے اٹلی کی فوجوں سے معرکہ آرائی کا حال لکھا ہے [۴۶]۔

ہندوستان کے مسلم اخبار ترکی کے حق میں آواز بلند کرتے تھے اور انگریزوں کی دشمن پالیسی پر کڑی تنقید کرنا ان کا شعار رہا ہے۔ ان صفحات پر ہندوستانی اخبارات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا۔ اردو صحافت کے ادبی اور سیاسی رسائل نے تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے جو خدمات انجام دی تھیں اس کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ اخبارات کے ذریعے صرف خبروں کی تفصیلات مل سکتی تھیں مگر مسلمانان ہند کو شعوری طور پر اتحاد اسلامی کا حامی بنانے میں اردو رسائل کی خدمات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

سید احمد خان کی صحافتی خدمت بھی ہندوستان میں جنگ آزادی کے بعد نمایاں ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے اخبار سائنٹیفک سو سائٹی جاری کیا۔ اس میں زیادہ تر مضامین علمی اخلاقی اور ہندوستانی معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ تہذیب الاخلاق ۱۸۶۹ء میں جاری ہوا۔ اس رسالے میں پان اسلامزم کے حوالے سے مضامین شائع ہوئے جس کا ذکر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کا اتحاد اسلامی کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان رسائل کا ذکر کیا جائے گا جو تہذیب الاخلاق کے بعد اس تحریک کو پروان چڑھانے میں خصوصی توجہ دیتے رہے ہیں۔

حیدر آباد دکن سے نکلنے والے ماہانہ رسالے حسن کو حقیقتاً ترکی اور خلافت عثمانیہ کے حوالے سے خاص لگاؤ تھا۔ اس رسالے کے بیش تر شماروں میں ترکی کے حالات و واقعات اور اس کی تاریخ پر مضامین ملتے ہیں۔ چوں کہ تحریک اتحاد اسلامی کا ایک بنیادی مقصد خلافت عثمانیہ کا بچاؤ بھی تھا جس کی وجہ سے اردو زبان میں کئی مقالات، مضامین اور قصے کہانیاں ان رسائل میں ملتے ہیں۔ رسالہ حسن ان میں پیش پیش تھا۔ اس رسالے کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کو فروغ دیتے ہوئے ان میں جوش و

حمیت پیدا کی جائے۔

رسالہ حسن میں سلطنت ترکی کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا گیا تھا جس میں ترکی کے ضابطہ، حکومت، آمد و خرچ، افواج، بحری و بری اور سیاسی و معاشی حالات کا شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا گیا[47]۔

اکتوبر ۱۸۸۹ء مسلمانوں کے جوش و خروش کی سچی تصویر کے عنوان سے مضمون میں محمد اصغر حسین نے بلنٹ کی اسلامی یونی ورسٹی کی تجویز کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کا یہ تبصرہ اس لیے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اس کی کتاب The Future Of Islam کا بھی جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> مسٹر ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے اپنی کتاب The Future Of Islam میں گورنمنٹ ہند کو دہلی اور پنجاب کے غریب مسلمانوں کی طرف سے ہوشیار کرتے ہیں اور عموماً ان کو خوف ہے کہ ان میں ہم جنسی پائی جاتی ہے جو کسی دوسری ہندوستانی قوم میں نہیں ہے اور یہ لوگ تاریخ کو جانتے ہیں اور دنیا کے ہم مذہبوں سے سلسلہ پیام و سلام رکھتے ہیں[48]۔

اس مضمون میں مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ صورت حال میں اسلامی ممالک کا عیسائی ممالک سے کسی طرح موازنہ ممکن نہیں ہے۔ ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائی ترقی کا اصلی سبب بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ جب تمام مسلمان متحد ہو کر نکلے تھے تو دنیا میں ترقی حاصل کی تھی[49]۔ انھوں نے لکھا ہے کہ: ''ترکی خود تباہ ہو گیا۔ ایران آپ غرق ہو گیا۔ تیونس چل بسا اور مصر کی تلوار چھن گئی۔ کوشش ہے کہ لبوں پر دم والے مردہ کا سر کاٹ ڈالا جائے''[50]۔ اس پوری صورت حال میں مصنف نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم میں فساد و بغاوت معدوم ہو جائے اور ہم اتحاد و اتفاق پیدا کر لیں تو دوبارہ سرخروئی حاصل کر لیں گے۔ اسی شمارے میں نواب عماد نواز جنگ بہادر کا مضمون مسجد دمشق بھی ہے۔ شام کی جامع مسجد کا پورا تاریخی و تہذیبی منظر بیان کیا ہے[51]۔

مولوی اصغر حسین رسالہ حسن میں تواتر کے ساتھ لکھنے والوں میں شامل تھے ان کا ایک اور مضمون اصلاح سلطنت ترکی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ یورپ کی تمام قوتیں ترکی کو ایک جہالت پر مبنی حکومت تصور کرتی تھیں مگر یورپ کے ہی ایک مستشرق پروفیسر ویمبری نے جب ترکوں کی حالت پر عالمانہ لیکچر دیا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس مضمون میں ترکوں کے یہاں اصلاحات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلسل نامساعد حالات کے باوجود بھی اہل ترکی امور سلطنت سے بے خبر نہیں ہیں

بلکہ کئی حوالوں سے ترقی کے اہم اقدامات کر رہے ہیں جس میں خصوصی توجہ تعلیم کے حوالے سے ہے۔ سلطان عبدالحمید کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ''تمام تمدنی اور ملکی فرائض جو سلطان نے ادا کیے اور جو مالی ملکی فوجی سول اور تجارتی کی گئیں وہ قابل تعریف ہے''۵۲۔

اسی طرح ترکی کے ایک اہم وزیر ابراہیم حقی بے کا ایک مضمون کیا ترکی ترقی کر رہا ہے کا ترجمہ رسالہ حسن میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں حقی بے نے ترکی کے عام حالت کی نسبت یورپ میں پھیلی ہوئی بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

حقی بے کا کہنا ہے کہ ''جو عظیم الشان ترقی ترکی نے موجودہ صدی میں کی ہے اس کا اندازہ موجودہ اور گذشتہ عام تعلیمی حالت سے کیا جا سکتا ہے''۵۳۔ اس کے بعد انھوں نے اس مضمون میں ترکی کی تعلیمی صورت حال کو بھی بیان کیا ہے جو ماضی کی نسبت حال میں زیادہ بہترین انداز میں ہوئی۔

ہندوستانی صحافت اور ہندوستان میں لکھے گئے تاریخی، علمی و ادبی سرمائے میں خواہ شاعری ہی کیوں نہ ہو غرناطہ اور اسپین کے تذکروں سے خالی نہیں۔ اس ملک سے مسلمانوں کو ایک خاص نسبت اور تعلق ہے جو اس سلطنت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی قائم رہا۔ رسالہ حسن میں مولوی حامد علی خان نے تاریخ اسپین کے عنوان سے مضمون لکھا جس میں انھوں نے اسپین کی تاریخ کی دو متضاد حالتوں کا نقشہ پیش کیا ہے۔

اسپین کے حوالے سے مسلمان مؤرخین نے اس مملکت کی علم پروری کا نقشہ دنیا کے سامنے رکھا تھا جب کہ عیسائی مؤرخین نے مسلمانوں پر بے پناہ تعصب کے الزامات لگائے ہیں۔ اسی لیے حامد علی خان نے رسالہ حسن میں اسپین کی تاریخ کے ان متضاد پہلوؤں کا محاکمہ کیا ہے تاکہ عیسائی مؤرخین کے الزامات کی تصحیح کرتے ہوئے انھیں رد کیا جا سکے۵۴۔ ترکوں سے یورپی رویوں کی وجہ سے کروسیڈ یعنی صلیبی جنگوں پر بھی کئی ادبی رسائل میں مضامین لکھے گئے۔ رسالہ حسن نے بھی اس موضوع پر ایک طویل تاریخی مضمون لکھا جس کا آغاز تحقیق و تفتیش سے مملو ہے۔

یہ رسالہ مسلمانوں کی اہم تاریخی و سماجی شخصیات کے کارناموں کو بھی پیش کرتا ہے۔ کئی اہم تاریخی شخصیات جن میں سلطان بایزید اور تیمور بادشاہ گورگانی اور مسلمانوں کی موجودہ پولی ٹیکل حالت پر ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ تاریخ کے ان واقعات سے مسلمانوں کو اپنی حالت کو درست کرنے میں مدد لینی چاہیے۔

سراج الدین احمد خان نے اس مضمون میں ان فتوحات کا بھی ذکر کیا ہے کہ جو مسلمانوں کو یورپی قوتوں کے مقابلے میں حاصل ہوئیں [۵۵]۔

مہدی سوڈانی کی تحریک کے بھی خاطر خواہ اثرات ہندوستانی ادب پر نظر آتے ہیں۔ رسالہ حسن نے بھی مسٹر سی ڈی کولٹ کا ایک مضمون سلطان روم اور مہدی سوڈانی کے باہمی تعلقات کا ترجمہ شائع کیا۔ اس مضمون میں مصنف نے سلطان عبدالحمید اور مہدی سوڈانی کے باہمی تعلقات پر ایک جائزہ پیش کیا ہے اور یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں ایک ذوسرے کے حوالے سے ایک روحانی کشش موجود ہے جو انھیں ہر مشکل گھڑی میں ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار بنا دیتی ہے [۵۶]۔

اس رسالے کو اس حوالے سے بھی اہم تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تواتر کے ساتھ اہم مستشرقین کے مضامین کا ترجمہ پیش کیا جاتا تھا۔ اس نے اہم مستشرقین سے استفادے کی یہ صورت نکالی کہ انھیں خطوط لکھے جاتے جس میں یورپ کے اور بین الاقوامی صورتحال کے حوالے سے سوالات موجود ہوتے تھے، جو جوابات موصول ہوتے انھیں پھر ترجمہ کر کے رسالے میں شائع کیا جاتا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹز کو ایک خط لکھا جس میں اشاعت اسلام کے حوالے سے یورپ میں کیا صورت حال ہے دریافت کیا گیا۔ فروری ۱۸۸۹ء کے شمارے میں اس سوال و جواب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح عیسائیت اور اسلام کے عنوان سے ایک مضمون ایشیا ٹک کوار ٹرلی ریویو لندن سے ترجمہ کیا گیا۔ جس میں ان دونوں مذاہب کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے والے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی وجہ معلوم کرنے کا خواہش مند ہے کہ پروٹسٹنٹ مشنریوں کی کوششیں اہل اسلام کی نسبت کامیابی سے کیوں ہم کنار ہوتی ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

> تہذیب، شائستگی اور حکومت اور اختیار کے لحاظ سے جو جو تفوق مسلمانوں کو بہت سی صدیوں تک حاصل رہا وہ اب ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور وہ اب بالکل عیسائی قوموں کا حصہ ہے اور ہندوستان اور ان ملکوں کے نقشوں سے ظاہر ہوتا ہے [۵۷]۔

رسالہ حسن کے بارے میں مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ ''اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق کے بعد علمی رسالے کی حیثیت سے حسن ہی ایک ایسا رسالہ تھا جو اس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ بلکہ اسے کئی لحاظ سے تفوق حاصل تھا۔ ایک یہ کہ اس میں لکھنے والے بعض ایسے نام ور اہل قلم ہیں جن کے علم و فضل پر ملک و قوم کو ناز ہے'' [۵۸]۔

تہذیب الاخلاق کا مقصد خاص تھا اور حسن کا عام۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین صرف ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود تک محدود تھے مگر حسن کا دائرہ بہت وسیع دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ہر علم وفن کے متعلق متنوع موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ چناں چہ مذہبی، تاریخی، تمدنی، سیاسی ہر قسم کی مضامین اس میں شامل ہوتے ہیں [۵۹]۔

رسالہ حسن کے بعد جس رسالے نے تحریک اتحاد اسلامی کے نمو میں بھر پور کردار ادا کیا وہ عبدالحلیم شرر لکھنوی کا رسالہ دلگداز تھا۔ یہ رسالہ علمی و ادبی حوالوں سے اہم ہے۔ اس نے جس طرح تاریخی کردار کیا اس کے نقوش کبھی بھی نہیں مٹائے جاسکتے۔ شرر کی ذاتی کوششیں بھی یہی تھیں کہ مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے اہم گوشوں سے جو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں نکال کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

مولوی عبدالحق نے اس رسالے کے بارے میں لکھا تھا کہ ان رسالوں میں شائع ہونے والے ناولوں نے مسلمان قوم میں وہ عصبیت پیدا کی ہے جو ہر قوم کے لیے دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ عمل گزشتہ وموجودہ و آئندہ زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جو گزشتہ سے ناواقف ہیں اس کا حال ابتر ہے اور جس نے گزشتہ سے کام لے کر حال کی اصلاح نہ کی اس کا مستقبل تاریک ہے [۶۰]۔

رسالہ دلگداز ۱۸۸۷ء میں لکھنو سے جاری ہوا۔ اس رسالے میں تاریخی مضامین کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی کڑیاں مضبوط سے مضبوط تر ہوں۔ اس کے ساتھ یہ رسالہ خلافت عثمانیہ سے ہم دردی رکھتا تھا۔ اس کے تمام شماروں میں سلطنت عثمانیہ کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جنوری ۱۸۸۸ء کے شمارے میں روس اور روم کے مابین جاری مخاصمت کو بیان کرتے ہوئے رسالہ لکھتا ہے کہ:

> اولوالعزم سادہ دل، بہادر، مقدس، فتح مند اور بامراد مسلمان جن کی تلوار دس دس لاکھ جماعت میں چمکتی تھی اور اپنا کام کر جاتی تھی۔ جن کے قدم چاروں طرف ممالک کو فتح کرنے بڑھتے چلے جاتے تھے، جن کا پاؤں ترقی کی رفتار زمانہ سے آگے نکل جاتا تھا۔ جو اشاعت دین اپنا فرض اور تہذیب اپنا کام سمجھتے تھے۔ سپہ گری جن کا جوہر تھا۔ مرنا جینا جن کا کھیل تھا، علوم وفنون میں سب سے سبقت لے گئے تھے۔ وہی مسلمان آج کس درجے پریشان حال، شکستہ دل فسردہ صورت نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ زمانے سے انھوں نے بگاڑ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی بگڑ گئے [۶۱]۔

اس رسالے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں تمام مضمون عبدالحلیم شرر خود لکھا کرتے تھے۔ اس بارے میں امداد صابری کا کہنا ہے کہ یہ رسالہ اپنے عہد کا بے نظیر رسالہ تھا۔ جس میں تاریخی معلومات بہت زیادہ ہوتی

تھیں اور ادبی مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اس رسالے نے واقعات عالم سے لوگوں کو آگاہ کرنے کا بڑا کام انجام دیا اور لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا ذوق بھی اسی رسالے کے ذریعے پروان چڑھا[۶۲]۔

اس کے شماروں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شرر نے تقریباً عالم اسلام کے تمام اہم واقعات کو اپنے رسالے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپریل ۱۸۸۸ء کے شمارے میں ایک مضمون دارالخلافت بغداد چھپا جس کے بارے شرر کا کہنا ہے کہ ''یہ وہ شہر ہے جس پر صدیوں سے اسلام رو رہا ہے اور خدا جانے کب تک روئے گا۔ اسلامی وقعت کا سماں دکھانے کے لیے ہم جس شہر کو دعوے کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں وہ دارالخلافت بغداد ہے''[۶۳]۔ اسی طرح جولائی ۱۸۸۸ء میں دمشق پر بھی مضمون شائع ہوا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی استعمار نے مسلمانوں کے کسی بھی علاقے کو اپنے ظلم و جبر سے آزاد نہیں رہنے دیا، تقریباً مسلمانوں کے تمام ممالک پر کسی نہ کسی سامراج کا قبضہ تھا۔ ہندوستان بھی برطانیہ کے ہاتھوں اپنی روایات کو تیزی کے ساتھ ترک کر رہا تھا۔ اسی لیے شرر نے تمام اسلامی ممالک کی صورت حال پر تاریخی نظر ڈالی ہے۔ ان کا ایک مضمون افریقہ میں مسلمانوں کی کامیابی میں انھوں نے اسے مسلمانوں کی عجیب و غریب فتح قرار دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''مسلمانوں کی عجیب و غریب فتوحات میں ایک واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے جس نے افریقہ کو ان کی قسمت میں لکھ دیا اور وہاں کے لوگ ایسے مسلمان ہوئے کہ زمانہ ہزار کوشش کرے مگر دین اسلام سے نہیں پھر سکتے''[۶۴]۔

اس رسالے نے مسلمانوں کے تاریخی شعور کو جس طرح بے دار کیا اس سے ان میں حرکت عمل کا احساس پیدا ہوا۔ اس شعوری عمل نے مسلمانوں کو ماضی کے کارناموں سے اچھی طرح باخبر کر دیا۔ اس رسالے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں تم اپنی تاریخ سے سبق سیکھو اور جو حالات تمھارے سامنے ہیں ان سے نکلنے کی جدوجہد کرو۔ شرر خود بھی عظمت رفتہ کے دلدادہ تھے۔ ان کے اس شوق کا اندازہ اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے جب وہ انگلستان سے واپسی پر جبرالٹر سے گزرے۔ لکھتے ہیں کہ:

> مجھے بھی انگلستان سے واپس آتے وقت یہ خیال آیا کہ چند ساعت کے لیے ہمارا جہاز جبرالٹر پر ٹھہرے گا تو شوق نے ایک بے چینی کے انتظار کی صورت پیدا کر لی۔۔۔۔ آخر کئی دن کے انتظار کے بعد ایک طرف سواحل اندلس نظر کے سامنے تھے۔ اسے دیکھ کر یہ خیال ذہن میں مرکزی رخ اختیار کر گیا کہ کاش اس کی سیر کر لوں جسے صدہا سال تک مسلمانوں اور عربوں سے تعلق رہا

ہے۔[65]

معرکہ یونان وروم نے برطانوی سامراج اور ہندوستانی مسلمانوں میں ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سرسید احمد خان کے کچھ رفقا برطانوی حکومت کے طرف دار تھے۔ شرر بھی سرسید کی تعلیمی پالیسی کے طرف دار تھے مگر اس معاملے میں انھوں نے خلافت عثمانیہ کا ساتھ دیا۔ ان کا مضمون معرکہ یونان وروم میں اسلامی دنیا کی حالت دکھائی دیتی ہے۔ اس معرکے میں ترکوں کی کامیابی کے لیے ہندوستان کی مساجد میں خصوصی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ فتوحات کے مژدے پہ لوگ خوشیاں مناتے تھے اور حافظ پاشا جیسے شہیدوں کے لیے فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ اس رسالے میں شرر نے لکھا ہے کہ ''جب حضرت سلطان روم خلد اللہ ملکہ خلیفہ وقت تسلیم کیے گئے ہیں تو تمام دنیا کے مسلمان دولت عثمانیہ کے حالات سے جتنا زیادہ تعلق رکھیں تھوڑا ہے''۔[66]

ان سطور سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شرر بھی ترکی خلافت کے حق میں تھے انھوں نے یورپی دنیا پر سخت تنقید کی اور کہا ہے کہ ''یورپ کے بعض نادانوں کو جو سلطان روم کی خلافت سے انکار کرتے ہیں، بتادیں کہ مسلمانوں میں دولت عثمانیہ کی ہمدردی اور سلطان کو خلیفہ برحق ماننے کا کس قدر جوش ہے''۔[67]

اصل میں دلگداز صرف ایک فرد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رسالے کا مطالعہ شرر کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ مگر شرر نے جس انداز میں اس رسالے کی ترتیب وتہذیب سے کام لیا ہے اس نے اس رسالے میں تنوع کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ جولائی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں دو مضامین ایسے ہیں جو پان اسلامزم کے تصور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس میں ایک صلیبی لڑائیوں کے زمانے کا ایک دل چسپ واقعہ ہے جس میں انھوں نے امیر شجاع الدین شیرازی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے[68]۔ دوسرا مضمون مراکش کا زوال ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کہا ہے کہ: ''آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں جو مسلمانوں کو مراکو کے زوال کا مرثیہ سنائے! یونان کے زوال پر لارڈ بیکن (Lord Bacon) نے موجودہ یونانیوں کی ناکارکردگی بتا کے اگلے بہادروں کو پکارا تھا کہ قبروں سے اٹھو اور اپنے تباہ شدہ وطن کو دشمنوں سے بچاؤ۔ کیا مسلمانوں میں کوئی لارڈ بیکن نہیں جو مراکو کے موجودہ لوگوں کی نالائقی و بے حمیتی ظاہر کر کے اگلے بہادران عرب کو پکارے جو جبل موسیٰ کے دامن میں آغوش کے اندر لیٹے ہوئے ہیں''[69]۔

انھیں اس حوالے سے خدشہ تھا کہ مراکو بھی کہیں الجیریا اور تیونس کی طرح فرانسیسیوں کا صوبہ نہ بنا دیا

جائے۔ دلگداز میں خیالات و واقعات کا ایک ایسا ماہانہ سلسلہ بھی تھا جس میں عالم اسلام اور ہندوستان میں برپا مختلف اہم واقعات پر مختصر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اسی تبصرہ میں انھوں نے عالم اسلام کی دگرگوں حالت پر اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> آج کل مسلمان سلطنتوں پر آفت نازل ہے۔ مراکو جس نے کبھی اسپین کو فتح کیا تھا آج اس پر اسپین چڑھائی کررہا ہے۔ اٹلی جس نے طرابلس الغرب پر حملہ کردیا اور ساری دنیائے اسلام میں ہل چل ڈال دی ہے اور سب سے آخری مصیبت یہ کہ ایران پر روس دست تظلم دراز کرنا چاہتا ہے[۷۰]۔

اسی تبصرے میں سلطنت عثمانیہ کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ: ''لڑائی کے اعتبار سے کوئی سلطنت شاید اتنی خوش قسمت نہ ہوگی جتنی دولت عثمانیہ ہے۔ بحری قوت نہ ہونے کے باوجود وہ اٹلی کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہے۔ مگر اسلام نے جو ذوق شہادت مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کیا، اس سے طرابلس میں مختلف جگہوں سے مجاہدین اسلام پہنچ رہے ہیں اور عثمانوی خلیفہ کا دفاع کررہے ہیں[۷۱]۔

صحافتی، علمی و ادبی سرمائے میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم جنگ طرابلس کو کثرت سے موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ جنگ طرابلس کے اردو ادب پر اثرات کے حوالے سے لکھا جاسکتا ہے۔ دلگداز ہی نہیں کسی بھی ادبی رسالے کا مطالعہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس جنگ کے حوالے سے اچھا مواد مل سکتا ہے۔ شرر نے بھی اس جنگ پر کئی چیزیں تحریر کی ہیں۔ دلگداز میں ترکوں اور عربوں نے طرابلس الغرب میں مل کر یورپی قوتوں کے سامنے جس بہادری کا مظاہرہ کیا ہے اسے انھوں نے پان اسلامزم کے تصور کی دین قرار دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی بہادری کو دیکھتے ہوئے یورپ پر طنز کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر یورپ کو اٹلی سے ہمدردی ہے تو اس بے وقوف آفت زدہ کو تباہی و ہلاکت بلکہ خودکشی سے بچائے[۷۲]۔

شرر نے بھی دلگداز میں ترکان آل عثمان پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا۔ انھیں ترکوں سے عقیدت تھی۔ ترکوں کی شکست پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور اسے ترکوں کا موجودہ عبرت ناک تنزل قرار دیا ہے[۷۳]۔ ہندوستانی مسلمانوں کو خلافت عثمانیہ کے زوال کا سخت صدمہ تھا اور تحریک خلافت اس زوال کی آخری ہچکی تھی۔ جس کے مٹ جانے کے بعد عالم اسلام میں منصب خلافت کو قصہ پارینہ بنادیا گیا ہے۔ ترکوں کی خلافت سے دست برداری کے بعد مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی عالمی اتحاد کی صورت حال ختم ہوچکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اب اجتماعی طور پر کسی بھی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی صف بندی سے

قاصر ہوئے۔ پھر عرب ازم کا تصور نمودار ہونے کی وجہ سے فلسطین جیسے ملک پر اسرائیل جیسی ریاست نمودار ہوئی جس نے پورے مشرق وسطیٰ کو آج بھی کئی ٹکڑیوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

عثمانوی خلافت کی بقا کا مسئلہ اتحاد بین المسلمین کی محافظت سے جڑا ہوا تھا اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ پر اقلیتوں کے حقوق غصب کرنے کے حوالے سے جتنے الزامات لگائے گئے اس کا جواب مختلف رسالوں اور کتابچوں کی صورت میں دیا گیا۔ رسالہ دلگداز کے بیش تر مضامین اس سوچ کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

ترکوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو مصر سے بھی لگاؤ تھا۔ دو شخصیات مصر کی ایسی گزری ہیں جن پر بڑے اہم مصنفین نے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک محمد علی پاشا اور دوسرا مصطفٰے کامل پاشا ہے۔ دلگداز میں بھی محمد علی پاشا کی زندگی کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ محمد علی پاشا عثمانوی سلطنت کا نہایت اہم مستعدرہ نما تھا جس نے مصر میں عثمانوی ترکوں کی مخالف قوت کا سد باب کیا اور وہابی تحریک کو حرمین سے بے دخل کیا، مگر بعد میں وہ خود ترکوں سے بدظن ہو گیا تھا [۷۴]۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران دلگداز میں عالم گیر قتال مغرب کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصنف نے لکھا ہے کہ یورپ کے اس دعوے کی دھجیاں بکھر کر چکی ہیں کہ دنیا میں اہل مغرب ہی حاملان نوائے تہذیب ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے ایسی خوں ریزی ہو رہی ہے جیسی کہ آج تک دنیا میں کبھی نہیں ہوئی تھی [۷۵]۔

شرر نے دلگداز میں ترکی خلافت کے حوالے سے ایک مضمون تاریخ خلافت پر لکھا جس میں اس نے خلافت کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کیا تھا اس میں ان کا موقف ہے کہ عبدالحمید کا زمانہ باوجود ان کی اعلیٰ تدبروں کے خلافت اسلامیہ اور دولت عثمانیہ کے لیے نہایت خطرناک رہا ہے۔ یورپ کی جارحیت کو وہ اپنی پالیسی سے ہمیشہ مسترد کرتے رہے ہیں مگر جب ان کی قوم اہم قومی رہ نماؤں نے جنھوں نے یورپ کے آغوش میں پرورش پائی تھی بغاوت ومخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے تو انھیں اپنی حکومت سے دست بردار ہو جانا پڑا اور نوجوان آزاد خیالوں نے سلطان محمد خامس کو تخت پر بٹھا کر حکومت کرنا شروع کی۔ ان انقلابات پر یورپ کی خاموشی معنی خیز رہی۔ سلطنتوں کے مابین اندرونی جھگڑے خوش اسلوبی سے طے ہو گئے تو اہل یورپ نے باہم اتفاق سے ترکی کی سلطنت کو مکمل طور پر تباہ کرنے کی منصوبندی شروع کر دی۔

چناں چہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا اور پھر بلغاریہ، سرویا، مانٹی نیگرو اور یونان نے ترکی پر یکایک حملے شروع کر دیے اور اس کے بعد جزیرہ نمائے بلقان بھی ترکوں کی عمل داری سے نکل گیا۔ یہ تمام تنازعات ابھی جاری ہی تھے کہ جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی جس میں ناگاہ ترکی کو بھی جرمنی کے اتحادی کے طور پر میدان میں آنا پڑا۔ شرر نے اس پورے منظر نامے کو اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ جب اتحاد کی لڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور نفس پروری میں قوم اور دین دونوں کو قربان کر دیا جاتا ہے تو پھر سلطنت باقی بچتی ہے اور نہ نام ونشان [76]۔

دلگداز کے شماروں کا اگر ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو اس دور کے ہندوستان کی طویل تاریخ مرتب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ شرر نے ہر اداریے میں تازہ حالات پر قلم اٹھایا ہے۔ جو عموماً سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مثلاً تقسیم بنگال، مسلم لیگ و کانگریس اور تحریک خلافت وغیرہ۔ ان تحریکوں، سیاسی جماعتوں اور نمایاں سیاسی واقعات پر شرر نے ایک حد تک غیر جانب داری سے جائزہ پیش کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ تحریریں اس دور کے سیاسی ماحول کا آئینہ دار ہیں۔ نیز شرر کے سیاسی شعور کی مظہر بھی ہیں۔ شرر نے دلگداز میں جن بین الاقوامی سیاسی حالات کو پیش کیا تھا وہ بہت تفصیلی ہیں۔ صرف جنگ عظیم پر شرر نے کئی حوالوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اس جنگ پر لکھی گئی تمام تحریروں کو اگر مرتب کر دیا جائے تو وہ ایک کتابچے کی شکل میں اس جنگ کی پوری تاریخ کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

دلگداز میں دنیا کے عظیم اور طاقت ور ملکوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی صورت حال کا ذکر ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ رسالہ تاریخی معلومات کا خزینہ ہے اور اس میں موجود مواد تاریخ کے طالب علم کے لیے بیش بہا علمی سرمایہ ہے [77]۔

شرر نے اپنے رسالے میں شیعہ سنی اتحاد کی بھی کوشش کی ہے۔ جن کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ دلگداز میں سلسلہ وار مضمون سکینہ بنت حسین کے شائع ہونے کی وجہ شیعہ فرقے سے جن اختلافات کا انھیں سامنا کرنا پڑا وہ اسے کم کرنا چاہتے تھے [78]۔ یہ رسالہ اردو زبان میں تاریخی شعور کی آبیاری میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا ہے۔

رسالۂ معارف بھی اپنے دور کا ایک اہم رسالہ تھا۔ یکم جولائی ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر ملک کے نام ور ادیب مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔ یہ رسالہ چار سال کی زندگی پا کر

۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ لیکن اس نے چار سال میں جو علمی ادبی خدمات انجام دیں وہ بے مثال ہیں۔ اس کے علمی معاونین میں مولوی ذکاء اللہ، مولانا عبد العلی، خواجہ غلام الثقلین اور مولانا حالی کے نام نمایاں ہیں۔

نواب مہدی حسن خان اس رسالے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> افسوس کہ ہم جواں مرگ معارف کو جو تہذیب الاخلاق کا خلف صالح تھا اچھے سے اچھے علمی پرچوں سے برا نہیں۔ اصحاب المعارف نے جس طرح داد تحقیق دی اور عربی و ترکی کے لٹریچر کے اجزا جس شائستگی اور قابلیت کے ساتھ اردو میں منتقل کیے، لکھنے والوں کا خاص حصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ رفتار دماغی کے ساتھ ہم مدتوں اس قابل نہ ہوں گے [۷۹]۔

وحید الدین سلیم پانی پتی معارف کی غرض و غایت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس رسالے میں بلاد اسلامیہ مثل قسطنطنیہ، قرطبہ، غرناطہ، بغداد، دمشق وغیرہ کے متعلق تاریخی مضامین لکھے جائیں گے جس کے پڑھنے سے مسلمانوں کا قدیم و جدید تمدن معلوم ہوگا [۸۰]۔ عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں جو اخبار اور رسائل چھپا کرتے تھے ان میں عمدہ مضامین جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید سمجھے جاتے تھے ان کا ترجمہ اس رسالے میں شائع کیا گیا اور ترجمہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا گیا کہ پڑھنے والے کا جی نہ اکتائے بلکہ یہی محسوس ہو کہ ان مضامین کو اصلی زبان میں پڑھ رہے ہیں [۸۱]۔

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کا ذہنی رجحان بھی اتحاد اسلامی کو فروغ دینے میں معاونت کرتا رہا۔ سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی پر ایک مصری رسالے سے اردو ترجمہ کر کے اسے معارف میں چھپوایا۔ اس کے علاوہ مسلمان عورتوں کے مضامین کے عنوان سے ہندوستان، مصر، ترکی، روس اور ایران کی بعض مشہور خواتین کے حالات بھی لکھے [۸۲]۔

یہ رسالہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کے اہم کارناموں کی یاد دلانا چاہتا تھا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خان نے اسپین پر اور وحید الدین سلیم پانی پتی نے ابن جبیر اور اس کا سفر نامہ پر مضمون لکھا [۸۳]۔ اسی طرح اس رسالے میں عالم اسلام پر جو نئی کتابیں شائع ہوتی تھیں خصوصی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

مولوی انشاء اللہ خان کی کتاب تاریخ خاندان عثمانیہ، محاربات پلونا، بست سالہ عہد حکومت سلطان عبد الحمید، پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایک تبصرے میں مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی لکھتے ہیں کہ ''کوئی کتاب ایسی نہیں جو محض تالیف یا ترجمہ ہو ان کتابوں کے مصنف نے اس سلسلہ کو تیار کر کے ترکوں کی تاریخ، ملکی، علمی، تمدنی اور ہر قسم کے حالات کو آئینہ کر دیا ہے۔ ہر کتاب کے ساتھ

نہایت دل چسپ اور مفید حاشیوں نے اسے اورزیادہ معلوماتی بنادیا ہے [۸۴]۔

اس رسالے میں عالم اسلام کے حوالے سے اچھوتے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مولوی محمد مرتضٰی نے حالات سسلی پر دو مضامین لکھے۔ اس میں انھوں نے پہلے حصے میں سسلی کا جغرافیہ اور دوسرے حصے میں سسلی کی قدیم تاریخ بیان کی ہے [۸۵]۔ رشید احمد سالم نے دولت عثمانیہ کے عنوان سے مضمون میں کسی عربی رسالے سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ رشید احمد سالم کا کہنا ہے کہ:

> سعادت نعمان بے جو سلطان عبدالحمید کے پانچویں سیکریٹری ہیں۔ اورنٹیل کانگریس کے ایک جلسے میں جس میں یورپ اور امریکہ کے علما اور سلاطین عالم کے سفیر موجود تھے دولت عثمانیہ کے حوالے سے ایک مضمون پڑھ کرسنایا تھا یہ مضمون فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا محمد طلعت آفندی نے اس کا ترجمہ عربی میں کردیا اور میں نے اردو میں اسے منتقل کیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کی تاریخ ترکوں کے دانش وروں سے معلوم ہوسکے [۸۶]۔

مولانا عبدالعلی خان نے نامق کمال بے کی سوانح عمری رسالہ معارف میں صراحت کے ساتھ لکھی۔ نامق جمال بے کے اردو ادب پر اثرات نمایاں ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم، وحیدالدین سلیم پانی پتی پر تو اس کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ عبدالعلی خان معارف میں تواتر کے ساتھ لکھتے تھے انھوں نے اسلام اور اسلامی ممالک کے حوالے سے کئی اہم مضامین کے ترجمے اس رسالے کے لیے کیے۔ ان کا مضمون ابن رومیہ دسمبر ۱۹۰۰ء کو معارف کے شمارے میں شائع ہوا جب معارف کا دفتر علی گڑھ سے پانی پت چلا گیا تھا۔ یہ مضمون ایک اہم فقیہہ کے حالات پر مبنی تھا۔ مولوی عبدالعلی خان نامق کمال بے کے حالات لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نامق کمال بے ترکوں میں نہایت اعلیٰ درجے کا انشا پرداز اور نام ور شاعر گزرا ہے۔ اس کی ولادت ۱۲۵۶ء میں قصبۂ تکفور طاغی میں ہوئی۔ اس کے نانا اس قصبے میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ نامق کمال بے کی پیدائش پر عارف آفندی، جو اس زمانے کا مشہور شاعر تھا نے ترکی نظم میں ان کی ولادت کی تاریخ لکھی۔ اس نظم کا آخری مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ ''اس زمانے نے محمد کمال کے پیدا ہونے سے عزت وشرف حاصل کیا ہے''۔ اس شاعر کی پیش گوئی آئندہ چل کر پوری ہوئی کیوں ترک نامق کمال بے کی انشا پردازی اور شاعری پر فخر کرتے ہیں اور اس کے وجود کو ترکی مصنفوں کے طبقہ اعلیٰ میں شمار کرتے ہیں'' [۸۷]۔

نامق کمال بے کی شخصیت کا احاطہ مولانا عبدالعلی خان نے دل چسپ انداز میں کیا ہے ان کے بچپن

سے لے کر جوانی تک کے حالات بیان کیے ہیں اور اس کے اسلوب اور مضامین پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> نامق کمال بے نے کبھی اپنے قلم کو ہجو یہ مضامین سے آلودہ نہیں کیا، اس نے کبھی اپنے مضامین میں شرم ناک اور رکیک الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اس کو فلسفیانہ اور ملکی و اخلاقی مضامین کے علاوہ مذہبی خیالات کے لکھنے پر ایسی قدرت تھی کہ عالم روحانی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیتا تھا اور اس کے مذہبی مضامین کو پڑھ کہ دہریے اور ملحد بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ انشا پردازی میں اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا جن سے عام لوگ مانوس نہیں ہوتے تھے مگر وہ ان کو ایسے سانچے میں ڈھالتا تھا کہ بے تکلف ہر شخص کی سمجھ میں آ جاتے تھے[۸۸]۔

نامق کمال بے نے دولت عثمانیہ کی تاریخ بھی لکھنی شروع کی تھی مگر کسی وجہ سے حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی۔ رسالہ معارف نے نامق کمال بے کی شخصیت کا احاطہ نہیں کیا بلکہ ترکی کے افسانوں کو اردو میں سب سے پہلے متعارف کرایا۔ یلدرم نے سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں خلیل رشدی جو ترک افسانہ نگار تھے ان کا افسانہ نشہ کی پہلی ترنگ اسی رسالے میں ترجمہ کیا جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا افسانہ تھا۔

چوں کہ ہندوستانی معاشرے میں کئی ادبی رسائل خواتین کے ترجمان کی حیثیت سے نکلنے شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں خواتین میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان عام ہوا۔ اس لیے معارف نے خصوصی طور پر ترکی کی خواتین کے مضامین کا ترجمہ پیش کیا کیوں کہ ترکی میں خواتین کی ترقی سے ہندوستانی عورتیں متاثر تھیں۔

صحی خانم نے اپنے خاندان کی موجودہ اور گذشتہ حالت اس لیے بیان کی ہے کہ خاندان کے موجودہ افراد تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور ان کے سامنے علم و عمل کے حوالے سے ایسے واقعات رکھے جائیں تا کہ ان میں علمی جوش پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو جائے۔ آخر میں انھوں نے اپنے خاندان کے اشخاص سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو علم و ہنر سکھانے پر توجہ دیں تا کہ خاندان کی حالت بگڑنے نہ پائے اور چند نسلوں کے بعد اس کو وہی عظمت اور نام وری حاصل ہو جس کا خاندان کی گزشتہ تاریخ میں ذکر ہو چکا ہے[۸۹]۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں علمی ذوق پیدا کرنے میں اس رسالے نے جو کام کیا وہ ہماری تاریخ کا

حصہ ہے۔ خصوصاً اردو ادب میں ترکی افسانوں اور ناولوں کے جو ترجمے اس رسالے میں شائع ہوئے اس نے اردو لکھنے والوں میں ایک نئی فکر پیدا کی۔ اسی لیے ڈپٹی نذیر احمد نے اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> میں نے ایک دوست کے کہنے پر سے جولائی ۱۸۹۹ء سے جون ۱۹۰۰ء تک کے معارف کے بارہ رسالے پڑھے۔۔۔ان بارہ رسالوں میں جتنے بھی مضامین ہیں سبھی مسلمانوں کے لیے نافع ومفید ہیں۔معارف کو تہذیب الاخلاق کا جانشین بالاستحقاق سمجھ کر اس کی مدد کی جائے[۹۰]۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں صحافت پر بین الاسلامیت کے نظریے نے جس طرح اپنے اثرات مرتسم کیے اس نے صرف ایک سوچ کو ہی پروان نہیں چڑھایا بلکہ کئی ایسی علمی کوششیں بھی منظر عام پر آئیں جس نے مسلمانوں کی تاریخ کے اہم گوشوں کو اردو زبان میں سمیٹ لیا ہے۔ بہر حال اردو صحافت کے اس رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور کئی اہم رسالے منظر عام پر آئے جس نے اس تہذیبی، تمدنی تاریخ میں کئی نمایاں علمی کام کیے ہیں ان ہی میں ایک رسالہ الناظر بھی ہے جو لکھنو سے نکلتا تھا۔

الناظر برطانیہ کے رسالے اسپیکٹیٹر کے طرز پر نکالا گیا تھا۔اس کے اکثر مضامین کے اسلوب میں اسپیکٹیٹر کی طرز کو نقل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مولوی ذکاءاللہ نے اس رسالے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے عوام کے مذاق کے موافق عمدہ تحریریں شائع کیں اور اس کی اشاعت تیزی سے ہو رہی ہے اگر یہی معاملہ رہا تو ہندوستان میں یہ رسالہ اسپیکٹیٹر کا کردار ادا کرے گا[۹۱]۔

الناظر میں فخر الدین احمد نے فاطمہ علیا خانم کے عنوان سے مضمون میں نوجوان ترکوں کی ان کوششوں کو پیش کیا ہے، جنھوں نے صرف سیاسی سطح پر ہی ہل چل پیدا نہیں کی بلکہ ترکوں کی معاشرت پر بھی خاطر خواہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ''جدید تعلیم کی وجہ سے وہاں کے مرد ہی اس لائق نہیں ہوئے کہ وہ دنیا کی شائستہ ومہذب قوموں میں شمار ہو سکیں بلکہ تعلیم یافتہ ترکی مستورات بھی ایسی نمایاں ترقی کر رہی ہیں، جن کی وجہ سے ممالک اسلامیہ کی تہذیب وشائستگی میں چار چاند لگ گئے۔ ایسی ممتاز خواتین میں ایک فاطمہ علیا خانم ہے[۹۲]۔

الناظر ہو یا کوئی اور اردو رسالہ ان میں یہ احساس ملتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان دنیا کی شائستہ ومہذب قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں یہ احساس آج بھی ہمارے معاشرے میں علمی وادبی سطح پر دکھائی دیتا ہے مگر

تاریخ کا مطالعہ کرنے اور مختلف تحریکات کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنھیں اپنی شائستگی اور تہذیب کے مٹ جانے کا غم مسلسل ستا رہا ہے وہی لوگ آج بھی دنیا میں عمدہ تہذیب وتمدن کے حامل ہیں۔فرق یہ ہے کہ ان میں اپنے جوہر کی پہچان مٹ گئی ہے جو شاید دور غلامی میں پیدا ہونے والے احساسات کا نتیجہ ہے۔

اسی لیے مسلمانوں نے اپنے غلامی کے احساس کو کم کرنے کے لیے ان تاریخی یادگار فتوحات اور سلطنتوں کا ذکر ان رسالوں میں کیا تھا جو کبھی ان کے اسلاف کے عظیم کارنامے تھے۔اور اردو کا شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو جس میں اسپین کا تذکرہ نہ کیا گیا ہو۔ابرار حسین کا مضمون اسپین اور اسلام، الناظر میں شائع ہوا جس میں انھوں نے ہسپانیہ میں اسلام کی صورت حال پر خاصی روشن ڈالی ہے[۹۳]۔

دول یورپ کے ٹکراؤ کو عالم اسلام میں صلیبی محاربات کا شاخسانہ قرار دیا گیا۔مولوی معشوق علی نے محاربات صلیب کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ الناظر میں شروع کیا اور یورپ کے ساتھ اسلامی قوتوں کے تصادم کی تاریخی وتہذیبی حقیقت بیان کی۔اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ دنیا کے وہ عظیم الشان واقعات جن کا اثر تاریخ پر پڑتا ہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکا یک اور اچانک واقع ہو جائیں۔ان کے مقدمات شاذونادر مخفی اور ہمارے علم سے باہر ہوتے ہیں۔جب واقعہ ہو جاتا ہے اور اس کے اسباب تلاش کیے جاتے ہیں تو وہ کہیں نہ کہیں پہلے سے مضمر نظر آتے ہیں۔یہی حالت ان جنگوں کی ہے جو آج عالم اسلام میں جاری ہیں۔لہٰذا محاربات صلیب میں یہ سلسلہ اسی لیے شروع کیا گیا تا کہ ان واقعات کے پس منظر سے واقف ہو کر ان کے صحیح نتائج معلوم کر لیے جائیں[۹۴]۔

انھوں نے بیت المقدس کے حوالے سے لکھا تھا کہ ''جنگ ارسوف کے نتیجے میں یروشلم کا راستہ صلیبیوں کے لیے کھل گیا تھا مگر انھوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے بجائے شرمناک تنازعات اور مسلمانوں کے ساتھ کبھی کبھی غیر فیصلہ کن لڑائی لڑنے میں ضائع کر دیا''[۹۵]۔

دسمبر ۱۹۱۶ء کو ہاشمی فرید آبادی کی نظم چل بلقان چل چھپی۔اسی میں الناظر کے ایڈیٹر ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کے بارے میں کہتے ہیں کہ لکھنو کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں اور ترکی مجاہدین کی مرہم پٹی کرنے قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔یہ جمعیت یکم دسمبر کو لائڈ نامی جہاز پر روانہ ہو جائے گی۔ہم ان لوگوں کے جذبات کے اعادہ سے قاصر ہیں جو برادر عزیز کو رخصت کرتے وقت ہمارے دل میں موجزن تھے مگر پھر بھی ان کی حالت پر اظہار رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتے''[۹۶]۔

الناظر کے مقاصد میں خواتین کی بے داری پر خصوصی توجہ دی گئی۔اسی لیے عالم اسلام میں بالخصوص ترکی خواتین میں جو روشن خیالی پیدا ہوئی اسے خاص جگہ دی گئی۔ترکی مسلمان عورتیں کے عنوان سے مضمون میں ظفر الملک علوی کا کہنا تھا کہ:

> اس مضمون کے ذریعے ترکی بہنوں کی معاشرت کے روشن پہلوؤں پر نظر کر کے ہندوستان کی خواتین جن کو نسبتاً تعلیم حاصل کرنے اور بیداری عام سے فائدہ اٹھانے میں کم دشواریوں کا سامنا ہے کوشش کریں گی کہ وہ بھی آئندہ چل کر انور بے کے سے شیر دل بچے پیدا کریں [۹۷]۔

اس مضمون کے لکھنے والے مضمون نگار منظور علی کا کہنا ہے کہ ''ترکوں میں جو خوبیاں ہیں ان میں سے ایک ان کا زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے۔اس گئی گزری حالت پر بھی ترکوں میں اس خوبی کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس قوم کی عورتوں میں ابھی کچھ روح باقی ہے''[۹۸]۔اسی طرح مولوی محمد شاکر کا مضمون عرب کی گذشتہ عظمت عربوں اور ان کے عظیم کارناموں کے بیان پر مبنی ہے[۹۹]۔

الناظر نے جہاں اردو شاعری کو اپنے رسالے میں جگہ دی وہاں اس نے تحریک اتحاد اسلامی کے حوالے سے کئی نظموں کو اپنے رسالے میں شامل کیا جو اتحاد اسلامی کے جذبات کو پروان چڑھانے کے لیے نتیجہ خیز رہیں۔یہ نظمیں جہاں قومی، اخلاقی اور علمی انداز کی ہوا کرتی تھیں وہاں دول یورپ کے ساتھ جاری مختلف معرکہ آرائیوں پر خصوصی نظمیں شائع ہوئی جس میں ایران پر روسی حملے کی مذمت کی گئی۔اسی طرح ثاقب نامی شاعر کی ایک نظم خوں نابہ جگر میں گلشن اسلام کی تاراجی پر نوحہ ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

ایک مدت ہوگئی وقت ناکامی ہیں ہم
شہرتیں اپنی مٹا کر محو گمنامی ہیں ہم
کیوں نہ تڑپیں کشتہ تیغ بدانجامی ہیں ہم
نوحہ خوان گلشن تاراج اسلامی ہیں ہم
بلبل بے آشیاں ہیں جان کھونا ہے ہمیں
طاقت پرواز برسوں تجھ پہ رونا ہے ہمیں[۱۰۰]

مولانا ظفر علی خان کا رسالہ دکن ریویو پان اسلامزم کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔اس رسالے میں ایسے مضامین شائع ہوئے جو خصوصیت سے اتحاد اسلامی کی فکر سے جڑے ہوئے تھے۔مولوی محمد عزیز مرزا کا مضمون سلطان صلاح الدین ایوبی نومبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع

ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے ایوبی کی شخصیت کو اس لیے پیش کیا تھا تا کہ مسلمان موجودہ صیبی قوتوں سے کسی طور پر بھی خائف نہ ہوں۔

اسی طرح مصر کے معروف سیاست دان مصطفیٰ کامل پاشا کے انتقال پر مولوی عبدالحق نے مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے اس نابغہ روزگار کی موت کا افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس اچانک موت نے عالم اسلام کو شدید بحران میں مبتلا کر دیا۔ عبدالحق نے اس رسالے میں ایک سلسلہ مضمون العالم اسلامی بھی شروع کیا تھا جس میں عالم اسلام کے ان علاقوں پر خصوصی مضامین لکھے گئے جو یورپی نوآبادیات کا حصہ بن گئے تھے۔ اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں ظفر علی خان نے اس رسالے کے بارے میں لکھتے ہوئے سلطان عبدالحمید سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے۔

اب بھی مسلمانوں کی محفلوں کی رہی سہی رونق اسی شمع سے ہے جس کا فانوس قسطنطنیہ ہے۔ اندلس، بغداد اور دہلی کے افسانے پرانے ہو چکے۔ عبدالرحمٰن، المامون اور شاہ جہاں کے کارنامے صرف کانوں اور زبانوں تک محدود ہیں۔ پیش نظر اگر ہے تو قسطنطنیہ اور اس کا جلیل القدر فرماں روا"[۱۰۱]۔ آگے چل کر اسی اداریے میں مسلمانوں کی عقیدت جو ترکی سلطان سے تھی اس کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ "کون ہوگا جس کی رگوں میں خلیفۃ المسلمین کا نام سن کر خوف تیزی کے ساتھ دوڑنے نہ لگتا ہو"[۱۰۲]۔

دکن ریویو میں سلطان عبدالحمید، شاہ ایران، امیر حبیب اللہ والی افغانستان کی تقریریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ اس کے دو شمارے اسلام نمبر کے بھی نکلے جس میں اسلام اور تبلیغ اسلام اور دیگر مذاہب کا اسلام کے ساتھ جائزہ بھی موجود ہے۔

راشد الخیری بھی پان اسلامزم سے متاثر تھے۔ اسی لیے رسالہ تمدن بھی اتحاد بین المسلمین میں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ رشید شوکت دہلوی کا مضمون سید جمال الدین افغانی جو براؤن کی کتاب انقلاب ایران سے ماخوذ ہے اس رسالے میں شائع ہوا۔ شوکت دہلوی نے اس کتاب کے خاص پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر یہ مضمون ترتیب دیا تھا۔

اسی طرح شمس اللہ قادری کا مضمون صلاح الدین ہے۔ جس میں انھوں اس کی شخصیت کے پورے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا رجحان عام ہو گیا تھا، اس لیے کئی اہم لکھنے والوں نے عام مذاق سے ہٹ کر تاریخ اسلام کے نام ور سپہ سالاروں کے حالات تحقیق و تفتیش کے

ساتھ مرتب کیے تا کہ ان بہادر نام وروں کی سرگزشت دوبارہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں تازہ کی جائے[۱۰۳]۔

سید شوکت دہلوی کا ایک اہم مضمون روس اور اسلام نومبر ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے روسی مسلمانوں کی صورت حال پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> اب سے کئی سو برس پہلے مشرقی روس میں ترک آباد تھے ان قوموں کے مختلف قبیلوں کا مذہب بت پرستی تھا جب ملت اسلام عالم کون و مکاں میں جلوہ افگن ہوا تو اس کا پرتو اس پر بھی پڑا۔ اور طالبان راہ حق ظلمت کے بحر ذخار سے نکل کر صراط مستقیم پر آنے لگے[۱۰۴]۔

اس کے بعد اس مضمون میں انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کے قبول اسلام کی صورت حال اور سیاسی لحاظ سے ان کے استحکام کی بنیاد پر کی گئی اہم کارگزاریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے انیسویں صدی کے وسط میں عیسائی مبلغین کا جائزہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے کس طرح مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکا[۱۰۵]۔ راشد الخیری نے پان اسلامزم کے حوالے سے کئی افسانے اور مضامین لکھے۔ ان کا ایک مضمون تبریز بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

> طرابلس کا زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ مظالم تبریز نے اور چرکا دیا ہے۔ روس ہمیشہ سے اسلام کا دشمن اور اس تاک میں رہا ہے کہ جب موقع پائے مسلمانوں کے خون سے اپنی تلوار رنگے اور جب کوئی عذر نہ ملے تو رعیت ہی کے مسلمانوں پر نت نئے ظلم توڑے[۱۰۶]۔

اس مضمون میں انھوں نے مسلمانوں کی بے بسی اور بے چارگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیسا نازک وقت اسلام پر آ گیا ہے علما اسلام عشرہ محرم کے روز پھانسیوں پر چڑھا دیے جاتے ہیں اور مسلمان منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ ابھی ابتدا ہے انجام دیکھیے کیا ہوتا ہے[۱۰۷]۔ راشد الخیری کا ایک اہم مضمون مسلمانوں کے دستر خوان پر ایک ناخوانده مہمان اسی رسالے میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ جہاں اپنے دستر خوان پر انواع اقسام کے کھانے چنتے ہیں وہاں طرابلس کی مظلوم بہنوں کے لیے اگر ایک نوالہ بھیج دیں گے تو ان فاقہ کش مسلمانوں کی اعانت ہو جائے گی۔ انھوں نے خاص کر ان اخبارات کے نام لیے ہیں جو اس حادثے کے حوالے سے مسلمانوں کی اعانت کے لیے اپیل کر رہے تھے۔ وکیل، وطن، زمیندار اس خدمت کو جس طرح نبھا رہے تھے اس سے راشد الخیری نے متاثر ہو کر کہا کہ اے مسلمانو! اپنے ہاتھ پر دل رکھ کر ان مظلوموں کی حالت پر غور کرو اور جہاں تک ان کی

مدد کر سکتے ہو مدد کرو[108]۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:

> کاظم آفندی کیا وہ مسلمان تمھاری ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں جو اپنے خون بہا کر طرابلس کی مسجدوں کو اس وقت بچا رہے ہیں تا کہ ان میں اللہ اکبر کے بدلے تثلیث کی آوازیں نہ گونجیں۔ کاظم آفندی! جب تمھارے دستر خوان پر انواع واقسام کے کھانوں چنے ہوئے ہوں۔۔۔ کیا ان بھائیوں کا اتنا حق بھی نہیں کہ روئے زمین کے مسلمان اپنے دستر خوان سے ایک ایک روٹی کی قیمت ان کو بھیج دیں[109]۔

راشد الخیری کا اس حوالے سے ایک افسانہ سیمونہ اگست ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا، جس میں انھوں نے جنگ طرابلس کو موضوع بنایا ہے۔ اس رسالے میں عالم اسلام کی مشہور شخصیات اور مقامات کی تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ سلطان عبدالحمید کی تصویر تو کئی رسالوں میں شائع ہوئیں مگر اس رسالے میں غرناطہ میں اہل کیسٹائل نے جب ظلم کرنے کے بعد مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا تھا تو اس منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قصر جامع العارف کی خوب صورت تصویر بھی اس رسالے میں موجود ہے[110]۔

سید شوکت دہلوی اس رسالے میں با قاعدہ لکھنے والوں میں شامل تھے ان کا ایک مضمون مصطفٰے کامل پاشا کی کتاب مسئلہ شرق سے ماخوذ ہے۔ اس میں بھی انھوں نے اس خاص حصے کا جائزہ پیش کیا ہے جس پر آل عثمان اور روس کے باہمی تنازعات موجود تھے[111]۔ تمدن میں ایک اہم مضمون قسطنطنیہ اور قصر یلدرم چھپا۔ اس میں قصر یلدرم کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے معلوماتی مضمون ہونے کی وجہ سے قاری کے لیے دل چسپی کا حامل ہے۔ اس میں قسطنطنیہ شہر کے حالات وواقعات اور آل عثمان کی ان کاوشوں کو پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اس شہر کے تعمیری مراحل کو طے کیا تھا[112]۔

حکیم شمس اللہ قادری کا ایک اور مضمون رود نیل بھی ایک معلوماتی مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس دریا کا منبع، معاون دریاؤں کے نام اور ان کی کیفیات، دریا کے شاخوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں[113]۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلمان مکے اور مدینہ کے بعد جس مسلم ریاست کا ذکر سب سے زیادہ کرتے ہیں وہ غرناطہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دور کے رسائل میں تو یہ موضوع کثرت سے موجود ہے۔ تمدن کیوں اس ذکر سے خالی ہوتا! حضرت ناشاد کا مضمون غرناطہ میں انھوں نے کہا ہے کہ ہر قوم کے عروج اور زوال کا ایک وقت مقرر ہے جس طرح یونان کا زوال ہوا، جس طرح رومانیا تباہ ہوا، اسی طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں پر زوال آیا[114]۔ اسی طرح مجیب احمد تمنائی نے غرناطہ میں موجود قصر

الحمرا کا جائزہ پیش کیا ہے[115]۔ تمدن کے بعد جس رسالے نے سنجیدگی کے ساتھ اتحاد اسلامی کو فروغ دیا وہ شیخ عبدالقادر کا مخزن ہے۔ جس نے نہ صرف غیر منقسم ہندوستان میں علمی و ادبی کاموں کے لیے فضا ہموار کی بلکہ اردوداں طبقے کو تحریکی مزاج سے روشناس کرایا[116]۔

اس رسالے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اردو کی علمی خدمت کی جائے اور سیاسی معاملات سے خود کو دور رکھا جائے، مگر ترکوں کے ساتھ جو تعلق مسلمانان ہند کو تھا، اس کی جھلک اس رسالے میں نظر آتی ہے۔ شیخ عبدالقادر بھی ترکی خلافت کے حامی تھے، اس لیے اس رسالے میں کئی اہم مضامین ترکوں اور عالمی سیاست کے حوالے سے شائع ہوئے ہیں۔ مرزا جلال الدین کا مضمون چند دن ترکوں میں، مخزن میں شائع ہوا۔ اسی نوع کے اور مضامین بھی مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مخزن کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ لہٰذا مرزا جلال الدین کے مضمون کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مدیر یہ چاہتے تھے کہ عالمی سطح پر ترکوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ درست نہیں ہے اور ہندوستانی مسلمان اپنے اس برادر ملک کے حالات و واقعات سے اچھی طرح واقفیت حاصل کریں۔ مرزا جلال الدین ترکوں کی معاشرت کے بارے میں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ترکوں کی معاشرت اگر چہ آج کل بہت کچھ یورپین طرز معاشرت سے مشابہ ہے مگر پھر بھی اوالذکر سے اس طرح علیحدہ ہے جس طرح جنس نوع اور اس کی وجہ سے وہ خوش اسلوب میلان ہے جو مشرقی تہذیب کے ملنے سے پیدا ہوا ہے ترکوں نے یورپین طرز معاشرت اختیار کرنے ساتھ اپنے قومی شعائر کی بہت سی عمدہ باتوں کو بھی قائم رکھا ہے[117]۔

مرزا جلال الدین رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر تھے۔ اس لیے انھیں قسطنطنیہ میں رہنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ انھوں نے ترکوں کی بدلتی ہوئی معاشرت کو قریب سے دیکھا تھا۔ ترکوں میں برپا ہونے والے درپے انقلاب نے انھیں کئی مختلف دھاروں میں بیک وقت بہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اردو کے اور دیگر رسائل کے شامل مضامین میں یہ مضمون اس لیے مختلف ہے کہ اس میں مصنف کا مشاہدہ عمیق نظر آتا ہے۔ وہ اس زمانے میں بذات خود قسطنطنیہ میں موجود تھے۔ مخزن کا یہ سلسلہ مضامین کئی شماروں پر مشتمل ہے۔

اقبال کی نظم بلاد اسلامیہ بھی مخزن میں پہلی بار شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر کا مضمون سلطان عبد الحمید کی معزولی اس رسالے کا مزاج اور اس کا ترکوں کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ان اسباب و حالات کا جائزہ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ترکی میں خلیفہ کے حوالے

سے ایک بغاوت کی صورت پیش آئی۔ ہندوستان میں خلیفہ کی معزولی کو علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ کئی ادبی رسائل میں اس کو سراہا گیا جب کہ بعض رسالوں میں مذمت بھی کی گئی۔ شیخ عبدالقادر کا کہنا تھا کہ:

> سلطان عبدالحمید نہایت زیرک اور دور اندیش ہے اس نے بغیر کشت وخون کے اپنی معزولی گوارا کر لی تاکہ ترک آپس میں متحارب نہ ہوں اور ترکی کی قوت مزید کمزور نہ ہو جائے۔ عبدالحمید نے ایسا کر کے یورپی قوتوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ یورپی اقوام یہ چاہتی تھیں کہ اس کے نتیجے میں موقعے پر خوں ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے ایک ایسا نقش قائم کیا ہے جو صفحۂ تاریخ پر تادیر قائم رہے گا[118]۔

اسی طرح جوان ترک پر شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے میں ایک تعارفی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے نوجوان ترکوں کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے جو خلیفہ کی معزولی کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ نوجوان ترکوں نے جس شوق تغیر کا مظاہرہ کیا اس نے ترکی کا نقشہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ وہ ترکی جو کبھی عالم اسلام کی سیادت کرتا تھا ان انقلابیوں کے ہاتھوں نے اپنی اصل قوت اسلام کھو کر سیکولر نظریات کو اپنا لیا۔ مگر اس زمانے میں نوجوان ترکوں کے اغراض و مقاصد کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔ اسی لیے مسلمان جو ہندوستان میں ترکوں کے ساتھ جذباتی لگاؤ رکھے تھے انھوں نے ان کے بارے میں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مگر ان کے بارے میں سب کو یہ علم ضرور تھا کہ ان انقلابیوں کی تربیت مغربی ممالک میں ہوئی ہے۔ شیخ عبدالقادر کہتے ہیں کہ:

> اس موقع پر یہ امر واقعہ کا بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آل عثمان کے قابل ترین افراد اس گروہ میں شامل ہیں۔ جس زمانے میں انھوں نے اس گروہ کی بنیاد ڈالی اس وقت وہ جوان ہوں گے لیکن اب وہ معمر ہیں سب کے سب یا تقریباً سب مغربی تعلیم پائے ہوئے ہیں جو انھوں نے فرانسیسی کے ذریعہ سے حاصل کی ہے[119]۔

عبدالقادر قسطنطنیہ بھی گئے اور انھوں نے وہاں کے حالات مخزن میں لکھنے کا آغاز بھی کیا۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ ''مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں آخر پوری ہوئی اب تین ہفتوں سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں نہ وہ ختم ہوتی ہیں، نہ میرا شوق''[120]۔

خالد خلیل کی کتاب *The Diary of a Turk* ہے جس کا ترجمہ محمد انشاء اللہ خان اور محمد حسن خان نے کیا ہے۔ محمد حسن خان نے اس کے دیباچے میں خالد خلیل کے خیالات پر سخت تنقید کی ہے اور ترجمے کے

دوران انھوں نے بعض مقامات پر تصرف بھی کیا ہے۔ مخزن میں اس پر مرزا محمد سعید نے گرفت کی ہے اور محمد حسن کے ترجمہ میں جہاں انھوں نے تصرف سے کام لیا اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مرزا محمد سعید لکھتے ہیں کہ

> ترکوں کی معاشرت کا دیباچہ اہمیت میں اصل کتاب سے گویا سبقت لے گیا ہے اس لیے ہمارے ریمارکس زیادہ تر اسی سے متعلق ہوں گے [۱۲۱]۔

مخزن میں خدایون مصر پر بھی شیخ عبدالقادر کا مضمون ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی حالت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں جب ان لوگوں کے عزم و استقلال کو دیکھتا ہوں تو مسلمانوں کی گم شدہ تاریخ کا سنہرا باب یاد آجاتا ہے مگر آج مسلمانوں کی روش کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اپنی اصلاح نہیں کی تو جو باقی نام ونشاں ہے وہ بھی مٹ جائے گا [۱۲۲]۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے مسلمانوں میں تحریک اتحاد اسلامی کی سرگرمی کو تیز کرنے میں کامیاب رہے۔ انھون نے جو دعوت دی وہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لیے تھی، کیوں کہ سیاسی شعور کے لحاظ سے مسلمان ہی سب سے زیادہ کمزور تھے [۱۲۳]۔

الہلال صرف ایک سیاسی ہفت روزہ ہی نہیں تھا۔ اس کے پیش نظر ایک سوچا سمجھا منصوبہ بھی تھا۔ راستے اور منزل کا تصور بالکل واضح تھا۔ تمام ہندستان میں الہلال پہلا اخبار تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو واضح طور پر سیاسی معاملات میں اتباع شریعت کی تلقین کی [۱۲۴]۔ سیاسی طور پر آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کو دین و مذہب کی تعلیمات کے مطابق بتایا۔ الہلال میں ادبی، علمی، سیاسی اور تاریخی مضامین شامل ہوتے تھے۔ سماجی اور تہذیبی مسائل پر بھی اظہار خیال ہوتا تھا۔ ان تمام تحریروں کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ مسلمان زوال کی وادیوں سے نکل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔

الہلال کے مقالہ نگار عالم عرب میں اور اسلامی دنیا کے بیش تر ممالک میں موجود تھے۔ اس رسالے نے اسلامی اخوت کو فروغ دینے کے لیے جاں فشانی کا مظاہرہ کیا۔ اس میں برید شرق کا ایک باب قائم تھا جو خاص کر ترکی کے حالات وواقعات اور وہاں پر ہونے والی سیاسی، سماجی تبدیلیوں کے ذکر سے مزین ہوتا تھا۔ عالم اسلام کے ساتھ ترکی کے کیا روابط تھے اسی باب میں اس کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا۔

۱۱ر مارچ ۱۹۱۴ء میں نامورانِ غزوہ بلقان کی یاد میں چند قطرات اشک مضمون میں اس جنگ میں شریک بہادروں کے حالات نہایت مختصراً درج کیے گئے ہیں۔ اس جنگ کے حوالے سے رسالہ لکھتا ہے کہ:

جنگ طرابلس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایسی حالت اور ایسے لوگوں کے ساتھ شروع ہوئی جو
باقاعدہ فوجوں اور منظم سامان جنگ سے بالکل محروم تھے اور معدودے چند ترکوں کے سوا کوئی
جماعت وہاں ایسی نہ تھی جس پر سلطنت کے عسکر و سپاہ ہونے کا اطلاق ہو سکے[۱۲۵]۔

رسالہ الہلال نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کو بارہا غزوہ لکھا ہے اور اس کے کہنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے اس کا کہنا تھا کہ ''جنگ طرابلس کے اس بیان کی صداقت کے لیے ایک بہترین مثال ہے۔ عرصے کے بعد یہ ایک ایسی جنگ ہوئی جس کی بے سروسامانیوں نے دولت عثمانیہ کو بالکل مجبور کر دیا کہ صدائے جہاد بلند کرے اور اندرون طرابلس کے عرب قبائل کو اپنی جاں فروشیوں کے اظہار کا موقع دے''[۱۲۶]۔

اصل میں الہلال کا موقف یہ تھا کہ اس جنگ کے نتیجے میں عالم اسلام میں جو اخوت پروان چڑھ رہی ہے اس سے مسلمانوں نے ایک نئی توانائی حاصل کی ہے اس کے خوابیدہ جوہر کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ واقعہ طرابلس کے اس موقف کو شاید رد کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جنگ کے نتیجے میں عالم اسلام کی بے کلی دیدنی تھی اور اس جنگ کے نتائج نے مسلمانوں کی وحدانی قوت کو جس طرح بڑھایا وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ الہلال کے تقریباً تمام شماروں میں شئون عثمانیہ کے عنوان سے ایک خصوصی باب قائم کیا گیا۔ جس میں سلطنت عثمانیہ اور دیگر اسلامی ممالک کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور جنگی حالات کے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ان خبروں اور دیگر معلومات نے مسلمانوں میں عالم اسلام کے حوالے سے ایک جوش کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس باب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانان ہند کے رہنما کرام اب کسی حال میں عثمانوی خلافت سے اپنے آپ کو جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

الہلال نے تو اپنے آپ کو اس پورے مسئلے میں اس قدر وقف کر دیا تھا کہ آٹھ روپیہ سالانہ چندے میں ساڑھے سات روپے مظلوم و ستم رسیدہ برادران ترکی کے فنڈ میں جمع کیے جاتے تھے اور آٹھ آنے الہلال کے اخراجات پر خرچ ہوتے تھے[۱۲۷]۔ شئون عثمانیہ کے ایک باب میں ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کا ایک خط بھی شائع ہوا جس میں اس نے برطانیہ کی دورخی پالیسی کا جائزہ لیا ہے اور سر اڈورڈ گرے (Sir Edward Grey) نے روس کے ساتھ جو خفیہ معاملات رکھے ہوئے تھے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

ادرنا کی حوالگی میں دولت علیہ اب تاخیر نہ کرے، ورنہ ممکن ہے کہ روس ایشیائی صوبوں کی طرف پیش
قدمی کر دے گا۔ اس وقت عثمانی رجال سیاست اڈورڈ گرے کی روشوں سے کماحقہ قلبی سیلان و

التفات سے ناواقف تھے کہ اس سے جتنی ترکوں کے ساتھ خیر اندیشی ہے اس سے کہیں زیادہ سیلانی اقوام کے ساتھ ہمدردی و طرف داری ظاہر ہوتی ہے اور یہ روس کے مصالح کا عین متقاضی ہے[۱۲۸]۔

الہلال کے مختلف شماروں میں افغانی، عبدہٗ اور رشید رضا کے بارے میں لکھا گیا اتنا کسی اور معاصر مسلمان عالم پر نہیں لکھا گیا۔ افغانی کی شخصیت کی وجہ سے آزاد، عبدہٗ اور رشید رضا بھی متاثر تھے۔ الہلال میں ان تینوں حضرات کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔ براہ راست برطانیہ کے خلاف اس اخبار نے کبھی نہیں لکھا، مگر ناموران طرابلس، کارزار طرابلس کے عنوانات سے جو کچھ لکھا جا رہا تھا، اس سے برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اور غیر ملکی طاقت سے آزادی حاصل کرنے کی تمنا بھی جاگ رہی تھی[۱۲۹]۔ اس رسالے میں ادبیات کا بھی ایک گوشہ موجود تھا جس میں باقاعدہ طور پر عالم اسلام میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اسی طرح ایک شمارے میں ترکی شاعری کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون موجودہ ترکی شاعری کا ایک نمونہ میں ضیاء الدین خسروزادہ کے کلام نغمہ فلك پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کا اجمالی جائزہ بھی اس مضمون میں شامل ہے۔ اس میں شاعر نے بلبل سے ہم کلام ہو کر ایک ایسی گفتگو کی ہے جو مادری محبت پر بحث کرتی ہے۔ ایک بلبل کے خیالات ماں کی محبت کے بارے میں کیا ہو سکتے ہیں شاعر نے اس نظم میں اسی خیال کو پیش کیا ہے[۱۳۰]۔ الہلال چوں کہ ایک ہفت روزہ مصور رسالہ تھا مگر اس نے اردو صحافت کی مختلف شاخوں میں اجتہادی فکر و نظر کی نئی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے اس کا ہر نمبر مختلف موضوعات کا حامل ہوتا تھا۔ اس میں مذہب، سیاست، ادبیات، علوم و فنون اور جہان اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔

انجمن حمایت اسلام نے جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کی، بعینہ اس نے ترکی کے مشکل وقت میں بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس انجمن نے ایک رسالہ انجمن حمایت اسلام بھی جاری کیا۔ اس رسالے کے سرورق پر ابوبکر عمر عثمان وحیدر۔۔۔چراغ مسجد و محراب و منبر کا سلوگن درج ہوتا تھا۔ یہ رسالہ مکمل طور پر عالم اسلام کی بے بسی اور ناتوانی پر نوحہ گر تھا۔ اس رسالے میں انجمن حمایت اسلام کی جلسوں کے روداد درج ہوتی تھیں جو ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں سے اس وقت کے تمام بڑے رہ نما نہ صرف خطاب کرتے تھے بلکہ اپنی نگارشات بھی عوام الناس کے سامنے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ۲۴ جنوری ۱۸۹۶ء کے اجلاس کی کارروائی میں منشی نثار علی صاحب

سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ریاست جموں وکشمیر نے ایک نظم اسرار التنزیل پڑھی جس میں مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا جو قرآن مجید کے بتدریج نازل ہونے کی نسبت پیش گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

باغ اسلام کی کچھ آج فضا اور ہی ہے
پہلے کچھ اور تھی ان کے ہوا اور ہی ہے[۱۳۱]

یہ نظم ترجیع بند شکل میں ہے اور اس نظم میں اسلام کی شان و شوکت کے علاوہ اس عہد میں اس کے دشمن کس طرح اس پر ضرب لگا رہے تھے ان کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی دین سے دوری، شریعت کے احکام سے نافرمانی اور قرآن سے لاتعلقی کا شکوہ بھی اس نظم میں موجود ہے[۱۳۲]۔ یہ نظم نہایت دل چسپ تھی۔ سامعین پر اس کے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی اجلاس میں منشی محمد امین خاں جو امین تخلص کیا کرتے تھے۔ مسدس کی شکل میں ایک نظم سنائی جس میں مسلمانوں کی زوال آمادہ صورت حال سے نکلنے کی تلقین کی گئی۔ اس نظم میں جہاں جدو جہد پر آمادہ کرنے کی تحریک ملتی ہے وہاں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ خود کو علم و ہنر سے آراستہ کریں۔

اٹھو پھر رنگ بدلا ہے زمانے نے ذرا دیکھو
گئی ظلمت جہاں سے اب اجالا ہو گیا دیکھو
ذرا اس سمت گوش دل کو تم اپنے لگا دیکھو
کہ آتی ہر طرف سے ہے یہی اب تو صدا دیکھو[۱۳۳]

پھر اس کے بعد شاعر مسلمانوں کو دوسری قوموں کی مثالیں دیتا ہے کہ ان قوموں نے محنت و مشقت سے سارے جہاں میں اپنا نام اور مقام بنالیا ہے۔ مسلمانوں محنت و مشقت تمھارا وصف تھا اور اسی سبق کو یاد دلانے کے لیے تمھیں غیروں کی مثال دی جارہی ہے یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ یہ رسالہ اور اس کی روداد یں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی کئی اعلیٰ مثالیں اس رسالے میں موجود ہیں اور اس کی تاریخ میں قومی بین الاقوامی سانحات پر کی گئی کاوشوں کا ایک مکمل ریکارڈ ہے جسے از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

حسرت موہانی کی اردو شاعری میں تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات کیے جا چکے ہیں۔ یہاں پر ان کے رسالے اردوئے معلی کے بارے میں اختصار سے ذکر مقصود ہے۔ اردوئے معلی پر بھی پان

اسلامزم کی تحریک کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔اردوئے معلی میں مسلمانان ہند کا پولی ٹیکل مستقبل جیسے مضمون میں آزادی کامل کا مطالبہ کرنا اور مسلمانوں کو اس بات پر اکسانا کہ مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کریں، ایک ایسی سوچ تھی جس نے مسلمانان ہند کو انگریز دشمنی پر اکسایا۔اس مضمون میں حسرت نے لکھا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے۔انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

> اس وقت ان دونوں قوموں کے باہمی تعلقات رشک و بے اعتباری کے مانند ہوں گے بلکہ حصول آزادی کی کشمکش ان کو خود بہ خود مراعات باہمی کی جانب مائل اور سلف گورنمنٹ کے قابل بنا دے گی[۱۳۴]۔

انگریز مخالف کردار ہونے کی وجہ سے اس رسالے کو بہت جلد حکومتی پابندی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔مگر اس نے اپنی روش ترک نہیں کی۔ جرأت اظہار کی اعلیٰ ترین مثال اس رسالے میں دیکھی جا سکتی ہے۔حسرت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کے آنے سے جتنے فوائد حاصل ہوئے ہیں سب اتفاقیہ ہیں۔تعلیم یا ریلوے کا جتنا نظام ہے سب انگریزوں نے اپنی ضرورتوں کے لیے بنایا تھا۔لہٰذا اس سے اگر یہاں کے عوام فائدہ اٹھا رہے ہیں تو یہ سب کچھ محض اتفاقی بنیادوں پر ہے۔انھوں نے اپنے اس مضمون میں بھائی نوروز جی کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> انگریزوں نے لوگوں کو ایک دوسرے کو لوٹنے سے اس لیے باز رکھا کہ وہ خود سب کچھ لوٹ لیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوستانیوں کے جان و مال کے لیے امن پیدا کر دیا[۱۳۵]۔

مارچ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے مصر کے رہ نما مصطفٰے کامل پر اپنے رسالے کا خصوصی نمبر شائع کیا۔اس میں انھوں نے خود ایک مضمون مصطفٰے کامل پاشا لکھا، جس میں انھوں نے اس کی موت کو ایک ایسا پہاڑ قرار دیا ہے جو اچانک ٹوٹ پڑا ہے جس کے بار گراں کا اندازہ بیان کی قوت سے باہر ہے[۱۳۶]۔اس رسالے نے اردو ادب کے سرمائے کو کافی تقویت بخشی اور کئی پرانے شاعروں کے تذکروں کی دوبارہ اشاعت نے اور نئی چیزوں کو شائع کرنے سے زبان و بیان کے نئے سانچے تشکیل پائے۔

اس رسالے میں کئی ایسی ادبی چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں جو راست پان اسلامزم سے متاثر تھیں۔ یلدرم کا ایک چھوٹا سا مضمون میرے دوستانِ والے جنوری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا جو انھوں نے بغداد میں لکھا تھا۔اس میں انھوں نے رومانوی انداز میں مسلمانوں کو ایک بار پھر سرداران قوم دیکھنے کی تمنا کی ہے۔وہ

کہتے ہیں کہ:

> میں سردار قوم ہونا چاہتا ہوں، گھر گھر میں میرا نام عزت سے لیا جائے، مجھ سے قوم کی امیدیں وابستہ ہوں، میں قوم کو شاہراہ ترقی پر لے جاؤں۔ ان کے حقوق کی حفاظت میں رات دن کوشاں رہوں اسی دھن میں راتوں کو نہ سوؤں، دنوں کو مصروف رہوں [۱۳۷]۔

انھوں نے اس تحریر کے ذریعے مسلمانوں میں دوبارہ جوش عمل کو پیدا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ: ''ہاں مری تلوار کی جھنکار سے زمانہ گونج اٹھا میرے نام کے آتے ہی شہروں کا زہرہ پانی ہو جائے، مری جہاں گیرانہ سطوت کی مدح میں، نئے فردوسی اور ہومر پیدا ہوں میں اور موت ہم مشرب رفیق ہوں میں جبار ہوں اور جباروں کو ستانے والا تاریخ میں میرا نام خون اور شعلے سے لکھا جائے۔ میں نبرد آزما بننا چاہتا ہوں'' [۱۳۸]۔ اردوئے معلی میں صرف مقامی مضمون نگاروں کے مضامین ہی شائع نہیں ہوتے تھے بلکہ عالم اسلام کے اہم رسالوں اور مقامی رسالوں کے اہم مضامین کا ترجمہ بھی شائع ہوتا تھا۔ مصطفٰے کامل پاشا کے اخبار اللوا سے ایک مضمون مئی ۱۹۰۷ء میں ترجمہ کیا گیا جو قومی شاعری کے بارے میں تھا۔ اسی طرح فروری ۱۹۰۸ء کو مصریوں کا قومی گیت عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اخبار بندے ماترم سے ایک مضمون مسئلہ مصر اور برٹش کا نشسنس کا ترجمہ بھی اردوئے معلی اپریل ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا جس میں اخبار لکھتا ہے کہ:

> ہمارے نزدیک اگر صاف طور پر کہہ دیا جائے کہ اہل مصر کی آرزوؤں کا خون مخالفین مصر کے فوائد کی خاطر روا رکھا جاتا ہے تو یہ ایک بات قرین قیاس بھی ہوتی لیکن یہ ظاہر کرنا کہ اس فعل سے باشندگان مصر کی بہبود مدنظر ہے درحقیقت اول درجے کا فریب ہے [۱۳۹]۔

اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردوئے معلی پر پان اسلامزم کے جذبات محدود نوعیت کے تھے جب کہ قومیت کا اثر اس رسالے میں زیادہ مستحکم اور شعوری تھا۔ کیوں کہ اس رسالے کے مندرجہ جات کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں قومیت کو پروان چڑھانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ حسرت کی یہ خواہش بھی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کسی نہ کسی طرح صلح ہو جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آئی گی ان دو قومیں کے مابین اختلافات کم ہو جاتے جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا، کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں آزادی کی وجہ سے مفادات کی ایک ایسی جنگ چھڑی جس کے نتائج پاکستان کی تحریک کو تشکیل دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی

۱- سروری، تحسین، جون جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۰
۲- صابری، امداد، مولانا، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۵
۳- ایضاً، ص ۱۰۹
۴- خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، ۱۹۶۴ء، ص ۵۴
۵- ایضاً، ص ۴۸
۶- قیصر الاخبار ہند، الہ آباد، ۱۸ نومبر ۱۸۷۷ء، ص ۵۶
۷- خورشید، ص ۵۷
۸- ایضاً
۹- صابری، امداد، مولانا، ۱۹۶۳ء، ص ۵۱، ۵۲
۱۰- ایضاً، ص ۶۲
۱۱- ایضاً
۱۲- مسعود، طاہر، ڈاکٹر، ص ۹۳۱
۱۳- ہاشمی، طارق محمود، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۰
۱۴- صابری، ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۲
۱۵- خان، شاہد، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۹۷۲
۱۶- مسعود، ص ۶۴۴
۱۷- صابری، ۱۹۶۳ء، ص ۶۵۸
۱۸- ایضاً، ص ۶۲۰
۱۹- مسعود، ص ۷۱۹
۲۰- ایضاً
۲۱- ایضاً، ص ۷۲۳
۲۲- صابری، ۱۹۶۳ء، ص ۳۸۹
۲۳- ایضاً
۲۴- الپنچ، ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء، ص ۱۰
۲۵- ______، ۱۱ جنوری ۱۹۰۶ء، ص ۵
۲۶- ______، ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء، ص ۲

۲۷- مسعود، ص ۹۸۰
۲۸- ایضاً، ص ۹۸۲
۲۹- صابری، ۱۹۶۳ء، ص ۵۰۶
۳۰- حجازی، مسکین علی، ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۸
۳۱- ایضاً
۳۲- ایضاً، ص ۱۳۷
۳۳- ایضاً
۳۴- مسعود، ص ۲۹۸
۳۵- پیسہ اخبار، لاہور، یکم مئی ۱۸۹۷ء، ص ۶۹۸، ۶۹۹
۳۶- خورشید، ص ۶۳
۳۷- مسعود، ص ۱۴۷
۳۸- ایضاً، ص ۱۶۷
۳۹- ایضاً
۴۰- زمیندار، یکم مئی ۱۹۱۱ء، ص ۹۳
۴۱- حجازی، مسکین علی، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۵۴۸
۴۲- مسعود، ص ۵۲۷
۴۳- طوق آر، خلیل، ڈاکٹر، ۲۰۱۱ء، ص ۴۵
۴۴- ایضاً، ص ۴۸
۴۵- ایضاً، ص ۵۲
۴۶- جہان اسلام شمارہ نمبر ۴، مشمولہ: 'جہان اسلام ترکی کا ایک اردو اخبار'، مرتبہ: ڈاکٹر خلیل طوق آر، ۲۰۱۱ء، اردو اکیڈمی پاکستان، ص ۱۱۰
۴۷- حسن، دسمبر ۱۸۸۸ء، شمارہ نمبر ۵ حیدر آباد دکن، ص ۵
۴۸- حسین، محمد اصغر، مولوی، اکتوبر ۱۸۸۹ء، ص ۴۸
۴۹- ایضاً، ص ۴۹
۵۰- ایضاً
۵۱- جنگ، عماد نواز، نواب، اکتوبر ۱۸۸۹ء، ص ۴۸
۵۲- حسین، محمد اصغر، مولوی، مارچ ۱۸۹۰ء، ص ۳۷
۵۳- حقی بے، ابراہیم، اپریل ۱۸۹۲ء، ص ۳۳
۵۴- خان، حامد علی، مولوی، مارچ ۱۸۹۰ء، ص ۲۲

۵۵- خان، سراج الدین احمد، جولائی ۱۸۹۰ء، ص ۱
۵۶- مسٹر ڈی کولٹ، فروری ۱۸۸۹ء، ص ۲۰
۵۷- نامعلوم، اپریل ۱۸۸۹ء، ص ۷۳
۵۸- عبدالحق، مولوی، س ن، ص ۵
۵۹- ایضاً، ص ۶
۶۰- عبدالحق، مولوی، مئی ۱۹۱۵ء، ص ۴۶
۶۱- رسالہ دلگداز، جنوری ۱۸۸۸ء، ماہ نامہ، شمارہ ۱، لکھنو، ص ۳
۶۲- صابری، ۱۹۶۸ء، ص ۵۱
۶۳- شرر، عبدالحلیم، مولوی، اپریل ۱۸۸۸ء، ص ۴۹؛ 'دارالخلافت بغداد' کا بقیہ حصہ اگست ۱۸۸۸ء دلگداز نمبر ۸ میں چھپا-
۶۴- ______ اپریل ۱۸۹۱ء، ص ۱۰
۶۵- ______، مارچ ۱۸۹۸ء، ص ۱
۶۶- ______، اپریل ۱۸۹۷ء، ص ۱۵
۶۷- ایضاً، ص ۱۶
۶۸- ______، جولائی ۱۹۱۱ء، ص ۷
۶۹- ایضاً، ص ۱۳
۷۰- ______، جولائی ۱۹۱۱ء، ص ۲۳
۷۱- ایضاً، ص ۲۴
۷۲- ______، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۲۲
۷۳- ______، اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۲۰
۷۴- ______، اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۷۷
۷۵- ______، جولائی ۱۹۱۴ء، ص ۱۶۴
۷۶- ______، مارچ ۱۹۲۰ء، ص ۳۹-۴۰
۷۷- جوہر، نر بھے رام، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۵۰
۷۸- ایضاً، ص ۵۱
۷۹- خان، مہدی حسن، ۱۹۶۸ء، ص ۵۲
۸۰- پانی پتی، وحیدالدین سلیم، جولائی ۱۸۹۸ء، ص ۴
۸۱- ایضاً
۸۲- پانی پتی، اسماعیل، مولوی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۶

۸۳- رسالہ، ماہ نامہ معارف، اگست ۱۸۹۸ء، جلد اشمارہ نمبر۲، علی گڑھ، ص ۹۳
۸۴- ایضاً، ص ۹۲
۸۵- محمد مرتضیٰ، مولوی، فروری ۱۸۹۹ء، ص ۲۴۳
۸۶- سالم، رشید احمد، نومبر ۱۹۰۱ء، ص ۳۳۵
۸۷- عبد العلی خان، مولانا، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۲۳
۸۸- ایضاً، ص ۱۲۷
۸۹- خانم، مخفی، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۰۰
۹۰- رسالہ، ماہ نامہ، معارف، اکتوبر ۱۹۰۰ء، شمارہ نمبر۴ جلد ۳، علی گڑھ، ص ۲۵
۹۱- ذکاء اللہ، مولوی، جنوری ۱۹۱۰ء، ص ۱۱
۹۲- احمد، فخر الدین، جولائی ۱۹۰۹ء، ص [illegible]
۹۳- حسین، ابرار، مئی ۱۹۱۱ء، ص ۴۰
۹۴- علی، معشوق، مولوی، اکتوبر ۱۹۱۱ء، ص ۹۱
۹۵- ______، فروری ۱۹۱۳ء، ص ۹۳
۹۶- علوی، ظفر الملک، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۸۴
۹۷- ______، مئی ۱۹۱۳ء، ص ۵۲
۹۸- علی، منظور، مئی ۱۹۱۳ء، ص ۵۲
۹۹- شاکر، محمد، مولوی، نومبر ۱۹۱۲ء، ص ۴۹
۱۰۰- ثاقب، مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۱۱
۱۰۱- خان، ظفر علی، اپریل ۱۹۰۸ء، ص، ج
۱۰۲- ایضاً
۱۰۳- قادری، حکیم شمس اللہ، ستمبر ۱۹۱۱ء، ص ۱۴
۱۰۴- شوکت دہلوی، سید، نومبر ۱۹۱۱ء، ص ۵۴
۱۰۵- ایضاً
۱۰۶- راشد الخیری، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۶۸
۱۰۷- ایضاً، ص ۱۰۹
۱۰۸- ایضاً
۱۰۹- ______، فروری ۱۹۱۲ء، ص ۷۲
۱۱۰- تمدن، ستمبر ۱۹۱۲ء، جلد ۳ نمبر ۵، دہلی، ص ۴۰
۱۱۱- شوکت دہلوی، سید، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۳۳

۱۱۲- نامعلوم،فروری۱۹۱۴ء،ص۲۰

۱۱۳- قادری، حکیم شمس اللہ، مئی۱۹۱۴ء،ص۳۱

۱۱۴- ناشاد، حضرت، جولائی۱۹۱۴ء،ص۳۰

۱۱۵- تمنائی، مجیب احمد، نومبر۱۹۱۴ء،ص۳۸

۱۱۶- ندیم، امتیاز، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء،ص۲۳

۱۱۷- جلال الدین، مرزا، جون۱۹۰۵ء،ص۱۹

۱۱۸- عبدالقادر، شیخ، اپریل۱۹۰۹ء،ص۳

۱۱۹- ______، جون۱۹۰۹ء،ص۲

۱۲۰- ______، اکتوبر۱۹۰۶ء،ص۱

۱۲۱- سعید، مرزا محمد، اکتوبر۱۹۰۶ء،ص۱۳

۱۲۲- عبدالقادر، شیخ، اکتوبر۱۹۰۹ء،ص۶

۱۲۳- ملیح آبادی، احمد سعید، ۱۹۸۸ء،ص۳۷۱

۱۲۴- انجم، خلیق، ۱۹۸۸ء،ص۱۲۱

۱۲۵- الہلال، ۱۱مارچ۱۹۱۴ء،ص۱۹۴

۱۲۶- ایضاً،ص۱۹۷

۱۲۷- صابری، مولانا امداد، اگست۱۹۸۶ء،ص۶۴

۱۲۸- بلنٹ، ولفرڈ اسکاؤن، ۲۲اکتوبر۱۹۱۳ء،ص۱۳

۱۲۹- انجم،ص۱۲۸

۱۳۰- 'الہلال'، جون۱۹۲۷ء،ص۶

۱۳۱- نثار علی، منشی، فروری، مارچ، اپریل، ۱۸۹۶ء، مشمولہ: رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور،ص۲۰

۱۳۲- انجمن حمایت اسلام لاہور، فروری، مارچ، اپریل، ۱۸۹۶ء،ص۲۸

۱۳۳- حسرت، فضل الحسن، مولانا، ۱۹۹۹ء، انتخاب اردوئے معلی،ص۹۹

۱۳۴- ایضاً

۱۳۵- حسرت، فضل الحسن، مولانا، ۱۹۹۹ء، اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں،ص۱۲۴

۱۳۶- حسرت، فضل الحسن، مولانا، ۱۹۹۹ء، مرحوم مصطفے کامل پاشا،ص۱۲۵

۱۳۷- یلدرم، سجاد حیدر، ۱۹۹۹ء،ص۱۵۸

۱۳۸- ایضاً

۱۳۹- انتخاب اردوئے معلی، ۱۹۹۹ء،ص۱۶۶

ماحصل

اخوت اسلامی کا تصور اسلامی دنیا میں کوئی نیا رجحان نہ تھا۔اسی کی تجدید نے انیسویں صدی کے آخر میں تحریک اتحاد اسلامی کی شکل اختیار کی، جسے یورپ میں عالم گیر اسلامیت یا پان اسلامزم کا نام دیا گیا تھا۔اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یورپی قوتوں کی معاندانہ کوششوں کو جوترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے خلاف جاری تھے اسے ایک سیاسی حکمت عملی کے تحت روکا جائے۔یہ سیاسی حکمت عملی یا تحریک ناکامی سے دوچار ہوئی مگر اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی زندگی پر ہمہ گیر رہے۔اس مقالے میں سب سے پہلے انہی اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے کہ کس طرح اس تحریک نے مسلمانوں کی ملی زندگی کو غلامی کے دور میں ایک ایسی شعوری جہت فراہم کی جس کے نتائج بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس طور رونما ہوئے جس سے عالم اسلام میں آزادی کی تحریکوں کو فعال بنانے میں بنیادی اہمیت حاصل ہوئی۔

یہ تحریک جمال الدین افغانی کی شخصیت کی وجہ سے پوری دنیا میں اپنے اثرات مرتب کرنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہے۔افغانی نے پہلی بار مسلمانوں کی ملی زندگی میں جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔انھوں نے اسلام کے مسلمہ اصولوں سے انحراف تو نہیں کیا' مگر مغرب اور اسلام کے مابین دوری کو ختم کرنے کے لیے دانش وروں کے ایسے طبقے کو پیدا کیا جس کے اثرات عالم اسلام میں آج بھی موجود ہیں۔انھو ں نے جدید سائنسی علوم کی تطبیق کی اور مسلمانوں کو اس کے حصول کے لیے آمادہ بھی کیا۔اس مقالے میں افغانی کی سیاسی، علمی اور ادبی جدو جہد کا مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے نظریات نے کس طرح ہندوستانی مسلمانوں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ان پہلوؤں کا احاطہ اس مقالے کے اہم حاصلات میں سے ہے۔

افغانی یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان سیاسی طور پر خود کو طاقت ور بنائیں۔اس لیے انھوں نے اسلامی دنیا میں بادشاہت اور اس کے اصولوں پر سخت تنقید کی اور جمہوری یا دستوری طریقوں کو ان اہداف کے حصول میں موزوں قرار دیا۔اسی نظریے کی بنا پر راقم نے افغانی اور سلطان عبدالحمید کے نظریہ بین الاسلامیت کی فکری جہت کا مطالعہ کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں اصحاب نظری اور فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا تھے۔سلطان عبدالحمید کا مقصد صرف اپنے اقتدار کی بقا تھا جب کہ افغانی مسلمانوں کی ایک ایسی وسیع جماعت ترتیب دینا چاہتے تھے جس میں دنیا بھر کے مسلمان جغرافیائی شناختوں میں فرق کے باوجود اشتراک عمل میں ایک جیسے ہوں۔

افغانی کی شخصیت اپنے اثرات کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی موثر کیوں نہ ہو ان کے کاموں کا جب بھی مجموعی جائزہ لیا جاتا ہے تو کئی سوالات کے جوابات ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ان پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ان کا تعلق فری مشنری تحریک سے وابستہ لوگوں سے تھا۔ اس میں کتنی صداقت ہے اس کا بھی جائزہ اس مقالے میں لینے کی کوشش کی گئی ہے اور افغانی کے اہم ترین دوست ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے ان کی مدد سے عالم اسلام میں کیا کردار ادا کیا اس کا بھی جائزہ اس مقالے میں موجود ہے جس سے ہم افغانی کی خفیہ سرگرمیوں کا درست طور پر تجزیہ کر سکتے ہیں۔

اس مقالے میں افغانی اور ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کے روابط ہندوستان میں کس حیثیت کے حامل تھے۔ اس پہلو پر اردو رسالوں میں اختصار سے گنتی کے مضامین نکلے ہیں۔ ان دو اہم شخصیات کے روابط کو عالم اسلام میں سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے کیا اہمیت حاصل تھی اور کس طرح اس اشتراک کے باعث مسلمانوں میں نظری طور پر مغربی قومیت کے تصورات کو پروان چڑھایا گیا۔ پہلی بار اس مقالے میں اسے پیش کیا گیا ہے۔

افغانی نے ہندوستانی علما، سیاست دان اور دانش وروں پر کس طرح اثرات مرتب کیے اس کا بھی ایک اجمال پیش کیا گیا ہے۔ اہم امر یہ ہے کہ روایتی اور غیر روایتی علما و دانش وروں نے ان کی فکر سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کی سیاسی جدوجہد کے مطابق ہندوستانی سیاست کے رخ کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

سید احمد خان، افغانی کی شخصیت سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس اختلاف کی نوعیت کیا تھی، اور ان مشاہیر میں کس کی کاوشیں نتائج کے اعتبار سے زیادہ کامیاب رہیں۔ اس کا بھی جائزہ معاصر شہادتوں کی موجودگی میں لیا گیا ہے۔ سید احمد خان کے رفقا پر افغانی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شبلی، حالی نے تو ان کے نظریے کی تائید میں اپنی خدمات جزوی طور پر پیش کیں۔ یہ اکابرین عالم اسلام کے زوال پر افسردہ تھے اور ان کی شاعری اور تحریروں سے اس زوال کی صورت حال پر ان کی بے چینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سید احمد خان کے اہم رفقا میں کچھ شخصیات کی جانب سے اس تحریک کے بارے میں سرد مہری کا رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ شخصیات مسلمانوں میں اخوت کو تو اہم قرار دیتی تھیں لیکن تحریک اتحاد اسلامی کے سیاسی کردار کے بارے میں سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ان میں محسن الملک اور مولوی ذکاء اللہ کے نام شامل ہیں۔

اس تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے علمی و ادبی مراکز پر خاطر خواہ اثرات مرتب کیے تھے۔ علی گڑھ تحریک، دیوبند اور ندوہ نے مسلمانوں کے فکری انحطاط پر جولائحہ عمل ترتیب دیا اس میں اس تحریک کے نظریے کا عمل دخل بھی موجود ہے۔ مسلمانوں میں باہمی اخوت کو پروان چڑھانے کے لیے ان اداروں کے علمی اور عملی کاموں کو اس تحریک کے حوالے سے مبسوط مطالعے کی ضرورت تھی اس لیے اس مقالے میں اس کا جائزہ پیش

کیا گیا ہے،اوران اداروں کے ملی وقومی اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اس مقالے کے حاصلات میں ہے۔

اگر انیسویں صدی کو اردو ادب میں انقلاب کی صدی کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔اس عہد نے ادب کے مروجہ تصورات کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔تخیل کی دنیا سے نکل کر ادب نے عوامی مسائل اور ان کے حل کو موضوع بنایا تھا۔حقیقت پسندی کا رجحان ادب کا جز و قرار پایا۔حقیقت پسندی جیسے دیگر ادبی تصورات اردوادب نے دنیا بھر میں برپا تحریکوں سے حاصل کیے تھے۔

لہذا تحریک اتحاد اسلامی نے بھی اردوادب کو خاصا متاثر کیا۔انیسویں صدی میں اردو کی اہم اصناف پر اس کے گہرے اثرات ہیں۔داستان، ناول،افسانہ اور ڈراما جیسی اہم اصناف ادب پر اس تحریک کے اثرات کے بعد اردو کے نمائندہ ادیبوں میں نیم رومانوی تخیل پروان چڑھا۔جس نے اردو کے ادیبوں میں تاریخی واقعات وشخصیات کو موضوع بنانے پر اکسایا جس نے جدوجہد آزادی کی کوششوں کو مہمیز دی جائے۔اس مقالے کے اہم حاصلات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اردوادب کی نمائندہ اصناف میں اہم لکھنے والوں نے اس تحریک سے متاثر ہو کر جو تخلیقات پیش کی ہیں اس کا ایک مبسوط مطالعہ پہلی بار اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔کئی ایسی تحریریں بھی اس سلسلے میں اس مقالے میں نظر آئیں گی جو ہماری ادبی تاریخ میں گم ہوگئیں تھیں اس لحاظ سے اس مقالے کا یہ باب دریافت پر مبنی ہے۔

اردو ڈرامے اور افسانے میں موجود اتحاد اسلامی کے رجحان کو پہلی بار اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو کے اہم ڈرامانویسوں پر اس تحریک نے جو اثرات مرتب کیے اس سے اردو کی اس اہم صنف پر نیم تاریخی رومانویت کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔اس رجحان نے ڈراما نگاری کو دیو مالائی تصورات سے نکال کر اس کا رخ عالمی سیاسی حالات کی جانب موڑ دیا۔اس مقالے کا ایک حاصل یہ بھی ہے کہ اردو کے سفرناموں میں عالم اسلام کے وہ سیاسی حالات جو بالخصوص مصر،حجاز اور ترکی میں رونما ہوئے ان حالات کو بھی اس مقالے میں ہدف تحقیق بنایا گیا ہے۔ان سفرناموں میں اس تحریک کے اثرات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ان میں کچھ سفرنامے اس دور کی اہم تاریخی اور تہذیبی معلومات کے حامل ہیں۔ان میں خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ اس لیے منفرد ہے کہ اس کی زبان وبیان کی خوبیوں کی حامل ہے۔

اردو شاعری میں بھی اس انقلاب کو خصوصیت سے موضوع بنایا جا چکا تھا۔اس کے باوجود ہندوستانی مسلمان جن سیاسی اور سماجی حالات سے دوچار رہے اور ان کے ادب پر اس تحریک نے جس انداز سے اپنے اثرات مرتب کیے، ان میں وطنیت کا تصور، سیاسی محکومی کا شدید احساس اور اتحاد بین المسلمین کا جذبہ پروان چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ملکی زندگی کے یہ چند خدوخال بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں ہنگامی صورت اختیار

کر لیتے ہیں۔اس دور میں ہر شخص زندگی کے مسائل ومصائب کا قدرے سرگرمی سے مقابلہ کر رہا تھا اور اپنی ذات کا عرفان اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ کسی فرضی معشوق کے آستانے پر مسلسل ناصیہ فرسائی ممکن نہ رہی تھی۔وطن کی سر بلندی، قوم کی اصلاح، ملت کی تعمیر، مشاہیر اور اکابر کی تعریف، سیاسی مسائل کا ذکر، مناظر قدرت کو بیان کر کے شعرا ادبی عظمت محسوس کرنے لگے تھے۔یعنی اس دور میں غزل گوئی کے قدیم رجحانات پر زوال آ گیا تھا۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی تعمیری چیزیں اردو ادب کا حصہ بن گئی اور نظم نگاری کے ایسے سانچے تشکیل پائے جس نے زندگی کے ہر دائرے کو اپنا موضوع بنایا۔لہٰذا اس مقالے میں نمائندہ شاعروں کے یہاں اتحاد بین المسلمین کے تصورات کو نہ صرف تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے بلکہ یہ امر بھی اہم ہے کہ گم نام شاعروں کے یہاں بھی یہ تصور جذباتی طور پر موجود تھا۔اردو ادب کی اہم اصناف کے علاوہ اردو صحافت پر بھی اس تحریک نے خاطر خواہ اثرات مرتب کیے تھے۔ہندوستانی صحافت نے مسلمانوں کی ملی زندگی میں جن خیالات کو پروان چڑھایا تھا اس میں اس تحریک کا پرچار بھی شامل تھا۔اردو صحافت کے اس پہلو کو نظر انداز کرنے سے ہندوستانی مسلمانوں کی اس تحریک سے وابستگی کا درست اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

اس تحریک نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک ہلچل برپا کر دی تھی اور اس نے کئی تحریکوں کو پروان چڑھایا۔ان میں انجمن خدام کعبہ، ریشمی رومال کی تحریک، تحریک خلافت ایسی تحریکیں ہیں جنھوں نے سامراج کی قوت کو کم کر دیا تھا چوں کہ ان تحریکوں کا مطالعہ کئی جہتوں کو مدنظر رکھ کر کیا جا چکا ہے اس لیے اس مقالے میں ان تحریکوں کے بنیادی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے تا کہ مسلمانوں کی ملی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو مربوط انداز میں پیش کیا جا سکے۔

افغانی کی شخصیت کے اثرات نے ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کو عالمی سطح پر روشناس کرایا۔ہندوستانی دانش ور خواہ کتنا ہی اس تحریک سے اختلاف کریں مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی حیثیت کو منوایا بلکہ کئی مسائل ایسے بھی تھے جن کی بازگشت عالم اسلام میں اس تحریک کی رہین منت ہے۔جس کے بعد دنیا نے ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کو عالمی سطح پر تسلیم بھی کیا۔

ترکی خلافت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بظاہر یہ تحریک بے جان ہو گئی تھی لیکن اس کے اثرات آج بھی عالمی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔اسلامی ممالک آپس میں ارتباط اور اتحاد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ان کی یہ کوشش بھی ہے کہ اپنی اپنی حدود میں رہ کر ملت کے تصور کو زندہ کیا جائے۔اس سلسلے میں اسلامی ممالک میں موجود اسلامی تحریکیں خصوصی کردار ادا کر رہی ہیں۔

فہرست اسناد محولہ

ابن الحاج،محمد رفیع،۱۳۳۵ھ،دارالعلوم دیو بند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ،دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی

ابوسلمان،شاہ جہاں پوری،دسمبر۱۹۱۸ء،دارالعلوم دیوبند یاد گار عظمت اسلاف،مشمولہ:ماہ نامہ'الحق'،اکوڑہ خٹک،پاکستان

_____،۱۹۸۳ء،مولانا محمد علی اور ان کی صحافت،ادارہ تصنیف وتحقیق وپاکستان

_____،۱۹۸۸ء،شیخ الہند ایک سیاسی مطالعہ،مجلس یادگار شیخ الاسلام،پاکستان

_____،۱۹۹۴ء،شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی،مجلس یادگار شیخ الاسلام،پاکستان

_____،۱۹۹۴ء،کلیات شیخ الہند،مجلس یادگار شیخ الاسلام،کراچی

_____،دسمبر۲۰۰۴ء،مفتی کفایت اللہ دہلوی،جمعیۃ پبلی شرز،کراچی

_____،۲۰۰۹ء،بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں،قندیل،لاہور

احسان الحق،مرزا،قطعات رباعیات،حصہ دوم،بزم اکبر،کراچی

احمد،عزیز،جون۲۰۰۵ء،بر صغیر میں اسلامی کلچر،مترجم:جمیل جالبی،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور

_____،جون۱۹۹۷ء بر صغیر میں اسلامی جدیدیت،مترجم:جمیل جالبی،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور

احمد حسین،الہ آبادی،،۱۸۹۸ء،صلاح الدین،مطبع قیصر ہند،نعل بندٹولہ،الہ آباد

احمد،فخر الدین،جولائی۱۹۰۹ء،فاطمہ علیہ خانم،مشمولہ:'الناظر'،ماہ نامہ،شمارہ نمبر۱،لکھنؤ

احمد،اعجاز،جولائی،دسمبر۱۹۹۹ء،آزاد کا طریق زیست منتخب اور متروک راہیں،مشمولہ:ششماہی،'جامعہ'،خصوصی اشاعت(ابوالکلام آزادنمبر)،جلد نمبر۹۶ شمارہ نمبر۷۔۱۲،دہلی،ص۱۰۴

احمد،رشید،اگست۱۹۷۷ء،پان اسلامزم اور پاکستان،جمال الدین افغانی اور عرب رہنما،ترجمہ:احمد بشیر،مشمولہ:'فکرونظر'،اسلام آباد

احمد،شفیق،ڈاکٹر،۱۹۸۸ء،اقبال اور ترکی،ضیائے ادب،لاہور

احمد،مرتضی،۱۹۲۶ء،تاریخ اقوام عالم،جلد۲،مجلس ترقی ادب،لاہور

احمد منگلوری،سید طفیل،دسمبر۱۹۴۵ء،مسلمانوں کا روشن مستقبل،حماد الکتبی۔شیش محل روڈ،لاہور

احمد،نذیر،ڈپٹی،۱۹۱۸ء،انڈین نیشنل کانگریس،لکچر نمبر۱،۱۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء،ٹاؤن ہال دہلی،لکچروں کا مجموعہ،جلداول،مفید عام پریس،آگرہ

_____،۱۹۱۸ء،مجموعہ نظم بے نظیر،مرتبہ:مولوی بشیرالدین احمد،مفید عام پریس آگرہ

ارشد،آغا غلام حسین،فروری۱۹۱۲ء،تازہ ستم،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی

_____،اپریل۱۹۱۲ء،نالہ جگر سوز،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی

_____،جون۱۹۱۲ء،ہاتف کی صدا،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی

______، جولائی ۱۹۱۲ء، مکالمہ رند و شیخ، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، دہلی
______، اگست ۱۹۱۲ء، اسلام، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، دہلی
______، اکتوبر ۱۹۱۲ء، ساقی نامہ، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، دہلی
اسٹاڈرڈ، لوتھارپ، پروفیسر، (Prof.Lothrop Stoddard)، س ن، *The New World of Islam*، ترجمہ: مولوی عبدالقیوم، 'مسلمانوں کا دور جدید اور ہندوستان کا مستقبل'، شیخ عبدالرحمٰن وحبیب الرحمٰن تاجران امرتسر
اسماعیل میرٹھی، ۱۹۳۹ء، حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی، مکتبہ اسلامیہ دہلی
اسماعیل، پانی پتی، مولانا، ۱۹۶۰ء، مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی، مشمولہ: سہ ماہی 'صحیفہ'، چودھواں شمارہ، لاہور
______، اکتوبر ۱۹۶۲ء، مقالات سر سید، مجلس ترقی ادب، لاہور
______، دسمبر ۱۹۶۳ء، مقالات سر سید، حصہ سیزدہم، مجلس ترقی ادب، لاہور
اشرف بہاری، سید سلیمان، مولانا، س ن، البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ
اشرف، آغا محمد، نومبر ۱۹۵۹ء، انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت، ہمدرد اکیڈمی
اشرف، محمد، ڈاکٹر، ۱۹۵۳ء، علی گڑھ کی سیاسی زندگی، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین' علی گڑھ نمبر، شمارہ خصوصی، علی گڑھ، انڈیا
افغانی، جمال الدین، اپریل ۱۹۳۲ء، مقالات سید جمال الدین افغانی، مترجم و مؤلف: مولانا عبدالرحیم، دفتر روزنامہ پشاور، ص ۲۸، ۲۹
اقبال، علامہ، جون، جولائی ۱۹۵۲ء، بہ حوالہ، رضا علی وحشت، مشمولہ: 'مشرب'، جلد ۲ شمارہ ۱، کراچی
______، ۲۰۰۴ء، کلیات اقبال، (بانگ درا)، اقبال اکادمی پاکستان
______، ۲۰۰۵ء، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان
______، ۲۰۰۷ء، جاوید نامہ، ترجمہ: مزمل شفیق، اقبال اکادمی پاکستان
اکبر، الٰہ آبادی، اپریل ۱۹۳۲ء، کلیات اکبر الٰہ آبادی، اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
______ س ن، کلیات اکبر الٰہ آبادی، مکتبہ شعروادب لاہور
اکرام، شیخ محمد، ۱۹۹۴ء، یادگار شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
______، ۲۰۰۴ء، موج کوثر، سروسز بک کلب، راول پنڈی
______، س ن، شبلی نامہ، تاج آفس محمد علی روڈ، بمبئی
اکرام، سید محمد اکرم، ڈاکٹر، اکتوبر ۱۹۹۸ء، اقبال اور ملی تشخص، بزم اقبال، لاہور
البنچ، ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء، اسلامی دنیا، ہفت روزہ، بانکی پورہ
______، ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء، اسلامی دنیا کے حوالے سے ایک خط، ہفت روزہ، بانکی پورہ
______، ۱۱ جنوری ۱۹۰۶ء، اسلامی دنیا، ہفت روزہ، بانکی پورہ
الٰہ آبادی، اکبر، دیکھیے: اکبر الٰہ آبادی
الٰہ آبادی، احمد حسین، دیکھیے: احمد حسین، الٰہ آبادی

الہ ابادی، طالب، دیکھیے: طالب الہ آبادی

الہلال، ۱۱؍دسمبر ۱۹۱۲ء، کلکتہ

______، ۳؍جنوری ۱۹۱۳ء، کلکتہ

______، ۱۰؍جنوری ۱۹۱۳ء، کلکتہ

______، ۲۲؍اکتوبر ۱۹۱۳ء، کلکتہ

______، ۱۱؍مارچ ۱۹۱۴ء، چند قطرات اشک، کلکتہ

______، ۲۸؍جنوری ۱۹۱۴ء، کلکتہ

______، جون ۱۹۲۷ء، موجودہ ترکی شاعری کا ایک نمونہ، کلکتہ

امرتسری، حافظ عبدالرحمان، دیکھیے: عبدالرحمٰن امرتسری، حافظ

انتخاب اردوئے معلی، ۱۹۹۹ء، 'مسئلہ مصر اور برٹش کانشنس'، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی

انجمن حمایت اسلام، فروری، مارچ، اپریل، ۱۸۹۶ء، لاہور

انجم، خلیق، ۱۹۸۸ء، مولانا آزاد کی سوانح، مشمولہ: 'مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے'، مرتبہ: خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی

انشاء اللہ خان، مولوی، ۱۸۹۸ء، حالات قسطنطنیہ، مطبع روز بازار، امرتسر

______، ۱۸۹۹ء، پیش لفظ، محاربات تھسلی، منشی فاضل شیخ غلام محمد، مطبع امرتسر

______، ۱۸۹۹، تاریخ خاندان عثمانیہ، جلد دوم، باہتمام منشی فاضل شیخ غلام محمد صاحب، مطبع روز بازار، امرتسر

______، ۱۹۰۰ء، محاربات پلیونا، جلد سوم منشی فاضل شیخ غلام محمد، مطبع امرتسر

______، ۱۹۰۳ء، مترجم: مستقبل اسلام، مطبع حمیدیہ لاہور

______، ۱۹۰۳ء، ترکی زبان سیکھنے کی پہلی کتاب، حمیدیہ پریس، لاہور

______، ۱۹۰۵ء، رسالہ مفروضہ مظالم آرمینیا اور دول ثلاثہ، بار سوم، حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور

______، اپریل ۱۹۰۶ء، سیدی علی رئیس کا سفرنامہ، حمیدیہ سٹیم پریس لاہور

______، س ن، ترکوں کی موجودہ ترقیات اور اسلامی دنیا کا فوٹو، حمیدیہ سٹیم پریس لاہور

______، س ن، تاریخ خاندان عثمانیہ، جلد اول، باہتمام منشی فاضل شیخ غلام محمد صاحب، مطبع روز بازار، امرتسر

انصاری، اسلوب احمد، پروفیسر، جنوری ۱۹۷۷ء، اقبال کی تیرہ نظمیں، مجلس ترقی ادب، لاہور

انصاری، مختار احمد، ڈاکٹر، ۱۹۳۸ء، دیباچہ، ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی

انصاری، اقبال، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، سر والٹر رالے، مشمولہ: رسالہ 'فکر و نظر'، نامواران علی گڑھ نمبر، دوسرا کارواں، علی گڑھ، بھارت

انصاری، محمد حلیم، ۱۹۰۹ء، تواریخ آل عثمان، خادم التعلیم پریس، لاہور

انصاری، مفتی رضا، مولانا، جنوری ۱۹۸۴ء، علمائے فرنگی محل کے شجرہ نسب پر ایک نظر، مشمولہ: ماہنامہ 'معارف'، جلد ۱۳۳ شمارہ ۱، اعظم گڑھ، بھارت

انور، معظم، ۱۹۵۹ء، سید احمد خان، جمال الدین افغانی کی نظر میں، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، شمارہ ۱،

اوزکان، آزمی، ۲۰۰۹ء، Pan -Islam in British India، پس ورق، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس

اوکے، میم کمال، اگست ۱۹۹۱ء، تحریک خلافت، قائداعظم اکادمی، کراچی

اویس نگرامی، محمد، مولوی، ۱۸۹۷ء، تذکرہ علمائے حال، مطبع نول کشور، لکھنو

ایوبی، ڈاکٹر اکمل، اردو میں ترکی زبان کے الفاظ، مشمولہ: رسالہ معارف، شمارہ نمبر ۶، جلد ۱۰۴، اعظم گڑھ
آج کل، ماہ نامہ، جنوری ۱۹۸۱ء، دہلی

آرنلڈ، پروفیسر، (Thomas Walker Arnold) ۱۸۹۸ء، The Preaching of Islam، ترجمہ: مولوی عنایت اللہ، 'دعوت اسلام'، مفید عام، آگرہ

آزاد، ابوالکلام، مولانا، ۲۰۰۷ء، خطبات آزاد، مکتبہ جمال، لاہور

بخاری، پطرس، دیکھیے: پطرس بخاری

بانو، سعیدہ، ۱۹۷۰ء، اردو کی دو جہادی نظمیں، مشمولہ: سہ ماہی، 'الزبیر۲' تحریک آزادی نمبر، بہاولپور

بدرالدین، حاجی، ۱۹۱۴ء، فتح قسطنطنیہ، مطبع ستارہ ہند، کلکتہ

براؤن، ای. جی، (E.G.Brown)، ۱۹۰۹ء، The Persian Revolution1905-1909، لندن

_____، جون ۱۹۱۱ء، تاریخ انقلابِ ایران، ترجمہ: سیدشوکت صاحب دہلوی مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۳۱، دہلی

برٹن، رچرڈ، سر، (Captain Sir Richard F Burton)، س ن، Pilrimage to Al-Madinah & Meccaha، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور

برنی، انعام عظیم، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء، مولانا محمد علی جوہر کی شاعری، مشمولہ: سہ ماہی، 'العلم'، کراچی

برنی، ضیاء الدین، ۱۹۲۶ء، لارڈ رپن کا عہد حکومت، اردو ترجمہ: "India under Ripon; A Private Diary" مشمولہ: 'نگار'، اپریل ۱۹۲۶ء، لکھنو

_____، ۱۹۲۶ء، لارڈ رپن کا عہد حکومت، اردو ترجمہ: "India under Ripon; A Private Diary' مشمولہ: 'نگار' اکتوبر ۱۹۲۶ء، لکھنو

_____، راجہ غلام حسین، مشمولہ: رسالہ، فکر و نظر، ناموارانِ علی گڑھ نمبر، تیسرا کاررواں، علی گڑھ

_____، نومبر ۱۹۲۶ء، لارڈ رپن کا عہد حکومت، مترجم: ضیاء الدین برنی، مشمولہ: ماہ نامہ، 'نگار'، لکھنو

_____، ۱۹۵۴ء، جمال الدین افغانی، گدوبل لیکھراج روڈ کراچی

_____، ۱۹۶۱ء، عظمت رفتہ، کراچی

برینی لاڈیزردیو (Branilav Djurdjev)، ۱۹۷۱ء، بوسنہ، مشمولہ: 'اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، جلد ۵، دانش گاہِ پنجاب

بزم، عبد الصمد صبا، فروری ۱۹۷۶ء، دارالعلوم دیو بند کی ادبی خدمات، مشمولہ: 'الرشید'، لاہور، جلد ۳،۲، (دارالعلوم دیوبند نمبر)، لاہور

بسمل، عبدالغفور، ڈاکٹر، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۴ء، وسطی ایشیا کے ترک، مشمولہ: سہ ماہی، 'العلم'، کراچی

بشیر منڈیالوی، محمد، سن ندارد، محمد علی پاشا، حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور

بلنٹ، ولفرڈ اسکاؤن، ۱۸۸۲ء، The Future of Islam، کیگن پاؤل، ترینچ اینڈ کو، لندن

______، ۱۸۸۳، The Wind and the Whirlwind، کیگن پاؤل، ترینچ اینڈ کو، لندن
______، فروری ۱۹۰۳ء، The Future of Islam، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، مطبع حمیدیہ لاہور
______، فروری ۱۹۰۳ء، قومی تکبر اور ہندوستان سے تنفر، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، مطبع حمیدیہ لاہور
______، ۱۹۰۷ء، Secret History of English Occupation of Egypt، لندن
______، ۱۹۰۹ء، India under Ripon: A Private Diary، ٹی فشر ان ون، لندن
______، ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء، برطانیہ ازروئے معاہدہ دولت عثمانیہ کی اعانت پر مجبور ہے، تقریر، مشمولہ: 'الہلال'، کلکتہ
______، ۱۹۲۲ء، Secret Hsitory of the English Occupation of Egypt Being a personal Narrative of Events، الفریڈ، اے نوف، لندن
______، نومبر ۱۹۲۶ء، لارڈ رپن کا عہد حکومت، مترجم: ضیاء الدین برنی، مشمولہ: ماہ نامہ 'نگار'، لکھنؤ
______، ۱۹۸۰ء، بحوالہ، The Literary Achievement of Wilfrid Scawen Blunt، محمد توفیق محی الدین (Mohammed Tawfiq Muheiddin El Bujairan)، پی ایچ ڈی کا مقالہ، Sheffield University، انگلینڈ، ص ا
بگہم، سی۔ سی (C.C.Bigham)، ۱۸۹۸ء، With the Turkish Army In Thessaly، ترجمہ: منشی محمد حسن خان، 'جنگ ترکی و یونان'، مطبع مفید عام، آگرہ
بہاری، سید سلیمان اشرف، مولانا، دیکھیے: اشرف بہاری، سید سلیمان، مولانا
بھوپالی، برکت اللہ، مئی ۱۹۱۱ء، سلطان محمد خامس، مشمولہ: رسالہ 'اردوئے معلیٰ'، علی گڑھ
بیگ، مرزا عرفان علی، ۱۸۹۵ء، سفر نامہ حجاز، مطبع نول کشور، لکھنو
بینٹ، ارنسٹ این (Ernest N.Bennet)، مئی ۱۹۱۲ء، محاربات طرابلس، ترجمہ: مولانا شوکت علی، انجمن ہلال احمر لکھنو
بریلوی، محمود، جنوری ۱۹۴۱ء، حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی، مشمولہ، 'ندیم'، گیا
پاشا، غازی جمال، س ن، ترک انقلاب، ترجمہ: کارپردازان اخبار، بجنور
پانی پتی، اسماعیل، دیکھیے: اسماعیل پانی پتی
پانی پتی، وحید الدین سلیم، دیکھیے: سلیم پانی پتی، وحید الدین
پانی پتی، روشن، دیکھیے، روشن پانی پتی
پطرس بخاری، دسمبر ۱۹۹۱ء، سجاد حیدر یلدرم، ترجمہ: اقتدار حسین، مشمولہ: سہ ماہی 'العلم'، جلد ۴۱ شمارہ ۴، کراچی
پکتھال، مارما ڈیوک (Marmaduke Pickthall)، ۱۹۲۵ء، صبح ترکی، ترجمہ: مظہر الدین، محمد، دائرہ علمیہ الامان، دہلی
پیسہ اخبار، لاہور، یکم مئی ۱۸۹۷ء، مشمولہ: اردو صحافت انیسویں صدی میں، از: ڈاکٹر طاہر مسعود، فضلی سنز، کراچی
تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، ۱۸۵۸ء۔۱۹۱۴ء، نویں جلد، اردو ادب چہارم، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
تاریخ دارالعلوم دیو بند نمبر، ۱۹۸۰ء، مشمولہ: 'الرشید'، ساہیوال
تاراچند، ڈاکٹر، مارچ ۲۰۱۰ء، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مترجم: محمد مسعود احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور

تبسم،توصیف،ڈاکٹر،جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد
تمکین،منشی محمد آدم خان،مارچ ۱۹۰۷ء،سیاحت اسیری،کاچی گوڑہ،حیدرآباد دکن
تمنائی،مجیب احمد،نومبر ۱۹۱۴ء،قصر الحمرا،مشمولہ:ماہ نامہ،تمدن،جلد ۸ نمبر ۲،دہلی
تمنا عمادی،مولانا،جون ۱۹۱۲ء،دنیائے اسلام،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی،ص ۵۴؛
____،اگست ۱۹۱۲ء،اسلام اب کہاں رہتا ہے،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،ستمبر ۱۹۱۲ء،سراپا نبی کریم ﷺ،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،جنوری ۱۹۱۳ء،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،جون ۱۹۱۳ء،ہلال احمر،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،جون ۱۹۱۴ء،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،مئی ۱۹۱۲ء،اپنا ترانہ،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،دسمبر ۱۹۱۲ء،قطعہ،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،دسمبر ۱۹۱۲ء،کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا،مشمولہ:ماہ نامہ،'تمدن'،دہلی
____،جون ۱۹۲۳ء،ھل جزاء الاحسان الاالاحسان،مشمولہ:ماہ نامہ،'الناظر'،لکھنو
____،۱۳۲۷ھ،طرابلس کی ایک ستم رسیدہ عورت کی مناجات،مشمولہ:ماہ نامہ،'الناظر'،جلد ۶،شمارہ ۳۲،لکھنو
تمدن،ستمبر ۱۹۱۲ء،جلد ۳ نمبر ۵،دہلی
تنہا،محمد یحییٰ،مولوی،۱۹۲۸ء،سیرۃالمصنفین،جلد دوم،جامعہ ملیہ پریس،دہلی
ثاقب،شہاب الدین،۱۹۸۵ء،مولوی عبد الحق حیات اور علمی خدمات،انجمن ترقی اردو پاکستان
ثاقب،مارچ ۱۹۱۳ء،خون نابہ جگر،مشمولہ:'الناظر'،ماہ نامہ،شمارہ نمبر ۴۵ جلد ۸،لکھنو
جالبی،جمیل،مارچ ۲۰۰۵ء،تاریخ ادب اردو،جلد اوّل،مجلس ترقی ادب،لاہور
____،فروری ۲۰۱۲ء،تاریخ ادب اردو،جلد چہارم،مجلس ترقی ادب،لاہور
جامعہ ملیہ کے استاد کے قلم سے،۱۹۴۹ء،عالم اسلام اور جمال الدین افغانی:مشمولہ: 'مقام جمال الدین افغانی'،نفیس اکیڈمی کراچی
جان ملکم،۱۹۷۸ء،شبلی نعمانی،مشمولہ:'خدابخش جرنل،خدابخش اورنٹیل پبلک لائبریری،پٹنہ
جعفری،رئیس احمد،۱۹۷۱ء،اوراقِ گم گشتہ،رئیس احمد جعفری اکیڈمی،کراچی
____،۱۹۷۱ء،کاروانِ گم گشتہ،سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی کراچی
____،علی برادران،جوہر اسپیشل نمبر،علی برادران اکیڈمی،کراچی
جعفری،سید مرتضیٰ،ڈاکٹر،جون ۱۹۷۲ء،شرر کی زندگی،مشمولہ:رسالہ،'خیابان'،شرر نمبر،پشاور
جلال الدین،مرزا،جون ۱۹۰۵ء،چند دن ترکوں میں،مشمولہ:ماہ نامہ،'مخزن'،جلد ۹ شمارہ نمبر ۳،لاہور
جنگ،عمادنواز،نواب،دیکھیے:عمادنواز،جنگ،نواب
جون پوری،ممتاز حسین،دیکھیے:حسین،ممتاز جون پوری
جوہر،محمد علی،جنوری،۱۹۶۳ء،محمد علی جوہر اور ان کی شاعری،مرتبہ:سلطان عبدالرؤف عروج،حسین اینڈ

سنز کراچی

______، ۱۹۶۶ء، My life is a Fragmatism، مرتبہ: ایس۔ ایچ۔ محمد اشرف، لاہور

جوہر، نربھے رام، جولائی ۱۹۶۶ء، دلگداز کے ادا ریے، مشمولہ: ماہ نامہ 'ماہ نو'، کراچی

جہان اسلام شمارہ نمبر۴ 'جہان اسلام ترکی کا ایک اردو اخبار'، مرتبہ: خلیل طوق آر، اردو اکیڈمی پاکستان

جہاں، نواب سلطان، دیکھیے: سلطان جہاں، نواب

جیوا خان، شیخ نور الدین، ۱۳۰۲ھ، قصہ شاہ روم، در مطبع صفدر واقع بندر، بمبئی

چشتی، یوسف سلیم، س ن، شرح بانگ درا، (از اقبال) عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور

چغتائی، ابراہیم بیگ، ۱۹۰۹ء، جنگ یونان و روم، در مطبع خیر خواہ اسلام، گوالیار

چک بست لکھنوی، پنڈت برج نرائن، ۱۹۲۸ء، مضامین چک بست لکھنوی، انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد

چند، تارا، ڈاکٹر، دیکھیے: تاراچند، ڈاکٹر

چودھری، سوراکمار، یکم اگست ۱۹۴۳ء، ترکی عورتیں، مشمولہ: پندرہ روزہ 'آج کل'، دہلی

حالی، الطاف حسین، جنوری ۱۹۲۴ء، کلیات نظم حالی، جلد اول، مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، حالی بک ڈپو، پانی پت

______، مارچ ۱۹۵۳ء، شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان، مشمولہ: ماہ نامہ 'ماہ نو'، کراچی

______، مولانا، جولائی ۱۹۶۸ء، کلیات نظم حالی، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور

______، جنوری ۱۹۷۰ء، کلیات نظم حالی، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور

______، ۲۰۰۳ء، زمزمہ قیصری، مشمولہ: 'حالی کا ذہنی ارتقا'، ڈاکٹر غلام مصطفی خان، شہرزاد، کراچی

حجازی، مسکین علی، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، صحافت، مشمولہ: 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'، نویں جلد، لاہور

______، ۱۹۹۷ء، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

حسرت موہانی، فضل الحسن، مولانا، ۱۹۵۹ء، کلیات حسرت، کتاب منزل، لاہور

______، ۱۹۹۹ء، اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں، مشمولہ: انتخاب اردوئے معلی، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی، ص ۱۲۴

______، ۱۹۹۹ء، مرحوم مصطفی کامل پاشا، مشمولہ: 'انتخاب اردوئے معلیٰ'، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی

حسرت لکھنوی، عظمت علی، مولوی، ۱۹۲۱ء، محاصرہ درۂ دانیال، میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنو

______، ۱۹۹۹ء، انتخاب اردوئے معلی، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی

حسن، دسمبر ۱۸۸۸ء، شمارہ نمبر ۵ حیدرآباد دکن

حسن الاعظمی، نومبر ۱۹۴۸ء، محمد عبدہٗ اور پان اسلامزم، فاران لمیٹڈ کراچی

حسن، حافظ احمد، ۱۸۷۱ء، Pilgrimage to the Cabba and Charing Cross، لندن

حسن، فاطمہ، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء، زخ ش حیات و شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، انجمن ترقی اردو پاکستان

حسین، ابرار، مئی ۱۹۱۱ء معاسیین اور اسلام، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۲۳ جلد ۴، لکھنو

حسین، اقتدار، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء، نذر سجاد حیدر، مشمولہ: سہ ماہی 'العلم'، کراچی
______، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، سجاد حیدر، مشمولہ: سہ ماہی 'العلم'، کراچی
حسین، ثریا، ڈاکٹر، ۱۹۹۰ء، یلدرم اور اردو افسانہ، مشمولہ: 'انتخاب سجاد حیدر'، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
حسین، حفاظت، س ن، درد جگر، حصہ اول، در مطبع اخبار 'الپنچ'، بانکی پورہ
حسین، ممتاز، جون پوری، فروری ۱۹۳۴ء، لخت جگر، لکھنو
حسین، سید احتشام، ۱۹۵۳ء، علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، (علی گڑھ نمبر)، علی گڑھ
حسین، محمد اصغر، مولوی، اکتوبر ۱۸۸۹ء، مسلمانوں کے جوش و خروش کی سچی تصویر، مشمولہ: ماہنامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
______، مارچ ۱۸۹۰ء، اصلاح سلطنت ترکی، مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
حقی بے، ابراہیم، اپریل ۱۸۹۲ء، کیا ترکی ترقی کر رہا ہے، ترجمہ و مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
حقی، شان الحق، فروری ۱۹۷۲ء، نکتہ راز، عصری کتب، کراچی
حقی، عظیم زادہ، ۱۹۰۷ء، دفاع پلفنا، ترجمہ: کارپردازان پیسہ اخبار، لاہور
حیات، اسم، جولائی ۱۹۴۹ء، جمہوریہ ترکی کی معاشی ترقی، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
حیدر، قراۃ العین، ۱۹۹۰ء، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
خان، حامد علی، مولوی، مارچ ۱۸۹۰ء، تاریخ اسپین، مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
خان، شاہد، اکتوبر ۱۹۵۶ء، عبد الرزاق ملیح آبادی، مشمولہ: 'نقوش'، (شخصیات نمبر)، شمارہ ۵۹، ۶۰، لاہور
خان، محمد احمد، ۱۹۵۲ء، اقبال کا سیاسی کارنامہ، کاروان ادب، کراچی
خان، مہدی حسن، ۱۹۶۸ء، مشمولہ: روح صحافت، مرتبہ: مولانا امداد صابری، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی
خاور، رفیق، مارچ ۱۹۵۱ء، دنیائے اسلام ایک مرکز پر، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
خان، رشید الدین، ۲۰۰۰ء، مولانا ابو الکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
خان، سراج الدین احمد، جولائی ۱۸۹۰ء، سلطان بایزید 'تیمور بادشاہ گورگانی اور مسلمانوں کی موجودہ پولیٹیکل حالت، مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
خان، سید احمد، ۱۹۶۳ء، مقالات سرسید، قومی تعلیم 'قومی ہمدردی، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور
خان، ظفر علی، دیکھیے: ظفر علی، خان
خان، شیخ نور الدین جیوا، دیکھیے: جیوا خان، شیخ نور الدین
خان، انشاء اللہ، مولوی، دیکھیے: انشاء اللہ خان، مولوی
خان، عبد الوحید، ۱۹۳۸ء، مسلمانوں کا ایثار جنگ آزادی، لکھنو
خان، عبید اللہ، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۶ء، دوسرے مصنفین، مشمولہ: 'تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد چہارم'، پنجاب یونی ورسٹی لاہور
خان، غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر، مشمولہ: 'صریر خامہ'، (قومی

شاعری نمبر) سندھ یونی ورسٹی، شعبہ اردو
خان، مہدی حسن، نواب، اگست ۱۸۸۹ء، گلگشت فرنگ، ترجمہ: مولوی عزیز مرزا، مطبع مفید عام، آگرہ
خانم، کمی، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ایک ترکی خاندان اور اس کی گزشتہ و موجودہ حالت، ترجمہ: عزیز الرحمٰن، مشمولہ: ماہنامہ 'معارف'، شمارہ نمبر ۴ جلد ۳، علی گڑھ
خانم، خالدہ ادیب، ۱۹۳۸ء، ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، اردو ترجمہ: "Conflict of East and West in Turk"، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی
خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، ۱۹۶۴ء، کاروان صحافت، انجمن ترقی اردو پاکستان
____، جون ۱۹۶۳ء، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور
دریابادی، عبدالماجد، دیکھیے: عبدالماجد دریابادی دسنوی، سید شہاب، دیکھیے: شہاب دسنوی، سید
دہلوی، میمونہ دیکھیے: میمونہ دلوی دلگداز، جنوری ۱۸۸۸ء، ماہنامہ، شمارہ ا، لکھنو
دلی، شہباز حسین، ۱۹۸۸ء، مولانا سید سلیمان ندوی کی تعلیمی خدمات، مشمولہ: 'علامہ سید سلیمان ندوی سیمینار کے مقالات'، مرتبہ: بہار اردو اکادمی، پٹنہ
دہلوی، سید شوکت، دیکھیے: شوکت دہلوی، سید
دہلوی، میر امن، دیکھیے میر امن، دہلوی
دہلوی، مرزا حیرت، دیکھیے: مرزا حیرت، دہلوی
ذکاءاللہ، مولوی، ۱۹۰۴ء، محاربات عظیم، شمس المطابع، دہلی
____، جنوری ۱۹۱۰ء، الناظر، مشمولہ: 'الناظر'، ماہنامہ، شمارہ نمبر ا، لکھنو
ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، مطبع جامعہ پنجاب، لاہور
____، ۱۹۶۷ء، ظفر علی خان ادیب و شاعر، مکتبہ خیابان ادب لاہور
____، جنوری ۱۹۷۲ء، ملی نشاۃ الثانیہ کا نقیب، مشمولہ: 'صحیفہ'، حالی نمبر، شمارہ نمبر ۵۸، لاہور
____، ۱۹۹۳ء، مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
____، جنوری ۱۹۹۹ء، اقبال اتحاد اسلامی اور ہم، مشمولہ: سہ ماہی 'اقبال'، بزم اقبال، لاہور
راشد الخیری، دسمبر ۱۹۱۱ء، تبریز، مشمولہ: ماہنامہ 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۳، دہلی
____، فروری ۱۹۱۲ء، مسلمانوں کے دسترخوان پر ایک ناخواندہ مہمان، مشمولہ: ماہنامہ، 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۵، دہلی
____، ستمبر ۱۹۱۲ء، سیمونہ، مشمولہ: ماہنامہ رسالہ۔ تمدن، جلد ۳ نمبر ۵، دہلی
____، جون ۱۹۳۴ء، شہید مغرب، عصمت بک ایجنسی، دہلی
____، جنوری ۱۹۴۱ء، گلدستہ عید، عصمت بک ایجنسی، دہلی
راشد، ن، م، ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء، ظفر علی خان شاعر کی حیثیت سے، مشمولہ: پندرہ روزہ، 'آج کل'، دہلی
ردولوی، خورشید نعمان، دیکھیے: نعمان ردولوی، خورشید
رزاقی، شاہد حسین، ۲۰۱۰ء، جمال الدین افغانی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

رضا، جعفر، پروفیسر، ۱۹۸۸ء، عبد الحلیم شرر، ساہتیہ اکادی، انڈیا
رضوی، شفقت، جون ۲۰۰۷ء، نقیب انقلاب برکت اللہ بھوپالی، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ، کراچی
رضوی، وقار احمد، ڈاکٹر، ۱۹۸۹ء، تاریخ جدید اور اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
رفعت، مبارز الدین، سید، ۱۹۴۴ء، مقالاتِ جمال الدین افغانی، دارالاشاعتِ سیاسیہ، حیدر آباد دکن
روبنسن، فرانسس (Francis Robinson)، ۲۰۰۲ء، *The Ulema of Frangi Mahal and Islamic Culture in South Asia*، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور
روز ایٹرس (Ross Ettors)، طرابلس، مشمولہ: 'اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور'، جلد ۱۶، دانش گاہ پنجاب
روشن، پانی پتی، جنوری ۱۹۵۵ء، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، مشمولہ: 'نقوش'، شمارہ نمبر ۴۷-۴۸، لاہور
رئیس، قمر، ڈاکٹر، ۱۹۸۳ء، رتن ناتھ سرشار، ساہتیہ اکیڈمی، انڈیا
زبیری، رفیع الزماں، ۲۰۱۳ء، حرمین کے مسافر، فضلی سنز، کراچی
زبیری، محمد امین، س ن، مسلم یونی ورسٹی کی تاسیس اور اس کا تدریجی ارتقا، لیتھو پریس میکلوڈ روڈ، کراچی
_____، مارچ ۱۹۵۳ء، حالی اور دنیائے اسلام، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
_____، ۱۹۹۴ء، حیات محسن، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی
زیدی، نظیر حسنین، ڈاکٹر، جون ۱۹۸۶ء، مولانا ظفر علی خان احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور
زمیندار، یکم مئی ۱۹۱۱ء، آفتاب اسلام کا طلوع جاپان میں، مشمولہ: 'مولانا ظفر علی خان بہ حیثیت صحافی'، از: ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ۱۹۸۵ء مکتبہ اسلوب کراچی
ز، خ، ش، ۱۹۴۱ء، فردوس تخیل، دارالاشاعت پنجاب، لاہور
سالم، رشید احمد، نومبر ۱۹۰۱ء، دولت عثمانیہ، مشمولہ: ماہ نامہ 'معارف'، شمارہ نمبر ۱۱ جلد ۴، پانی پت
سدید، انور، ڈاکٹر، اگست ۱۹۸۷ء، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور
سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، ۱۹۸۴ء، فسانہ آزاد (جلد اول)، لاہور
_____، ۱۹۸۴ء، فسانہ آزاد (جلد دوم)، لاہور
سروری، تحسین، جون جولائی ۱۹۵۶ء، انیسویں صدی کے چند اردو اخبارات، مشمولہ: 'مشرب'، (تاریخ ادب اردو نمبر)، شمارہ ۵، ۶، کراچی
سرور، محمد، پروفیسر، اکتوبر ۱۹۴۵ء، مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی، لاہور
_____، اکتوبر ۱۹۶۸ء، جمال الدین افغانی، مشمولہ: 'فکر و نظر'، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
سعید، مرزا محمد، اکتوبر ۱۹۰۶ء، خالد خلیل بلک کی کتاب کا ترجمہ، مشمولہ: ماہ نامہ، مخزن، جلد ۱۶ شمارہ نمبر ۱، لاہور
سعید، احمد، انجمن اسلامیہ امرتسر، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ، پنجاب
سعید ملیح آبادی، احمد، ۱۹۸۸ء، مولانا آزاد کے چند اہم مسودات، مشمولہ: 'مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے'، مرتبہ: خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی
سلطان جہاں، نواب، ۱۹۱۱ء، سیاحت سلطانی، مفید عام، آگرہ

سلونوی، اشتیاق، س ن، درد دل، مطبوعہ حسن برقی پریس، ہیوٹ روڈ، لکھنو
سلیم پانی پتی، وحید الدین، جولائی ۱۸۹۸ء، ہما رامیگز ین اور اس کے مضا مین، مشمولہ: 'معارف'، ماہ نامہ شمارہ نمبر ا جلد ا، علی گڑھ
_____، اکتوبر ۱۹۰۰ء، ایک تر کی خا ند ان اس کی گز شتہ ومو جو دہ حالت، مشمولہ: 'معارف'، ماہ نامہ، علی گڑھ
_____، جون ۱۹۰۱ء، حیات جا وید پر ریو یو، مشمولہ: ماہ نامہ 'معارف'، پانی پت
_____، ۱۹۶۱ء، مضا مین سلیم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
سلیم، احمد، دسمبر ۲۰۰۰ء، حسرت کی سیا ست، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
سندھی، عبید اللہ، مولانا، اگست ۱۹۹۴ء، مکا تیب عبید اللہ سند ھی، مرتبہ: ابوسلمان شاہ جہان پوری، المحمود اکیڈمی کراچی
سندیلوی، سلام، ڈاکٹر، ستمبر ۱۹۶۰ء، مو لا نا شبلی کی اردو شا عری، مشمولہ: ماہ نامہ 'ادیب' (شبلی نمبر)، علی گڑھ
سیفی، محمد اسلم، ۱۹۳۹ء، حیات و کلیات اسمٰعیل میر ٹھی، مکتبہ اسلامیہ، دہلی
شاکر، محمد، مولوی، نومبر ۱۹۱۲ء، عر ب کی گز شتہ عظمت، مشمولہ: ماہ نامہ 'الناظر'، شمارہ نمبر ۳۵ جلد ۲، لکھنؤ
شاہ جہاں، ابوسلمان، دیکھیے: ابوسلمان، شاہ جہاں
شاہ، محمد، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء، *Pan Islamism in India and Bangal*، رائل بک کمپنی، کراچی
شبلی نعمانی، مولانا، ۱۹۲۸ء، سفر نا مہ روم و مصر وشا م، مہتاب پریس، دہلی
_____، ۱۹۳۸ء، مقا لا ت شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، در مطبع معارف اعظم گڑھ
_____، ۱۹۸۹ء، کلیا ت شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
_____، ۱۹۸۹ء، مکا تیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
_____ س ن، سفر نا مہ روم و مصر و شام، اشاعتِ دوم علی گڑھ
شبیہ الحسن نونہروی، سید، ۱۹۵۰ء، مضا مین اکبر ی، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، اکبر نمبر، جلد نمبر ۲۴، علی گڑھ
شرر، عبد الحلیم، مولوی، اپریل ۱۸۸۸ء، دا را لخلا فت بغد اد، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴، لکھنو
_____، ۱۸۸۹ء، اداریہ، مشمولہ: 'دلگداز'، لکھنو
_____، اپریل ۱۸۹۱ء، افر یقہ میں مسلما نو ں کی کا میا بی، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴ جلد ۵، لکھنو
_____، اپریل ۱۸۹۷ء، معر کہ یو نا ن و روم، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۳ جلد ۶، لکھنو
_____، مارچ ۱۸۹۸ء، چند گھنٹہ جبر الٹر میں، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۲ جلد ۶، لکھنو
_____، جولائی ۱۹۱۱ء، خیا لا ت و وا قعات، مشمولہ: 'دلگداز'، لکھنو
_____، جولائی ۱۹۱۱ء، صلیبی لڑ ائیوں کا ایک دل چسپ وا قعہ، مشمولہ: 'دلگداز'، لکھنو
_____، دسمبر ۱۹۱۱ء، خیا لا ت و وا قعات، مشمولہ: 'دلگداز'، لکھنو
_____، اپریل ۱۹۱۳ء، تر کوں کا مو جو دہ تنزل، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴ جلد ۱۵، لکھنو
_____، اپریل ۱۹۱۴ء، محمد علی پا شا، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴ جلد ۱۶، لکھنو
_____، جولائی ۱۹۱۴ء، عا لم گیر قتال مغرب، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴ جلد ۱۷، لکھنو

______، مارچ ۱۹۲۰ء، تاریخ خلافت، مشمولہ: 'دلگداز'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۳ جلد ۲۲، لکھنو
______، ۱۹۹۰ء، زمانہ اور اسلام، مشمولہ: 'عبد الحلیم شرر بہ حیثیت شاعر'، مرتبہ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی
شفیع، محمد، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۸ء، آغا حشر کا شمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ، فخر الدین علی احمد میموریل اتر پردیش لکھنو
شورش کاشمیری، جون ۱۹۶۷ء، قید فرنگ مولانا ظفر علی خان کے ایام اسیری، مطبوعات چٹان لمیٹڈ، لاہور
شوکت دہلوی، سید، نومبر ۱۹۱۱ء، روس اور اسلام، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۲، دہلی
______، دسمبر ۱۹۱۲ء، مسئلہ مشرقیہ، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۴ نمبر ۳، دہلی
شوکت علی، مولانا، ۹ نومبر ۱۹۱۵ء، خط بنام مولانا عبد الباری فرنگی محل، مشمولہ: علی برادران، مرتبہ: سید رئیس جعفری، مولانا محمد علی اکیڈمی، کراچی
شوق، حافظ احمد علی خان، مارچ ۱۸۹۹ء، شہنشاہ جرمنی کا سفر نامہ سفر قسطنطنیہ، مطبوعہ مطبع احمدی ریاست رام پور
شہاب دسنوی، سید، ۱۹۸۶ء، مولانا سید سلیمان ندوی اور ندوہ، مشمولہ: 'سید سلیمان ندوی'، مرتبہ: خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند
شیرانی، مظہر محمود، جنوری ۱۹۶۶ء، مقدمہ مقالات حافظ محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، لاہور
شیرانی، محمود، حافظ، جنوری ۱۹۶۶ء، مقالات حافظ محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، لاہور
______، ۱۹۱۱ء، Early Christian and Febels concerning Islam، لوزک اینڈ کو کمپنی، ۴۶ گریٹ رسل اسٹریٹ، ڈبلیوسی، لندن
شریف المجاہد، پروفیسر، مئی ۲۰۰۸ء، سخت کوشی اور المناک تجربوں کی ایک داستان، مشمولہ: 'جہات حسرت'، مرتبہ: ڈاکٹر سید احمد جعفر احمد، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
صابری، امداد اللہ، مولانا، جنوری ۱۹۴۹ء، فرنگیوں کا جال، امداد صابری پبلی شرز، دہلی
______، ۱۹۶۳ء، تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، دہلی
______، ۱۹۶۸ء، روح صحافت، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی
______، اگست ۱۹۸۶ء، امام الہند مولانا آزاد، مکتبہ رشیدیہ کراچی
صابر، محمد، ڈاکٹر، جون ۱۹۶۵ء، ترک اور برصغیر، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
______، نومبر ۱۹۶۸ء، ترکوں کی جنگ آزادی، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
صادق، محمد، ڈاکٹر، جنوری ۱۹۵۸ء، آزاد کا سفر ایران، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
______، نومبر ۱۹۷۶ء، محمد حسین آزاد احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور
صدیقی، احمد صدیق، ستمبر ۱۹۶۰ء، شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک نظر، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ادیب'، (شبلی نمبر) علی گڑھ
صدیقی، محمد اکبر الدین، اگست ۱۹۶۲ء، بابائے اردو اور رسالہ افسر، مشمولہ: 'ہم قلم'، ماہ نامہ، کراچی

صدیقی،افتخار احمد،جنوری ۱۹۷۰ء، کلیات نظم حالی ،جلددوم،مجلس ترقی ادب،لاہور

______،نومبر ۱۹۷۱ء،مولوی نذیر احمد احوال و آثار،مجلس ترقی ادب،لاہور

صدیقی،انور،اپریل ۱۹۷۹ء،شعلے کی سر گزشت،مشمولہ:'جامعہ'،جوہرنمبر،جلد ۷۶،شمارہ ۳،جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی

صدیقی،خلیق الزماں،نومبر ۱۹۶۵ء، کاش وہ جانتے، مستفیض احمد صدیقی پروپرائٹر انٹرنیشنل پریس،کراچی

______،اکتوبر ۱۹۶۷ء،شاہراہ پاکستان،انجمن اسلامیہ پاکستان

صدیقی،رشید احمد،علی گڑھ کی مسجد قرطبہ،مشمولہ:'نیادور'،شمارہ نمبر ۵۷،۵۸،کراچی

صدیقی،ظہیر احمد،ڈاکٹر،اکتوبر ۲۰۱۰ء،ذکر صادق،ادبستان لاہور

صدیقی،نفیس احمد،ڈاکٹر،حسرت موہانی اور انقلاب آزادی،خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ

صفی لکھنوی،۱۹۸۳ء،انتخاب کلام صفی لکھنوی،مرتبہ:سیدزائرحسین،اترپردیش اکادمی،لکھنو

طالب،الٰہ آبادی،س ن، اکبر الہ آبادی،مطبع انواراحمدی،الٰہ آباد

طارق،رابعہ،اگست ۱۹۹۹ء،مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی،ندوۃ المعارف،لاہور

طاہر،حاجی غلام محمود،۱۹۰۹ء،دلیل الحجاز والشام،مطبع نظام دکن،حیدرآباد دکن

طوق آر،خلیل،ڈاکٹر،۲۰۱۱ء،جہان اسلام ترکی کا ایک اردو اخبار،اردو اکیڈمی پاکستان

______،جولائی ۲۰۱۲ء،ترک اور ترکی،نیریٹو،اسلام آباد

طیب،محمد،مولانا،ستمبر ۱۹۷۲ء،تاریخ دارلعلوم دیوبند،دارلاشاعت،کراچی

ظفرعلی،خان،اپریل ۱۹۰۸ء،اداریہ،مشمولہ:'دکن ریویو'،ماہ نامہ،دکن

______،۱۳۳۹ھ،روح معانی،خطبہ صدارت خلافت کانفرنس بہرہان پور،کارپردازان مکتبہ زمیندار لاہور

______،مشمولہ: زمیندار، یکم مئی ۱۹۱۱ء،'آفتاب اسلام کا طلوع جاپان میں'،بہ حوالہ:'مولانا ظفرعلی خان بہ حیثیت صحافی'،ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی،۱۹۸۵ء،مکتبہ اسلوب،کراچی

______،اگست ۱۹۹۹ء،مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی،مرتبہ:رابعہ طارق،ندوۃ المعارف،لاہور

______،دسمبر ۲۰۱۰، کلیات مولانا ظفر علی خان،مرتبہ:زاہد علی خان،مولانا ظفرعلی خاں ٹرسٹ،لاہور

______،۱۹۹۳ء،خطبہ صدارت خلافت کانفرنس برہان پور مارچ ۱۹۲۰ء،مشمولہ:'مولانا ظفر علی خان حیات،خدمات وآثار'،پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

______،۱۳۳۹ھ،روح معانی،خطبہ صدارت خلافت کانفرنس بہرہان پور،کارپردازان مکتبہ زمیندار لاہور

______،س ن،جمال الدین افغانی،مطبع اسلامیہ سٹیم پریس،لاہور

______،س ن،غلبہ روم،کنول بک ڈپو،لاہور

______،۱۳۳۹ھ،روح معانی،خطبہ صدارت خلافت کانفرنس برہان پور،کارپردازان مکتبہ زمیندار،لاہور

عارف،محمد،ڈاکٹر،۲۰۰۶ء،اردو ناول اور آزادی کے تصورات،پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،لاہور

عالم،محبوب،منشی،۱۹۰۳ء،پروفیسر ویمبری کا سفر نامہ،کارخانہ پیسہ اخبار،لاہور

______،۱۹۹۷ء،سفر نامہ یورپ بلاد روم ومصر وشام،باردوم،نگارشات،لاہور

عباس،غلام،دیکھیے:غلام عباس

عبد الباری،سید،ڈاکٹر،۱۹۸۶ء،ڈاکٹر سید محمود،مشمولہ:رسالہ'فکر ونظر'(نامواران علی گڑھ نمبر)،دوسرا کارروان،علی گڑھ

عبدالحق،مولوی،جون۱۸۹۴ء،قاہرہ کی مسجد عمرو،مشمولہ:رسالہ'حسن'،حیدرآباددکن

______،اکتوبر۱۹۰۷ء،افریقہ میں اشاعت اسلام،مشمولہ:'دکن ریویو'،ماہ نامہ،حیدرآباددکن

______،اکتوبر۱۹۰۷ء،زنجبار،مشمولہ:'دکن ریویو'،ماہ نامہ،حیدرآباددکن

______،اپریل۱۹۰۸ء،مصطفےٰ کامل پاشا،مشمولہ:'دکن ریویو'،ماہ نامہ،حیدرآباددکن

______،ستمبر۱۹۰۸ء،ترکی کا انقلاب،مشمولہ:'دکن ریویو'،ماہ نامہ،حیدرآباددکن

______،۱۹۱۴ء،مقدمہ:ڈراماجنگ روس وجاپان،اسلامیہ سٹیم پریس لاہور

______،مئی ۱۹۱۵،دلگداز کی نئی شان،مشمولہ:'الناظر'،ماہ نامہ،جلد۱۲شمارہ نمبر۱۷،لکھنو

______،اگست۱۹۶۲ء،۲۲سال پہلے کی تحریریں،مشمولہ:'ہم قلم'،ماہ نامہ،کراچی

______،۱۹۷۶ء،افکار حالی،انجمن ترقی اردوپاکستان

______۱۹۸۹ء،مرحوم دہلی کالج،انجمن ترقی اردوہند

______،س ن،انتخاب رسالہ حسن،حیدرآباددکن

عبدالسلام،پروفیسر،اکتوبر۱۹۷۳ء،اردو ناول بیسویں صدی میں،اردواکیڈمی سندھ

عبدالعلی خان،مولانا،اکتوبر۱۹۰۰ء،نامق کمال بے،مشمولہ:'معارف'،ماہ نامہ شمارہ نمبر۴جلد۳،علی گڑھ

عبدالغفار،قاضی،باراول۱۹۲۴ء،نقش فرنگ،دارلاشاعت لاہور

______،۲۱فروری۱۹۳۲ء،جمال الدین افغانی،مکتبہ جامعہ دہلی

______،۱۹۴۰ء،آثار جمال الدین افغانی،انجمن ترقی اردوہند

عبدالقادر،شیخ،اکتوبر۱۹۰۶ء،قسطنطنیہ،مشمولہ:ماہ نامہ،'مخزن'،جلد۱۶شمارہ نمبر۱،لاہور

______،اکتوبر۱۹۰۶ء،قسطنطنیہ،مشمولہ:ماہ نامہ،'مخزن'،جلد۱۶شمارہ نمبر۱،لاہور

______،اپریل۱۹۰۹ء،سلطان عبد الحمید کی معزولی،مشمولہ:ماہ نامہ،'مخزن'،جلد۱۷شمارہ نمبر۱،لاہور

______،جون۱۹۰۹ء،جوان ترک،مشمولہ:ماہ نامہ،'مخزن'،جلد۱۷شمارہ نمبر۳،لاہور

______اکتوبر۱۹۰۹ء،خدیوان مصر،مشمولہ:ماہ نامہ،مخزن،جلد۱۷شمارہ نمبر۶،لاہور

عبداللطیف،قاضی،۱۳۳۰ھ،تاریخ جنگ طرابلس مصور،مطبع حبل المتین،کلکتہ

عبدالرحمٰن امرتسری،حافظ،۱۹۰۵ء،سفرنامہ بلاد اسلامیہ،مفید عام سٹیم پریس لاہور

عبدالرزاق کانپوری،۱۹۵۷ء،نوائے آزادی،ادبی پبلشرز،بمبئی

عبداللہ،ڈاکٹرسید،۱۹۹۸ء،سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور

عبداللہ،محمد،منشی،۱۹۱۲ء،مناظر کارزار طرابلس،ہلال پریس،دہلی

عبدالماجددریابادی،۱۹۶۹ء،اکبر کا سیاسی مسلک،مشمولہ:ماہ نامہ،'نگار'،(اکبرالہ آبادی نمبر)،کراچی

عبدالمغنی، ستمبر ۱۹۶۰ء، شبلی و حالی کی تحریکیت، مشمولہ: 'ادیب' (شبلی نمبر)، شمارہ ۹ جلد ۶، علی گڑھ
عبدہٗ، مفتی محمد، ۱۹۱۳ء، وحدت اسلامیہ، اردو ترجمہ، مولانا اصلاحی، مشمولہ: مجلّہ 'الہلال'، دہلی
عتیقی، حکیم عبدالمجید، س ن، ترکان احرار، کامل بک ڈپو، لاہور
عروج، عبدالرؤف، جنوری، ۱۹۶۳ء، محمد علی جوہر اور ان کی شاعری، سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی
عزیزالرحمٰن، مولانا، مفتی، اگست ۱۹۶۵ء، تذکرہ شیخ الہند، مدنی دارالتالیف بجنور، یوپی
عزیز، لکھنوی، مئی ۱۹۱۱ء، آہ رسا، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، جلد ۱ نمبر ۲، دہلی
_____، جولائی ۱۹۱۱ء، اشاعت اسلام، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، جلد ۱ نمبر ۴، دہلی
_____، نومبر ۱۹۱۱ء، نالہ دل، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۲، دہلی
عزیز، کے کے، (خورشید کمال عزیز) جون ۱۹۹۲ء، *Public life in Muslim India 1850-1947*، وین گارڈ، لاہور
عزیز، محمد، ۱۹۴۳ء، دولت عثمانیہ، جلد دوم، معارف پریس، اعظم گڑھ
عظیم، وقار، پروفیسر، جنوری ۱۹۷۲ء، حالی کا شکوہ، مشمولہ: 'صحیفہ'، حالی نمبر، شمارہ نمبر ۵۸، لاہور
عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور
_____، ڈاکٹر، جون ۲۰۰۸ء، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مجلس ترقی ادب، لاہور
علوی، ظفرالملک، دسمبر ۱۹۱۲ء، انصاری طبی وفد، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴۲ جلد ۷، لکھنو
_____، دسمبر ۱۹۱۲ء، تبصرہ، مشمولہ: ماہ نامہ 'الناظر'، لکھنو
_____، مئی ۱۹۱۳ء، ترکی مسلمان عورتیں، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴۷ جلد ۷، لکھنو
علی خان، نوازش، ۱۸۹۷ء، قسطنطنیہ یعنی دارلخلافت عثمانیہ کی دلچسپ کیفیت، منشی فضل الدین تاجر کتب قومی مالک اخبار اشاعت لاہور
علی، نثار، منشی، فروری، مارچ، اپریل، ۱۸۹۶ء، مشمولہ: رسالہ انجمن حمایت اسلام، لاہور
علی، محمد، مولانا، س ن، دارالعلوم ندوۃ العلما، مطبوعہ صبح المطابع محمود نگر، لکھنو
علی، منظور، مئی ۱۹۱۳ء، ترکی مسلمان عورتیں، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴۷ جلد ۷، لکھنو
علی، معشوق، مولوی، اکتوبر ۱۹۱۱ء، محاربات صلیب، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴۸ جلد ۴، لکھنو
_____، فروری ۱۹۱۳ء، محاربات صلیب، مشمولہ: 'الناظر'، ماہ نامہ، شمارہ نمبر ۴۳ جلد ۸، لکھنو
عمادی، تمنا، مولانا، دیکھیے: تمنا عمادی، مولانا عماد نواز جنگ، نواب، اکتوبر ۱۸۸۹ء، مسجد دمشق، مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
عنایت، افشاں، ۲۰۰۶ء، تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری، ایم۔اے اردو کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، شعبہ اردو، جامعہ کراچی
غازی پوری، قمراحمد، دیکھیے: قمراحمد، غازی پوری
غلام الثقلین، خواجہ، اپریل ۱۹۱۲ء، روزنامچہ سیاحت، مطبع شمس الانوار، میرٹھ
غلام عباس، جولائی ۱۹۴۸ء، ترکی ٹوپی، مشمولہ: ماہ نامہ 'ماہ نو'، کراچی
فاروقی، ضیاءالحسن، فروری ۱۹۶۲ء، *The Deoband School and the demand for Pakistan*، پروگریسیو

بک لاہور
فاروقی، محمد حمزہ، فروری ۲۰۱۰ء، حجاز نامہ مہر، اکادمی بازیافت، کراچی
فرخی، اسلم، ڈاکٹر، ۱۹۶۵ء، محمد حسین آزاد، جلد اول، انجمن ترقی اردو پاکستان
فرنگی محلی، عبدالباری، مولانا، س ن، خط بنام پنڈت موتی لال نہرو، مشمولہ: 'نقوش'، ۱۹۶۸ء شمارہ نمبر ۱۰۹، جلد ۵، ۴، لاہور
فریدی، قمرالھدیٰ، مولانا شوکت علی، مشمولہ: رسالہ، 'فکر ونظر'، ناموارانِ علی گڑھ نمبر، تیسرا کارروان، علی گڑھ
فرید آبادی، ہاشمی، دسمبر ۱۹۱۱ء، ٹریپولی، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۳، دہلی
_____، دسمبر ۱۹۱۲ء، چل بلقان چل، مشمولہ: ماہ نامہ، 'الناظر'، لکھنو
_____، مارچ اپریل، ۱۹۳۶ء، قطعہ، مشمولہ: ماہ نامہ، 'الناظر'، لکھنو
_____، ۱۹۵۳ء، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان
_____، ۱۹۵۷ء، بس اب ہے آج سے آغاز میری کار فرمائی مشمولہ: 'نوائے آزادی'، مرتبہ: عبدالرزاق کانپوری، ادبی پبلی شرز بمبئی
فصیح، غلام قادر، ۱۸۹۸ء، دربار روس کے اسرار، پنجاب پریس، سیالکوٹ
_____، ۱۸۹۸ء، دربار لندن کے اسرار، پنجاب پریس، سیالکوٹ
فوق، حنیف، ڈاکٹر، جنوری ۱۹۹۰ء، ترکی اور پاکستان کے رابطوں کا تاریخی و تہذیبی پس منظر، مشمولہ: رسالہ 'دائرے'، کراچی
فوق، محمد الدین، اکتوبر ۱۹۱۲ء، اخبار نویسوں کے حالات، مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس، لاہور
فہد، عبداللہ، اگست ۱۹۸۹ء، مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار، مشمولہ: رسالہ، 'فکر ونظر' (ابوالکلام آزاد نمبر)، علی گڑھ
قرآن حکیم، سورہ آلِ عمران آیت: ۱۲
قرآن حکیم، سورہ المجادلہ، آیت: ۳
قادری، حکیم شمس اللہ، ستمبر ۱۹۱۱ء، صلاح الدین، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ا نمبر ۲، دہلی
_____، مئی ۱۹۱۴ء، رود نیل، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۷ نمبر ۲، دہلی
قادری، محمد ایوب، ۲۰۱۰ء، اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
قاسمی، انوار الحق، مولانا، ۲۰۰۴ء، چودھویں صدی کے علمائے برصغیر، اردو ترجمہ: 'نزہۃ الخواطر'، دارالاشاعت، کراچی
قاسمی، انیس الاسلام، نومبر ۱۹۷۹ء، مولانا، دارالعلوم دیو بند اور اردو ادب، مشمولہ: رسالہ 'الحق'، ماہ نامہ، اکوڑہ خٹک، پاکستان
قدسی زادہ، اے، البرٹ (A. Albert Kudsi-Zadeh)، جنوری، مارچ ۱۹۷۲ء، *Afghani and Freemasonry in Egypt*، مشمولہ: جرنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی،
قدسیہ، قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۸۷ء، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی
قدوائی، مشیر حسین، ۷ اپریل ۱۹۱۴ء، خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محل، مشمولہ: 'نقوش'، ۱۹۶۸ء، شمارہ نمبر ۱۰۹، جلد ۵، ۴، لاہور

قریشی،اشتیاق حسین،۱۹۹۹ء،بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،مترجم: ہلال احمد زبیری،شعبہ تصنیف و تالیف وترجمہ کراچی یونی ورسٹی

____،جولائی ۱۹۹۴ء،علما میدان سیاست میں،ترجمہ:ہلال احمد زبیری،شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،کراچی یونی ورسٹی

قریشی،محمد طاہر،ڈاکٹر،۲۰۱۴ء،قرآن اور ظفر علی خان،قرطاس،کراچی

____،جون ۲۰۱۲ء،ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر،پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ مقالہ،شعبہ اردو،جامعہ کراچی

قریشی،محمد نعیم،۲۰۰۹ء،*Pan -Islamism in British India*،آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس

____،۲۰۱۴،*Ottoman Turkey.Ataturk and Muslim south Asia*،آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس،کراچی

قریشی،عبدالمجید،۱۹۶۶ء،سفر ناسے ایک اجمالی جائزہ،مشمولہ:سہ ماہی،الزبیر،بہاول پور

قسیم الدین،شاہ،س ن،درد جگر،حصہ اول،در مطبع اخبار النبخ بانکی پورہ

قیصر الاخبار ہند،الہ آباد،۱۸ نومبر ۱۸۷۷ء،مشمولہ:،کاروان صحافت(۱۹۶۴ء)از ڈاکٹر عبد السلام،انجمن ترقی اردو پاکستان

قیصر، رضوان ـ فروری،مارچ،۱۹۹۶ء،پان اسلامزم 'ہندوستان کی جنگ آزادی اور مہاتما گاندھی،مشمولہ:'جامعہ'،شمارہ ۱ـ۲ـ۳،جامعہ ملیہ،دہلی

کاشمیری،شورش،دیکھیے:شورش کاشمیری

کانپوری،عبدالرزاق،دیکھیے:عبدالرزاق کانپوری

کرامرز،۱۹۲۶ء،ترک تاریخ،مشمولہ:'اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور'،جلد ۶،دانش گاہِ پنجاب

لال،منشی موہن،س ن،انقلاب قسطنطنیہ،میجر صدیق بک ڈپو امین آباد،لکھنو

لکھنوی،صفی،دیکھیے:صفی لکھنوی

لکھنوی،عزیز،دیکھیے:عزیز لکھنوی

لکھنوی،عظمت علی حسرت،مولوی دیکھیے:حسرت لکھنوی،عظمت علی،مولانا

لونگ فورڈ،الزبتھ(Elizabeth Longford)،۲۰۰۷ء،،*A pilgrimage of Passion the life of Wilfrid Scawen Blunt*ٹورس پارک پیپر بیکس،لندن

مائل،محمد زکریا،نومبر ۱۹۴۹ء،فتح اندلس،مشمولہ:ماہ نامہ،'ماہِ نو'،کراچی

مٹکاف،باربراڈی،Babara D. Metcalf،۱۹۸۲،*Islamic Revolutoin in British India*،پرنسٹن یونی ورسٹی پریس،پریسٹن،نیوجرسی

محسن الملک،۱۹۹۴ء،روسی حملہ ہرات میں،مشمولہ:حیات محسن،محمد امین زبیری،اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ،کراچی

محمد شاکر،مولوی،نومبر ۱۹۱۲ء،عرب کی گزشتہ عظمت،مشمولہ:'الناظر'،ماہ نامہ،شمارہ نمبر ۳۵ جلد ۲،لکھنو

محمد مجیب،پروفیسر،اپریل ۱۹۷۹ء،مولانا محمد علی اپنی شکست کی آواز،ترجمہ:انوار احمد صدیقی،مشمولہ:'جامعہ'،جوہر نمبر،جلد ۷۶،شمارہ ۳،جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی

محمد مرتضٰی، مولوی، فروری ۱۸۹۹، سسلی کا جغرافیہ اور اس کی قدیم تاریخ، مشمولہ: 'معارف'، ماہ نامہ شمارہ نمبر ۸ جلد ۱، علی گڑھ
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، جنگ آزادی کے اردو شعرا، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد
محمود، سید فیاض، بریلوی، ۱۹۷۲ء، عبادت، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، ۱۸۵۸ء۔۱۹۱۴ء، نویں جلد، 'اردو ادب' چہارم، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
محی الدین، محمد توفیق (Mohammed Tawfiq Muheiddin El Bujairan) ۱۹۸۰ء، *The Literary Achievement of Wilfrid Scawen Blunt* پی ایچ ڈی کا مقالہ، Sheffield University، انگلینڈ
مدنی، حسین احمد، فروری ۲۰۰۷ء، نقش حیات، مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان
مرزا حیرت، دہلوی، ۱۹۰۱ء، حیات حمیدیہ، دوم، کرزن پریس شاہ گنج، دہلی
_____، ۱۹۰۴ء، تزک امیری، کرزن پریس، دہلی
_____، ۱۹۰۴ء، مضامین حیرت، مطبع کرزن پریس، دہلی
_____، ۱۹۰۶ء، حیات حمیدیہ، سوم، کرزن پریس شاہ گنج، دہلی
_____، حیات حمیدیہ، اول، کرزن پریس شاہ گنج، دہلی
مرتضٰی، محمد، ستمبر ۱۹۰۸ء، روئداد جلسہء تہنیت بہ تقریب مدینہ ریلوے، پتھر گٹی، حیدرآباد، دکن
مسٹر ڈی کولٹ، فروری ۱۸۸۹ء، سلطان روم اور مہدی سوڈانی کے باہمی تعلقات، ترجمہ و مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن
مسعود، طاہر، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء، اردو صحافت انیسویں صدی میں، فضلی سنز، کراچی
مشیر الحسن، ۲۰۰۶ء، دہلی کے مسلمان دانش ور انیسویں صدی میں، ترجمہ: مسعود الحق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی
مصطفٰی خان، غلام، ڈاکٹر، ۲۰۰۳ء، حالی کا ذہنی ارتقا، شہزاد، کراچی
معارف، اگست ۱۸۹۸ء، جلد ا شمارہ نمبر ۲، علی گڑھ
معارف، اکتوبر ۱۹۰۰ء، علی گڑھ
معظم، انور، جمال الدین افغانی کا مقام، مشمولہ: 'سویرا'، شمارہ نمبر ۳۵، کراچی
معین الرحمٰن، سید، مارچ ۱۹۷۱ء، مطالعہ یلدرم، نذر سنز لاہور؛ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: ماہ نامہ رسالہ ۱۹۶۲ء، 'پگڈنڈی' (سجاد حیدر یلدرم نمبر) شمارہ نمبر ۵ جلد ۹، امرت سر
ملک، عبدالقیوم، فروری ۱۹۶۸ء، ترکی زاویے، ترجمہ: سلیم الحق، مشمولہ: ماہ نامہ، 'ماہ نو'، کراچی
ملک، مسز شمیم، ڈاکٹر، مارچ ۱۹۸۶ء، آغا حشر کا شمیری حیات اور کارنامے مجلس ترقی ادب لاہور
مومن، خان مومن، جولائی ۱۹۶۴ء، کلیات مومن، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور
موہانی، فضل الحسن حسرت، دیکھیے: حسرت موہانی، مولانا فضل الحسن
میمونہ دلوی، ڈاکٹر، ستمبر ۱۹۷۰ء، بمبئی میں اردو، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی
ملیح آبادی، احمد سعید، دیکھیے: سعید ملیح آبادی، احمد
ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، ۱۹۷۸ء، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مکتبہ خیابان

ادب لاہور

منگوری، سید طفیل احمد، دیکھیے: احمد منگوری، سید طفیل

منگوری، ممتاز، ڈاکٹر، دیکھیے: ممتاز منگوری، ڈاکٹر

مہدی، صغرا، ۱۹۸۳ء، اکبر الہ آبادی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی

مہدی، مظہر، ۱۹۹۹ء، اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

میاں، سید محمد، مولانا، ۱۹۹۱ء، تحریک شیخ الہند، نگارشات لاہور

_____، ستمبر ۱۹۴۶ء، علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، حصہ اوّل، کتب خانہ فخریہ امروہہ گیٹ، مرادآباد یوپی

میر امن، دہلوی، جنوری ۲۰۰۱ء، باغ وبہار، اردو اکیڈمی سندھ

میرٹھی، اسمٰعیل، دیکھیے: اسماعیل میرٹھی

نارنگ، گوپی چند ۲۰۰۳ء، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی

ناشاد، حضرت، جولائی ۱۹۱۴ء، غرناطہ، مشمولہ: ماہ نامہ، تمدن، جلد ۷ نمبر ۴، دہلی

نامعلوم، ۱۹۹۹ء، مسئلہ مصر اور برٹش کانشنس، مشمولہ: 'انتخاب اردوئے معلی'، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی

نامعلوم، (جامعہ ملیہ کے استاد کے قلم سے)، ۱۹۴۹ء، عالم اسلام اور جمال الدین افغانی: مشمولہ، 'مقام جمال الدین افغانی'، نفیس اکیڈمی، کراچی

نامعلوم، فروری ۱۹۲۴ء، دلچسپ اور قابل دید ناول، مشمولہ: رسالہ تمدن، دہلی

نامعلوم، اپریل ۱۸۸۹ء، عیسائیت اور اسلام، مشمولہ: ماہ نامہ، 'حسن'، حیدرآباد دکن

_____، فروری ۱۹۱۴ء، قسطنطنیہ اور قصر یلدیز، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۶ نمبر ۵، دہلی

_____، ۱۲۳۱ھ، تاریخ جنگ بلقان با تصویر، سٹیم پریس زمیندار، لاہور

نامی، عبدالعلیم، ڈاکٹر، ۱۹۶۲ء، اردو تھیٹر، (جلد اول)، انجمن ترقی اردو پاکستان

نثار علی، منشی، فروری، مارچ، اپریل، ۱۸۹۶ء، مشمولہ: رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور

ندوی، ابوالحسنات، ۱۹۲۱ء، خلافت اسلامیہ اور ترک، دار المصنفین، اعظم گڑھ

ندوی، حافظ مجیب اللہ، مئی ۱۹۵۵ء، ندوۃ العلما اور سید صاحب، مشمولہ: ماہ نامہ، 'معارف'، جلد ۷۵ (سید سلیمان ندوی نمبر)، اعظم گڑھ

ندوی، سید ابوالحسن، اپریل ۱۹۷۹ء، مولانا محمد علی جوہر چند نقوش وتاثرات، مشمولہ: 'جامعہ' (جوہر نمبر)، جلد ۷۶، شمارہ ۳، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

_____، دسمبر ۱۹۸۰ء، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی

_____، ۱۹۸۸ء، نقوش اقبال، سروسز بک کلب، کراچی

ندوی، سید رئیس علی جعفری، دسمبر ۱۹۶۳ء، علی برادران، (جوہر اسپیشل نمبر)، کراچی

ندوی، سید سلیمان، ۱۹۱۲ء، انتخاب الاخبار کی خبروں کا خلاصہ، مشمولہ: 'الندوہ'، لکھنو
_____، اکتوبر ۱۹۲۱ء، خلافت اور ہندوستان، مشمولہ: ماہ نامہ 'معارف'، جلد ۸ نمبر ۴، اعظم گڑھ
_____، ۱۹۳۸ء، مرتبہ، مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، در مطبع معارف، اعظم گڑھ
_____، ۱۹۴۳ء، حیات شبلی، در مطبع معارف اعظم گڑھ
_____، ۱۹۶۶ء، مقالات سید سلیمان ندوی، مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبع معارف، اعظم گڑھ
_____، ۱۹۵۷ء، مشہد اکبر، مشمولہ: 'نوائے آزادی'، مرتبہ: عبدالرزاق کان پوری، ادبی پبلی شرز، بمبئی
_____، اپریل جون ۱۹۷۶ء، حسرت کی سیاسی زندگی، مشمولہ: ماہ نامہ 'نگار'، کراچی
_____، ۱۹۸۹ء، مرتبہ مکاتیبِ شبلی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
_____، ۱۹۸۹ء، مرتبہ، مکاتیبِ شبلی (حصہ دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
_____، ۱۹۸۹ء، مرتبہ: کلیات شبلی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
_____، ۱۹۹۷ء، برید فرنگ، خطوط کا مجموعہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی
ندیم، امتیاز، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء، ماہ نامہ مخزن اشاریہ اور ادبی خدمات، فخرالدین علی احمد میموریل اتر پردیش، لکھنو
نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۶۲ء، اخضری پہاڑوں میں محمد کا نام، مشمولہ: سہ ماہی 'الزبیر' (سفرنامہ نمبر)، بہاول پور
نظامی، خلیق احمد، پروفیسر، جنوری ۱۹۶۶ء، سید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی، مشمولہ: 'تاریخی مقالات'، ندوۃ المصنفین اردو بازار، دہلی
نعمانی، احمد اسحاق، ستمبر ۱۹۶۰ء، شبلی اور سیاست، مشمولہ: 'ادیب'، شبلی نمبر، شمارہ ۹ جلد ۶ علی گڑھ
نعمانی، پروفیسر شرر، جون ۱۹۷۰ء، فردوس بریں ایک مطالعہ، مشمولہ: رسالہ 'خیابان' (شرر نمبر)، پشاور
نعمانی، شبلی، دیکھیے: شبلی نعمانی، مولانا
نعمان ردولوی، خورشید، پروفیسر، ۲۰۰۱ء، دار المصنفین کی تاریخ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
نگرامی، محمد اویس، مولوی، دیکھیے: اویس نگرامی، محمد، مولوی نونہروی، سید شبیہ الحسن، دیکھیے: شبیہ الحسن نونہروی، سید
واحدی، ملا، مئی ۱۹۶۸ء، دار العلوم دیو بند اور اس کے قیام کا پس منظر، مشمولہ: ماہ نامہ البلاغ، کراچی
واسطی، سید تنویر، اپریل ۱۹۹۸ء، *Muhammad Inshaullah Khan and the Hijaj Railway*، مشمولہ: مڈل ایسٹرن اسٹڈیز: فرینک کیس جرنل، لندن
_____، جولائی ۲۰۱۰ء، *Sir Syed Ahmed Khan and the Turks*، مشمولہ: مڈل ایسٹرن اسٹڈیز: فرینک کیس جرنل، جلد ۴۶، شمارہ نمبر ۴، لندن
_____، ستمبر ۲۰۰۶ء، *The Political Aspirations of Indian Muslims and the Ottoman Nexus* مشمولہ: 'مڈل ایسٹرن اسٹڈیز: فرینک کیس جرنل'، جلد ۴۲، شمارہ نمبر ۵، لندن
_____ خط بنام جاوید احمد خورشید، ۱۵ اپریل ۲۰۱۴ء، مشمولہ: 'مشیر حسین قدوائی اور سلطنت عثمانیہ کی حمایت'، غیر مطبوعہ ترجمہ، کراچی
وحشت، رضا علی، مارچ ۱۹۱۳ء، فغان مسلم، مشمولہ: ماہ نامہ 'تمدن'، دہلی
وحشی، مرزا رفیع الدین بیگ، ۱۹۱۴ء، فتح قسطنطنیہ، مطبع ستارہ ہند، کلکتہ

وارن ڈاکٹر (Warren Dockter)، آٹومن، ۲۰۱۱ء، The influence of a poet: Wilfrid S. Blunt and the Churchills، مشمولہ: شمارہ ۱۰:۲؛ ۱۰۲۔۷۰، جرنل آف ہسٹاریکل بایوگرافی، یونی ورسٹی آف ڈی فریزر ویلے، ایبرٹس فورڈ، کینیڈا

وکیل، مورخہ ۲۸ مئی ۱۸۹۶ء، بحوالہ: 'عہد حکومت سلطان عبدالحمید'، مصنفہ، انشاء اللہ خان، حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور

وہیلر، جی۔ ای، یکم اگست ۱۹۴۳ء، جدید ترکی، مشمولہ: پندرہ روزہ 'آج کل'، دہلی

ویمبری، آرمینیس، اپریل ۱۹۰۶ء، سیدی علی رئیس کا سفر نامہ، ترجمہ: مولوی انشاء اللہ خان، حمیدیہ سٹیم پریس لاہور

_____، ۱۹۱۰ء، Western Culture in Eastern Land، ترجمہ: ظفر عمر نیلی چھتری والے، 'مستقبل اسلام۔ مغربی تمدن اور مشرقی ممالک'، باردوم، عبدالرشید اینڈ برادرز لاہور

_____، پروفیسر، نومبر ودسمبر ۱۹۱۰ء، مستقبل اسلام، مشمولہ: 'پنجاب ریویو'، جلد اول نمبر ۴ و ۵، لاہور

_____، س ن، لکچر ترکی کی عام ترقی و شائستگی، مشمولہ: رسالہ 'حسن'، حیدرآباد دکن

ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۴ء، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

ہاشمی، طارق محمود، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، عالم اسلام کا بازوئے مغرب اور شاعر مشرق، مشمولہ: رسالہ، 'زبان ادب'، شمارہ ۴، کراچی

ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ۱۹۸۳ء، امتزاج، نیو کتاب منزل بھاگل پور، بہار

_____، ۱۹۹۰ء، عبد الحلیم شرر بہ حیثیت شاعر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی

ہیرانو، جونیچی (Hirano Junichi)، ۲۲۔۲۴ نومبر ۲۰۰۸ء، Historical formation of Pan Islamism This paper includes additional modification to the presentation at IAS-AEI International conference on New horizons in Islamic Area Studies، کوالالمپور

ہربرٹ، ولیم ڈی، ۱۹۰۰ء، محاربات پلیونا، ترجمہ: محمد انشاء اللہ خان، جلد اوّل، منشی فاضل شیخ غلام محمد، مطبع امرت سر

ہمدانی، رضا، ۱۹۶۲ء، حیاتِ جمال الدین افغانی، گوشہ ادب چوک انارکلی، لاہور

یلدرم، سجاد حیدر، جولائی ۱۹۰۰ء، سر کیشیا، مشمولہ: 'معارف'، علی گڑھ

_____، اکتوبر ۱۹۰۰ء، نشے کی پہلی ترنگ، مشمولہ: ماہنامہ 'معارف'، علی گڑھ

_____، ۱۹۹۹ء، میرے دوستانے والے، مشمولہ: 'انتخاب اردوئے معلیٰ'، مرتبہ: فضل الحسن حسرت موہانی، حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی

یاسمین، عزل، ۱۹۷۳ء، سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان

اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان جنوبی ایشیا میں تحریک اتحاد اسلامی کے تاریخ، تہذیب اور اردو ادب پر متنوع اثرات کا غائر مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذ کو استعمال کرتے ہوئے تحریکِ اتحاد اسلامی کی ان جہتوں کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے جس نے اردو زبان و ادب کو متاثر کیا اور اس وقت کے مسلم دانش وروں نے اس ضمن میں کیا تصورات پیش کیے۔ نو آبادیاتی ہندوستان میں پان اسلامزم کی فکری بنیادوں کا احاطہ کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ترکی کی خلافت کو بچانے کے لیے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا منظر نامہ نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے یعنی اس تحریک کی نظریاتی بنیادوں کو سیاسی قوت فراہم کرنے والے رہنما جمال الدین افغانی کی مقبولیت کی وجہ کیا تھی۔

اس کتاب میں جنوبی ایشیا کے مسلم دانش وروں اور ملّی و سیاسی زندگی میں برپا ہونے والی تحریکوں علی گڑھ، دیوبند، ندوۃ العلما نے اس تحریک سے کیا حاصل کیا اور اس تحریک کو کتنا متاثر کیا اس کی تفصیلات کو اس کتاب میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں اردو کی اہم نثری و شعری اصناف پر اس تحریک کے اثرات کا سلسلہ وار مطالعہ کیا ہے اور ایک ارتقائی عمل کے ذریعے ان اصناف میں اس تحریک کی فکری اور نظریاتی بنیادوں کا نہایت جامع مطالعہ پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر خلیل طوق آر
استنبول یونی ورسٹی، ترکی

عکس
AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road,Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

9 789697 310265